افسانے

مکمل ناول

اکتوبر 2011

جلد 26 شمارہ 2

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: 91 بی، بلاک ڈبلیو، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaamonthly@yahoo.com, info@khawateendigest.com

شعاع کا اکتوبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

دس برس پہلے نائن الیون کو پیش آنے والا واقعہ جس نے دُنیا بدل دی۔ آج بھی اسرار کے پردوں میں لپٹا ہوا ہے۔ اس واقعہ کو بنیاد بنا کر جس جنگ کا آغاز کیا گیا، اس میں پاکستان صفِ اوّل کا اتحادی تھا۔ اس جنگ کے مقاصد کیا تھے اور لاکھوں معصوم بے گناہ انسانی جانوں کے زیاں سے کیا حاصل کیا گیا یہ تو وہی جانتے ہوں گے جنھوں نے یہ جنگ شروع کی لیکن پاکستان نے اس جنگ کا حصّہ بن کر تباہی و بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں کیا۔ آج ہمارے ملک کا کوئی حصّہ دہشت گردی سے محفوظ نہیں۔ معیشت تیزی سے زوال کی جانب بڑھ رہی ہے اور ہم توانائی کے بدترین بحران کا سامنا کر رہے ہیں۔ اس پر مستزاد آفتِ ارضی و سماوی۔ صوبہ سندھ کا بڑا حصّہ شدید بارشوں کے باعث زیرِ آب آچکا ہے۔

اس صورتِ حال میں عالمی برادری کی جانب سے جس سرد مہری کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔

ہمیں اپنی بقا کے لیے خود کوشش کرنا ہوگی۔ لاکھوں بے گھر، بے سروساماں لوگ ہماری امداد کے منتظر ہیں۔ مصیبت کی اس گھڑی میں ان کا ہاتھ تھام لیں۔ وہ ہمارے اپنے ہیں۔

عید نمبر

نومبر کا شمارہ عیدالاضحی سے پہلے آئے گا۔ اس میں عیدالاضحی کے حوالے سے تحریریں اور سلسلے شامل ہوں گے۔ عید نمبر میں قارئین کی شمولیت کے لیے حسبِ روایت سروے بھی شامل ہو گا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1- کسی بھی خوشی، عید، تہوار کے موقع پر خواتین کا زیادہ تر کچن کی نذر ہوتا ہے۔ عیدالاضحی کے موقع پر تو خاص طور پر کچن کی مصروفیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ آپ کو زیادہ لطف کون سی عید پر آتا ہے۔ عیدالفطر یا عیدالاضحی؟

2- عیدالاضحی کے موقع پر قربانی کے حوالے سے پیش آنے والا کوئی دلچسپ واقعہ؟

3- اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھ سے کوئی خاص چیز پکا کر کھلانے اور داد وصول کرنے میں ایک الگ ہی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اس عیدالاضحی پر کون سی ڈش خاص طور پر بنانے کا پروگرام ہے۔ اس ڈش کی ترکیب ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

محمود بابر فیصل (ذوالقرنین)

25 اکتوبر 1993ء کو محمود بابر فیصل اس دارِ فانی کو الوداع کہہ گئے تھے۔ ان کی پیاری شخصیت اُن کی دل آویز گفتگو، شگفتہ و لطیف باتیں بھلا کون بھلا سکتا ہے۔ آج ایک طویل مدت بعد بھی وہ ہماری یادوں میں زندہ ہیں۔

محمود بابر فیصل کے لیے دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- فائزہ افتخار کا مکمل ناول — مان جاؤ، • شہناز صدیقی کا مکمل ناول — راہِ نوردِ شوق،
- مریم عزیز، سائرہ عارف اور سمیرا یونس کے ناولٹ،
- حرا قریشی، حنا یاسمین، سمیرا گل، لبنیٰ طاہر اور فرحانہ ناز ملک کے افسانے،
- عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے ناول، • معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ — دستک،
- سامران جیلانی اور فاطمہ جیلانی کا بندھن، • بیٹھ کر سیرِ دو جہاں کرنا — آمنہ ذریں کا تبصرہ،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا ہر شمارہ ہمارے لیے خاص نمبر ہوتا ہے اور ہم اسے پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں۔ آپ کو شعاع کا یہ شمارہ کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔ خط ضرور لکھیے گا۔

حمد باری تعالیٰ

آہِ دل سوز میں تُو سینۂ افگار میں تُو
رُوح میں، قلب میں اور دیدۂ خوں بار میں تُو

گوشۂ امن میں، میدان و غار میں تُو ہے
دہر کی دھوپ میں تُو سایۂ دیوار میں تُو

آسمانوں میں، زمیں میں ہے اُجالا تجھ سے
آشکارا ہے ہر اک چیز سے سنسار میں تُو

قُلزُمِ زیست کے طوفاں میں سہارا تیرا
کشتیٔ عمر میں تُو، موج میں، پتوار میں تُو

تُو ہے جبّار و قوی، برق و شرر میں تُو ہے
تُو لطیف اور ولی، دہر کے گلزار میں تُو

ثور کے غار میں صدیقؓ و نبیؐ یک جا تھے
ساتھ اُن دونوں کے موجود تھا اس غار میں تُو

پھُول عاصی کے تجھے اشکِ ندامت ہیں پسند
قلبِ سائل میں نہاں، چشمِ گہر بار میں تُو

تنویر پھول

کہہ دیا اللہ نے نُورالہدیٰ سرکارؐ ہیں
تا قیامت ہر بشر کے رہنما سرکارؐ ہیں

آپؐ ہیں نُورِ ہدایت، آپؐ ہیں روشن چراغ
کہتا ہے قرآن ختم الانبیا سرکارؐ ہیں

رحمت اللعالمین ہیں صاحبِ خُلقِ عظیم
قولِ حق ہے لائقِ مدح و ثنا سرکارؐ ہیں

عبد ہیں اللہ کے لیکن شہنشاہِ انام
جانتا ہے ربِّ عالم ہی کہ کیا سرکارؐ ہیں

کیوں نہ اقرا کی تجلّی کا وہاں پر ہو ظہور
نُور بخشِ گوشۂ غارِ حرا سرکارؐ ہیں

سنگ باری کر رہے ہو، شرم کچھ آتی نہیں
اہلِ طائف! دیکھو مصروفِ دُعا سرکارؐ ہیں

پھُول! خورشیدِ قیامت سے نہ خائف ہو ذرا
حشر کے میداں میں تیرا آسرا سرکارؐ ہیں

تنویر پھول

پیارے نبی کی پیاری باتیں

ادارہ

باب : 195- مسجد حرام اور مسجد نبویؐ میں نماز کی فضیلت

1404- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "میری اس مسجد میں ایک نماز مسجد حرام کے سوا کسی بھی مسجد میں پڑھی جانے والی ہزار نمازوں سے افضل ہے۔"

فوائد و مسائل : دنیا میں سب سے افضل مسجدیں تین ہیں۔ مسجد حرام جس کے اندر خانہ کعبہ ہے' مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ' اس لیے ان تینوں مسجدوں کی زیارت کے لیے اور وہاں عبادت کی نیت سے سفر کرنا جائز اور ثواب کا کام ہے۔ ان کے علاوہ کسی بھی مقام' مسجد' مزار وغیرہ کی طرف اس نیت سے سفر کر کے جانا جائز نہیں کہ وہاں عبادت کا ثواب زیادہ ہو گا کیونکہ قبرستان میں تو نماز پڑھنا منع ہے اور دوسری تمام مساجد کا ثواب برابر ہے' لہٰذا سفر کا فائدہ نہیں' البتہ مسجد قباء کی فضیلت بھی دیگر احادیث سے ثابت ہے' اس لیے یہ چوتھی مسجد ہے جس کی مدینے میں ہوتے ہوئے زیارت کے لیے جانا مستحب ہے۔

مسجد نبویؐ میں ایک نماز کا ثواب ایک ہزار نماز کے برابر ہے' اس لیے جب مدینہ شریف جانے کا موقع ملے تو زیادہ سے زیادہ نمازیں مسجد نبویؐ میں باجماعت ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس میں چالیس نمازیں پوری کرنے کی شرط نہیں۔

بعض روایات میں مسجد نبوی میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر آیا ہے۔ مثلاً سنن ابن ماجہ حدیث : 1413 لیکن یہ حدیث ضعیف ہے۔

باب : 196- بیت المقدس کی مسجد میں نماز کا بیان

1407- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آزاد کردہ خاتون حضرت میمونہ بنت سعدؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ میں نے عرض کیا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں بیت المقدس کے بارے میں مسئلہ بتا دیجیے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "وہ حشر نشر کی سرزمین ہے' وہاں جا کر نماز پڑھا کرو کیونکہ اس جگہ میں ایک نماز پڑھنا کسی اور جگہ ہزار نمازیں پڑھنے کی طرح ہے۔"

میں نے عرض کیا۔ "یہ فرمائیے کہ اگر مجھے سفر کر کے وہاں جانے کی طاقت نہ ہو؟" (تو کیا کروں؟)

فرمایا۔ "اس مسجد کے لیے تیل بھیج دو جس سے اس میں چراغ جلائے جائیں' جس نے یہ کام کیا' وہ بھی ایسے ہی ہے جیسے وہ شخص جو (زیارت کے لیے) وہاں گیا۔"

1408- حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو انہوں نے اللہ سے تین چیزیں مانگیں۔

"ایسا فیصلہ جو اللہ کے فیصلے کے مطابق ہو۔

"ایسی بادشاہت جو ان کے بعد کسی کے شایاں نہ ہو۔

3- جو شخص بھی اس مسجد میں صرف نماز کی نیت سے آئے وہ گناہوں سے اسی طرح پاک صاف ہو جائے جس طرح اس دن (گناہوں سے پاک) تھا جب اسے اس کی ماں نے جنم دیا تھا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "دو چیزیں تو انہیں مل چکیں اور مجھے امید ہے کہ تیسری بھی مل ہی گئی ہے۔"

فوائد و مسائل : اللہ کے فیصلے کے مطابق کا مطلب یہ ہے کہ انہیں صحیح فیصلے کرنے کی توفیق ملے اور ان سے اجتہادی غلطی نہ ہو۔

پہلی دو درخواستوں کی قبولیت قرآن میں مذکور ہے۔ ارشاد ہے۔ ترجمہ : "ہم نے اسے حکمت دی اور بات کا فیصلہ کرنا۔" نیز ارشاد ہے۔ ترجمہ : "انہوں نے کہا۔ اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی بادشاہت عطا فرما جو میرے سوا کسی کے لائق نہ ہو۔ بلاشبہ تو ہی بہت عطا کرنے والا ہے۔ چنانچہ ہم نے ہوا کو ان کے ماتحت کر دیا' وہ ان کے حکم سے جہاں وہ چاہتے' نرمی سے پہنچا دیا کرتی تھی اور ہر عمارت بنانے والے غوطہ خور شیاطین (جنات) کو بھی (ان کے ماتحت کر دیا۔) اور دوسرے (جنات) کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔"

اس حدیث میں بیت المقدس کی زیارت اور وہاں نماز پڑھنے کی فضیلت کا بیان ہے۔

ثواب کی نیت

1409- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کجاوے کس کر صرف تین مسجدوں کی طرف سفر کیا جا سکتا ہے۔ مسجد حرام' میری یہ مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد اقصیٰ۔"

فائدہ : کسی اور مسجد' قبر' پہاڑ یا غار وغیرہ کی طرف ثواب کی نیت سے سفر کرنا یا زیارت کے لیے جانا ممنوع ہے۔ صرف یہ تین مساجد ایسی ہیں جن کی طرف ثواب کی نیت سے سفر کرنا جائز ہے۔ حجاج کرام کو چاہیے کہ جب مکے سے مدینہ جائیں تو نیت مسجد نبوی کی ہونی چاہیے نہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی کیونکہ قبر کی نیت سے سفر کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔

1410- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کجاوے کس کر سفر نہ کیا جائے مگر تین مسجدوں کی طرف۔ مسجد حرام کی طرف' مسجد اقصیٰ کی طرف اور میری اس مسجد کی طرف۔"

فائدہ : زیارت کے لیے سفر صرف ان تین مساجد کی طرف جائز ہے' اس کے علاوہ کسی جائز مقصد کے لیے سفر کر کے کسی بھی مقام پر جانا جائز ہے۔ مثلاً "حصول علم کے لیے' جہاد کے لیے' علماء و صلحاء سے ملاقات کے لیے' اقارب اور احباب سے ملاقات کے لیے یا تجارت اور ملازمت کے لیے' اسی طرح جو شخص مدینہ میں موجود ہے تو وہ مسجد قباء میں جائے تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ یہ سفر نہیں۔

باب : 197- مسجد قباء میں نماز کی فضیلت کا بیان

1411- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت اسید بن ظہیر انصاریؓ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مسجد قباء میں ایک نماز ایک عمرے کے برابر ہے۔"

فوائد و مسائل : مسجد قباء وہ مسجد ہے جو ہجرت کے بعد سب سے پہلے تعمیر ہوئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچنے سے پہلے چند روز قباء تشریف فرما رہے اور وہاں مسجد کی بنیاد رکھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہفتہ میں ایک بار وہاں جا کر نماز پڑھا کرتے تھے۔

مدینہ میں قیام کے دوران میں مسجد قباء کی زیارت کے لیے جانا چاہیے تاکہ عمرے کا ثواب حاصل ہو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا ثواب بھی مل جائے۔

باب : 198- جامع مسجد میں نماز کا ثواب

1413- حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آدمی کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا ایک نماز کے برابر ہے اور اس کا قبیلے (یا محلے) کی مسجد میں نماز پڑھنا پچاس نمازوں کے برابر ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنا پانچ سو نمازوں کے برابر ہے اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنا پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور میری مسجد (مسجد نبویؐ) میں نماز پڑھنا پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور مسجد حرام میں نماز پڑھنا ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔"

باب : 199- سب سے پہلے منبر کیسے بنا؟

1414- حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

جب مسجد نبوی ایک چھپر کی صورت میں تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے ایک تنے کی طرف (منہ کر کے) نماز پڑھا کرتے تھے اور اسی تنے سے ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے۔ ایک صحابیؓ نے عرض کیا۔

"کیا ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی ایسی چیز نہ بنادیں جس پر آپ جمعے کے دن (خطبہ دینے کے لیے) کھڑے ہوا کریں تاکہ لوگ آپ کی طرف متوجہ ہو سکیں اور آپ کا خطبہ (اچھی طرح) سن سکیں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں۔"

اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے (منبر کے) تین درجے بنائے۔ وہی (تین سیڑھیاں) اب (موجودہ) منبر کا سب سے بالائی حصہ ہے۔

جب منبر تیار ہو گیا تو صحابہ کرامؓ نے اسے اسی مقام پر رکھا جہاں وہ اب ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر منبر پر جانے لگے تو اس تنے کے پاس سے گزرے جس سے ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے آگے بڑھے تو وہ زور زور سے رونے لگا حتیٰ کہ (شدتِ غم سے) اس کی آواز پھٹ گئی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنے (کے رونے) کی آواز سنی تو (منبر سے) نیچے تشریف لے آئے اس (تنے) پر ہاتھ پھیرتے رہے، حتیٰ کہ وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر منبر پر تشریف لے گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے تھے تو اس کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ جب مسجد نبوی کو (دوبارہ تعمیر کرنے کے لیے) منہدم کیا گیا اور مسجد کی عمارت میں تبدیلی (اور توسیع) کی گئی تو وہ تنا حضرت ابی بن کعبؓ نے لے لیا۔ وہ ان کے پاس ان کے گھر ہی میں رہا حتیٰ کہ بہت پرانا ہو گیا پھر اسے دیمک نے کھا لیا اور وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔

فوائد و مسائل : خطبہ کھڑے ہو کر دینا مسنون ہے

خطبہ منبر پر دینا چاہیے۔

بڑھئی کا پیشہ ایک جائز پیشہ ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری خاتون سے کہا تھا کہ اپنے غلام سے منبر بنوا دو اور اس نے بنوا دیا۔ ممکن ہے پہلے کسی صحابی نے یہ تجویز پیش کی ہو اس کے بعد اس غلام سے کہا گیا ہو اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس انصاری خاتون کو یاددہانی کرادی ہو۔ (واللہ اعلم)

امام اور قائد کو اپنے متبعین کی اچھی رائے قبول کرنی چاہیے۔

جب منبر پہلے پہل بنایا گیا تو اس کے تین درجے تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کے نیچے مزید درجات کا اضافہ کر کے اسے مزید بلند کر دیا گیا۔

بظاہر بے جان نظر آنے والی چیزوں میں شعور اور احساس موجود ہے لیکن ہم اسے محسوس نہیں کر سکتے۔

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

کھجور کے تنے کا آواز سے اس طرح رونا کہ سب لوگ سنیں ایک معجزہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھنے والی اشیاء کو تبرک کے طور پر محفوظ رکھنا درست ہے، بشرطیکہ اس نسبت کی صحت کا یقین ہو۔

مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین مثلاً "شیخ البانیؒ" نے اسے حسن اور الموسوعة الحديثيہ کے محققین نے اسے صحیح لغیرہ قرار دیا ہے۔ نیز انہوں نے کافی تفصیل سے اس روایت کی بابت لکھا ہے، دیکھیے (الموسوعة مسند الامام احمد : 35/ 171، 172) لہٰذا مذکورہ روایت سنداً "ضعیف ہونے کے باوجود قابل عمل اور قابل حجت ہے۔

1415- حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک تنے سے ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر بنوایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر کی طرف چلے۔ تنا (ستون) رو پڑا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس آئے اور اسے سینے سے لگایا تب وہ خاموش ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر میں اسے گلے سے نہ لگاتا تو یہ قیامت تک روتا رہتا۔"

1416- حضرت ابو حازمؒ سے روایت ہے کہ لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ وہ کس چیز (کی لکڑی) سے بنا ہوا تھا؟ چنانچہ وہ حضرت سہل بن سعدؓ کے پاس آئے اور ان سے پوچھا۔ انہوں نے فرمایا۔

"یہ بات مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ وہ غابہ کے جھاؤ سے بنا تھا۔ اسے فلاں خاتون کے فلاں بڑھئی غلام نے بنایا تھا۔ وہ اسے لے کر حاضر ہوا۔ جب وہ (اپنے مقام پر) رکھا گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس پر کھڑے ہوگئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلے کی طرف منہ کیا۔ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے (آپ کی اقتدا میں نماز ادا کر رہے) تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرأت کی پھر رکوع کیا، پھر (رکوع سے) سر اٹھایا پھر آپ الٹے پاؤں پیچھے ہٹے۔ حتیٰ کہ زمین پر سجدے کیے پھر دوبارہ منبر پر کھڑے ہوگئے اور قرأت کی، پھر رکوع کیا، پھر قومہ کیا، پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹے حتیٰ کہ زمین پر سجدے کیے۔"

فوائد و مسائل : "مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی باقی نہیں رہا۔" یعنی جنہیں زیادہ معلوم تھا، وہ فوت ہو چکے ہیں۔

نماز باجماعت میں امام اگر مقتدیوں سے بلند مقام پر ہو تو کوئی حرج نہیں۔

نماز کے دوران کسی ضرورت سے پیچھے ہٹنے یا آگے بڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

منبر پر کھڑے ہو کر جماعت کرانے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اچھی طرح نماز کا طریقہ دیکھ لیں اور سمجھ لیں۔

باب : 200- نماز میں لمبا قیام کرنے کا بیان

1418- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔ "ایک رات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز (تہجد) پڑھی۔ آپ اتنا عرصہ کھڑے رہے کہ میں نے ایک برے کام کا ارادہ کر لیا۔ (ابو وائل) فرماتے ہیں)

میں نے کہا۔ "وہ کون سا کام تھا؟"

فرمایا۔ "میں نے ارادہ کیا کہ میں بیٹھ جاؤں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا رہنے دوں۔"

فوائد و مسائل : نمازِ تہجد باجماعت جائز ہے۔ نمازِ تہجد میں طویل قرات افضل ہے۔

شاگردوں کو تربیت دینے کے لیے ان سے مشکل کام کروانا جائز ہے اگرچہ اس میں مشقت ہو۔

استاد کا خود نیک عمل کرنا شاگردوں کو اس کا شوق دلاتا اور ہمت پیدا کرتا ہے۔

صحابہ کرام نیکی کا اس قدر شوق رکھتے تھے کہ افضل کام کو چھوڑ کر جائز کام اختیار کرنے کو انہوں نے "برا کام" قرار دیا۔

حضرت ابن مسعودؓ کا ارادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز ادا کرنے کا تھا اب اتباع اور محبت کا تقاضا ہے کہ اس نیکی میں آخر تک ساتھ دیا جائے اس لیے بیٹھ جانے کو انہوں نے برا سمجھا کہ یہ محبت کے تقاضے کے خلاف ہے۔

1419۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا حتیٰ کہ آپ کے قدم مبارک سوج گئے عرض کیا گیا۔

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ نے آپ کے تو اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے ہیں (پھر آپ اتنی مشقت کیوں کرتے ہیں؟)"

فرمایا۔ "کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟"

فوائد و مسائل : پیغمبر گناہ سے معصوم ہوتے ہیں' لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ کوئی گناہ سرزد ہو جائے گا تو اس کو پہلے سے معاف کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس سے مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند مقام و مرتبہ کا اظہار ہے یا "گناہ" سے مراد وہ اعمال ہو سکتے ہیں جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مصلحت کی بنا پر افضل کام کو چھوڑ کر دوسرا جائز کام اختیار فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اعلا مقام دے تو اسے چاہیے کہ شکر کا زیادہ اہتمام کرے۔

شکر کا بہترین طریقہ عبادت میں محنت کرنا ہے' خصوصاً" نماز اور تلاوت قرآن مجید میں۔ نماز تہجد میں یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔

باب : 201۔ کثرت سے سجدے کرنے کا بیان

1422۔ حضرت ابو فاطمہؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ میں نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کوئی عمل بتایئے جس پر میں قائم رہوں اور اسے کیا کروں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کثرت سے سجدے کیا کر کیونکہ تو اللہ کے لیے جو بھی سجدہ کرے گا اس کی وجہ سے اللہ تیرا ایک درجہ بلند کر دے گا اور تیری ایک غلطی معاف کر دے گا۔"

فوائد و مسائل : نماز کے تمام اعمال ہی اللہ کے قرب کا باعث ہیں لیکن سجدے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ اللہ کے سامنے عاجزی کا سب سے بڑا مظہر ہے اور یہ عجز ہی عبادت کی روح ہے۔

طویل قیام کی فضیلت تلاوت قرآن کی وجہ سے ہے اور سجدے کی فضیلت عجز و نیاز کی وجہ سے ہے' اس لیے طویل سجدہ بھی ایک عظیم عمل ہے جیسے کہ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طویل سجدوں کا بھی ذکر ہے۔

سجدے سے درجات بھی بلند ہوتے ہیں اور گناہ بھی معاف ہوتے ہیں۔

✱

محبتوں کی سرزمین سندھ دھرتی کا بڑا حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے اس کے باسی بے گھر' بے در' بے سرو ساماں کھلے آسمان تلے چاروں طرف سے پانی میں گھرے ہوئے ہیں۔ کنیز نبوی کی یہ "دعا" ہم سب سے عمل کا تقاضا کر رہی ہے۔ ہم سب محبتوں کے رشتے میں گندھے ایک جسم ایک جان کی مانند ہیں۔ یہ مصیبت زدہ لوگ ہمارے اپنے ہیں' آج ان کی منتظر نگاہیں ہم پر جمی ہیں' ہم ان کی محبتوں کے مقروض ہیں' مصیبت کی اس گھڑی میں ان کے لیے جو کچھ بھی' جتنا بھی ممکن ہو کریں۔ خصوصاً" بیرون ملک پاکستانی جو ہر افتاد میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ رہے ہیں۔ آپ کے چند ڈالر' پونڈ' دینار' ریال ان کی سانسوں کا رشتہ جسم کے ساتھ استوار رکھ سکتے ہیں۔ نیکی چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی' خیر کے عمل میں اللہ تعالیٰ برکت ڈال دیتا ہے۔ کیا پتا آپ کا چھوٹا سا ایثار کسی کے لیے زندگی بن جائے۔

یا ارحم الراحمین

کنیز نبوی

سب ثنا' ساری تعریف تیری ذات باری کے لیے' تو نے کائنات بنائی اور تیرے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔

اور درود و سلام نبی آخر الزماں' محمد مجتبیٰ احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا اور ہم سب پر احسان کیا۔

آج میں تیری بارگاہ میں عاجز' نمانی سندھ اور دشمنوں کے نرغے میں گھرے پاکستان کی فریاد لے کر حاضر ہوئی ہوں۔

تیرا در چھوڑ کر کس کے پاس جاؤں۔ یہاں اندھیر نگری ہے۔ کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ حکمران اندھے اور بہرے ہیں۔ انتظامیہ بدعنوان' خود غرض اور ارتی کیشن والے نااہل ہیں۔

جنہوں نے پچھلے سال بھی سندھ کو ڈبو دیا اور اس سال بھی تیری رحمت کو زحمت بنا دیا۔

اے میرے رب تو جانتا ہے کہ پچھلے سال شیر دریا نے جب ارض پاک کے سینکڑوں شہر و قصبے اور دیہات نگل لیے تھے۔ تو ہمارے سندھ کے لوگ تب بھی چیخ رہے تھے۔ لاڑ سندھ کے لوگ جن کے پٹکے (پگڑی) میں محبت بندھی ہوئی ہے۔

جن کے شانوں پر اجرک کی مانند عاجزی کے رنگ بکھرے ہیں' جن کے دلوں میں اللہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیا اللہ کی محبت ٹوپیوں کے شیشوں اور ہیروں سے زیادہ چمکتی ہے۔

بدین کی دھرتی جو کہ اپنی کوکھ سے تیل اور گیس کے ذخائر نکال کر ارض پاک کو سونپتی ہے۔

جس کی زمینیں کپاس' گنا' ٹماٹر' خربوزہ' تربوز' ٹنڈے' گندم' جوار' باجرہ' پیاز اور ہر طرح کی فصل اگنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔

وہ میرپور خاص جو صرف شاندار فصلیں ہی نہیں اگاتا اپنے رسیلے میٹھے آموں کی وجہ سے بھی پوری دنیا میں مشہور ہے۔ وہ تھر اور مٹھی جو اپنی ریت کے نیچے کالا سونا (کوئلے) کا بے تحاشا خزانہ چھپائے بیٹھا ہے۔

وہ کنری جو ایشیا کی سب سے بڑی مرچ منڈی ہے اور سندھ جس کے چپے چپے میں کوئی نہ کوئی خزانہ پوشیدہ ہے۔ لیکن اس دھرتی کے لوگوں کے تو جھے

پیٹوں میں بھوک دوڑتی ہے۔

وہ پھر بھی ہر حال میں تیرے شکر گزار بندے ہیں۔ کہ تو نے ان کے اندر سندھ کی مثالی مٹی جیسی عاجزی رکھی ہے، جو کہ تجھے بے حد پسند ہے۔

یہ سندھ کی ماروِیاں، جن کی اداؤں میں حیا کے موتی ٹنکے ہوئے ہیں۔ کرپٹ "نااہل حکومتی مشینری نے مسلسل سالوں پر محیط بدانتظامی کی وجہ سے ان سب کو پورے جنوبی سندھ کو ڈبو دیا۔

تیل اور گیس کے ذخائر سے مالا مال بدین، جس کے لوگ کبھی پانی کے لیے ترستے تھے، کربلا پکارتے اور احتجاج کرتے تھے "اس بار ایسے پانی کے گھیرے میں آئے کہ عمر بھر کی پونجی لٹا بیٹھے۔

تو جانتا ہے میرے رب کہ پچھلے سال سب چیخ رہے تھے کہ جنوبی سندھ کی ساری نہریں، سیم نالے، شاخیں، کینال، جن کے بند کمزور ہیں ان کو پختہ کیا جائے۔ کھدائی کی جائے، مگر کسی کی نہیں سنی گئی۔ ان کا خیال تھا یہاں سے سندھ دریا نہیں بہتا سو سیلاب کا کوئی خطرہ نہیں۔ مگر یہاں سے ایل بی او ڈی تو سمندر کی طرف جاتا ہے۔

جس کی تین ہزار کیوسک گنجائش ہے اور جو بیس ہزار کیوسک کا بوجھ نہ اٹھا سکا اور یہ گندہ نالا ساری آبادیوں کو نگل کر ویران کر گیا۔ اس نالے کی غلط پلاننگ نے بدین کو دوسری بار ڈبو دیا ہے۔ سمندر تک رینگ کے جانے والا پہلے بھی سمندر کو کھینچ کر اوپر لایا تو تباہی بچ گئی تھی۔ اور جو کسر دریا نے چھوڑی وہ نالے نے نکال دی۔

یہاں ڈیم بنانا تو بڑی بات، کبھی کسی نے سوچا تک نہیں کہ یہاں بھی ڈیم بن سکتا ہے۔

بارشیں ہوتی ہیں تو سیلاب آجاتے ہیں اور نہیں ہوتیں تو قحط کے سے حالات ہوتے ہیں۔ المیہ تو یہ ہے کہ وہ سندھو دریا جو دو حصوں میں بٹ کر سمندر تک جاتا تھا۔

موسم کی وجہ سے اس کا ایک حصہ مہران یا ہاکڑو دریا کے نام سے سوکھ گیا۔ اب لوگوں نے اس کے پیٹ میں تجاوزات قائم کر کے ان کو تقریباً "مٹا دیا ہے۔

یہی المیہ کراچی کے ساتھ ہوا ہے۔

گیارہ حصوں میں بٹ کر سندھو کراچی سے سمندر میں گرتا تھا۔ اب وہاں پلازے بن گئے ہیں۔ اگر کبھی طوفانی بارشیں ہوئیں تو کراچی بھی پورا ڈوب جائے گا۔

اب ملک کا نظام چلانے والے تو سارے لوٹ مار کی مشینیں بنے ہوئے ہیں۔ بیرون ملک جائیدادیں بنا کر اپنا مستقبل محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کو یقین ہے کہ ملک ٹوٹ جائے گا۔

سو وہ کیونکر پاکستان میں بسنے والے غریبوں کے لیے کچھ پلاننگ کریں۔

جو سچے پاکستانی ہیں ان کا ایمان ہے کہ لا الہ الا اللہ کی بنیاد پر بنے ارض وطن کو اللہ سائیں ضرور قائم و دائم رکھے گا۔ ان شاء اللہ

یا اللہ تو جانتا ہے کہ سندھ دھرتی کے باشندے امن و محبت و تصوف کے پیامبر ہیں۔ اس کا ثبوت ہر شہر قصبے دیہات میں بسنے والے پنجابی، پٹھان، بلوچی، مہاجر ہیں۔ انھوں نے اندرون سندھ میں کبھی بھی خود کو غیر محفوظ ——— تصور نہیں کیا۔ سیاست دانوں کی نفرتیں بونے کی کوششوں کو سندھ دھرتی کے باشندوں نے اپنے عمل و کردار سے ہمیشہ ناکام بنایا ہے سندھ جو تیل اور گیس سے مالا مال ہے اور کوئلے کے بیش بہا ذخائر جن کو آج تک استعمال میں نہیں لایا گیا۔ جو پورے پاکستان کی توانائی کی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں۔ یا اللہ تو نے ان کو مالا مال زمینوں کا باسی بنایا۔ پھر ان کے اندر بھوک، غربت، بدحالی کیوں ہے؟ ان بے یار و مددگار لوگوں کو کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے مدد کے لیے پکارنے کی ضرورت نہ پڑے، اگر صرف ایک سال کے لیے ان کے تیل و گیس کی آمدنی ان کو دے دی جائے۔ یہ اجڑے دیار پھر سے آباد ہو سکتے ہیں۔

غربت و بدحالی کی جگہ خوش حالی ان کے گھروں پر دستک دے سکتی ہے۔ ڈینگی کے فوبیا میں مبتلا میڈیا کی کوریج بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ڈینگی جس سے اب تک ڈیڑھ دو سو افراد جاں بحق اور چند ہزار متاثر ہوئے ہیں۔ انھیں کروڑ کے لگ بھگ متاثرین نظر نہیں آتے۔

یا اللہ یہ لوگ، جو تجھے اللہ سائیں کہہ کر پکارتے ہیں ان پر رحم فرما۔ ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ ان کے گناہ بخش کر دے۔

ان دکھوں لوگوں کو صبر و استقامت عطا فرما۔

ان کی مدد کر مصائب سے شاکر و صابر بنا کر نکال۔

اے زندہ قائم و دائم رہنے والے رب۔

اس پانچ دن کی ڈوب کر ہلاک ہونے والی بچی اور اس جیسے اور بچوں کی ماؤں کو صبر دے اور پھر سے ان کی جھولیاں بھر دے۔ ان کی ماؤں کو ٹھنڈا رکھ۔ 8 لاکھ چھوٹے بچوں کو محفوظ رکھ۔ ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ حاملہ خواتین کے بچے بخیر و عافیت دنیا میں جنم لیں۔

تین لاکھ گیسٹرو، ملیریا کے مریضوں کو شفائے کاملہ عاجلہ مستقل عطا فرما اور ان کی تعداد کو بڑھنے سے روک دے۔

15 لاکھ منہدم گھروں کو پھر سے آباد کر۔

اپنے معصوم بچوں کو کاندھے پر اٹھائے۔ تانبے کے برتنوں اور پلاسٹک کے ڈرم پر پانی سے باہر نکلنے والوں کا تو ہی محافظ ہے تو ہی ان کی حفاظت فرما۔

اے میرے رزاق رب! تو صرف مسلمانوں کا نہیں، کافروں کا بھی رازق ہے۔ کل عالمین کو رزق دیتا ہے اور یہ تیرا ہی کام ہے۔ تو ان میلوں پھیلے ہوئے ٹیلوں پر بیٹھے لاکھوں لوگوں کو رزق دے۔ چاہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔

یا الٰہی تو لوگوں کے دلوں میں رحم ڈال۔ انھیں ان ڈوبے ہوئے مسکین لوگوں کا دامے درمے وسیلہ اور مددگار بنا اور مددگاروں کو اجر عظیم اور ان کے رزق میں برکت عطا فرما۔

اور جو تیری راہ میں کسی بھی شخص خواہ ادارے تنظیم این جی او و سیلاب زدگان کی مدد میں فنڈ دیتے ہیں۔ یہ سوچے بنا کہ کہیں بے ایمانی خرد برد بھی ہو سکتی ہے۔ ان کا یہ عمل قبول فرما اور ان کو خیر کثیر اجر عظیم دنیا و آخرت میں عطا فرما۔

اور امدادی کاموں میں مصروف اداروں لوگوں کے دلوں میں اپنا خوف ڈال، رحم ڈال کہ وہ سب ایمان داری سے سیلاب زدگان کی مدد میں مصروف عمل رہیں۔

اے میرے رب! ہمیں مچھروں اور نمرود والے عذاب سے بچا۔

ہم اپنی ذات کے متکبر بتوں سے تیری پناہ چاہتے ہیں۔ ہمیں خودکش بمبوروں کے جنم سے بچا۔ زمین و آسمانی آفات و مصائب و بلیات سے بچا۔ ذلت و خواری اور کفار کی یلغار سے بچا۔

اے ہمارے پالن ہار اپنی رحمت سے عادل حکمران عطا فرما۔ آمین ثم آمین۔

بناگھن

کامران جیلانی اور فاطمہ کامران

شاہین رشید

کامران جیلانی شوبز کے ایک کامیاب فنکار ہیں' ان کی شادی کو تقریباً" سوا تین سال ہو گئے ہیں۔ ان کا ایک دس ماہ کا بیٹا بھی ہے جس کا نام "آیان" ہے۔

☆ "کیسے ہیں کامران جیلانی۔۔۔ اور زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

* "بالکل ٹھیک اور الحمدللہ زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔ بیٹے کے آجانے سے تو جیسے اور بھی زیادہ بہار آگئی ہے۔"

☆ "شوبز کی زندگی نے گھریلو لائف پر اثر تو نہیں ڈالا ہے؟"

* "نہیں جی۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔ میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ گھر والوں کو پراپر ٹائم دیتا ہوں تو پھر بھلا گھریلو لائف ڈسٹرب کیوں ہو گی۔"

☆ "جوائنٹ فیملی ہے؟"

* "جی بالکل۔۔۔ ہماری فیملی میں لوگ ہی کتنے ہیں' بھائی کی فیملی ہے اور والدہ ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ کوئی پرابلم نہیں ہے۔"

☆ "فاطمہ سے ملاقات کب اور کیسے ہوئی تھی؟"

* "انٹرنیٹ کے ذریعے ہماری بات چیت کا آغاز ہوا تھا۔ یہ اسلام آباد میں رہتی تھیں اور میں کراچی میں۔ ٹیلی فون پہ بھی اکثر بات ہو جاتی تھی۔ پھر جب میں شوٹ کے سلسلے میں اسلام آباد گیا تو وہاں ان سے میری ملاقات بھی ہو گئی۔ بس پھر شادی کا فیصلہ کر لیا۔"

☆ "لو (Love) کو ارینج کرنے میں مشکل تو نہیں ہوئی؟"

* "نہیں کوئی خاص نہیں۔ دونوں خاندان آپس میں ملے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پرکھا اور بس۔۔۔ کہتے ہیں ناکہ جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔ ہمارا جوڑا بھی اسی طرح آسمان پر اللہ تعالیٰ نے بنا دیا تھا' جس کی تکمیل زمین پر ہوئی۔"

☆ "شادی دھوم دھام سے ہوئی؟"

* "جی بالکل جناب! خوب دھوم دھام سے ہوئی تھی اور بہت لوگ آئے تھے۔"

☆ "شادی سے پہلے اور شادی کے بعد آپ نے فاطمہ کو کیسا پایا؟"

* "فاطمہ تھوڑی غصے کی تیز اور جذباتی بھی ہیں۔ جلدی غصہ آجاتا ہے۔"

☆ "فاطمہ گھر گرہستن خاتون ہیں یا بس گزارا ہے؟"

* "فاطمہ ماشاء اللہ بہت گھر گرہستن خاتون ہیں۔ بہت اچھا کھانا پکاتی ہیں۔ شادی سے پہلے میں زیادہ تر گھر سے باہر کھانا کھاتا تھا کیونکہ شوٹ سے دیر سویر ہو جاتی تھی تو میں امی کو تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا لیکن شادی کے بعد کھانا زیادہ تر گھر پر ہی کھاتا ہوں۔ گھر میں کک بھی ہے مگر فاطمہ میرے لیے خود کوکنگ کرتی ہے اور بہت اچھا پکاتی ہے۔"

☆ "کھانے کے معاملے میں بے صبرے ہیں یا صبر ہے آپ میں؟"

* "میں کسی معاملے میں بھی بے صبرا انسان نہیں ہوں۔ کھانے میں اگر تھوڑی دیر ہو بھی جائے تو میں صبر و تحمل سے کام لیتا ہوں۔ بھئی جب کھانا پکا ہے تو میز پر بھی لگ جائے گا' جلدی کیا ہے۔"

☆ "فرمائش کرکے پکواتے ہیں؟ اور کیا پسند ہے آپ کو؟"

* "نہیں' فرمائش کرکے تو نہیں پکواتا۔ جو پکتا ہے کھا لیتا ہوں۔ ویسے فاطمہ کو پتا ہے کہ مجھے کیا پسند ہے تو پھر وہ میری پسند ہی کا پکاتی ہے۔ مثلاً" مجھے چائنیز اور بریانی مسالا بہت پسند ہے۔ فاطمہ کے ہاتھ کا پکا ہوا ہر کھانا۔"

☆ "اللہ تعالیٰ آپ کی محبت کو قائم و دائم رکھے۔"

* "بس جی آپ دعا کیا کریں۔"

فاطمہ کامران

☆ "کیسی ہو فاطمہ! مصروف تھیں کیا؟"

* "جی آپا! میں ٹھیک ہوں' یہ ہمارے بیٹے آیان ذرا تنگ کر رہے تھے اس لیے تھوڑی مصروف تھی۔"

☆ "کتنا بڑا ہو گیا ہے۔۔۔ تنگ تو کرتا ہو گا؟"

* "یہ 6 دسمبر کو پیدا ہوا تھا تو تقریباً" دس ماہ کا ہو گیا ہے اور اب تو یہ چلنے لگے گا تو آپ خود سوچیں کہ مصروفیات اور بڑھ جائیں گی۔"

☆ "زندگی تو پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو گی؟"

* "جی بالکل عورت کا گھر مکمل ہو جاتا ہے۔ کامران سے شادی کرکے تو زندگی میں بہار آئی ہی تھی "آیان" نے اس میں اور اضافہ کر دیا ہے۔"

☆ "جب تمہاری نئی نئی شادی ہوئی تھی تو "نیو کپل" کے حوالے سے میں نے انٹرویو کیا تھا۔ اب تھوڑی سینئر ہو گئی ہو تم۔۔۔ تب سے اب تک کیا فرق آیا؟"

* "کوئی فرق نہیں آیا اور میں تو ابھی تک اپنے آپ کو "نیو کپل" ہی کہتی ہوں اور اگر آپ پندرہ سال بعد بھی فون کریں گی تو میں اپنے آپ کو نیو کپل ہی کہوں گی۔"

☆ "بہت بھروسا ہے اپنے میاں صاحب پر؟"

* "جی بالکل۔۔۔ آپ یقین کریں کہ اب تو پہلے سے بھی زیادہ اچھے ہو گئے ہیں اور میرا پہلے سے زیادہ خیال رکھتے ہیں۔۔۔ اور جو انسان ہر روز پہلے روز سے زیادہ اچھا ہو جائے تو اس پر بھروسا تو آنکھ بند کرکے کرنا چاہیے۔"

☆ "مگر جناب' جس میڈیا سے ان کا تعلق ہے' وہاں بھٹکنے کے چانس ہر وقت رہتے ہیں؟"

* "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن مجھے کامی پر مکمل بھروسا ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ ہی اعتماد کا ہے۔ شک و شبے سے تعلقات خراب ہی ہوتے ہیں اور میں نے آپ کو بتایا ناکہ کامی تو اب پہلے سے زیادہ اچھے ہو گئے ہیں۔"

☆ ”تم تو بیرے کامی کہہ رہی ہو وہ کیا کہتے ہیں؟ جوائنٹ فیملی میں رہنا کیسا لگ رہا ہے؟“

* ”بے بی جان‘ جانی اسی طرح کے الفاظ بولتے ہیں۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ جوائنٹ فیملی ایک نعمت ہے اور ہماری فیملی تو بہت چھوٹی ہے اور میری ساس بہت اچھی ہیں۔ ہمارا گھر میں کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ سب بہت پیار سے بہت محبت سے رہتے ہیں۔“

☆ ”اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟“

* ”میں پنجابی ہوں اور لاہور میں پیدا ہوئی تھی۔ میرا ایک ہی بھائی ہے‘ والد کا انتقال ہو چکا ہے اور والدہ ”منسٹری آف فوڈ اینڈ ایگری کلچل“ میں جاب کرتی ہیں۔ والد صاحب کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا اور وہ بزنس کے سلسلے میں اسلام آباد قیام پذیر ہوئے تو ہم بھی لاہور سے اسلام آباد آ گئے۔ میں نے Anthropology (علم الانسان) میں ایم ایس سی‘ ایم فل کیا ہے اور زندگی میں کبھی ٹائم ملا تو ان شاء اللہ پی ایچ ڈی بھی کروں گی۔“

☆ ”ڈگرز اتنی تعلیم کے بعد ہاؤس وائف؟“

* ”میں شادی سے پہلے نیشنل کمیشن فار وومن ڈیولپمنٹ میں بحیثیت میڈیا منیجر جاب کرتی تھی اور جب ڈاکٹر نسیم اشرف کرکٹ بورڈ میں تھے تو بطور میڈیا منیجر کے میں نے ان کے ساتھ بھی کام کیا۔ اب تو گھریلو ذمہ داریاں ہیں اور پھر بیٹا بھی بہت چھوٹا ہے تو فی الحال تو جاب کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ لیکن ان شاء اللہ جب بیٹا سمجھ دار ہو جائے گا اور کامی نے بھی اجازت دی تو ضرور جاب کروں گی۔“

☆ ”کامران جیلانی نے بتایا کہ شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ تم بتاؤ کہ شادی کی رسمیں انجوائے کیں یا بور ہو گئیں؟“

* ”جی.... شادی کی رسمیں بہت انجوائے کیں اور جوتا چھپائی کی رسم خاص طور پر مزا دیتی ہے۔ باقی رسمیں بھی بہت اچھی تھیں۔ بھلا کون ہو گا جو ان رسموں سے بور ہوتا ہو گا۔“

☆ ”زندگی میں ایک دم چینج آنے والا تھا۔ سب کچھ کیسا الگ رہا تھا؟“

* ”میں سمجھتی ہوں کہ لڑکی کی زندگی میں یہ دن بہت اہم ہوتا ہے۔ بہت سی سوچیں آتی ہیں بہت سے خیالات آتے ہیں۔ بچپن جہاں گزارا ہو اسے چھوڑنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ کامی کی امی سے اور کامی سے میری بات چیت ہوتی رہتی تھی تو اجنبیت کا احساس کچھ کم ہو گیا تھا۔ اس لیے مجھے اندازہ تھا کہ میں بہت آسانی سے ایڈجسٹ ہو جاؤں گی اور ایسا ہی ہوا۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔“

☆ ”نکاح اور ولیمہ کے جوڑوں پر بہت خرچ کیا جاتا ہے۔ یہ خرچ ہونا چاہیے یا نہیں؟“

* ”بالکل اور ضرور خرچ ہونا چاہیے۔ یہ دن لڑکی کی زندگی میں بہت اہم ہوتا ہے اور بجنا سنورنا اس کا حق ہوتا ہے اس لیے پہلے دن یعنی بارات کا جوڑا اور پھر ولیمہ کا جوڑا مہنگا اور خوب صورت ہونا چاہیے.... ہاں اگر جیب میں پیسہ ہے تو.... ورنہ تو سادگی سے بھی سب کچھ ہو سکتا ہے۔“

☆ ”منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کے لیے کہاں گئے تھے؟“

* ”انہوں نے مجھے سونے کا سیٹ دیا تھا اور ہنی مون کے لیے کہیں نہیں گئے تھے اور میرے خیال میں یہ کوئی اتنا ضروری بھی نہیں۔ اگر پیار محبت کے ساتھ رہیں تو روز ہنی مون ہوتا ہے اور ہمارا ہنی مون روز ہی ہوتا ہے۔“

☆ ”کامران کتنے رومانٹک مزاج ہیں اور فیشن پرست ہیں یا سادگی پسند؟“

* ”ارے کامی بہت زیادہ رومانٹک مزاج ہیں.... اور جب بہت زیادہ محبت کا اظہار کرنا ہو تو پھر گنگناتے ہیں اور یہی بات بتاؤں کامی بہت اچھا گاتے ہیں۔ میرے معاملے میں تو بالکل بھی فیشن پرست نہیں ہیں۔ میں تو انہیں سادگی میں بھی اچھی لگتی ہوں اور فیشن میں بھی۔“

☆ ”روایتی بیوی کی طرح ان کے سب کام آپ خود

کرتی ہیں؟"

* "میرا تو دل چاہتا ہے کہ ان کے سارے کام خود کروں۔ لیکن کاشی اپنے کام خود کرنے کے عادی ہیں۔ کیونکہ جب ان کی شادی نہیں ہوئی تھی تو یہ اپنے سارے کام خود کرتے تھے۔ اس لیے انہیں عادت ہے اپنے زیادہ تر کام خود کرنے کی۔"

☆ "واہ.... پھر تو آپ کے ساتھ بھی ہاتھ بٹاتے ہوں گے؟"

* "جب سے آیان ہوا ہے تب سے تو بہت ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اس سے پہلے کچن میں تو ضرور ہاتھ بٹاتے تھے۔ باقی کام میں خود کرتی تھی۔ ویسے انہیں رعب ڈالنے کی بالکل بھی عادت نہیں ہے۔"

☆ "ان کی کوئی اچھی بری عادت بتاؤ؟"

* "ان کی تو سب عادتیں بہت اچھی ہیں۔ بہت ٹھنڈے مزاج کے ہیں۔ غصہ بالکل بھی نہیں آتا' البتہ میں غصے کی تیز ہوں اور میرے غصے کو دیکھ کر بھی ان کو غصہ نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ ایسا ہیرا شوہر سب لڑکیوں کے نصیب میں لکھ دے تاکہ وہ بھی میری طرح بہت خوش رہیں۔"

☆ "آج کل کی لڑکیاں پیسے کو سب کچھ سمجھتی ہیں مگر آپ آج کل کی ہونے کے باوجود محبت کو ترجیح دے رہی ہیں؟"

* "دیکھیں! اچھی زندگی کے لیے محبت اور پیسہ دونوں بہت ضروری ہیں۔ بہت سے گھرانے ایسے ہیں جہاں بہت زیادہ پیسہ ہوتا ہے مگر وہ محبت کو ترس رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے اتنا پیسہ ہو کہ وہ محبتوں میں رکاوٹ نہ بنے۔ ہر چیز بیلنس میں اچھی لگتی ہے۔"

☆ "شوٹنگ ہو یا کہیں اور جانا ہو' آپ ان کے ساتھ جاتی ہیں؟"

* "پہلے تو ہر جگہ جاتی تھی مگر اب نہیں۔ کیونکہ اب آیان کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ اگر ان کے ساتھ ساتھ رہوں گی تو آیان کے لیے مشکل ہو جائے گی۔ یہ گھر سے باہر اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہیں اور میں گھر میں اپنی ذمہ داریاں نبھاتی ہوں۔ اولاد کے بعد بہت چینج آجاتا ہے عورت میں۔"

☆ "بیویوں کا یا لڑکیوں کا پڑھنا لکھنا اور ملازمت کرنا ضروری ہے؟"

* "لڑکی کا پڑھا لکھا ہونا بہت ضروری ہے اور جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی اس کا ملازمت کرنا کوئی عیب نہیں ہے بلکہ نہ صرف اس کا وقت اچھا گزر جاتا ہے بلکہ جیب خرچ اور اطمینان بھی حاصل ہوتا ہے۔ ڈگری صرف نام ——— کے لیے نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا استعمال بھی بہت ضروری ہے اور بیوی اگر خوشحال گھرانے میں آئی ہے اور اس کا میاں خوشحال ہے تو میرے خیال میں بیوی کو کمانے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ اپنی تعلیم سے اپنے گھر کے ماحول کو اور اپنی نسل کو اچھا بنا سکتی ہے' چاہے لڑکی ملازمت کرے یا نہ کرے لیکن اس کا پڑھا لکھا ہونا بہت ضروری ہے اور اچھی سیرت کا ہونا بھی ضروری ہے۔"

☆ "مشہور بندے سے شادی کرکے ——— مسائل کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟"

* "نہیں بالکل نہیں ——— یہ اتنے مشہور ہیں لیکن ان میں غرور نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور گھر میں تو بالکل بھی نہیں لگتا کہ یہ آرٹسٹ ہیں اور ان کے اتنے چاہنے والے ہیں۔"

☆ "عام جگہوں میں یا شاپنگ کے دوران یا کہیں کھانا کھانے جائیں تو لوگ پریشان تو کرتے ہوں گے؟"

* "نہیں کچھ خاص نہیں' لوگ پیار سے ملتے ہیں۔ ہیلو ہائے کرتے ہیں۔ ان کی تعریف کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ انہی لوگوں کی وجہ سے تو نام ہوتا ہے۔ اگر لوگ پسند نہ کریں تو پھر ڈائریکٹر کیسے بک کر سکتے ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اس جوڑے سے اجازت چاہی۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

نیلم منیر

☆ "نیلم... کیسی ہو؟"

* "جی اللہ کا شکر ہے۔"

☆ "میری صبح کا ستارہ" میں بہت اچھی لگ رہی ہو، تمہارے خیال میں اس کی کہانی حقیقت سے کتنی قریب ہے۔"

* "میرے خیال سے تو کافی قریب ہے کیونکہ اکثر گھروں میں ہوتا ہے ایسا۔"

☆ "تمہارا سلوک اپنی بہن کے ساتھ زیادہ برا نہیں ہے کیا؟"

* "ایسا اس لیے ہے کہ گھر والوں کا اس کے ساتھ سلوک اچھا نہیں ہے اور ساری بات گھر والوں کی تربیت پہ ہوتی ہے۔ میں بچپن سے دیکھ رہی ہوں کہ میری ماں اس سے نفرت کرتی ہے اور ہر وقت میری تعریفیں کرتی ہے تو بس مجھ میں بھی نفرت کے جذبات ابھر آئے۔"

☆ "ہوں... یہ تو ہے... خیر اپنے گھر میں کیا صورت حال ہے... بہنوں میں پیار محبت ہے؟"

* "جی بہت زیادہ ہم تین بہنیں ہیں۔ دونوں مجھ سے بڑی ہیں۔ ایک کی شادی ہو چکی ہے۔ بہت پیار محبت ہے ہم سب میں... ہم گھر میں افراد ہی کتنے ہیں۔ ہم دو بہنیں اور امی... والد صاحب کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ جان دیتے ہیں ہم سب ایک دوسرے پر۔"

☆ "تعلیم کا سلسلہ جاری ہے یا شوبز نے ختم کرا دیا؟"

* "بالکل، تعلیم کا سلسلہ جاری ہے اور بی اے فائنل ہو چکا ہے۔ اب ان شاء اللہ مزید تعلیم بھی حاصل کروں گی۔ سچ بات ہے کہ تعلیم کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں ہے۔"

☆ "پہلے کمرشل کے بعد گیپ کیوں آیا؟"

* "پہلا کمرشل بہت کم عمری کا کمرشل تھا۔ میں نویں جماعت کی طالبہ تھی اور دوسرا کمرشل عاطف اسلم کے ساتھ تھا... بس پھر گیپ اس لیے آیا کہ تعلیم کو ادھورا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔"

☆ "کمرشل، پھر ڈرامے، گھر والوں نے اعتراض نہیں کیا؟"

* "نہیں نہیں بالکل نہیں۔ بلکہ گھر والوں نے تو خود

خوشی خوشی اجازت دی اور دیگر لوگوں نے یعنی رشتے داروں نے بھی کچھ نہیں کہا۔"

☆ "اچھا گڈ! پٹھان گھرانوں میں ذرا کم ہی اجازت ملتی ہے۔"

* "جی... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا بلکہ سب میرے کام سے خوش ہیں۔ دیکھیں اگر میں اپنی روایات کی پاس داری کروں گی اور کوئی ایسا کام نہیں کروں گی کہ جس کی وجہ سے فیملی پر کوئی حرف آئے تو پھر بھلا کسی کو کیا اعتراض ہوگا۔"

☆ "یعنی کچھ پابندیاں عائد ہیں؟"

* "جی جی... اور اگر پابندیاں نہ بھی ہوتیں تو میں از خود اس بات کا خیال رکھتی کیونکہ مجھے اپنے گھر والوں کی عزت سب سے پہلے عزیز ہے۔ مجھے اور میرے گھر والوں کو یہ پسند نہیں کہ میں رات گئے تک گھر سے باہر رہ کر شوٹنگ کرواؤں اور نہ ہی میں یہ چاہوں گی کہ میں اکیلی یونٹ کے ساتھ ملک سے باہر جاؤں اور سب سے اہم بات یہ کہ میرے کپڑے غیر مناسب نہ ہوں۔"

☆ "تم نے سیریل "دیا جلے" میں بہت اچھا پرفارم کیا تھا۔ اس کے ڈائریکٹر بابر جاوید تھے۔ ان تک رسائی کیسے ہوئی؟"

* "بابر جاوید صاحب نے مجھے "نادیہ خان شو" کے ایک سیگمنٹ میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد ان کا فون آیا اور کام کی پیشکش کی۔ جب "دیا جلے" کیا تو میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔"

☆ "میری صبح کا ستارہ" میں جو رول تم کر رہی ہو، اس کے لیے تمہارا باقاعدہ انتخاب ہوا تھا؟"

* "جی اس کے لیے میرا باقاعدہ انتخاب ہوا تھا۔ جس زمانے میں اس سیریل پہ کام ہو رہا تھا بابر جاوید نے مجھے فون کیا مگر میں ملک سے باہر تھی لیکن انہوں نے کہا کہ میں تمہارا انتظار کروں گا اور پھر جب میں واپس آئی تو..."

☆ "تمہیں "ٹوٹے ہوئے پر" سے ملی پھر "پل صراط" میں بھی لوگوں نے تمہیں پسند کیا، کچھ کہو گی اس بارے میں؟"

* "بس جی اتفاق ہے، کوئی ڈرامہ یا کردار ایک دم سے کلک کر جاتا ہے اور انسان کو راتوں رات بلندیوں پہ پہنچا دیتا ہے۔ مجھے زیادہ پہچان "ٹوٹے ہوئے پر" سے ملی ہے۔"

☆ "کیسا لگ رہا ہے یہ کردار اور یہ تمہاری زندگی سے کتنا قریب ہے؟"

* "بہت مزا آ رہا ہے جب مجھے اس کردار کی آفر ہوئی اور میں نے اسے پڑھا تو مجھے ایسا لگا کہ شاید میں یہ کردار نہیں کر سکوں گی۔ پھر سوچا کہ اگر مجھ میں صلاحیت ہے تو میں یہ کردار با آسانی کر لوں گی۔ مجھے ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔ میں نے اپنے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر سے ڈسکس کیا۔ انہوں نے مجھے ہمت دلائی تو مجھ میں حوصلہ ہوا یہ کردار کرنے کا۔"

☆ "کیا مشکل پیش آ رہی تھی؟"

* "میرے کردار میں اتار چڑھاؤ بہت تھے۔ شروع میں میں ایک لاابالی شوخ و چنچل لڑکی دکھائی گئی، پھر سنجیدہ ہو گئی۔ شادی ہوئی تو کچھ اور رنگ ہو گیا اور جب حادثہ ہوا تو بالکل بدل گئی۔ مطلب یہ کہ اتار چڑھاؤ کی وجہ سے میں تھوڑا گھبرا رہی تھی کہ ٹھیک طرح سے کر پاؤں گی یا نہیں مگر اللہ کا شکر ہے کہ لوگوں نے بہت زیادہ پسند کیا، بلکہ کر رہے ہیں... جہاں تک یہ سوال کہ میری زندگی سے کتنا قریب ہے تو ہاں اس لحاظ سے قریب ہے کہ میں بھی ایک شریر اور شوخ سی لڑکی ہوں، جو زندگی کے سارے رنگوں کے ساتھ جینا چاہتی ہے۔"

☆ "کردار لیتے وقت کوئی خاص ڈیمانڈ کرتی ہو؟"

* "بالکل... بولڈ کردار یا بہت زیادہ ماڈرن کردار بالکل نہیں کروں گی۔ کیونکہ ٹی وی ایک فیملی میڈیا ہے اسے سب مل بیٹھ کر دیکھتے ہیں، اس لیے نہ خود شرمندہ ہونا چاہتی ہوں، نہ گھر والوں کو شرمندہ کرنا چاہتی ہوں۔"

عائزہ کا تفصیلی انٹرویو ان شاء اللہ جلدی شائع کریں گے۔

شہناز پرویز

☆ "کیسی ہیں آپ؟"

* "میں ٹھیک ہوں۔ بہت دنوں کے بعد تم نے یاد کیا۔ خیر تھی ناسب؟"

☆ "جی بالکل خیر تھی۔ آپ کو اسکرین پہ دیکھ کر آدھی ملاقات ہو جاتی تھی بس اس لیے فون نہیں کیا اور پھر خیریت بھی بذریعہ اسکرین معلوم ہو جاتی تھی۔"

* "یہ اچھا بہانہ ہے فون نہ کرنے کا۔"

☆ "یہ بڑی بات ہے کہ آپ یاد رکھتی ہیں۔۔۔ اتنی شہرت کے باوجود آپ میں غرور نہیں ہے۔"

* "غرور کس بات کا کرنا۔۔۔ سب اپنے اپنے گھروں سے کھاتے ہیں۔ کوئی کسی کا محتاج نہیں اور ہمیں تو ہر وقت اوپر والے کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے تو ہمیں اس کی ریکارڈنگز شروع ہو گئیں۔"

☆ "تم بتا رہی ہو کہ ملک سے باہر تھیں۔ تو کہاں کہاں جا چکی ہو؟"

* "اس وقت میں ترکی میں تھی۔ اس کے علاوہ تھائی لینڈ، ملائشیا اور دبئی وغیرہ جا چکی ہوں۔"

☆ ☆ ☆

فائق خان

☆ "کیسے ہیں؟"

* "اللہ کا شکر ہے۔"

☆ "سنا ہے آپ کی شادی ہو رہی ہے؟"

* "جی بالکل، ان شاء اللہ تین چار مہینے کے بعد۔ مگر کس لڑکی سے ہو رہی ہے، یہ میں آپ کو ابھی نہیں بتاؤں گا۔"

☆ "لیکن پہلا انٹرویو مجھے ہی دینا ہو گا۔"

* "جی ضرور۔"

☆ "میری "صبح کا ستارہ" میں بہت اچھا پرفارم کر رہے ہیں۔ مگر نگیٹیو رول کیوں؟"

* "کردار تو ہر طرح کے کرنے چاہئیں۔ جب مجھے اس کردار کی آفر ہوئی اور میں نے اسکرپٹ کا مطالعہ کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس میں پرفارمنس کی کافی گنجائش ہے۔ ویسے بھی نگیٹیو رول میں پرفارمنس کی زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔"

☆ "فائق آپ نے میزبانی بھی کی، ماڈلنگ بھی کی اور میوزک سے بھی لگاؤ ہے۔۔۔ کہاں ایزی فیل کرتے ہیں۔"

* "اداکاری اور ماڈلنگ میں۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ میں یہ دونوں کام زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتا ہوں اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ماڈلنگ اور اداکاری کا ریسپانس بھی بہت اچھا ملتا ہے۔"

☆ "اب تو خیر بہت چینلجز ہیں۔ بہت کام ہو رہا ہے لیکن کیا اس فیلڈ میں جگہ بنانا آسان ہے؟"

* "اس فیلڈ میں جگہ بنانا مشکل ہے کیونکہ اب مقابلہ زیادہ ہو گیا ہے۔ ٹیلنٹ کو منوانا مشکل ہے۔ مجھے بھی کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر بالآخر مجھے

کامیابی نصیب ہو ہی گئی۔"

☆ "مشکلات تو شوق کو ختم کر دیتی ہیں۔۔۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

* "نہیں ایسا نہیں ہے۔ مشکلات میں مزید جدوجہد کرنے کو دل چاہتا ہے۔ حالانکہ میرے والد صاحب نے کہا کہ اعلا تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلے جاؤ مگر میں ۔۔۔ مجھے یہیں رہ کر اپنے آپ کو منوانا تھا اور کسی حد تک میں کامیاب بھی ہوا۔"

☆ "اور کیا مصروفیات ہیں۔"

* "کافی ہیں بس آپ دیکھتی جائیں۔"

☆ اوکے! خوش رہیں۔

☆ ☆ ☆

عائزہ خان

☆ "جی عائزہ خان! کیسی ہیں اور کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

* "جی! میں ٹھیک ہوں اور کیا ہو رہا ہے تو جناب بہت کچھ ہو رہا ہے اور ساتھ ساتھ پڑھائی بھی چل رہی ہے۔"

☆ "کیا پڑھ رہی ہو اور چند ڈراموں کے نام بھی بتاؤ؟"

* "میں ایک پرائیویٹ یونیورسٹی سے مارکیٹنگ میں بی بی اے آنرز مارکیٹنگ کر رہی ہوں اور میرے جو ڈرامے آن ایر ہیں ان میں "لڑکیاں محلے کی کوٹے ہوئے پر" اور "پل صراط" خاص طور پر شامل ہیں۔ سب ڈراموں کا رسپانس بہت اچھا آرہا ہے۔"

☆ "تم تین چار سال سے اس فیلڈ میں ہو لیکن شہرت کے لیے ہمارا انتخاب کیا۔"

☆ "کہتے ہیں کہ اس فیلڈ میں کام کرنے کے لیے اسمارٹ ہونا بہت ضروری ہے مگر آپ نے اور کچھ دیگر فنکاروں نے اس بات کو غلط ثابت کر دکھایا۔"

* "دیکھو! میں سمجھتی ہوں کہ انسان میں ٹیلنٹ کا ہونا بہت ضروری ہے اور پھر ڈراموں میں ہر طرح کے لوگ چاہیے ہوتے ہیں۔ صرف اسمارٹ لوگوں سے کام نہیں چلتا۔"

☆ "بلاشبہ آپ میں بہت ٹیلنٹ ہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد کوئی پریشانی تو نہیں ہوتی؟"

* "ان کی کمی کون پوری کر سکتا ہے۔ لیکن مالی طور پر اللہ کا شکر ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ ان کی زندگی میں بھی کام کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہوں۔ کام کرنے کی عادت تو ہمیشہ سے ہے۔"

☆ "انہوں نے کبھی منع کیا تھا کام کرنے سے؟"

* "نہیں کبھی نہیں اور کیوں کرتے۔ گھر میں خوشحالی لانے کے لیے گھر کے ہر فرد کا کام کرنا بہت ضروری ہے اور چونکہ میرے سسرال میں میری نندیں بھی جاب کرتی تھیں تو مجھے بھی کسی نے منع نہیں کیا۔ بلکہ سب خوش ہوتے تھے میرا ٹیلنٹ دیکھ کر اور ابھی بھی ایسا ہی ہے۔ سب بہت عزت اور پیار کرتے ہیں۔"

☆ "اپنی زندگی سے خوش ہیں آپ؟"

* "بہت خوش ہوں۔ اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے بندے کو خوش رہنا چاہیے اور پھر اس نے تو مجھے بہت نوازا ہوا ہے۔ دولت، شہرت، عزت سب کچھ ہے۔ میرے پاس کیا نہیں ہے کہ میں خوش نہیں ہوں گی اور پھر میری صحت سے لگتا نہیں تمہیں کہ میں کتنی خوش ہوں۔" (قہقہہ)۔

☆ "بے شک۔۔۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔۔۔ بس دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔"

* "کیوں نہیں۔۔۔ خوش رہو۔"

اقبال درونِ خانہ

مصنف: خالد نظیر صوفی
تبصرہ: آمنہ زریں

قومی شناخت کی حامل شخصیات سے ہمارا تعارف زیادہ تر نصاب میں درج معلومات اور امتحانی تقاضوں پر پورا اترنے والے مضمون تک ہی رہتا ہے۔ نصاب کی یہ مہیائی بھی نہ ہو تو ہم ان شخصیات کے متعلق ابتدائی معلومات سے بھی بے بہرہ ہی رہ جائیں۔

جبکہ ذات شناسی ہی ان سے محبت رکھنے کا موجب بن سکتی ہے اور ذات سے محبت ہی ان کے افکار تک رسائی کا شوق عطا کرتی ہے۔

ہم میں سے اکثر بلند پایہ شخصیات کے متعلق، حتیٰ کہ اساتذہ کے متعلق بھی یہ فرض کر لیتے ہیں کہ شاید ہم جیسے انسان نہیں اور ان کا اٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا سب کچھ فوق الفطرت ہی ہو گا۔ حالانکہ ایسا سوچتے وقت ہم خود کو حقیقت سے اور اس شخصیت سے دور کر لیتے ہیں۔

"اقبال درون خانہ" یادداشتوں پر مشتمل ایک ایسی نادر کتاب ہے، جس کا مطالعہ ہمیں اقبال کی فطری سادگی، معصومیت کے ساتھ ساتھ بلند نگاہی سے بھی روشناس کرواتا ہے۔ کتاب کا پیش لفظ بھی شاندار ہے جو مولانا غلام رسول مہر کے الفاظ میں یوں ہے۔

"اس کتاب کے ہر صفحے پر علامہ اقبال ابتدا سے آخری دور تک کا ملاً بے ساختہ انداز میں چلتے پھرتے معلوم ہوتے ہیں۔ پیش نظر کتاب جیسا کوئی دوسرا مرقع شاید ہی تیار ہو سکے، جس میں خالص علم و فضل اور فلسفہ و حکمت کے اسرار و رموز تو شاید نہ مل سکیں، تاہم ایک معصوم بچی نے بچپن سے اپنے بلند منزلت عم محترم کے پاس رہ کر جو کچھ دیکھا "جزواً جزواً" محفوظ رکھا اور اسے انتہائی بے ساختگی سے بیان کر دیا۔

ایسا کہا جا سکتا ہے کہ ان گراں بہا معلومات کو محفوظ رکھنا ممدوحہ کا کتنا عظیم القدر کارنامہ ہے جسے علامہ کے کروڑوں نیاز مندوں کی گردن پر ایک دائمی احسان کی حیثیت حاصل رہے گی۔ پھر ممدوحہ کے صاحب زادے عزیزی خالد نظیر صوفی کا بھی ہم سب کو شکر گزار ہونا چاہیے جن کی کاوش سے یہ گنجینہ بے بہا مرتب ہو کر منظر عام پر آرہا ہے۔"

یہ مرحوم کی حد درجہ خوشگوار گھریلو زندگی کا بھی ایک نہایت دلآویز مرقع ہے۔

"سرور رفتہ کے نام سے پہلا باب کھلتا ہے۔۔۔ 29 دسمبر 1873ء بروز سوموار، صبح صادق کے وقت سیالکوٹ کے ایک معزز اور متوسط کشمیری گھرانے کے چھوٹے سے گھر کی ناپختہ اور نیم روشن کوٹھڑی میں ایک عظیم روح نے دیے کی ٹمٹماتی اور مدھم سی روشنی میں آنکھیں کھولیں۔۔۔۔ کسے خبر تھی کہ اس بچے کی قسمت کا ستارہ ایک دن آسمان شہرت پر اس تابناکی سے چمکے گا کہ مشرق و مغرب کو اپنی ضیاپاشیوں سے جگمگا دے گا اور زمانے کے قلب و نظر کو منور کر کے انسانیت کے لیے مینارۂ نور کی حیثیت اختیار کرے گا۔"

بی اس کتاب کی معرفت ہمیں پتا چلتا ہے کہ آپ کی تاریخ پیدائش غلط معروف ہو چکی ہے۔۔۔ جبکہ تحقیق اور خاندانی افراد سے تصدیق کے بعد 29 دسمبر ہی درست تاریخ قرار دی گئی ہے۔

بہرحال۔۔۔ ہمیں پتا چلتا ہے کہ سرکار کو اس قسم کے دقیق تحقیقی معاملات سے بے پروائی ہے! (کس کی ہوئیے؟)

ننھا منا اقبال اپنی عظیم ماں (محترمہ امام بی بی صاحبہ) کے سایہ شفقت میں آہستہ آہستہ پروان چڑھنے لگا۔

ایسی عظیم مائیں بہت کم بچوں کو نصیب ہوتی ہیں جو جسمانی پرورش کے ساتھ ساتھ ذہنی اور روحانی نشوونما پر بھی نگاہ رکھتی ہیں اور بچے کو صراط مستقیم پر ثابت قدمی کے ساتھ قدم جمانے کی تربیت بہم پہنچاتی ہیں۔

"حصول علم کے لیے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ رات کو نیند میں اٹھ اٹھ کر پڑھتے رہتے۔ شاید قدرت انہیں جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ علوم سے بہرہ مند کرنے کا انتظام کر رہی تھی۔ ایک دفعہ نصف شب کے وقت بے جی کی آنکھ اچانک کھل گئی تو انہیں دیے کے قریب بیٹھے اسکول کا کام کرتے ہوئے پایا۔ دو ایک آوازیں دیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہوں نے اٹھ کر شانوں سے پکڑ کر ہلایا اور کہا۔

"اقبال! اس وقت آدھی رات کو کیا پڑھ رہے ہو؟ اٹھو سو جاؤ صبح کام کر لینا۔"

کسمسائے اور جواب دیا۔

"بے جی! سویا ہوا تو ہوں۔" اب تو ان کی والدہ کو وہم ہو گیا، روز رات کو کئی کئی بار اٹھ کر دیکھتیں اور اکثر انہیں اسی حالت میں پاتیں اور اٹھا کر سلاتیں۔ حیران کن بات یہ تھی کہ ریاضی کے جو سوالات وہ نیند میں حل کرتے، وہ بالکل درست ہوتے۔

چھوٹی عمر میں ہی آپ بڑے حاضر جواب اور اسکول میں ہر دل عزیز تھے۔ حاضر جوابی کا یہ عالم تھا کہ ایک روز جماعت میں ذرا دیر سے پہنچے، استاد نے استفسار کیا تو جواب دیا۔

"جناب! اقبال دیر سے ہی آیا کرتا ہے۔"

ایک نا پختہ ذہن سے ایسے بامعنی جواب نے استاد کو چونکا دیا..... اور اس نے پس منظر میں جھلکتی ہوئی ایک عظیم شخصیت کا پرتو دیکھا تو سینے سے لگا لیا۔

اس جملے کی تاریخی حقیقت سے تو سب ہی آشنا ہیں.....!

1893ء میں میٹرک کا امتحان دیتے ہی گھر والوں کے اصرار پر آپ کی شادی ہوئی۔ اس بیوی سے دو بچے پیدا ہوئے۔ معراج بیگم اور آفتاب اقبال۔

انگلستان سے واپسی پر چند گھریلو وجوہ کے زیر اثر دوسری شادی کرنے کے ارادے کا اظہار اپنے بزرگوں سے کیا۔ ان کی برہمی پر دلائل سے ثابت کیا کہ دوسری شادی ناگزیر ہے۔

چنانچہ 1912ء میں لاہور کے ایک معزز کشمیری گھرانے کی نیک سیرت اور خوش اطوار لڑکی سے جو قرآن شریف اور گھر پر اردو پڑھی ہوئی تھیں، ان کا نکاح ہو گیا۔ چند وجوہ کی بنا پر تقریباً" 2 برس تک رخصتی نہ ہو سکی۔

1914ء میں جب والدہ جاوید سیالکوٹ تشریف لائیں تو اس وقت میری والدہ کی عمر ڈھائی برس کی تھی اور وہ اپنے چچا جان کی بڑی چہیتی تھیں۔ وہ انہیں گود میں لیے کھلاتے رہتے۔ وہ بچوں کی ٹوٹی پھوٹی اور توتلی باتیں بڑے شوق سے سنتے۔ گھر کے تمام چھوٹے بچوں سے ان کے نام بار بار پوچھتے اور جب بچے الٹے سیدھے نام بتاتے تو خوب ہنستے۔ میری بڑی خالہ بھی ان دنوں چھوٹی تھیں۔ جب ان سے ان کا نام پوچھا جاتا تو وہ بڑی تیزی سے بتاتیں "علیت بیبن" "آپ ہنستے ہوئے فرماتے" عنایت نام نہیں بتاتی، بلکہ بندوق داغتی ہے۔" اس کے بعد جب میری والدہ کی باری آتی تو وہ بڑی آہستگی سے اپنا نام "چھیما بارک" (وسیمہ مبارک) بتاتیں تو آپ پوچھتے کون سی بارک، فوجیوں والی؟

والدہ محترمہ بیان فرماتی ہیں کہ "چچا جان بیرون خانہ اگر ایک عظیم مفکر اور بلند پایہ شاعر تھے تو اندرون خانہ ایک ہمدرد شوہر اور شفیق باپ بھی تھے۔ وہ گھر میں بڑے خوش و خرم رہتے اور اہل خانہ کا ہر طرح خیال رکھتے۔ البتہ جب کبھی بیٹھے بیٹھے کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتے تو انہیں مخاطب کرنا خاصا مشکل ہو جایا کرتا۔"

حضرت علامہ اپنے والدین کے بڑے فرماں بردار تھے۔ ان کی عزت انہیں اس قدر ملحوظ تھی کہ ان کے سامنے کبھی اونچی آواز میں گفتگو نہ کرتے۔

والدہ سے تو بے پناہ محبت تھی۔ جب سیالکوٹ تشریف لاتے تو سب سے پہلے بڑے پیار سے ان سے گلے ملتے اور وہ بھی بڑی محبت سے ان کے سر اور پیشانی کو چومتیں۔ آپ اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کا بھی بے حد احترام کرتے جو عمر میں ان سے پندرہ برس بڑے تھے۔ اگر وہ گھر پر موجود ہوتے تو کبھی اونچی آواز میں شعر نہ پڑھتے۔ دونوں بھائیوں میں بے حد محبت تھی۔ گھنٹوں اکٹھے بیٹھے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات کرتے رہتے اور جب تک دونوں بھائی آپس میں مشورہ نہ کر لیتے کسی کام کی ابتدا نہ کرتے۔

حضرت علامہ بڑے بذلہ سنج اور حاضر جواب واقع ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران چھوٹے چھوٹے چٹکلے بیان کرنا ان پر ختم تھا۔ کوئی سوال کرتا تو جواب میں الفاظ و معانی کا بحر ذخار امڈتا چلا آتا۔ ان کا جواب اس قدر جامع اور معلومات افزا ہوتا کہ اس موضوع پر مزید سوالات کی گنجائش مشکل ہی سے پیدا ہوتی۔ عام طور پر وہ گفتگو پنجابی زبان میں کرتے۔ البتہ جب کوئی دقیق اور فلسفیانہ مسئلہ درپیش ہوتا تو اردو اور انگریزی وغیرہ کو اظہار مطلب کا ذریعہ بناتے۔ گھر میں وہ ہمیشہ پنجابی اور وہ بھی ٹھیٹھ سیالکوٹی میں بات چیت کرتے۔

آپ کی آواز بڑی صاف، بلند، پرسوز اور پروقار تھی۔ علی الصبح قرآن حکیم کی تلاوت ان کا روز معمول تھا۔ وہ اس قدر خوش الحان تھے کہ سننے والے مسحور ہو جاتے۔ تلاوت کے دوران اس قدر رقت طاری ہو جاتی کہ زار و قطار رونے لگتے اور بعض اوقات اس قدر روتے کہ قرآن پاک کے صفحات تر ہو جاتے۔

یہ بات جب میں نے بہت پہلے پڑھی تھی..... تب حیرانی ہوئی تھی کہ اس میں رونے والی کیا بات ہے؟ مگر اب سمجھ میں آتا ہے..... کہ جو فہم و ادراک کے بلند درجے پر فائز ہوتے ہیں..... کلام الٰہی کا ان پر یہی اثر ہوتا ہے۔

لباس کے ضمن میں لکھا ہے۔

سادگی بھی ان کی ایک ایسی خصوصیت تھی جس کی کوئی مثال مجھے ان کے درجے یا اس سے کم مرتبے کے کسی فرد میں نہ مل سکی۔

گرمیوں کا موسم ہوتا تو علامہ گھر میں سفید قمیص اور دھوتی پہنتے، سردیاں آتیں تو دھسا اوڑھ لیتے۔ کسی خاص تقریب میں شمول ناگزیر ہو جاتا تو سوٹ پہن لیتے۔ شلوار کے ساتھ چھوٹا کوٹ بھی پہنا اور شیروانی بھی۔ سر پر ترکی ٹوپی رکھتے تھے۔ جب ترکی ٹوپیاں ملنی مشکل ہو گئیں تو قراقلی نما سیاہ ٹوپی پسند فرمائی۔ کبھی کبھی پشاوری لنگی اور کلاہ بھی استعمال فرماتے۔ تکلف کا لباس کبھی نہ پہنا۔ تکلف کے تقاضوں سے وہ بالطبع نفور تھے۔"

"کھانے کے معاملے میں وہ سادہ مزاج ضرور تھے لیکن نفاست پسند بہت تھے۔ جو کچھ کھانے کو مل جاتا بہ رضا و رغبت کھا لیتے۔ کبھی کسی چیز میں نقص نہ نکالتے البتہ اچھے کھانے کی تعریف ضرور کرتے۔"

"ترش چٹ پٹے اور مرغن کھانے انہیں بہت مرغوب تھے۔ نمک مرچ تیز پسند کرتے تھے۔ کھانے کے بعد میٹھا ضرور کھاتے۔ ہر قسم کا اچار انہیں بہت پسند تھا۔ خاص طور پر شلغم کا اچار بہت مرغوب تھا۔

آپ کھانا بڑی قلیل مقدار میں کھانے کے عادی تھے۔ صبح ہلکا سا ناشتہ، دوپہر کے وقت بھی تھوڑا سا پلاؤ یا ایک ڈیڑھ خمیری روٹی اور رات کو مکمل فاقہ۔ البتہ رات کو نو دس بجے کے قریب دو خطائیاں اور نمکین کشمیری چائے کی ایک پیالی نوش فرماتے۔

میٹھی چیزیں انہیں بہت پسند تھیں۔ یہاں تک کہ دوا بھی میٹھی ہی پسند کرتے۔ جب کبھی دوا کی ضرورت محسوس کرتے، حکیم نابینا یا کسی دوسرے حکیم سے رجوع کرتے تاکہ کسی میٹھی معجون ہی سے کام چل جائے۔ خمیرہ گاؤ زبان ان کی پسندیدہ دوا تھی۔ کڑوی کسیلی دوا پینا ان کے لیے انتہائی مشکل ہوتا۔ کسی دوسرے شخص کو خاموشی اور آرام سے کڑوی دوا پیتے دیکھ کر بہت حیران ہوا کرتے۔

آپ ریوڑیاں، کشمش اور اخروٹ کے مغز ملا کر بڑے شوق سے کھاتے۔

سیالکوٹ سے جو بھی لاہور جاتا، ان کا یہ من بھاتا کھاجا ضرور ہمراہ لے کر جاتا۔

آم ان کی سب سے بڑی کمزوری تھے۔ خواہ بیمار

ہوں، آم سے پرہیز ناممکن تھا۔ گرمیوں میں تقریباً" روزانہ ہی اعلیٰ سے اعلیٰ اقسام کے آم منگوائے جاتے اور کام و دہن کو لطف اندوز کیا جاتا۔ سہارن پور، الٰہ آباد اور دلّی سے ان کے نیاز مند دوست قسم قسم کے آم بھجواتے جنہیں وہ خود بھی بڑی رغبت سے کھاتے اور احباب کو بھی کھلاتے۔

اہل خانہ اور گھریلو ملازمین سے ان کا برتاؤ بڑا ہی نرم ہوتا تھا۔ ملازمین سے خواہ کتنا بڑا نقصان ہو جاتا، ہمیشہ عفو و درگزر سے کام لیتے۔ انہیں ملازمین کے کھانے وغیرہ کا بھی خاص طور پر خیال رہتا تھا۔ جو چیز گھر میں تیار ہوتی یا باہر سے آتی تمام ملازمین کو ضرور دی جاتی۔"

کتاب میں چھوٹے چھوٹے واقعات کو عنوانات کے تحت قلمبند کیا گیا ہے، جو سب ہی آپ کی گھریلو زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مگر ایک عظیم ہستی کی گھریلو زندگی کی جھلکیاں بھی اس کی عظمت کی گواہ ہوتی ہیں۔ ان سب واقعات کے لیے صفحات کا دامن تنگ ہے..... مگر ان کے دلچسپ اور بیان کی بے ساختگی میں کوئی شک نہیں۔

زمانہ طالب علمی میں آپ کے زیر استعمال رہنے والی کتب پر آپ کے لکھے گئے نوٹس کے عکس بھی کتاب میں شامل ہیں۔ اقبال منزل، سیالکوٹ کی لفظی تصویر کشی ہمیں بھی وہاں لے جاتی ہے۔ جہاں 52ء یا 53ء میں محترمہ فاطمہ جناح بھی تشریف لائیں۔

ان کی خدمت میں آپ کی استعمال کردہ ایک نادر کتاب پیش کی گئی، جسے انہوں نے بڑی خوشی سے قبول فرمایا۔

کتاب کے آخری ابواب میں ہمیں یہ جانکاری ملتی ہے کہ محسن کشی کی روایت ہمارے لوگوں میں پرانی ہے۔

کسی ادب کی جو قسمت بگڑتی ہے اقبال
تو پہلے ہوتے ہیں ناداں نکتہ چیں پیدا

اس کتاب میں آپ پر لگنے والے الزام مکمل حوالہ جات کے ساتھ دیے گئے ہیں اور ان کی صحت کا بڑے احسن طریقے سے رد کیا گیا ہے اور جواب میں معتبر شخصیات کی آپ کے متعلق آرا بھی پیش کی گئی ہیں۔ جو محض حسن ظن سے نہیں بلکہ مشاہدے سے تعلق رکھتی ہیں۔

گورنمنٹ کالج کے صدر شعبہ فلسفہ پروفیسر چیٹر جی کے مضمون سے: "سب سے پہلے اور سب سے زیادہ میں ان کی غیر معمولی سادگی سے متاثر ہوا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ اقبال عیش و عشرت کے دلدادہ ہیں، لیکن میں نے ان کے گرد کبھی تن آسانی، عیش پرستی اور نفس پروری کا سامان نہیں دیکھا۔ ان کو ہمیشہ سادہ ترین لباس میں فرش پر بیٹھے ہوئے کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف یا کسی اہم فکر کے ساتھ گہری حکیمانہ بحث میں مشغول پایا۔ دوسری بات جو میں نے ان کے متعلق محسوس کی، یہ تھی کہ ایسے وقت میں جبکہ ہماری اجتماعی زندگی مکر و فریب اور خود غرضی کا شکار ہو رہی تھی، اقبال ذاتی مفاد سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور ان کی آرزوؤں اور خواہشوں کا واحد مرکز تمدن اور روحانیت کی دنیا رہی۔"

جسٹس ایم آر کیانی کے مطابق: "اقبال کی شاعری قرآن کی آیات سے مملو ہے، پڑھنے والوں کے علاوہ سننے والوں کو بھی باوضو ہونا چاہیے۔"

ایسی بلند پایہ شاعری اور عالمگیر پیغام کا ماخذ شراب کو قرار دینا..... ذہنی ناپختگی کا واضح اظہار ہے۔

کتاب میں آپ کی پیدائش، بچپن، زمانہ طالب علمی، گھریلو معاملات پر مشتمل یادداشتیں خود بخود پڑھنے والے پر واضح کر دیتی ہیں کہ آپ اپنے اس شعر کی تفسیر تھے۔

حدیث بندہ مومن دل آویز
جگر پر خون، نفس روشن، نگہ تیز

مقام اقبال تو آج بھی روشن ہے..... حاشیہ آرائی کرنے والے جانے کدھر گئے!

☆

آمنہ ریاض

ستارۂ شام

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اُگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے جو وہ اپنے چھ مربعہ زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ، اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مُردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کو رواں رواں اولاد کی خوش خبری پالنے کے لیے مجسّم دُعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوبصورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی جنت کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ بہتر مستقبل کا خواب سے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دُنیا آباد رکھتا ہے۔ ہر دم اس کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے جنت بی بی حراست میں ہے، جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت بی بی شیزوفرینیا کی مریض ہے جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر

میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتلائے گئے بنگلے کو تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور مجلسی خاتون ہیں۔ ولی، ولید اور انیبا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں انیبا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

شبیہہ العباس طبعاً سخت گیر اور عفت و رنو جوان تھے۔ جسے صنف نازک کا عزیز مزدوری بننا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے نالاں ہے۔ شبیہہ، تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیرہ اور نمرہ، تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہہ، تنوی کا منگیتر ہے۔ وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروج کو اس کی بات کا علم نہ ہو۔

شبیہہ بیگم، ثروت دانیال کی اولاد ہے جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بدمزاج اور غصیلا بنا دیا۔ وہ انیبا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بحیثیت بہن بھائی قلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انیبا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انیبا پر بری نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو پیٹ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بیمار پڑنے پر بیگم دانیال، ثمینہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہے تو ثمینہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا بلکہ اس کے شوہر کو گھر داماد بنائے گا۔

اتفاقاً ماوی کا ٹکراؤ شبیہہ سے ہوتا ہے جس سے ماوی کا سر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھنجلاہٹ میں شبیہہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔

ثمینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں، لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے۔ جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ، ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا۔ اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں، جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔

انیبہ دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔۔۔ ماوی ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ثمینہ ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔

عبیر، نمرہ اور تنوی کو عروس کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے۔ وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد، بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوسن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو یہ بات جنت بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پنپنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

"ان دنوں ہم ہدایت اللہ صاحب کے سامنے والے مکان میں رہا کرتے تھے، رجب کی فیاض بھائی سے دوستی تھی اور وہ ہمارے گھر آتے جاتے تھے۔ پھر وہ اعلا تعلیم کے سلسلے میں لاہور چلے گئے، لیکن فیاض بھائی شدید خواہش کے باوجود نہیں جا سکے، کیونکہ ان دنوں ہمارے مالی حالات اب سے بہت مختلف تھے۔ ہم بہت غریب سے لوگ ہوا کرتے تھے اور اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے سلسلے میں کڑی محنت کرنا پڑتی تھی۔ سو وہ بڑے صبر آزما دن تھے۔

ہمارے ابا یعنی تمہارے نانا جان ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہو کر بستر پر پڑے تھے۔ ہمارے پاس ان کے مناسب علاج کے لیے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔ اماں کئی سال پہلے انتقال کر چکی تھیں اور فیضان اس وقت چھوٹا تھا۔ گھر کی مالی کفالت میں ہاتھ بٹانے کے قابل نہیں ہوا تھا۔

میں اجرت پر ہاتھ کی کڑھائی اور آڑ کا کام کر لیتی تھی لیکن میری محنت گھر کی تمام ضروریات پوری کرنے کے لیے ناکافی تھی، اسی لیے فیاض بھائی نے مناسب سمجھا کہ مزید تعلیم کا خیال دل سے نکال کر کوئی ملازمت تلاش کریں گو کہ چھوٹی موٹی ملازمتیں وہ پہلے بھی کرتے رہے تھے، لیکن اب انہیں ایسے کام کی ضرورت تھی جو ان کی تمام مالی ضروریات پوری کرے۔ پھر ان ہی دنوں فیاض بھائی کو ایک بہتر ملازمت مل گئی، جس کے سلسلے میں انہیں کوئٹہ جانا پڑا۔

فیاض بھائی کے جانے کے بعد ہمیں کوئی خاص دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ پورا محلہ ہماری پہچان کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور یوں بھی یہ وہ دن تھے جب پڑوسیوں نے ایک دوسرے کی خبر گیری ترک نہ کی تھی پھر سب سے بڑی بات سامنے والا گھر چچا ہدایت اللہ کا تھا، جو ابا کے اچھے دوستوں میں شمار ہوتے تھے اور فیاض بھائی کی غیر موجودگی میں ہمارا خیال رکھتے تھے۔ رجب جب گھر آتے تو باقاعدگی سے ہمارے یہاں بھی آتے، ابا کی خبر گیری کرتے، ان کی دوائیوں کے متعلق معلومات رکھتے۔ بالکل خاموشی سے انہوں نے ہم لوگوں کی بہت ساری ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں۔ اس سے اگلا سال ہم چاروں کے لیے غم کا سال ثابت ہوا۔

میرے ابا تو خیر کئی سالوں سے بیمار تھے لیکن چچا ہدایت اللہ کی بیگم جنہیں ہم چچی کہتے تھے اور جو بالکل صحت مند خاتون دکھائی دیتی تھیں، کے خون میں کینسر کی علامات ظاہر ہو گئیں۔ ان دنوں کینسر جیسے مرض کا علاج آج سے تین گنا مہنگا تھا اور اسے امرا کی بیماری سمجھا جاتا تھا۔ چچی کے مرض کے بارے میں پتا چلتے ہی رجب اور چچا بری طرح فکر مند ہو گئے کہ اب علاج معالجے کا بندوبست کس طرح کیا جائے۔ تب رجب نے چچا کا مکان جسے کچھ عرصہ قبل چچا رجب کے نام کر چکے تھے، کو فروخت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ چچا ہدایت اللہ اور چچی نے بہت سمجھایا کہ اس مکان پر رجب کے مستقبل کی بنیاد کھڑی تھی مگر رجب نے ان کی ایک نہ سنی۔

"آپ دونوں کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں ہرگز انہیں اتار نہیں سکتا، لیکن جو تھوڑی بہت ذمہ داری میں پوری کر سکتا ہوں، وہ تو مجھے کر لینے دیں۔ یہ گھر بھی آپ لوگوں کا ہی دیا ہوا ہے۔ قسمت میں اپنا مکان ہوا تو دوبارہ مل ہی جائے گا لیکن قسمت مجھے ایک اور ماں فراہم نہیں کرے گی۔"

رجب نے قطعیت سے کہہ کر اگلے چند روز میں مکان فروخت کر دیا تھا اور وہ تمام رقم چچی کے علاج پر خرچ کرنا شروع کر دی تھی جو مکان کی فروخت سے انہیں ملی۔ وہ لوگ اسی محلے میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے کر رہنے لگے تھے۔ سارا جمع جتھا چچی کے علاج پر خرچ کرنے کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکیں۔

ان کے انتقال کے بعد چچا ہدایت اللہ بہت چپ چپ اور مضمحل رہنے لگے تھے۔ وہ رجب کو سمجھاتے کہ کم سے کم ایک بار جا کر اپنے والد سے مل آئیں، لیکن بہت تابعداری کے باوجود یہ واحد بات تھی جو رجب نے ان کی مان کر نہ دی۔

ٹھیک دو ماہ بعد بے حد معمولی بخار میں مبتلا ہو کر چچا ہدایت اللہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے اور میرے ابا جو کئی

سالوں سے بیمار اور لاغر تھے' کئی روز تک روتے رہے۔ انہیں اس بات کا قلق تھا کہ ان کی اتنی طویل بیماری کے باوجود اللہ نے انہیں اپنے پاس بلانے کے بجائے ان کے بھائیوں جیسے دوست اور عزیز بھاوج کو بلا لیا۔ رجب ان دنوں بہت افسردہ اور تنہا ہو گئے تھے۔ فیاض بھائی اور ہم سب نے ان کو بہت جذباتی سہارا دیا۔

ابا جو ہر وقت اللہ سے شکوہ کرتے تھے' چند مہینوں کے بعد خاموشی سے چل بسے۔ پچھلی رات میں نے انہیں کھانا کھلایا اور پھر میں اور فیضان دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے تھے' لیکن صبح جب میں انہیں جگانے گئی تو ان کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ہماری دعائیں اور استطاعت سے بڑھ کر مہنگا علاج بھی ان کی موت کو نہیں ٹال سکا تھا۔ ہم بہت روئے دھوئے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی ان دیکھے ہاتھ نے سر سے آسمان کھینچ لیا ہو۔ لیکن ہمیں صبر آ ہی گیا' کیونکہ موت وہ واحد چیز ہے' جس پر دیگر تمام صدمات کے مقابلے میں جلد صبر آ جاتا ہے۔ انسان ساری دنیا سے ٹکرا سکتا ہے' حکم الٰہی سے نہیں۔

بہر حال ہمیں صبر آ گیا اور ہم تینوں نے دل سے یہ بات قبول کر لی کہ اب ہمیں ابا کی شفقت سے محروم ہو کر زندگی گزارنا پڑے گی۔ یہی بات کچھ مہینے قبل رجب بھی سمجھ چکے تھے۔ اب ہم چاروں ایک سے ہو گئے۔ ہمارے ماضی گو کہ مختلف تھے' مگر حالات کی پیدا کردہ محرومیاں ہرگز مختلف نہ تھیں۔ حال میں ہم ایک ہی مقام پر کھڑے تھے اور ہم چاروں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے احساسات موجود تھے۔ رجب ان دنوں اسی گھر میں رہائش پذیر تھے جہاں ہم رہتے تھے۔ چند روز بعد انہیں لاہور چلے جانا تھا اور فیاض بھائی کو کوئٹہ' لیکن اصل دقت یہ تھی کہ میں اور فیضان یہاں تنہا کس طرح رہیں گے۔"

کھوئی کھوئی سی کیفیت میں ثمینہ سب کچھ بیان کر رہی تھیں اور ہادی بے حد انہماک سے سن رہی تھی کہ بیڈ روم سے ہادی کے سیل فون کی آواز سنائی دینے لگی۔ ان دونوں پر پھیلی ہوئی کیفیت کا شیشہ چٹخ گیا۔

"فون سنو ہادی!" ثمینہ نے مسلسل بجتی بیپ کی آواز سے اکتا کر گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ہادی کے چہرے پر بے زاری تھی اور اسے بے وقت فون بجنے کا سخت ملال تھا۔

"بجنے دیں' ممی جو بھی ہو گا دوبارہ کر لے گا' آپ اپنی بات مکمل کریں۔" اس نے اکتا کر کہا' اس کا اٹھنے کا ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔

"کوئی ضروری کال بھی ہو سکتی ہے۔" ثمینہ نے زور دے کر کہا۔ ہادی نے چڑ کر سر پیچھے کی طرف گرایا اور میز پر دونوں ہتھیلیوں کا بوجھ ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اس وقت شہزا فون کرتی ہے' اب تیس منٹ تو اس سے بات کرنا پڑے گی۔" بے زاری کے ساتھ بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے اس نے کہا۔ چند لمحے بعد اس کی دھیمی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کا اندازہ درست تھا' دوسری طرف شہزا ہی تھی۔

ثمینہ نے سر کرسی کی پشت سے لگا دیا اور گردن موڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگیں' جس کے باہر ابر آلود رات بہہ رہی تھی۔ بارش کی باریک پھوار شیشہ بھگو رہی تھی۔ ثمینہ کو خیال آیا' اس بارش سے ان کا کوئی گہرا تعلق تھا کہ ان کی زندگی کے ہر اہم موقع پر بارش ضرور برسی تھی۔ کبھی ان کی خوشی میں شریک ہونے کے لیے تو کبھی غم پر آنسو بہانے کے لیے۔ معاً انہیں کئی سال پہلے کی وہ شام یاد آ گئی' جب آسمان کو بوجھل بادلوں نے سنوار رکھا تھا اور وقفے وقفے سے برسنے والی بارش نے کچی مٹی کی سوندھی خوشبو کو ساون کی ہوا کا سنگی ساتھی بنا دیا تھا۔

ثمینہ نے آہستگی سے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی بند پلکوں کے پیچھے ٹی وی اسکرین پر چل رہے کسی سین کی طرح ایک منظر روشن ہو گیا تھا۔

چھوٹا سا کمرا' کمرے کے کونے میں بچھی چارپائی' چارپائی کے قریب رکھی تپائی پر ابا کی دوائیوں کی چھوٹی بڑی

شیشیاں جنہیں کسی خیال کے تحت اب تک وہاں سے اٹھانے کی ہمت نہ کی گئی تھی' دروازے سے جھانکتا نیم تاریک نم اجالا' کچے فرش پر بچھی چٹائی اور چٹائی پر دسترخوان کے گرد بیٹھے چار نفوس۔

فیاض بھائی کا چہرہ فکرمندی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ کوئٹہ میں ان کے پاس رہائش کا مناسب بندوبست بھی نہیں تھا' نہ ہی ان کے وسائل اتنے تھے کہ ثمینہ اور فیضان کو اپنے ساتھ لے جا کر رکھ سکتے۔

"او بھائی میرے! اس میں اتنی فکرمندی کی کون سی بات ہے' تم اطمینان سے کوئٹہ پہنچو' لاہور' سیالکوٹ کے اس گاؤں سے کوئٹہ کے مقابلے میں تو کہیں نزدیک ہے۔ میں ہر ہفتے ان دونوں کی خبرگیری کے لیے آتا رہوں گا۔" رجب نے مونگ کی پتلی دال میں نوالہ ڈبو کر کھاتے ہوئے فیاض بھائی سے کہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ یہ قابل عمل حل نہیں ہے' میں ان دونوں کو یہاں اس طرح نہیں چھوڑ سکتا۔" فیاض بھائی نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔

"ٹھیک ہے' پھر میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لاہور لے جاتا ہوں' جب تم کوئٹہ میں رہائش کا بندوبست کر لو تو ان دونوں کو وہاں بلوا لینا۔" رجب نے ایک اور حل بتایا تھا۔

"تم تو خود اسپتال میں رہتے ہو۔"

"کوئی چھوٹا موٹا کرائے کا مکان دیکھ لوں گا۔" رجب نے رغبت سے کھانا کھاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ فیاض بھائی کو یہ بات قابل عمل لگی تھی' لیکن اسی وقت ثمینہ پر نظر پڑ گئی اور وہ مخمصے میں پڑ گئے تھے۔

"نہیں یار! یہ بھی قابل عمل نہیں ہے۔" انہوں نے کہا۔ ثمینہ اور فیضان خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ فیضان رغبت سے روٹی کھا رہا تھا' جبکہ ثمینہ سر جھکائے مونگ کے شوربے میں غوطہ زن تھیں۔ اس دن دال بے دھیانی میں کچھ زیادہ ہی پتلی بن گئی تھی۔

"کیوں؟" رجب نے سر اٹھا کر اور ابرو اچکا کر پوچھا تھا۔

"مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟" رجب کا سوال' فیاض بھائی سٹپٹائے تھے۔

"یہ بات نہیں ہے۔" انہوں نے جلدی سے کہا تھا۔

"پھر؟" رجب نے پانی کا ایک گھونٹ پیا۔

"تم نے دنیا کی زبان دیکھی ہے؟" فیاض نے بھی گھما پھرا کر بات کی۔

"تم نے دنیا کے ساتھ رہنا ہے' جو اس کی زبان کے لیے فکرمند ہو؟" رجب نے پوچھا تھا۔

"دنیا کے ساتھ نہیں۔۔۔ دنیا میں تو رہنا ہے' زبان کی فکر کرنا پڑتی ہے۔" فیاض بھائی نے تحمل سے کہا تھا۔

"اچھا۔۔۔" رجب نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے پر سوچ انداز میں کہا۔

"پھر تم یوں کرو فیاض! اپنی بہن کا نکاح مجھ سے پڑھوا دو۔ یہ اس مسئلے کا سب سے بہترین اور لوجیکل حل ہے۔" رجب نے اچانک کہا تھا۔ ان تینوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ رجب کے چہرے پر بے انتہا سنجیدگی تھی اور انداز ایسا تھا جیسے یہ بات اپنے نہیں کسی اور فرد کے بارے میں کی ہو۔

"کیا کہہ رہے ہو رجب؟" فیاض بھائی بمشکل بولے تھے۔

"وہی جو تم نے سنا کہ اپنی بہن کا نکاح مجھ سے پڑھوا دو۔ اس کے بعد تو تمہیں ثمینہ کو میرے ساتھ بھجوانے پر اعتراض نہیں ہو گا۔ دنیا کی زبان کی فکر بھی ختم ہو جائے گی اور تمہارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔" رجب کا انداز پہلے جیسا ہی تھا۔

"لیکن۔۔۔" فیاض بھائی شش و پنج میں مبتلا تھے۔

"او بھائی! لیکن ویکن چھوڑ دو' میں جانتا ہوں' تمہیں زیادہ پریشانی ثمینہ کو تنہا چھوڑنے کی طرف سے لاحق ہے'

اسی لیے میں خود کو پیش کر رہا ہوں' کوئی بڑا بزرگ ہوتا میرا تو میری طرف سے وہی بات کرتا' لیکن اب میں ہی ہوں تو مجھے خود ہی بات کرنا پڑے گی۔ زندگی کے جتنے سال میں نے تم لوگوں کے سامنے گزارے ہیں۔ میرے چال چلن کی سند کے طور پر کافی ہوں گے۔ ہاں ابھی میں بے سروسامانی کی حالت میں ہوں' لیکن میرے اندر محنت کرنے کا حوصلہ ہے اور آگے بڑھنے کی لگن ہے۔ میری سنگت میں ثمینہ کے چند سال مشکل ضرور ہوں گے' لیکن میرا وعدہ ہے' جلد ہی میں اس کے لیے ایک گھر بنا کر دوں گا اور اس کا مستقبل بے حد محفوظ ہوگا۔ امید ہے فیاض! تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" رجب کی سنجیدگی دیکھنے سے متعلق تھی۔

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" فیاض بھائی خوشی سے چہکے تھے۔ "میرا بہترین دوست میرا بہنوئی بن رہا ہے' اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے' کیوں فیضی؟" انہوں نے فیضان سے پوچھا' وہ زور زور سے سر اثبات میں ہلانے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے' پھر اس بات پر تو منہ میٹھا ہونا چاہیے۔" رجب نے دسترخوان سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا اور اتنی دیر سے ہکا بکا بیٹھی ثمینہ گویا جاگ اٹھی تھی۔

"لیکن مجھے اعتراض ہے۔" ہر چند کہ یہ ایسا دور نہیں تھا کہ لڑکیاں اتنا آزادانہ اپنی شادی کے متعلق بات کریں' لیکن جس طرح کی صورت حال انہیں لاحق تھی' اس میں زبان پھسل جانا کچھ ایسا غیر معمولی بھی نہیں تھا۔

"میں یہ شادی نہیں کر سکتی' کیونکہ میں زبردستی کسی پر مسلط نہیں ہونا چاہتی۔ مسئلہ ہمیں درپیش ہے' آپ کو نہیں کہ آپ خود کو میرے لیے پیش کریں۔" ثمینہ نے سر جھکا کر قطعیت سے لیکن ناراضی بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"مجھے اس زبردستی کے لفظ پر سخت اعتراض ہے' لیکن تم کیا چاہتی ہو' تمہاری تشفی کے لیے میں تمہارے بھائیوں کے سامنے تم سے اظہار محبت کروں؟" رجب نے اپنی بے ساختگی سے کہا تھا کہ ثمینہ خفت سے لال پڑ گئی تھیں۔ فیضان اور فیاض قہقہہ لگا کر ہنس دیے تھے۔

"میرا خیال ہے میں تمہارا منہ میٹھا کروانے کے لیے مٹھائی لے آتا ہوں' لیکن یاد رکھنا رجب! میں سالا ہونے کے ساتھ حق دوستی بھی نبھا رہا ہوں۔"

فیاض بھائی نے ہنستے ہوئے شرارتی انداز سے کہا تھا اور ثمینہ کا بس نہ چلا کہ شرم کے مارے کہیں چھپ جائیں۔ فیاض بھائی تو خوشی میں بہت ہی بدلحاظ ہو گئے تھے۔

"شکریہ میرے دوست! لیکن تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں' وقت آنے پر اظہار کا بہانہ ہم خود بنا لیں گے۔ فی الحال تم اس گڑ سے منہ میٹھا کرو اور اپنی بہن کا بھی کرواؤ جو دل ہی دل میں غصہ پھانک رہی ہے۔" رجب نے گڑ کا چھوٹا سا ٹکڑا دانتوں سے توڑتے ہوئے کہا تھا۔

"اس گڑ کو شگن کی مٹھائی سمجھا جائے' دو روز بعد قاضی اور گواہ بلوا کر نکاح کا بندوبست کر لیتے ہیں۔" رجب نے اضافہ کیا۔ ثمینہ کی آنکھوں میں ساون آبسا تھا۔ فیاض بھائی نے جلدی سے بڑھ کر انہیں اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔ اس رات آسمان وقفے وقفے سے برستا رہا اور ثمینہ بار بار روتی رہی تھیں۔ انہیں اماں یاد آ رہی تھیں' ابا یاد آ رہے تھے اور خدا معلوم کیا کیا یاد آ رہا تھا۔ صبح تک ناک سوج کر لال پکوڑا ہو چکی تھی اور آنکھوں میں سرخ ڈورے دوڑ رہے تھے۔

"السلام علیکم۔" رجب نے قریب سے گزر کر نلکے کی طرف جاتے ہوئے باآواز بلند کہا۔ ثمینہ کونے میں بنے چولہے کے پاس لکڑی کی پیڑھی پر بیٹھی روٹی پکا رہی تھیں۔ اس شرارت بھرے انداز پر غضب ناک ہو کر رجب کو گھورنے لگیں۔

"آنکھیں تمہاری پہلے ہی بھینس جتنی بڑی ہیں' اوپر سے دھوئیں سے انہیں لال لال کیے بیٹھی ہو۔ ایسے غصہ آنکھوں میں بھر کر مجھے گھورتی ہو تو یقین مانو میرا دل خوف سے کانپنے لگتا ہے۔"

رجب نے دستی نلکے کے پاس رک کر اور خوب بازو پھیلا کر انگڑائی لیتے ہوئے مسکراہٹ کے ساتھ شرارتی لہجے میں کہا تھا۔ اس طرف بادلوں کے چھٹنے کے بعد کی تیز چمکیلی دھوپ پڑ رہی تھی اور رجب کا چمکتا ہوا چہرہ ثمینہ کو زہر لگ رہا تھا۔ اوپر سے جملہ بھی ایسا بول دیا کہ تلووں میں لگی سر پہ بجھی۔

"یاد رہے' اب ان ہی خوف ناک آنکھوں کے ساتھ ساری زندگی بسر کرنا ہے آپ نے۔ میرا مشورہ ہے ایک بار پھر اپنے فیصلے پر غور کر لیں۔" ثمینہ نے جل کر کہا تھا۔

"جو فیصلہ جذباتیت میں ہو چکا اب اس پر کیا غور کرنا۔" رجب نے نلکا چلا کر زور زور سے منہ پر پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے سابقہ انداز میں کہا تھا۔ "اور اگر اپنے جذباتی فیصلے پر پچھتانا بھی پڑا تو مقدر کا لکھا سمجھ کر خاموش رہیں گے۔ زبان دے کر پھر جانے والوں میں سے تو ہم ہیں نہیں۔"

"اللہ رے یہ قناعت پسندی۔" پتا نہیں دھواں چولہے سے اٹھا تھا یا ثمینہ کے دل سے۔ انہوں نے زور زور سے آٹے کے پیڑے کو دونوں ہتھیلیوں میں اچھل اچھل کر کے توے پر پٹخ دیا۔

"روٹی پہ کیسا غصہ؟" رجب جیب سے رومال نکال کر چہرہ پونچھتے ہنسے تھے۔

"اس سے تو اچھا یہ فیاض بھائی میری شادی سلطان پہلوان سے کروا دیں۔" ارشاد ہوا۔

"میرے لیے تو ایک روٹی پکاتے تمہیں مصیبت پڑتی ہے۔ اس پہلوان کے لیے جب پچیس پچیس روٹیاں ایک ساتھ پکانا پڑیں گی تو عقل ٹھکانے آجائے گی۔"

"پکا لوں گی... کم سے کم وہ مجھ سے محبت تو کرتا ہے۔" ثمینہ نے دوسری روٹی کا آٹا ہاتھ میں لیا۔

"کیا یہ بات وہ پہلوان خواب میں آکر بتا گیا تھا؟" رجب نے ابرو اچکا کر قدرے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"نہیں... اس نے مجھے خط لکھا تھا۔" ثمینہ نے مزے سے کہا۔ رجب نے چند لمحے ثمینہ کو بغور دیکھا۔ گویا جھوٹ اور سچ کے تناسب کا تخمینہ لگانے کی کوشش کی تھی لیکن کچھ واضح نہ ہوتا تھا۔ تب ہی چھوٹے سے رومال کو زور سے جھاڑ کر الگنی پر پھیلا دیا۔

"رومال پہ کیسا غصہ؟" ثمینہ نے کن انکھیوں سے رجب کو دیکھا۔

"مجھے پتا ہوتا ایک معمولی سا خط تمہیں جذبوں کی صداقت کا یقین دلا سکتا ہے تو میں بہت پہلے تمہیں خط لکھ چکا ہوتا۔"

رجب نے سادگی سے کہتے ہوئے اس کے قریب پنجوں کے بل بیٹھ کر مہارت کے ساتھ توے پر روٹی پلٹی تھی۔ ثمینہ کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی تھی۔

"مطلب؟" انہوں نے سر اٹھا کر رجب کو دیکھا تھا۔

"مطلب یہ ہے کہ خدا نے تمہیں اس روئے زمین پر میرا مقدر بنا کر بھیجا ہے' کوئی پہلوان کا بچہ تمہیں جتنے مرضی خط لکھ لے' تمہیں مجھ سے چھین کر کہیں نہیں لے جا سکتا۔" رجب نے خوب صورتی سے مسکراتے ان کی آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا۔

"خوش فہمی۔" ثمینہ نے سٹپٹا کر' لیکن بظاہر لاتعلقی سے نظروں کا رخ بدلا اور روٹی سینکنے لگیں۔ رجب نے ان کی بات پر بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

"خوش فہم ہوتا تو آج تم کو بیٹھا اپنے جذبوں کی صداقت کا یقین نہ دلا رہا ہوتا' بلکہ کئی سال پہلے تمہارے بھائی سے تمہیں مانگ چکا ہوتا۔"

ثمینہ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ رجب نے ہنستے ہوئے ان کے سر پر ہتھیلی جماکر سر کو زور سے ہلایا اور چلے گئے۔ ثمینہ متعجب سی انہیں جاتا دیکھتی رہیں۔ بند آنکھوں سے دیکھے ہوئے کچھ خواب آنکھ کھلنے پر ذہن سے محو ہو جاتے ہیں لیکن لاشعور میں اپنا عکس چھوڑ جاتے ہیں۔ جو زندگی میں اکثر مجسم ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی خواب تھا۔ ثمینہ حیران تھیں۔ پتا نہیں انہوں نے یہ خواب کب دیکھا تھا' لیکن یہ طے تھا کہ دیکھا ضرور تھا۔ اور یہ کیسی دلچسپ بات تھی کہ ان کا یہ انجانا خواب اس طرح اچانک پورا ہو رہا تھا۔ شاید خوش قسمتی اسی کو کہتے ہیں۔ ثمینہ نے مسکراتے ہوئے بے ساختہ سوچا تھا اور ان کا دل ٹھہر سا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ممی!" ہادی نے آہستگی سے پکارا تھا۔ ثمینہ یوں چونکیں جیسے گہری نیند سے جاگی ہوں۔ وہ کئی سال پہلے کا سفر کر کے آئی تھیں تب ہی کچھ ناقابل فہم سے تاثرات ان کے چہرے پر ابھر آئے تھے۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے ممی!" ہادی نے گھبرا کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ثمینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا' تب ہادی نے کہا۔

"شہزا آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

ثمینہ نے اس کے ہاتھ سے سیل فون لے کر کان سے لگا لیا۔

"ہیلو شہزا!"

ہادی خاموشی سے کھڑکی کے پاس جا رکی۔ بند شیشے پر باریک باریک بوندیں دکھائی دیتی تھیں اور شیشے کے اس پار گھٹاٹوپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ دیر تک طوفانی بارش برسنے کے بعد اب باہر گہری معنی خیز خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان خاموش' لیکن بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ کبھی کبھار بادل بڑے زور سے گرجتے اور بجلی کڑکتی تھی۔ ہوا البتہ کم صم اور پیڑ بودے ساکن تھے۔

طوفان آکر گزر چکا' لیکن یوں لگتا جیسے ایک اور طوفان کی آمد آمد ہو۔ ہادی کے خیالات الجھے ہوئے تھے۔ وہ گو کہ چپ چاپ اور ذہن و دل پر ایک بوجھ لیے ہوئے تھی' لیکن کسی ایک سوچ پر اس کا ذہن ٹکتا ہی نہ تھا۔ کبھی وہ بابا کو سوچنے لگتی تو ذہن شہوز کی طرف چلا جاتا؟ پھر دادا جان کا خیال آتا تو ان خاتون کی بے رحمی ستانے لگتی جن کا نام جنت تھا۔ لیکن اپنے نام کے برعکس انہوں نے اس کے بابا کی زندگی کو جہنم بنا دیا تھا۔ اسے بار بار چچا ہدایت اللہ اور ان کی بیگم بھی یاد آتی رہیں۔ نجانے کتنی دیر وہ یوں ہی کھڑی رہی' پھر ممی نے اسے پکار لیا۔

"ہادی!" اس نے مڑ کر انہیں دیکھا' آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی وہ بہت مضمحل دکھائی دیتی تھیں۔

"ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟"

"ضرور... میں ابھی لے کر آتی ہوں۔" ہادی کچن کی طرف چلی گئی۔

ثمینہ آہستگی سے اٹھ کر صوفے پر دراز ہو گئیں اور انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ماضی کے سفر نے انہیں تھکا دیا تھا۔ ان کے ذہن و دل کو تھوڑا آرام چاہیے تھا۔ پھر انہیں ابھی ہادی کو اور بھی بہت کچھ بتانا تھا۔ بہت سے رازوں سے پردہ اٹھانا تھا اور اسے قائل کرنا تھا جو کہ وہ جانتی تھیں' ہرگز بھی آسان نہ ہوگا۔ وہ خود کو ہادی کے ہر اعتراض کو رفع کرنے کے لیے تیار کرنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"اور یوں میری شادی رجب سے ہو گئی گو کہ میں ان سے عمر میں خاصی چھوٹی تھی' شاید سولہ سال یا سولہ سال کچھ مہینے میری عمر رہی ہوگی لیکن تمہارے بابا سے میری... بہترین ذہنی ہم آہنگی تھی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ

وہ کچھ سوچ رہے ہوتے اور وہ بات میرے لبوں سے ادا ہو جاتی اور کبھی میرے ذہن میں کچھ چل رہا ہوتا تو ان کو اس بات کی خبر میرے بتائے ہو جاتی۔ ایک دوسرے سے محبت کرنا' احساسات و ترجیحات کی قدر کرنا' عزت دینا' میرا خیال ہے' میوچل انڈر اسٹینڈنگ اسی کو کہتے ہیں یوں لگتا تھا جیسے ہم ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے اور گزرتے وقت نے یہ ثابت کر دیا۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں تو بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ ہر حال میں اور رجب خوش تھے۔ زندگی جیسے یکدم ہی بہت خوب صورت ہو گئی تھی۔ پہلے میں جن باتوں پر پہروں پریشان رہتی تھی اب انہی باتوں کو میں نے چٹکیوں میں اڑانا شروع کر دیا تھا کیونکہ میرا دل کہتا تھا جب تک رجب میرے ساتھ ہیں کوئی پریشانی دیر تک میرے پاس ٹک ہی نہیں سکتی۔

رجب کو ملازمت مل گئی تو ہم نے اپنے گھر کے متعلق سوچ بچار شروع کر دی' ہمیں ایک گھر بنانا تھا مضبوط بنیادوں والا گھر' جس میں ہماری اولاد محفوظ رہ سکے' لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ فیضان ہمارے پاس رہا۔ اس وقت روابط کے ذریعے اتنے تیز تو نہیں تھے کہ انسان دور جانے والے کے پل پل کی خبر رکھ سکے مگر کچھ عرصے بعد ان کی خبر آنا بھی بند ہو گئی۔ لیکن ہم جانتے تھے وہ جہاں بھی ہوں گے خیریت سے ہوں گے یا شاید ہم نے اپنے دلوں کو سمجھا لیا تھا' بہرحال ہمارا رابطہ ان سے ختم ہو گیا۔ ان ہی دنوں میں اور رجب ہر وقت اپنے نئے گھر کے متعلق باتیں کرتے رہتے تھے۔

ان دنوں تم پیدا نہ ہوئی تھیں اور اولاد کے معاملے میں خدا نے ابھی ہماری دعائیں قبول نہ کی تھیں۔

ان ہی دنوں رجب کی ملاقات سر راہ اپنے والد صاحب سے ہو گئی۔ اس وقت تک رجب سولہ سال کے ڈرے سہمے نوعمر لڑکے نہ رہے تھے۔ انہوں نے اعتماد سے اپنے والد کا سامنا کیا۔ ادب احترام کے ساتھ خود آگے بڑھ کر ملے۔ دلاور حسین اس وقت تک ایک بڑے اور امیر آدمی اور زمین دار مانے جانے لگے تھے ان کا شملہ اونچا ہو چکا تھا اور وہ چوہدری کہلوانے لگے تھے لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اونچے شملے والے چوہدری دلاور حسین نے اپنے بیٹے کے سامنے آتے ہی بھرے بازار میں رونا شروع کر دیا تھا۔

رونا آسان نہیں ہوتا۔ آنسو انسان کا خون جگر ہوتے ہیں' اس کی کمزوری کی علامت۔ کوئی اپنی کمزوریاں ہر ایک پر عیاں نہیں کرنا چاہتا لیکن کوئی انسان اگر سب کے سامنے رو پڑے اپنا خون جگر عیاں کر دے تو اس کی لاچاری کا احساس کر لینا چاہیے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بے بسی کی کس آخری حد پر آکر رویا ہوگا۔

اور میں نے چوہدری دلاور حسین کو ان کے ملازمین کی موجودگی میں روتے دیکھا۔ میرا دل بری طرح پسیج گیا یہی حال رجب کا تھا۔ اپنے باپ کے پہلے آنسو کے ساتھ ہی ان کے سارے گلے شکوے' شکایتیں' ناراضیاں بہہ چکی تھیں۔ وہ بڑے مان سے ابا جی کو گھر لے آئے اور سب سے پہلا اچنبھا ابا جی کو ہمارا بڑے ارمانوں سے سجایا ہوا گھر دیکھ کر ہوا۔

"تم لوگ یہاں رہتے ہو رجب!" ابا جی حیرانی و ناپسندیدگی سے ہمارے گھر کی خستہ دیواروں کو دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ دیواریں ان کی عظیم الشان حویلی کی دیواروں سے کہیں چھوٹی اور چھتیں اتنی نیچی تھیں کہ وہ ہاتھ بڑھا کر چھو سکتے تھے۔

"جی ابا جی!" رجب نے ہنس کر کہا۔ "کیوں آپ کو ہمارا گھر اچھا نہیں لگا؟ خیر یہ تو کرائے کا مکان ہے جلد ہی میں اپنے ذاتی مکان کی بنیاد رکھنے والا ہوں' آپ وہاں ضرور آیئے گا۔"

"اور جو اتنی بڑی حویلی ہے۔" ابا جی کی مجسم بات میں جو اشارہ تھا' وہ ہمیں سمجھنے میں ایک پل بھی نہ لگا۔

"وہ آپ کے باقی بچوں کے لیے ہے ابا جی! اسے ان ہی کے لیے رہنے دیں۔" رجب نے سر جھکا کر لیکن مستحکم

لہجے میں کہا تھا۔

"نہ چہ نہ... وہ تیرے بہن بھائی نہیں۔ پہلے تو میرے لیے اہم ہے پھر وہ سب۔ میرا سب کچھ تیرا ہی ہے دل چاہے تو ان کو بھی دے دینا ورنہ میں اپنا سب کچھ تیرے نام لگا دوں گا۔"

"چھوڑیں بھی ابا جی! اینٹ گارے کی عمارتیں لے کر میں نے کیا کرنا ہے۔ میرے حصے کی محبت تو آپ مجھے دے نہ سکے۔" شکوہ بالآخر زبان پر آ ہی گیا تھا۔

پھر دونوں باپ بیٹا میں طویل گفتگو ہوئی۔ شکوے شکایتیں اور ان شکووں کو روکنے کے لیے دلائل۔ حاصل بحث یہ کہ جتنے دن ابا جی رہے یہاں رجب کو ساتھ لے جانے کے لیے اصرار کرتے رہے۔ رجب متامل تھے۔ باپ کے اصرار کے آگے کمزور تو پڑ رہے تھے لیکن وہ اس حویلی میں جانا نہیں چاہتے تھے جہاں وہ جلاد صفت عورت اب تک موجود تھی۔ تب میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ وہاں جا کر رہنا نہیں چاہتے تو نہ رہیے لیکن چند روز کے لیے چلے جانے میں کیا مضائقہ ہے۔"

بات معقول تھی رجب کے دل کو لگی اور وہ حویلی جانے کے لیے تیار ہو گئے ساتھ ہی انہوں نے ابا جی کو بتایا کہ ہم چند روز ہی رکیں گے۔ ابا جی اسی میں خوش تھے کہ رجب ان کے ساتھ چلنے کے لیے راضی ہو گئے ہیں سو انہوں نے مزید اصرار کو اور وقت کے لیے ٹال دیا اور یوں ہم حویلی آ گئے۔

حویلی میری توقعات سے کہیں زیادہ پرشکوہ تھی اور جنت بی بی۔ اف میں کیا بتاؤں وہ کیا تھی۔ رجب کی باتیں سن سن کر میرے ذہن و دل میں ان کا جو تصور ابھرتا تھا وہ ایک ایسی عورت کا تھا جس کی شکل و صورت تھوڑی سی اچھی تھی لیکن جنت میرے تصور سے ماورا چیز تھی۔

وہ اتنی خوب صورت تھی ماوی کہ میں لفظوں میں اس کی خوب صورتی کو بیان بھی نہیں کر سکتی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ وہ اتنے بڑے بڑے بچوں کی ماں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کی بڑی بہن لگتی۔ اس حساب سے تمہارے دادا کے ساتھ اس کی جوڑی بڑی بے ڈھب لگتی تھی کہاں وہ لمبی سفید ریش والا اونچا لمبا لیکن ناتواں آدمی جسے بیٹے کی جدائی نے کچھ زیادہ ہی بوڑھا کر دیا تھا اور کہاں وہ کسی سانچے میں ڈھلی ہوئی نظروں کو ٹھٹکنے پر مجبور کر دینے والی عورت۔ بولتی تو اس کے لبوں سے گویا پھول جھڑتے تھے۔ اتنی میٹھی محبت بھری زبان سن کر مجھے رجب کی ساری باتیں من گھڑت لگنے لگیں۔ شاید اپنے حویلی سے بھاگ جانے والی بات جسٹی فائی کرنے کے لیے انہوں نے جھوٹی سچی کہانی بنائی تھی۔ بہرحال میں جنت کی خوب صورتی سے مرعوب ہوئی تھی تو اس کی شیریں بیانی نے مجھے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

اور زریں بالکل اپنی ماں کا پرتو تھی۔ ویسی ہی دلکش، وہ طرح دار انداز، یا شاید وہ اپنی ماں کا عکس تھی "یا غالباً" اس سے کچھ کم خوب صورت تھی جیسے ایک ہی دکان سے ایک کمپنی کا ایک ہی رنگ کا دھاگا انیس بیس کے فرق کے ساتھ ہاتھ میں آتا ہے تو یہی حال جنت اور زریں کا تھا۔ وہ خوب صورت تو تھی لیکن جنت والی بات اس میں نہ تھی پھر بھی فیضان نے اس کے آگے دل ہار دیا۔ ہم وہاں پندرہ یا بیس دن رکے اس دوران خدا معلوم ان دونوں کے درمیان کیا بات چیت ہوئی۔ واپس آ کر فیضان نے میرے سامنے اپنی خواہش رکھ دی۔"

ماوی کو اسی قصے میں سب سے زیادہ دلچسپی تھی لہٰذا وہ ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئی۔ بلکہ ہمہ تن گوش تو پہلے ہی تھی اب اور توجہ سے سننے لگی۔

"لیکن میں نے فیضان کی خواہش کو رد کر دیا۔ کچھ تو میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ رشتہ طے پانا ناممکنات میں سے ہے پھر اس رشتے کی راہ میں بہت ساری رکاوٹیں حائل تھیں۔ عمر کا فرق، رتبے کا فرق۔ سب سے بڑی بات جو مجھے اپنے حویلی میں قیام کے دوران ہی پتا چل چکی تھی وہ یہ کہ زریں کا رشتہ اس کی چھوٹی بھاوج کے بھائی سے طے پا چکا

تھا۔

یہی ساری باتیں فیضی کے سامنے رکھ کر میں نے انکار کر دیا کہ یہ رشتہ ممکن نہیں وہ زریں کو بھول جائے۔ فیضان اس وقت بہت کم عمر تھا، کوئی کیریئر نہیں تھا اس کا لیکن اس عمر کی جذباتیت کے ہاتھوں تقریباً" خفا ہو کر یہ جرمنی چلا گیا۔ آگے کی اس کی جدوجہد کی داستان تو تمہیں معلوم ہے۔ ہم اپنی زندگیوں میں مست رہے۔

فیضان نے فیاض بھائی کو اپنے پاس کس طرح بلایا اور اپنے قدم جمانے کو کیا کچھ کیا تم جانتی ہی ہو، اس لیے یہاں ان باتوں کا ذکر غیر ضروری ہو گا۔ میں تمہیں تمہارے دادا کی حویلی کے متعلق بتا رہی تھی۔ ہم حویلی سے واپس تو آ گئے تھے لیکن پھر اکثر وہاں جانے لگے۔

میں غریب گھر کی تھی مجھے حویلی کے وہ ٹھاٹ زیادہ اچھے لگتے تھے پھر جنت کے حسن و محبت کا سحر بھی مجھ پر چل چکا تھا لہٰذا رجب معترض ہوتے لیکن میں بصد اصرار انہیں حویلی لے جاتی لیکن میں یہ نہیں جانتی تھی کہ اندر ہی اندر وہ کیا پلاننگ کر رہے ہیں۔ انہوں نے چپکے چپکے نوشہرو جانے کی تیاری کر لی تھی اور مجھے کانوں کان خبر نہ ہونے دی تھی۔ وجہ شاید یہی تھی کہ وہ مجھے جنت کے سحر سے بچانا چاہتے تھے۔

نوشہرو روانگی سے کچھ روز پہلے ہم مستقیم کی شادی میں حویلی گئے، وہیں میری پہلی ملاقات دلہن بنی ثروت سے ہوئی۔"

"ثروت؟" یہ نام سن کر ماوی ٹھٹک گئی اس نے زیر لب دہرایا۔

"ہاں ثروت۔ انہا کی ممی۔" ثمینہ نے سابقہ اطمینان سے جواب دیا، ساتھ ہی بغور اس کے تاثرات کا جائزہ لیا تھا۔ حالانکہ بغور جائزہ لینے کی ضرورت تو نہیں تھی سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ ماوی مارے تعجب کے کھلی آنکھوں اور کھلے منہ کے ساتھ ہکا بکا ثمینہ کو دیکھ رہی تھی۔

"ثروت آنٹی؟ انہا کی ممی؟" چند منٹ بعد بالآخر وہ تعجب و بے یقینی کے اثر سے نکلنے کے بعد بولنے کے قابل ہو ہی گئی تھی۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دانیال انکل میرے چچا..."

اس کا جملہ بیچ میں ہی رہ گیا ثمینہ نے اس کی بات تیزی سے کاٹی تھی۔

"ارے نہیں بھئی... ثروت دراصل تمہارے سوتیلے چچا مستقیم بھٹی کی پہلی بیوی ہیں۔ مستقیم سے طلاق کے بعد انہوں نے دانیال حسن سے شادی کر لی تھی۔"

"یا اللہ..." ماوی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ "یہ کیا گڑبڑ ہے ممی! آپ کس طرح کے انکشافات کر رہی ہیں آج کہ میں یقین نہیں کر پا رہی۔"

اس کی بات پر ثمینہ بے مقصد مسکرا دیں۔

"تم ابھی سے تھک گئیں ابھی تو بہت کچھ ایسا ہے جس سے تمہیں آگاہ ہونا ہے۔"

"تھکی نہیں ہوں۔ لیکن حیران ضرور ہو گئی ہوں۔" اس نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر گہری سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا آپ ثروت آنٹی کے بارے میں پہلے سے جانتی تھیں؟"

"نہیں... پہلے سے کیسے پتا ہو سکتا تھا... یہاں آنے کے بعد اور ثروت سے ملنے کے بعد مجھے شک سا گزرا تھا۔ میں اس سے پہلے بھی کہیں مل چکی ہوں لیکن چونکہ حویلی میں بڑی مشکل سے ایک یا دو ملاقاتیں ہوئی تھیں اس لیے میں فوری طور پر پہچان نہیں سکی۔ پھر کچھ روز گزرنے کے بعد مجھے یاد آ گیا تھا۔"

"انبیاء، وی اور ولید تو شاید اس بارے میں لاعلم ہوں گے کہ ثروت آنٹی کی پہلے بھی کہیں شادی ہوئی تھی۔"
اسے یکدم خیال آیا تھا۔

"میرا نہیں خیال کہ ثروت نے بچوں کو اس بات سے بے خبر رکھا ہوگا۔" ثمینہ نے پرسوچ انداز میں اپنا خیال ظاہر کیا۔ "وہ بھی اس صورت میں کہ جب وہ اپنے پہلے شوہر سے جو اولاد ہے، اس سے بھی رابطہ رکھے ہوئے ہے۔ ایسی باتیں کہاں چھپائی جاسکتی ہیں خصوصاً" اس کنڈیشن میں جب مستقیم کا بیٹا بھی اسی ایریا میں رہائش پذیر ہے۔"

"ارے۔" ماوی کا فطری تجسس جاگا۔ "وہ بھی یہیں رہتا ہے۔ آپ ملی ہیں اس سے؟"

"باقاعدہ ملاقات تو نہیں ہوئی لیکن پارک میں اکثر شبیہہ العباس کو دیکھا ہے۔"

"شبیہہ العباس۔" یہ نام اپنی انفرادیت کی بنا پر ابھی تک اس کی یادداشت سے محو نہیں ہوا تھا۔ اس نے زیر لب نام دوہرایا، پھر ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن کی سرزمین پر گر پڑا۔

"شبیہہ العباس تو جلال الدین کا بھائی ہے۔ اس طرح تو۔۔۔" اس نے تیزی سے کہا تھا۔

"تم صحیح سمجھ رہی ہو۔" ثمینہ نے آہستگی سے کہا تھا۔ "شبیہہ العباس جلال الدین کا بھائی ہے، لیکن سگا بھائی نہیں ہے بلکہ تایا زاد بھائی ہے اور وہ دونوں رجب کے سوتیلے بھائیوں کی اولادیں ہیں۔"

"یہ کیسا اتفاق ہے۔ کہاں تو میں ان کے ناموں سے بھی ناواقف تھی اور کہاں پاکستان آتے ہی ان سے ملاقات ہوگئی۔ کبھی ایسا ہوتا ہے، انسان کی پوری زندگی کسی دوسرے انسان سے ملنے کی خواہش میں ختم ہوجاتی ہے اور کبھی قدرت کچھ ایسے انسانوں کو لاکر سامنے کھڑا کردیتی ہے جن کے متعلق ہم نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوتا۔ مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے ممی! کہ اتنے سارے سوتیلے رشتوں کا ہمارے سامنے اچانک آجانا کوئی معمولی بات نہیں ہے، تقدیر ہمارے ساتھ کوئی ڈبل گیم کھیل رہی ہے یا ہمیں اپنے داؤ پیچ میں الجھانا چاہتی ہے؟" معاً اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ یہ محض اتفاق ہے کہ وہ لوگ اس طرح غیر متوقع طور پر ہمارے سامنے آگئے۔" ثمینہ نے فوراً سختی سے اس کی تردید کی تھی۔

"ہاں۔۔۔ لیکن میں یہ ضرور مانتی ہوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو آنے والے دنوں میں ہوگا، وہ تقدیر کا چلایا ہوا چکر ہے اور ہم کچھ بھی کرلیں، تقدیر سے نہ تو منحرف ہوسکتے ہیں، نہ ہی اس کے چکر سے بچ سکتے ہیں۔ مجھے اس بات پر یقین آچکا ہے ماوی! تم بھی یقین کرلو۔"

ثمینہ کہہ رہی تھیں اور اس وقت ان کی آنکھیں اس طرح چمک رہی تھیں، جس طرح کسی گھنے جنگل کی تاریکی میں بھیڑیے کی آنکھیں چمکتی ہوں گی۔ ماوی دونوں ہاتھ اوپر تلے میز پر رکھے ان ہاتھوں پر تھوڑی ٹکائے سامنے کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ کا عکس تھا۔ چونکہ وہ ثمینہ کی طرف متوجہ نہیں تھی اس لیے ان کی آنکھوں کی چمک بھی نہ دیکھ پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

عین اس لمحے جب ثمینہ ماوی کو لے کر ماضی کی تلخیوں میں بھٹک رہی تھیں، ٹھیک اسی وقت ہسپتال کے پرائیویٹ کمرے میں تنہا لیٹی ثروت کو ان کی یادوں نے گھیر رکھا تھا۔

کبھی انہیں شبیہہ کی باتیں، اس کی ناراضی یاد آنے لگتی، کبھی دانیال حسن کی بدگمانی، کبھی مستقیم کی محبت اور کبھی۔۔۔ کبھی وہ عورت، جس نے اپنی کینہ پرور ذہنیت کے ہاتھوں ان کی پرسکون زندگی کو عذاب بنا دیا تھا۔ ہوتا

دراصل یہ ہے کہ زندگی مشکل نہیں ہوتی لیکن جب چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں کو جان بوجھ کر بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے تو زندگی مشکل بن ہی جاتی ہے۔ ثروت کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

وہ ایک پڑھے لکھے خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد شہر کے مشہور بیرسٹر تھے۔ وہ ابھی اسکول میں ہی تھیں کہ اس دور کے رواج کے مطابق یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ ان کی شادی خالہ زاد دانیال سے کی جائے گی۔ کوئی باقاعدہ رسم نہیں ہوئی تھی لیکن بزرگوں میں سرسری طور پر بات چیت ہوچکی تھی اور اپنی بڑی بہنوں کی زبانی ثروت کو بھی خبر مل چکی تھی۔ ان کے خاندان میں پردے وغیرہ کی ایسی کوئی خاص پابندی نہیں تھی اسی لیے دانیال سے ان کی ملاقات خاندان کی تقریبات وغیرہ میں ہوتی رہتی تھی۔ ثروت جانتی تھیں جلد یا بدیر انہی سے ان کی شادی ہوگی لیکن انہوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ دانیال انہیں پسند ہیں یا نہیں۔

نہ ہی انہوں نے کبھی اس بات پر توجہ دی کہ ان پر نظر پڑتے ہی دانیال کے چہرے پر کیسی روشنی سی پھیل جاتی ہے۔ کسی بندھی روٹین کی طرح وہ اپنے اور دانیال کے رشتے کو قبول کرچکی تھیں۔ پھر ایک روز اچانک ان کی ملاقات مستقیم سے ہوگئی۔ وہ ان کے بڑے بہنوئی کے دوستوں میں سے تھے۔ اپنے یہاں کسی تقریب میں بھائی صاحب نے اپنے دوستوں کو بھی بلا رکھا تھا جب ثروت نے انہیں دیکھا۔

"نشی آپا! یہ بھائی صاحب کے دوستوں میں اتنا لمبا لڑکا کون ہے؟" وہ کچن کی کھڑکی سے نظر آتے لان میں نظریں ڈالتے پوچھ رہی تھیں۔

"کون۔۔۔ کس کی بات کررہی ہو؟" نشی آپا ذرا مصروف تھیں۔

"وہی جو اتنا لمبا ہے کہ مجمع میں کھڑا دور سے ہی فوراً نظر آجائے۔ توبہ توبہ۔۔۔ اتنا لمبا بھی کوئی نہ ہو۔۔۔ ایک منٹ کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے بجلی کے کھمبے پر کسی نے انسانی شکل لگادی ہو۔" ثروت نے نیم سنجیدگی سے کہا نشی آپا ہنستے ہنستے دوہری ہوگئیں۔

"تمہارا بھی جواب نہیں ہے ثروت!۔۔۔ بیچارہ مستقیم اتنا بھی لمبا نہیں ہے۔"

"اچھا تو موصوف کا نام مستقیم ہے۔ جتنا لمبا قد اتنا ثقیل نام۔"

"تمہارے بھائی صاحب کے ساتھ انجینئرنگ کالج میں پڑھتا ہے لیکن جونیئر ہے ان سے۔" "ویسے مجھے مستقیم بھائی بہت پسند ہیں۔"

"اچھا۔۔۔ میں بتاؤں گی بھائی صاحب کو۔" ثروت نے شرارتی انداز میں آنکھیں مٹکائی تھیں۔

"ہاں بتا۔۔۔ تمہارے بھائی صاحب جانتے ہیں تم ان کی کتنی فسادی قسم کی سالی ہو۔" آپا نے ہنس کر کہا تھا۔ ویسے ثروت! اگر دانیال کا معاملہ نہ ہوتا تو میں مستقیم کے ساتھ تمہاری بات چلاتی۔"

"اچھا۔" ثروت نے دور کھڑے مستقیم کو دیکھا۔ وہ اس طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ ثروت سٹپٹا کر کھڑکی سے ہٹ گئیں۔

"امی نے تمہارا رشتہ طے کرنے میں بڑی جلد بازی کی۔" آپا کہہ رہی تھیں۔ ثروت خاموش رہیں اور لاحول پڑھ کر اس خیال کو جھٹک دیا لیکن یہ کچھ ایسا آسان بھی نہ تھا، پھر نشی آپا بھی پتا نہیں کیا سوچ چکی تھیں۔ انہوں نے اگلے ہی روز امی سے اس سلسلے میں بات کرڈالی۔

"آپ خالہ جان کی طرف سے فکرمند نہ ہوں۔ دانیال ابھی تک برسرروزگار نہیں ہوا۔ آخر ہم کب تک ثروت کو اس کے نام پر بٹھائے رکھیں گے۔"

"پھر بھی نشی! تمہاری خالہ بہت خفا ہوجائیں گی۔" امی متذبذب تھیں۔

"مگر ثروت کے لیے ان کے دل میں سچ مچ محبت ہے تو ہرگز خفا نہیں ہوگی۔ امی! فی زمانہ ہر کوئی اپنی اولاد کی بھلائی سوچتا ہے تو پھر آپ کیوں اولاد سے زیادہ بہن کی فکر کررہی ہیں؟" میں نے اکبر سے بات کی تھی۔ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ ثروت کے لیے مستقیم بھائی دانیال سے زیادہ مناسب ہیں شکلاً" بھی اور فیملی بیک گراؤنڈ کے اعتبار سے بھی..... ہماری ثروت ان کی حویلی میں راج کرے گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ثروت بھی مستقیم کو پسند کرتی ہے۔ اس نے خود کہا مجھ سے۔"

نشی آپا کے اس کھلے جھوٹ پر ثروت بری طرح بدکیں۔

"ہائے اللہ..... آپا! یہ کب کہا میں نے؟"

"کیوں کل خود ہی نہیں کہہ رہی تھیں کہ اس لمبے قدوالے کی آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں؟"

"ہاں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اسے پسند کرتی ہوں۔"

"ناپسند بھی تو نہیں کرتیں۔"

"آپا.....!" ثروت کے احتجاج کو بھی نشی آپا کسی خاطر میں نہ لائیں اور امی کو قائل کرکے ہی دم لیا۔ ثروت کو نہ دانیال سے دلچسپی تھی نہ مستقیم سے۔ لیکن نشی آپا کے سمجھانے بجھانے پر انہوں نے بھی اپنے بہتر مستقبل کو اولیت دی اور یوں قرعہ فال مستقیم کے نام نکل آیا۔ لیکن اس شادی کے لیے امی کو بہن کی ناراضی سول لینا پڑی تھی۔

شروع کے دنوں میں یہ شادی ثروت کو کسی خواب کی طرح لگتی تھی۔ کہاں انہیں دانیال کی دلہن بننا تھا اور کہاں آناً" فاناً" ان کی شادی مستقیم سے ہوگئی۔ مستقیم نے انہیں بتایا تھا' خود انہوں نے بھی ثروت کو اسی تقریب میں دیکھا تھا جب ثروت ان کے لمبے قد پر تبصرہ کررہی تھیں اور وہ انہیں دیکھ کر پہلی نظری محبت ٹائپ کسی جذبے کا شکار ہوگئے تھے۔ بقول ان کے' یہ ان کے جذبوں کی سچائی ہی تھی جس نے انہیں اپنی ماں سے ضد منوانے میں مدد دی تھی۔

یہاں تک سب کچھ ٹھیک تھا۔ نکاح کی بدولت ثروت کو بھی مستقیم سے محبت ہوگئی تھی لیکن جلد ہی انہیں احساس ہوگیا کہ اس حویلی میں آنا صرف مستقیم کی رضا تھی اور اپنی بات منوانے کے لیے انہوں نے اپنی ماں سے تقریباً" ضد ہی باندھ لی تھی۔ انجام کار ثروت اس حویلی میں آگئیں لیکن مستقیم کی ماں کے دل میں ان کے لیے بغض پیدا ہوگیا تھا۔

وہ حاکمیت پسند عورت تھیں۔ اپنے اختیارات میں دخل اندازی اس سے برداشت نہ ہوپاتی تھی اور اس نے ثروت سے بیر باندھ لیا تھا۔ شادی کے کچھ مہینوں بعد ہی اس نے ثروت اور مستقیم کے درمیان غلط فہمیوں کی دیوار اٹھانا شروع کردی تھی۔ مستقیم بھی عجیب و غریب انسان تھے۔ انہوں نے ماں سے ایک ضد منوانے کے بعد گویا باقی ساری زندگی شرم ساری سے ان کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ مجال ہے جو حقیقت حال سے واقف ہونے کے باوجود ثروت کی طرف داری میں ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نکلا ہو۔

ثروت اس صورت حال سے بے حد پریشان رہنے لگی تھیں۔ وہ خود پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے ماحول کی پروردہ تھیں۔ ایسی شاطرانہ اور گھٹیا چالوں سے ان کا کبھی سابقہ نہ پڑا تھا اسی لیے فوراً" ہی گھبرا گئیں اور انہوں نے مستقیم سے شکایت کرنا شروع کردی۔

"تم مجھے میری ماں کے خلاف کرنا چاہتی ہو۔"

خدا معلوم جنت بی بی ان کے کان کس کس طرح بھر رہی تھی کہ ہر بار ثروت کی باتیں انہیں یہی سوچنے پر مجبور کردیتیں۔ رفتہ رفتہ مستقیم ان سے اتنا دور ہوتے چلے گئے کہ ناچار ثروت نے علیحدگی کے متعلق غور کرنا شروع کر

دیا۔

"مجھے کچھ روز امی کے یہاں چھوڑ دیں۔ یہاں رہوں گی تو پاگل ہو جاؤں گی۔" انہوں نے اپنا سر دباتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں کہا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں لیکن اس کے بعد لینے نہیں آؤں گا۔ تم ساری زندگی انہی کے پاس رہنا اور ہاں شبیہہ کو بھی میں لے جانے نہیں دوں گا۔" مستقیم نے رکھائی سے کہا تھا۔

"مستقیم۔۔۔" وہ اس انداز پر ہکا بکا رہ گئی تھیں۔

"مستقیم بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم اپنی مرضی سے جاؤ گی تو واپس لانا یا نہ لانا ہماری مرضی پر منحصر ہوگا۔ شبیہہ مجھ سے بہت قریب ہے' وہ میرے پاس ہی رہے گا۔" جنت بی بی نے یکدم کمرے میں آتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ دروازے کے باہر کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھیں؟" ثروت نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔ "آپ کو شرم نہیں آئی اس طرح کی گھٹیا حرکت کرتے ہوئے۔"

"مستقیم! تم نے سنا یہ مجھ سے کس طرح بات کرتی ہے؟"

"جی ماں جی! میں نے سنا۔۔۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا' اسے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں ہے۔ ثروت! اماں جی سے معافی مانگو۔"

"کس بات کی معافی!" ثروت بری طرح سلگیں "اگر کسی کو معافی مانگنا چاہیے تو وہ تمہاری ماں جی ہیں جو ہمارے کمرے کے باہر کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھیں۔۔۔ پھر انہیں کیا حق ہے کہ ہمارے نجی معاملے میں دخل دیں۔"

"یہ حویلی میری ماں کی ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے' وہ ان معاملات میں شامل ہیں اور تمہیں کوئی حق نہیں کہ میری ماں کی توہین کرو۔۔۔ معافی مانگو ان سے۔" مستقیم نے دانت کچکچا کر کہا تھا۔

"تم جیسے مردوں کو شادی نہیں کرنا چاہیے مستقیم! ساری زندگی ماں کے آنچل میں چھپ کر بیٹھے رہنا چاہیے۔"

اس بات پر مستقیم نے انہیں تھپڑ کھینچ مارا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے؟ وہ حویلی چھوڑ کر اپنے باپ کے گھر آ گئیں۔ کورٹ میں خلع اور پھر شبیہہ کی کسٹڈی کا کیس فائل کیا گیا۔

لیکن عدالت میں پہلی ہی شنوائی پر مستقیم کے وکیل کی طرف سے ثروت کو ایسے ایسے شرمناک الزامات کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کی ہمت جواب دے گئی اور انہوں نے گھبرا کر عدالت میں دی ہوئی خلع کی درخواست واپس لے لی۔

کچھ مہینوں کے بعد مستقیم نے از خود انہیں تحریری طلاق بھجوا دی تھی۔ البتہ شبیہہ کو دینے پر وہ راضی نہیں تھا۔ ناچار ثروت نے دل پر جبر کی سل رکھ لی۔ قانون کی مدد لینے کی صورت [illegible] انہیں پھر عدالت جانا پڑتا۔ پھر ان کے کردار پر کیچڑ اچھالا جاتا اور پھر وہ ذہنی توڑ پھوڑ کا شکار ہوتیں۔

تقریباً سال بھر کے بعد خالہ پھر ان کے لیے سوالی بن کر آ گئیں۔ تب [illegible] نے ضد پکڑ لی۔

"دانیال تمہارے لیے سب سے بہتر ہے۔ مستقیم کے لیے بھی تم [illegible] دباؤ ڈالا تو مجھے ماننا پڑا تھا ورنہ سچی بات ہے اس کی ماں مجھے ایسی لگی ہی نہیں تھی جو اولاد کا گھر بسنے دے۔"

"لیکن امی!"

"بیٹے! مجھ پہ بھروسا کرو۔ ماں ہوں تمہاری دشمن نہیں۔ دانیال کے دل میں تمہارے لیے محبت ہے ورنہ کون یوں ٹھکرائے جانے کے بعد واپس آتا ہے وہ بھی طلاق یافتہ اور ایک بچے کی ماں کے لیے۔"

امی نے ان کے ہر اعتراض کو رد کر دیا اور جس طرح اچانک ان کی شادی مستقیم سے ہوئی تھی پھر طلاق بھی آنا "فانا" ہو گئی' اسی طرح دانیال سے شادی بھی ہو گئی۔

امی کی بات درست تھی۔ دانیال کے دل میں سچ مچ ان کے لیے محبت تھی۔ شادی کے بعد ہر دن یہ محبت گہری ہوتی گئی لیکن دانیال کے دل میں مستقیم کی طرف سے ایک چبھن تھی جو ایک روز مارکیٹ میں غیر متوقع طور پر مستقیم سے مل کر گہری ہو گئی۔ مستقیم کا ثروت کو دیکھ کر ٹھٹکنا اور پھر ثروت کا بے ساختہ اس کی طرف بڑھنا دانیال کے دل میں ہمیشہ کی کدورت ڈال گیا تھا۔

بعد میں ثروت بہتیرا سمجھاتی رہیں کہ وہ مستقیم کو دیکھ کر نہیں' بلکہ اس کے ساتھ کھڑے شبیہہ کی طرف بڑھی تھیں لیکن ان کو یقین نہ آنا تھا' سو نہ آیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دانیال کا دھوپ چھاؤں سا رویہ بڑھتا چلا گیا۔ ثروت عادی ہو کر بھی عادی نہ ہو سکیں۔ ایک بار طلاق کا داغ ان کے دامن پر لگ چکا تھا۔ دوسری بار بھی خدانخواستہ اس مرحلے سے گزر کر وہ خود کو "بری عورت" نہیں کہلوانا چاہتی تھیں۔ ہمارا معاشرہ کسی عورت کو ایک بار طلاق یافتہ ہونے پر معاف کر سکتا ہے' لیکن دوسری بار ہرگز نہیں۔

یہی وجہ تھی کہ ثروت نے اپنی زبان پر قفل لگا کر اپنی گرہستی بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا۔ لیکن اتنی کوششوں کے باوجود اتنے ڈھیر سارے سالوں کی رفاقت بھی انہیں بدگمانی کے اس دائرے سے باہر نہ نکال سکی تھی جو دانیال نے ان کے گرد کھینچ رکھا تھا۔ چند سال پہلے شبیہہ نے بھی اسی علاقے میں رہائش اختیار کی اور اتفاقاً" ان لوگوں کی مڈبھیڑ رہنے لگی۔ جہاں شبیہہ کو دیکھ کر ثروت کے ممتا سے تڑپتے دل کو کسی قدر سکون آجاتا تھا' وہیں ذہنی پریشانی شروع ہو جاتی تھی کہ پھر کئی روز تک انہیں دانیال کی ناراضی برداشت کرنا پڑتی تھی۔

لیکن اب وہ سب سہتے سہتے تھک چکی تھیں۔ یہ ذہنی تھکن ہی تھی جو انہیں ہسپتال لے آئی تھی۔ اتنی محنت اتنی جدوجہد کے بعد تھک ہار کر انہوں نے فیصلے کا اختیار دانیال کو دے دیا تھا اور دانیال نے منٹوں میں ان کی محنت مٹی میں ملا دی تھی۔ اپنے چھوٹے سے فیصلے سے انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ انہیں ثروت پر اعتبار نہیں ہے۔

ثروت کی کنپٹیوں پر آنسوؤں کی لکیریں بہہ رہی تھیں اور انتہائی کرب سے وہ سوچ رہی تھیں۔

"اگر اٹھارہ سال کی رفاقت بھی مرد کو عورت کے اخلاص کا اعتبار نہیں دلا سکتی تو کیا فائدہ ہے اس عورت کی زندگی کا؟" زندگی میں پہلی بار ان کا دل چاہ رہا تھا وہ خودکشی کر کے زندگی کے اس عذاب سے چھٹکارہ حاصل کر لیں۔

☼ ☼ ☼
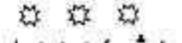
منظر کچھ خاص نہ بدلا تھا۔ صوفے پر نیم دراز ثمینہ' سامنے والے صوفے سے ٹیک لگا کر اور میز پر کہنیاں ٹکا کر چہرے پر زمانے بھر کا تجسس سجائے کارپٹ پر بیٹھی ماوی' شیشے کی بڑی سی کھڑکی کے باہر چپکے چپکے بہتی رات اور اس رات کے ساتھ سفر کرتے یادو یاراں۔

ثمینہ کی دھیمی' یکساں متوازن آواز سارے میں بکھر رہی تھی۔

"زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ ہم خوش اور مطمئن تھے لیکن مجھے رجب کے آنا "فانا" اٹھ کر نوشہرو آجانے کے فیصلے پر اعتراض تھا جو میں وقتاً" فوقتاً" جتاتی رہتی تھی اور رجب سے ڈانٹ بھی کھاتی تھی کہ ان کو یہ ذکر کچھ خاص پسند نہ تھا جبکہ مجھے حویلی کی شان و شوکت اور وہاں کے کمفرٹس بھولتے ہی نہ تھے۔

جب ہم آخری بار حویلی گئے تو مستقیم کی شادی ہو رہی تھی۔ حویلی کو خوب سجایا گیا تھا۔ میری آنکھوں میں سے [illegible] حویلی کا منظر نکلتا ہی نہ تھا۔ میرا دل چاہتا تھا ہم حویلی جائیں اور ان آرام دہ بستروں کو استعمال کریں جن کی [illegible] خواب کی سی لگتی تھی۔

وہ نت نئے کھانے جن کے ذائقے اپنی پہلی زندگی میں میں نے کبھی نہ چکھے تھے۔ بہرحال میں نے کئی بار رجب کو [illegible] حویلی میں رہنے اور اپنا حصہ لینے کے لیے اصرار کیا لیکن ان کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ وہ میرے

اصرار کے جواب میں ہر بار سختی سے انکار کر دیتے تھے۔ میں ان کا غصہ دیکھ کر خاموش ہو جاتی اور چند روز گزرنے کے بعد پھر وہی قصہ چھیڑ دیتی۔

"اچھی بھلی تمہاری عقل تھی۔ آخر اس معاملے میں چلنا کیوں بند ہو گئی ہے؟ جب میں نے کہہ دیا مجھے حویلی اور جائیداد میں سے حصہ نہیں چاہیے تو تم کیوں آخر ایک ہی بات کے پیچھے پڑی رہتی ہو؟ تم حویلی کی شان و شوکت سے متاثر ہوئی ہو لیکن یاد رکھو ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔"

ایک روز رجب نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔ میں ان کے رویے سے دل برداشتہ ضرور ہوئی تاہم دل ہی دل میں دعا کرتی رہی کہ اللہ کچھ ایسے حالات بنا دے کہ ہمیں حویلی جا کر رہنے کا موقع ملے۔

اسی دوران سال یا ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر گیا اور پھر ایک روز وہ ہو گیا جس کی توقع کوئی ذی ہوش نہیں کر سکتا۔

ایک معمولی سے روڈ ایکسیڈنٹ میں رجب کی دائیں ٹانگ مفلوج ہو گئی۔ بظاہر کوئی چوٹ دکھائی نہ دیتی تھی۔ ڈاکٹرز نے مکمل چیک اپ ایکسرے وغیرہ کے بعد بھی یہی بتایا کہ بظاہر کوئی اندرونی گہری چوٹ بھی نہیں ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رجب کی ٹانگ کام کرنے لگے گی۔ لیکن پھر ——— رجب کی ٹانگ نے سن ہوتے ہوتے بالکل ہی کام کرنا چھوڑ دیا۔ دکھ اور تکلیف کی بات ایک تو ٹانگ کا مفلوج ہونا بھی تھا لیکن اصل پریشانی ہمیں تب لاحق ہوئی جب رجب کو احساس ہونے لگا ان کی دوسری ٹانگ بھی سن رہنے لگی ہے۔

رجب کی ملازمت چھوٹ چکی تھی۔ ہمارے پاس کوئی مال و اسباب بھی نہیں تھا پھر پریشانی بھی کچھ ایسی لاحق ہوئی کہ میں نے گھبرا کر رجب کے والد کو اطلاع بھجوا دی۔ وہ بیٹے کے لیے دوڑے چلے آئے اور رجب کی حالت دیکھ کر مجھ پر خوب برسے کہ میں نے انہیں بروقت اطلاع کیوں نہ دی۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے رجب نے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ اس پر ابا جی خاموش ہو گئے اور پھر رجب سے اصرار کرنے لگے کہ وہ ان کے ساتھ چلیں۔ وہ رجب کا بہترین علاج کروا سکتے تھے۔

اور میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حویلی جا کر رہنے کی دعائیں اس طرح قبول ہوں گی۔ سچی بات ہے مجھے ذرا بھی علم ہوتا تو میں دعا مانگنا ہی چھوڑ دیتی۔ رجب نے بہت پس و پیش سے کام لیا لیکن اس بار ان کے انکار میں وہ پہلے جیسی سختی مفقود تھی۔ ایک رات انہوں نے مجھ سے کہا۔

"میں نے تہیہ کیا تھا کہ کسی بھی قیمت پر حویلی نہیں جاؤں گا لیکن میرے پاس ایسا کوئی جمع جتھا نہیں ہے جسے اپنے علاج پر خرچ کر سکوں پھر میں نے فیاض سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں ایک خوش حال زندگی دوں گا۔ مجھے افسوس ہے اور شرمندگی بھی کہ میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر پا رہا۔"

ان کے شرمساری بھرے لہجے پر میرا دل کٹ سا گیا۔

میں نے کہا۔ "آپ فکر مند نہ ہوں رجب! ہم کچھ عرصہ حویلی میں رہیں گے اور جب آپ صحت یاب ہو جائیں گے تو واپس یہاں آ جائیں گے۔ اس میں کوئی معیوب بات تو نہیں ہے۔ دنیا کے بہت سے باپ اپنے بیٹوں کا علاج کرواتے ہیں۔"

"تمہیں حویلی میں بہت سی قوتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔" رجب نے کہا۔ میں ان کے خدشات پر ہنس دی۔

"آپ کے خدشات دور کیوں نہیں ہو جاتے رجب! وہاں سب لوگ ہم سے پیار کرتے ہیں۔"

"تصویر کا ایک رخ دلکش ہو تو پلٹ کر دوسری طرف دیکھنے کی زحمت کوئی نہیں کرتا۔ بہرحال تمہیں ذہنی طور پر ہر طرح کی پریشانیوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" رجب نے کہا تھا۔ میں نے زیادہ پرواہ نہیں کی۔ کچھ وہ پہلے ہی وہاں جا کر رہنے کے خلاف تھے اور کچھ بیماری نے انہیں زود رنج اور حساس بنا دیا تھا۔

پھر میں خوشی خوشی حویلی جانے کی تیاریاں کرنے لگی اور حویلی آ کر مجھے احساس ہوا، رجب کے خدشات کچھ

ایسے بے بنیاد بھی نہ تھے کیونکہ وہاں سب کے محبت بھرے رویے یکسر تبدیل ہو چکے تھے۔ خصوصاً جنت بی بی کی وہ میٹھی زبان طنزیہ اور دل جلانے والی باتوں تک محدود ہو چکی تھی۔ میں اس کی باتوں اور رویے پر جلتی کڑھتی لیکن چپ رہنے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ عورت بڑے حساب کتاب سے ہمیں زچ کر رہی تھی۔ ابا جی کے سامنے وہ بڑی اچھی بن جاتی اور ان کی غیر موجودگی میں جلادنی لگتی۔ لیکن ابھی پھر بھی اس کا رویہ غنیمت تھا۔ رجب تیزی سے صحت یاب ہو رہے تھے۔ پہلے پہل وہ خود سے قدم بھی نہیں اٹھا پاتے تھے لیکن اب بیساکھی کے سہارے بڑی سہولت سے چلنے لگے تھے۔

بہت ساری ناگواریوں کے باوجود بہت ساری تسلیاں میرے ہمراہ تھیں لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ انہی دنوں جب مجھے اور رجب کو یقین ہو چلا کہ بہترین علاج سے رجب جلد ہی مکمل طور پر صحت مند ہو جائیں گے ابا جی اللہ میاں کو پیارے ہو گئے۔ گو کہ عمر ہو گئی تھی لیکن ان کی موت اچانک، غیر متوقع اور حادثاتی تھی۔ حویلی میں کہرام آ کر گزر گیا اور میرے اور رجب کے لیے صحیح امتحان ان کی وفات کے بعد ہی شروع ہوا۔

جنت بی بی کے خوب صورت چہرے کے پیچھے چھپا ہوا مکروہ پن جلد ہی سامنے آ گیا اور اس نے ہم پر حویلی میں عرصۂ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کچھ وہ فطرتاً "حاکمیت پرست" تھی کچھ غالباً اسے یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں رجب اپنا حصہ جائیداد سے وصول کر کے اس کے بچوں کو بے دخل نہ کر دیں۔

اپنے اسی خدشے کو دور کرنے کے لیے وہ ہر وقت ہمیں اپنی زبان سے بھیدتی رہتی۔ مجھ پر تو خیر اس نے ذہنی اور جسمانی ہر طرح کا تشدد کیا۔

مجھے آج بھی وہ دن نہیں بھولتا۔ اپنے چھوٹے بیٹے مصطفیٰ کی شادی کی صبح ہی صبح اس نے کسی معمولی سی غلطی پر مجھے سب مہمانوں کے سامنے بری طرح مارا تھا۔ نئی نویلی دلہن کمرے سے نکل رہی تھی اور میں عین سامنے جنت بی بی کے ہاتھوں اپنے سر میں جوتیاں کھا رہی تھی۔ وہ مار اتنی تکلیف دہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ توہین زیادہ تکلیف دہ ہوتی تھی جو مجھے بہت سے لوگوں کے سامنے سہنا پڑتی۔

اس نے مجھے حویلی کے ملازمین سے بھی کم تر حیثیت دے رکھی تھی۔ جب اس کا دل چاہتا مجھے مارتی، جب دل چاہتا ذلیل کرتی۔ رجب کچھ بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھے کیونکہ جنت بی بی نے سب کو باور کروا دیا تھا ہم اس کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔ ایک دوبار رجب بولنے کی کوشش کی منہ کی کھائی۔"

ثمینہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں نمی اور حلق میں سسکیاں اٹکتی تھیں۔ ماوی نے بے ساختہ آگے بڑھ کر اور ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ان کی ڈھارس بندھائی تھی۔

"پھر انہی دنوں ہمیں تمہاری پیدائش کے متعلق خبر ملی۔ یہ ایسی خوش خبری تھی جس کے لیے میں اور تمہارے بابا بڑی شدت سے دعا گو تھے۔ لیکن جن حالات میں ہمیں خبر ملی ہم ڈھنگ سے خوش بھی نہیں ہو سکے۔ عجیب بات ہے لیکن خوشی ہو یا غم ——— کبھی کبھی انسانی زندگی میں ایسا وقت بھی آ جاتا ہے جب اس کا ہر جذبہ روپے پیسے کا محتاج بن کر رہ جاتا ہے۔

ہمارے لیے بھی وہ وقت ایسا ہی تھا ——— سسک سسک کر گزرتا ہوا وقت ——— بغیر کسی آس امید کے اندھیری تاریک رات جیسا وقت ——— سمجھ میں نہیں آتا تھا ہم کیا کریں۔ حویلی سے نکلنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا کہ ہمارے پاس مال و اسباب نہ ہونے کے برابر تھا۔ رجب گو کہ صحت یاب ہو رہے تھے لیکن وہاں سے نکل کر اپنی خود مختار زندگی گزارنا ممکن نہ تھا۔ دراصل اتنی طویل بیماری نے انہیں ذہنی طور پر مضمحل کر دیا تھا اور ان کو خود پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ رنج کی بات تو یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو ہی چکے تھے۔

پھر تم پیدا ہوئیں تو رجب جیسے طویل کشمکش سے آزاد ہو کر اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ انہیں اپنے والد کے ترکے

میں سے اپنا حصہ وصول کر لینا چاہیے کہ بہرحال اب ہمیں صرف اپنی فکر نہیں تھی تمہاری فکر بھی ہمارے ساتھ لگ چکی تھی۔ پھر... پھر رجب نے اپنا حق مانگ لیا۔ تم اندازہ کر سکتی ہو ماوی! غلام بنا کر رکھے ہوئے انسان جب بنا کوئی اعتراض کیے سزا بھگت سکتے ہیں تو نعوذ احتجاج بلند کرنے پر کسی کا ظلم و ستم ماننے سے انکار کرنے پر ان کے ساتھ کس حد تک ناروا سلوک برتا جا سکتا ہے۔

سچ بات ہے رجب نے اپنا آپ تسلیم کروانے کے لیے بڑی ہمت کی تھی اور جب ہمیں لگا کہ بالآخر جنت بی بی ہمیں ہمارا حق دے دے گی تو... تو ایک صبح... ایک صبح' رجب دنیا سے چلے گئے مجھے اور تمہیں اکیلا چھوڑ کر۔"

ثمینہ یکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔

ماوی نے سرعت سے اٹھ کر انہیں بازوؤں میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا اور ان کا سر سہلانے لگی۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی نم تھیں۔

"اس روز بھی طوفان آیا تھا۔ اس رات بھی بارش ہو رہی تھی لیکن ایسی بارش نہیں جو آج برس رہی ہے۔ یہ تو اس رات کے طوفان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ٹھنڈ ایسی کہ بیان سے باہر... آسمان سے پانی نہیں برس رہا تھا' برف برس رہی تھی۔ ہمیں حویلی کے باہر کا کمرا دیا گیا تھا۔ درختوں میں گھرا ہوا تھا وہ کمرا... لیکن اس کی دیواروں سے وحشت ٹپکتی تھی اور... اور اس رات تو اس کمرے کی دیواریں برف کی بن گئی تھیں اور ایسا لگتا تھا ہم برف کے کسی غار میں قید ہوں۔ ہمارے پاس دو لحاف تھے بالکل گھسے ہوئے۔

رجب نے کہا۔ ماوی کو ٹھنڈ لگ سکتی ہے میرا لحاف بھی تم دونوں لے لو مجھ سے غلطی ہو گئی۔ تمہیں ٹھنڈ لگ جانے کے ڈر سے میں نے ان کا لحاف لے لیا۔ نہ لیتی تو اس رات بے تحاشا سردی کی وجہ سے صرف رجب کی حرکت قلب بند نہ ہوتی ہم تینوں ہی مر جاتے۔ اچھا ہوتا... مجھے پچھتاوے تو نہ ستاتے۔"

دیر تک رونے کے بعد ثمینہ تھم پڑ گئیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے آنسو ختم گئے تھے۔ ان کے چہرے پر ابھی بھی لکیر کی صورت آنسو بہہ رہے تھے اور ماضی کی بھول بھلیوں سے الجھتے ہوئے جیسے وہ مضمحل ہو چکی تھیں۔

ماوی دوڑ کر گئی اور پانی کا گلاس بھر لائی۔

"بس کریں ممی!" اس نے ثمینہ کے سر پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"رجب کی اچانک وفات نے جیسے میرے حواس ہی گم کر دیے تھے۔ میں نے دیکھا ہی نہیں... رجب بارش میں بھیگے ہوئے تھے... میں نے کیوں نہیں دیکھا۔" وہ اور شدت سے رونے لگیں۔

"پلیز ممی... ڈونٹ کرائے (Cry)" ماوی انہیں سنبھالنے لگی پھر پانی کا گلاس زبردستی ان کے لبوں سے لگا دیا۔

"بھول جائیں ان سب باتوں کو... جو ہونا تھا' ہو چکا۔ ہم گزرا وقت واپس تو نہیں لا سکتے۔ آپ پلیز رونا بند کریں اور بھول جائیں ان سب یادوں کو۔" اس نے نرمی سے کہا تھا۔

"بھول جانا آسان ہے؟ ایسی باتوں کو بھول جانا... ایسی زندگی کو بھول جانا' جب ہر لمحہ آپ کے جسم پر زخم لگے ہوں۔" ثمینہ نے یکدم درشتی سے کہا تھا۔

ماوی لمحہ بھر کے لیے دم بخود رہ گئی۔ غم اپنی جگہ۔ لیکن وہ ثمینہ سے اتنی درشتی کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"اوکے... نو پرابلم۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر صلح جو انداز میں کہا کہ وہ ثمینہ کے غصے کو ان کے غم سے ہی مشروط سمجھ رہی تھی۔

"بہت رات ہو گئی ہے بلکہ اب تو تقریباً" صبح ہونے والی ہے۔ چلیں بیڈ روم میں جا کر سو جائیں۔" اس کا انداز ایسا تھا جیسے چھوٹے سے بچے کو بہلا رہی ہو۔

"نہیں... میں یہیں ٹھیک ہوں۔" ثمینہ نے رکھائی سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ "تم جا کر سو جاؤ۔"

وہ چند منٹ متذبذب سی انہیں دیکھتی رہی پھر گہری سانس بھر کر بولی۔

"اوکے ویل... گڈ نائٹ ممی!" اس نے جھک کر ایک بار پھر ثمینہ کے سر کو بوسہ دیا اور بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ ثمینہ نے اپنی نم اور دکھتی ہوئی آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔ اس دکھ کو یاد کرتے ہوئے ان کا دل جیسے کٹ رہا تھا اور دماغ بری طرح دکھنے لگا تھا۔ وہ اتنی بری طرح تھک چکی تھیں کہ چند منٹ میں ہی گہری نیند سو گئیں۔

ماوی لحاف لے کر لاؤنج میں آئی۔ ثمینہ کے چہرے پر مرکزی ٹیوب لائیٹ کی روشنی ڈائریکٹ پڑ رہی تھی اور وہ بہت پژمردہ لگ رہی تھیں۔ وہ نے ٹیوب لائٹ بند کر کے نائٹ بلب جلایا۔ ثمینہ کو لحاف اوڑھا کر انہیں ہمدردی سے دیکھتی رہی۔ اس کا ذہن و دل عجب خالی پن کا شکار تھے۔ پھر وہ صوفے پر خوب اچھی طرح لحاف پھیلا کر لیٹ گئی اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے ان تمام انکشافات پر غور کرنے لگی جو ممی نے آج کی رات اس پر منکشف کیے تھے۔ معاً" بجلی کا کوندا سا اس کے ذہن میں لپکا۔

"ممی! تو کہہ رہی تھیں بابا کا قتل ہوا تھا۔" اس خیال کے آتے ہی وہ بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اسی بے ساختگی میں ثمینہ کی طرف بڑھنے لگی' لیکن وہ بے حد گہری نیند میں تھیں اور شاید اس وقت ان سے کچھ بھی پوچھنا مناسب نہ رہتا۔ ماوی گرنے کے انداز میں دوبارہ لیٹ کر چھت کو گھورنے لگی اور اس الجھی ہوئی گتھی پر غور کرنے لگی۔ یہاں تک اس کا ذہن نیند کی گہرائیوں میں چلا گیا اور اسے پتا بھی نہیں چلا۔

☼ ☼ ☼

گہری نیند کے سائے تلے ثمینہ کئی سال پیچھے پہنچ گئی تھیں۔ وہاں جہاں ان کے ماضی کے اس انتہائی دردناک راز کی کڑیاں بکھری پڑی تھیں۔

"انہوں نے دیکھا... درختوں میں گھرا ہوا کسی کھنڈر سے مشابہ ایک قدیم برآمدہ تھا۔ برآمدے کی سیڑھیاں گرد اور سوکھے پتوں سے اٹی ہوئی تھیں۔ سیڑھیوں سے آگے سرمئی پتھروں کی ٹوٹی پھوٹی روش تھی۔ درختوں کے تنے قد آور اور پتے گھنے ہو کر جھنڈ کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ ان چوڑے اور گھنے پتوں سے کہیں کہیں آسمان جھانکتا تھا۔

روش جہاں ختم ہوئی تھی وہاں مدتوں جگت کا کنواں تھا جس کی گہرائی اور تاریکی کا احساس دور سے دیکھ کر بھی ہوتا تھا۔

برآمدے کے دائیں اور بائیں ہاتھ طویل راہداریاں تھیں اور عقب میں ایک بڑا سا دروازہ... سمٹتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ ساتھ منظر ان پر واضح ہو رہا تھا اور ثمینہ کا دل عجیب سا ہو رہا تھا۔

"میں پھر یہاں پہنچ گئی... یا کبھی یہاں سے جا ہی نہ سکی تھی۔"

ان کا دل لحظہ بہ لحظہ سہم رہا تھا۔ معاً" بارش ہونے لگی۔ بالکل خاموشی سے پہلا قطرہ ان کی ناک پر گرا' دوسرا گال پر پھر تیسرا' پھر چوتھا۔ ثمینہ نے سر اٹھایا۔ درختوں کے پتوں میں سے جھانکتے آسمان سے رات کی سیاہی کے ساتھ بارش بھی اتر آئی تھی۔

ثمینہ نے متعجب ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ تو برآمدے میں کھڑی تھیں یہاں روش پر کیسے پہنچ گئیں۔ ابھی یہ الجھن نہ سلجھی تھی کہ کسی نے ان کو پکارا۔ ثمینہ سہم کر پلٹیں۔

ایک چھوٹی سی بچی ان کی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑی تھی۔

"یہ لے لو۔۔۔ چاچا نے دیا تھا۔"

داہنی طرف سے ایک مردانہ آواز ابھری۔

"جاؤ چلی جاؤ۔۔۔ وہ تمہیں بھی مار دے گی۔" وہ درمیانی عمر کا اور چھوٹے قد کا مسکین سا آدمی تھا۔

"جاؤ چلی جاؤ۔۔۔ جاؤ۔۔۔ جاؤ۔" وہ چیختا ہوا ان کی طرف لپکا۔

"یہ لے لو۔۔۔ چاچا نے دیا تھا۔" وہ دونوں چیخنے لگے۔ ثمینہ ہراساں ہوتی پیچھے ہٹنے لگیں۔ بارش چوڑے پتوں پر تڑ تڑ برس رہی تھی۔ معاً "جنت بی بی" ہوا کے جھونکے کی طرح ان پر جھپٹی۔ نفرت اور غصے نے اس کے نقوش مسخ کر دیے تھے۔ اس نے لوہے کی موٹی سلاخ سے ایک زوردار ضرب ثمینہ کی گردن پر لگائی۔ ثمینہ کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی۔

اور ان کی آنکھ کھل گئی۔

ان کے جسم پر لرزہ طاری تھا اور خوف و وحشت سے دل اور آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو رہے تھے۔ چند منٹ انہیں خوف کی اس کیفیت پر قابو پانے میں لگے پھر مضمحل انداز میں انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔

شاید ابھی بھی بارش ہو رہی تھی۔ بادلوں سے ڈھکا آسمان کھڑکی پر جھکا ہوا تھا۔ لاؤنج میں زیرو پاور کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ماوی لحاف گردن تک اوڑھے بے سدھ سو رہی تھی۔ ان کا لحاف ٹانگوں سے پھسلتا کارپٹ پر جا گرا تھا۔

ثمینہ تھکے تھکے انداز میں سر کرسی پر لگا کر ستانے لگیں۔

ایسے خواب انہیں اکثر آتے تھے لیکن ہر بار وہ حویلی کے کسی مختلف حصے میں ہوتیں۔ البتہ ہر بار کوئی انہیں کچھ دینے کی کوشش کرتا، کوئی حویلی سے جانے کو کہتا، پھر جنت بی بی ان پر جھپٹتی اور ان کی آنکھ کھل جاتی۔ حویلی چھوڑ دینے کے بعد پہلے پہل انہیں ایسے ڈراؤنے خواب تواتر سے آتے رہے پھر جوں جوں وہ حویلی سے دور اس دوسری زندگی میں گھلنے ملنے لگیں خوابوں کے تواتر میں کمی آ گئی۔ کبھی ایسا ہوتا، رجب کی یاد کے ساتھ یہ خواب مشروط ہو جاتے اور اب تو بہت عرصہ بعد ان ڈراؤنے خوابوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا جس کی ایک واحد وجہ یہی تھی کہ بڑی مدت بعد اس زندگی کی یاد نے ان کے ذہن کو جکڑ لیا تھا۔

دیر اسی طرح بیٹھی رہیں پھر ماوی پر ایک نظر ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی اور اس کے بیدار ہونے تک ثمینہ کو انتظار کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

دروازہ آہستگی سے کھول کر انبیاء اندر داخل ہوئی۔ ثروت بیڈ پر بیٹھی قدرے بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ انبیاء بے ساختہ ان سے لپٹ گئی۔

"ممی!۔۔۔" اور رونے لگی۔

"کیسی ہے میری گڑیا!" ثروت نے خوشی سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ بیٹی کی شکل دیکھتے ہی ان کی پژمردگی چھٹ گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے نرس ان کی ڈرپ اتار کر تھوڑا ٹہلنے کی تاکید کر گئی تھی۔ اس پرائیویٹ روم میں دو بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جن سے صبح کی چمکیلی کرنیں کمرے کے فرش تک آ رہی تھیں۔

"آپ کیسی ہیں ممی!۔۔۔ کیا ہوا ہے آپ کو؟" دیر تک رونے کے بعد اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔ سفر کی تھکان اور آنسوؤں نے اسے مضمحل کر دیا تھا۔ ثروت نے پیار سے اس کی پیشانی سے بال ہٹائے۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ بالکل ٹھیک ہوں اور اب تو میری بیٹی آ گئی ہے۔ اب تو میں بالکل ہی ٹھیک ہو گئی ہوں۔" صاف لگ رہا تھا وہ اسے ٹال رہی ہیں۔

"اگر آپ ٹھیک ہیں تو ہسپتال میں کیوں ہیں؟" اس نے ناراضی سے پوچھا۔

"بلڈ پریشر اچانک بہت لو ہو گیا تھا۔ ذرا سا سر چکرایا تو بھائی جان ہسپتال لے آئے اور ہسپتال میں تو ڈاکٹرز کو موقع چاہیے ہوتا ہے کہ معمولی معمولی بیماریوں پر لوگوں کو دھڑا دھڑ ایڈمٹ کریں۔ مجھے بھی فاف فٹ بیڈ پر لٹا کر دو، چار ڈرپس لگا دیں۔" وہ بظاہر سکون ہو کر بول رہی تھیں۔

انبیاء نے بغور انہیں دیکھا۔ اسے ان کی بات کا اعتبار ہرگز نہیں تھا لیکن یہ وقت جرح کے لیے بھی ہرگز مناسب نہ تھا۔ وہ دوبارہ ان سے لپٹ گئی۔

"میں بہت ڈر گئی تھی۔" اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

"میری گڑیا۔" ثروت نے خوب زور سے اسے گلے لگا لیا تھا۔

"اس گڑیا کے ساتھ دو گڈے بھی آئے ہیں۔ تھوڑا سا دھیان ان کی طرف بھی دے لیں ممی!" یہ ولید کی آواز تھی۔ وہ بند آنکھوں سے بھی پہچان گئی تھیں۔ ثروت نے آنکھیں کھولیں اور ان دونوں کی پیشانیوں پر بھی پیار کیا۔

"میں تم لوگوں کو اچانک دیکھ کر اتنی خوش ہوں کہ بیان بھی نہیں کر سکتی۔" ثروت واقعی بہت خوش لگ رہی تھیں۔

"ہم کل رات میں ہی یہاں پہنچ گئے تھے اور اسی وقت آپ کے پاس آنا بھی چاہ رہے تھے لیکن ماموں نے منع کر دیا کہ اس وقت وزیٹرز الاؤ (Allow) نہیں ہیں۔۔۔ ورنہ ہم تو رات کو ہی آ جاتے۔"

"اور مجھے پتا ہوتا ثروت تم لوگوں کو دیکھ کر اتنی فریش ہو جائے گی تو رات کو ہی یہاں لے آتا۔" ثروت کے بڑے بھائی سعود اندر داخل ہوتے خوشگوار سے بولے۔ ثروت نے دیکھا ان کے ہمراہ دانیال حسن بھی تھے گو کہ وہ فکرمند تھے اور فکرمندی ان کے چہرے سے جھلک بھی رہی تھی لیکن ثروت سے نظریں ملتے ہی انہوں نے نگاہ چرا لی۔

"ہم ڈاکٹر سے بات کرنے رک گئے تھے لیکن ڈاکٹر جبار کے آنے میں ابھی ٹائم ہے۔ کیا خیال ہے بچو! تب تک ناشتہ یہیں نہ منگوا لیا جائے؟"

سعود بھائی نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ان کے ایک بہترین دوست اس ہسپتال کے ایگزیکٹو [illegible] تھے۔ اسی لیے انہیں یہاں وہ سہولیات میسر تھیں جو دیگر مریضوں کو حاصل نہ ہو سکتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ماوی کی آنکھ دن چڑھے کھلی تھی۔

بڑی سی کھڑکی سے ابر آلود لیکن روشن دن جھانک رہا تھا۔ لاشعوری طور پر ماوی کی دوسری نگاہ آرام کرسی کی طرف اٹھی پھر سرعت سے اس نے کچن کی طرف دیکھا۔ ثمینہ وہاں بھی نہیں تھیں۔

ماوی کسی خدشے کے تحت سرعت سے اٹھ کر بیڈ روم میں گئی۔ وہاں بھی ثمینہ کی غیر موجودگی نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اسی تیزی سے وہ برآمدے میں کھلنے والی جالی کا دروازہ دھکیل کر باہر نکلی۔ جھولے پر بیٹھی ثمینہ کو دیکھ کر بے ساختہ اس کے لبوں سے پرسکون سانس خارج ہوئی تھی۔
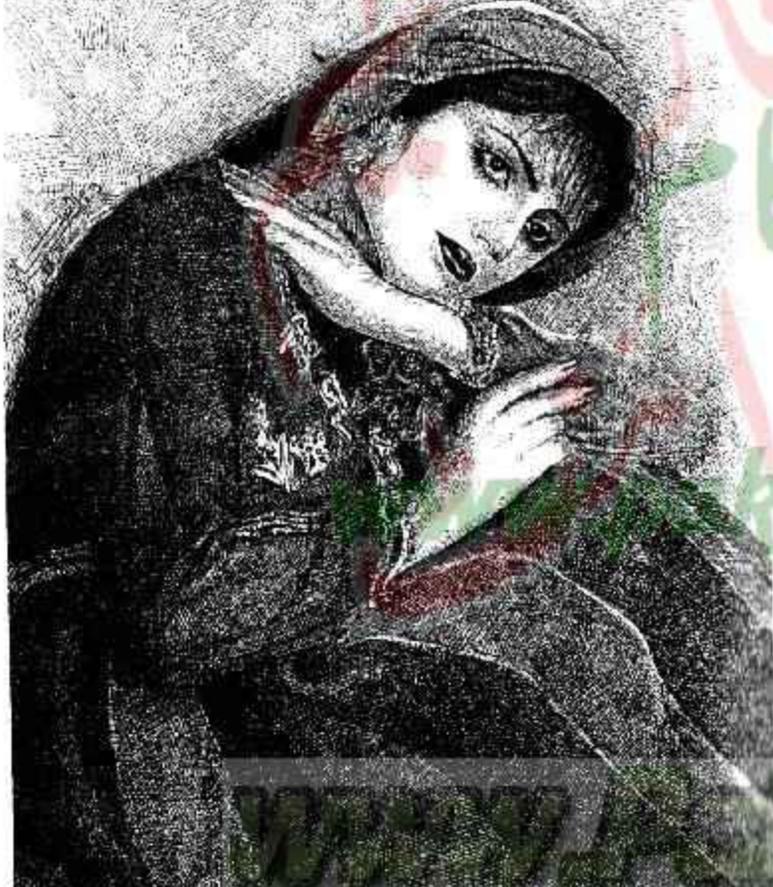
"گڈ مارننگ ماوی!" ثمینہ نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ وہ اسے اکثر ماوی کے بجائے "ماوی" کہہ کر پکارتی تھیں۔ رات کے مقابلے میں وہ بے حد پرسکون دکھائی دے رہی تھیں۔ انہیں اس طرح دیکھ کر ماوی کو بھی سکون محسوس ہوا تھا۔

"گڈ مارننگ ممی!" اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے جگا دیا ہوتا۔ میں بہت دیر تک سوئی۔" دیر تک سونے سے اس کی آواز بوجھل ہو رہی تھی۔

"پھر تم میرا دماغ کھاتیں کہ جلدی جگا دیا۔ اب میرے سر میں درد ہے۔" ثمینہ نے خوش دلی سے اس کا محبوب جملہ دہرایا تھا۔ ماوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سارے بال سمیٹ کر کلائی میں پہنا ربینڈ ان پر چڑھاتی واپس پلٹنے لگی۔

"ناشتہ بناؤں؟"

"شیور۔" دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ بیس پچیس منٹ بعد وہ کپڑے بدل کر جب کچن میں آئی ثمینہ ناشتے کے لوازمات ڈائننگ ٹیبل پر رکھے نظر کا چشمہ لگائے اخبار پڑھنے میں مصروف تھیں۔

ماوی نے کرسی گھسیٹتے ہوئے چپکے سے لیکن بغور ان کا جائزہ لیا۔ پچھلی رات کا کوئی شائبہ ان کے چہرے پر دکھائی نہ دیتا تھا۔

فریش اورنج جوس، دودھ، کارن فلیکس اور ثمینہ کے سامنے چائے کے مگ کے ساتھ براؤن بریڈ کا سلائس رکھا تھا۔

ماوی نے جوس کا گلاس اٹھا لیا۔

"فیضان کا فون آیا تھا۔" ثمینہ نے بتایا۔ "تمہارا پوچھ رہا تھا۔"

ماوی گلاس خالی کر کے کارن فلیکس کا ڈبہ کھولنے لگی۔ اس نے جیسے ثمینہ کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

"رات کے طوفان نے بہت تباہی مچائی۔ پتا نہیں انیمہ نے اپنے لان کا حال دیکھا ہے یا نہیں؟"

ماوی نے کارن فلیکس باؤل میں ڈالے پھر ان پر دودھ ڈالنے لگی۔ وہ گاہے بہ گاہے ثمینہ پر نظریں ڈالتے ہوئے رات والا موضوع چھیڑنے کے لیے پر تول رہی تھی۔

دونوں کچھ دیر خاموش رہیں پھر بالآخر ماوی نے بات شروع کرنے کی ٹھانی۔

"ممی! آپ نے مجھے بابا کی ڈیتھ کے متعلق نہیں بتایا۔ آئی مین آپ نے تو کہا تھا کہ انہیں کسی نے قتل کر دیا تھا؟" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی جیسے الجھن میں ہو۔

"نہیں میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔" ثمینہ نے اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے کہا۔ "میں نے کہا تھا تمہارے بابا کو کسی نے نہیں بلکہ جنت بی بی نے قتل کیا تھا اور اب میں چاہتی ہوں تم حویلی جاؤ اور اپنے بابا کے قاتل کے خلاف ثبوت لے کر آؤ۔"

ثمینہ نے اطمینان سے کہا۔ ماوی کا منہ دودھ میں بھیگے کارن فلیکس سے بھرا ہوا تھا۔ ماں کی بات کا مفہوم سمجھتے ہی یکدم اس کے حلق میں پھندا لگ گیا تھا اور وہ بری طرح کھانسنے لگی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ انشاءاللہ)

لبنیٰ طاہر

آنگن کے بیچوں بیچ شازیلی کی ماں بال کھولے سر نہوڑائے بال کر رو رہی تھی۔ برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھی ہوئی دادی کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک اور چہرے پر شاطر سی مسکراہٹ تھی گو کہ یہ منظر اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ اپنی کوششوں سے وہ یہ منظر اکثر دیکھ لیا کرتی تھی پھر بھی جب کبھی یہ منظر پا ہوتا دادی

کی خوشی دیدنی ہوتی۔ بغل میں بستہ دبائے شانزل کمرے سے باہر نکلا۔ ایک نظر روتی ہوئی ماں پر اور دوسری دادی کے مکار چہرے پر ڈال کر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ اس کے لیے بھی اس منظر میں نیا کچھ نہیں تھا۔ ماں کے قریب پہنچ کر وہ کچھ لمحوں کے لیے ٹھہرا، پھر کواڑ کھول کر گھر سے باہر نکل گیا۔ اسے اسکول سے دیر ہو رہی تھی۔

چند سال پہلے جب وہ چھوٹا تھا، یہی کوئی چار پانچ برس کا تب روتی ہوئی ماں کے ساتھ وہ بھی چیخ چیخ کر روتا۔ جس وقت ابا اماں کی پٹائی لگا رہے ہوتے وہ سہما ہوا کسی کونے میں دبکا ہوتا۔ باپ کے جانے کے بعد وہ ماں کے آنسوؤں میں برابر کا شریک بن جاتا، روتا جاتا اور ماں کی گود میں گھسنے کی کوشش میں ہلکان ہوتا۔ وہ جتنا ماں کے اندر گھستا۔ ماں اسے اتنا ہی دھتکارتی، دھکے دے دے کر اسے پیچھے دھکیلتی پھر بھی وہ باز نہ آتا تو اسے دھنک کر رکھ دیتی۔ مار کھا کر وہ بہت جنونی سی ہو جاتی تھی۔ شوہر پر تو بس چلتا نہیں تھا سو اپنا غصہ وہ شانزل پر اتارتی ورنہ عام حالات میں وہ اسے بہت پیار کرتی تھی، آخر وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔

ماں کے ہاتھوں پٹ کر شانزل اور بھی زور زور سے روتا۔ ایسے میں دادی آگے بڑھ کر اسے بہلانے کی کوشش کرتی ساتھ ساتھ ماں کو بھی کوستی جاتی۔

”اری بدبخت اس معصوم پر کیوں غصہ اتار رہی ہے؟ خبردار جو تو نے آئندہ میرے پوتے کو ہاتھ بھی لگایا ——— تو ہڈیاں تڑوا دوں گی تیری، سمجھی تو؟“

وہ شانزل کو گود میں اٹھانے کی کوشش کرتی تو وہ اور بپھر جاتا اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے دادی کو پیٹ ڈالتا۔ پل بھر میں دادی کی محبت اڑن چھو ہو جاتی، وہ اسے زمین پر پٹخ دیتی اس کے کوسنوں میں شدت آجاتی۔

”ڈائن نے اپنے جیسی اولاد پیدا کی ہے۔ چھٹانک بھر کا چھوکرا اور حرکتیں دیکھو۔“ اپنے بیٹے کا بیوی کے ساتھ التفات دادی کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ اسی لیے وہ لگائی بجھائی کر کے مظلومیت کا ڈھونگ رچا کر عبدالکبیر کو کچھ ایسے بس میں کرتی کہ اسے خود پر قابو نہ رہتا۔ پھر دونوں میاں بیوی میں گھمسان کی جنگ ہوتی اور عبدالکبیر اپنے مرد ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کلثوم کو چار چوٹ کی مار لگاتا، تب بڑھیا کے کلیجے میں گویا ٹھنڈ پڑ جاتی۔ شانزل ہوش سنبھالنے سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اب اس کے لیے گویا یہ روز کی بات تھی مگر کہ اب بھی ماں کو پٹتے دیکھ کر اس کا دل سہم جاتا تھا۔ روتی ہوئی ماں کو چپ کرانے کے لیے اب بھی اس کے قدم اٹھتے مگر وہ رک جاتا۔ اندر ہی اندر کڑھتا مگر آگے نہ بڑھتا کیونکہ ماں اپنا سارا غصہ اس پر اتار لینے میں ذرا دریغ نہ کرتی البتہ دادی کے لیے اس کے دل میں نفرت سوا ہو جاتی۔ سارا کیا دھرا اسی مکار بڑھیا کا ہی تو تھا، وہی فساد کی جڑ تھی ورنہ عام طور پر اس کے ماں باپ آپس میں شیر و شکر رہتے تھے اور یہی بات دادی کو ہضم نہ ہوتی تھی۔

کبھی کبھی شانزل شدت سے خواہش کرتا کہ دادی مر جائے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اس کا ننھا سا دل دادی کی موت کی دعا میں مانگا کرتا تھا دادی کو تو کچھ نہ ہوا مگر ایک روز وہ اسکول سے واپس آیا تو دور سے ہی اپنے گھر کے سامنے لگی بھیڑ دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ ایک لمحے کو اس کے دل میں خیال آیا کہ شاید دادی گزر گئی۔ اس خیال نے اس کے خوف کو کسی حد تک کم کر دیا تھا۔ لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا جب وہ گھر میں داخل ہوا تو منظر اس کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ صحن کے بیچوں بیچ چارپائی پر ابا کی خون میں نہائی لاش پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کی پتلیاں پھیل گئیں ابا کی لاش سے بمشکل نظر ہٹا کر اس نے بین ڈالتی ہوئی عورتوں کو دیکھا۔ اس کی ماں دادی کی بوڑھی چھاتی سے چمٹی دھاڑیں مار رہی تھی۔ جھریوں سے بھرے دادی کے چہرے پر کرب و اذیت کی جیسے ایک داستان رقم تھی اس کے کمزور وجود میں اتنی طاقت پتا نہیں کہاں سے آگئی تھی جو اس نے بری طرح مچلتی تڑپتی ماں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ رکھا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اسے صبر کی تلقین بھی کیے جا رہی تھی۔ اسی دوران اس کی نظر شانزل پر پڑی۔

”ہائے ——— آگیا میرا بچہ ——— آ ——— آجا میرے لعل ——— ادھر آ ——— آکر سنبھال اپنی ماں کو ——— دیکھ تو ——— میرے تو یہ قابو میں ہی نہیں آرہی۔“

پھر وہ ماں سے مخاطب ہوئی۔

”دیکھ کلثوم ——— ! شانزل آگیا۔ یہی اب تیرا اور میرا سہارا ہے۔ اسے دیکھ اور ہمت پکڑ ——— تو ادھر آ شانزل! وہاں کیوں کھڑا ہے؟“

دادی نے اپنا بازو اس کے لیے وا کیا اور شانزل جیسے کسی ٹرانس میں دوڑتا ہوا دادی کے کھلے بازوؤں میں سما گیا۔

☼ ☼ ☼

ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں ہونے والی ابا کی موت نے اس گھر کی جیسے فضا ہی بدل ڈالی تھی۔ اب نہ دادی کے چہرے پر وہ مکاری تھی نہ آنکھوں میں وہ شاطرانہ چمک جس سے شانزل نفرت کرتا تھا بلکہ اب تو وہ جیسے ماں کا سایہ بن گئی تھی۔ شاید اس کی ساری نفرت اور بیر بیٹے کے مردہ وجود کے ساتھ ہی مٹی میں دفن ہو گئی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی عورت ہے جسے ماں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ اب تو وہ اتنی مہربان اور نرم خو ہو گئی تھی کہ شانزل بھی کبھی اس تبدیلی پر بے تحاشا حیران ہو جاتا۔ تب وہ حسرت سے سوچتا۔ کاش ابا کی زندگی میں بھی دادی ایسی ہی ہوتی۔ کاش ابا بھی ساس بہو کا یہ التفات اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور گھر میں سکھ چین کا دور دورہ ہوتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے باپ کی بھی یہ دلی آرزو تھی۔ لڑائی جھگڑے کے بعد جب حالات معمول پر آتے تھے تو وہ ماں کو سمجھایا کرتا تھا کہ وہ اماں کی باتوں کو دل سے نہ لگایا کرے اور کبھی دادی کے ہاتھ پاؤں جوڑتا کہ بہو سے اتنی ضد بحث نہ کیا کرے مگر جب تک وہ زندہ رہا، اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ اب جبکہ خاک نشین ہو گیا تھا تو ر اوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ابا کے انتقال کے پانچ سال بعد دادی بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئی۔ کلثوم کے لیے یہ دوسرا بڑا سانحہ تھا۔ وہ ایسے ٹوٹ کے روئی کہ جیسے اس کی سگی ماں مر گئی ہو۔ بہت سارے دنوں تک وہ سوگ کی کیفیت میں رہی۔ نہ اپنا ہوش تھا نہ گھر اور شانزل کا۔ پھر آہستہ آہستہ زندگی معمول پر آنے لگی۔ مرنے والوں کے ساتھ مرتا تو کوئی نہیں ہے مگر کلثوم کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ شانزل کے لیے انتہائی حساس۔ محبت تو وہ اس سے پہلے بھی کرتی تھی مگر اب یہ محبت جیسے دیوانگی اختیار کر گئی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی شانزل کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی حتیٰ کہ اسے اپنی تعلیم بھی ادھوری چھوڑنا پڑی۔

کالج کا پہلا ہی سال تھا۔ اس نے بہت شوق سے کالج میں داخلہ لیا تھا، مگر ماں کی ذہنی ابتری کو دیکھتے ہوئے اس نے کالج جانا چھوڑ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پرائیویٹ ہی امتحان دے لے گا۔ اس لیے وہ گھر پر ہی امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ کالج جانا تو چھوٹا ہی تھا، کلثوم اسے گھر سے باہر بھی نہ نکلنے دیتی۔ پتا نہیں اسے کون سا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ وہ ہر وقت شانزل کو اپنی نظروں کے حصار میں رکھتی۔ وہ گھر میں پڑے پڑے گھبرا جاتا۔ ماں کی منتیں کر کے تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلتا تو کلثوم بولائی بولائی پھرتی۔ بار بار دروازے سے باہر جھانکتی۔ کبھی گلی میں نکل آتی اور جو کہیں اسے تھوڑی دیر ہو جاتی تو رو رو کر اپنی حالت خراب کر لیتی۔ شانزل اس صورت حال سے پریشان ہو اٹھا۔ ماں کی حالت کے پیش نظر وہ اسے علاج کے لیے بھی لے گیا۔ ڈاکٹر کے مطابق دوا سے زیادہ توجہ اور محبت کی ضرورت تھی اور ساتھ میں تبدیلی کی بھی۔ شوہر کے بعد ساس کی موت نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ ڈرنے لگی تھی کہ کہیں شانزل بھی اسے نہ چھوڑ جائے، بس اسی لیے وہ ایسی ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر نے جب شانزل کے سامنے ہی ماں کو مشورہ دیا کہ وہ بیٹے کی شادی کر دے تو دونوں کا ردعمل مختلف

تھا۔ ماں تو یہ سن کر خوشی سے جھوم اٹھی تھی جبکہ شازلی ایک دم سے پریشان ہو گیا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔۔۔ میں بھلا ابھی کیسے شادی کر سکتا ہوں؟"

"کیوں برخوردار۔۔۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ مانا کہ تم ابھی کم عمر ہو مگر یہ کوئی انھونی بات تو نہیں ہے۔ کم عمری میں بھی شادیاں ہوتی ہی ہیں۔ اکیس بائیس سال تو عمر ہو گی ہی تمہاری۔۔۔ شادی ہو گی۔۔۔ گھر میں دلہن آئے گی تو تمہاری ماں کا دل لگ جائے گا۔۔۔ شادی خوشی کا دوسرا نام ہے اور تمہاری ماں کو اس وقت واقعی خوشیوں کی ضرورت ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری ماں ایک نارمل لائف گزارے تو میرے مشورے پر عمل کرو۔ یقین مانو تم خود اپنے آپ میں بھی ایک بہتر تبدیلی محسوس کرو گے۔۔۔ آگے تمہاری مرضی۔"

وہ تو ماں کو علاج کے لیے لے کر گیا تھا' الٹا ماں ایک اور بیماری ساتھ لیے چلی آئی تھی۔ یہ تو وہی بات ہو گئی تھی کہ "گئے تھے آگ لینے پیغمبری بھی ساتھ لے آئے" اب ماں کی دن رات ایک ہی رٹ تھی کہ شازلی شادی کر لے۔ وہ کس برتے پر شادی کرتا' ابھی تو تعلیم ہی پوری نہ ہوئی تھی تو نوکری بھلا کیا ہوتی' گو کہ روپے پیسے کی کوئی تنگی نہ تھی' دو دکانیں تھیں جن کا کرایہ آ جاتا تھا' اس کے علاوہ ایک مکان اور بھی تھا جس کے دو پورشن تھے اور دونوں ہی کرائے پر دیے ہوئے تھے' پھر بھی شازلی کا خیال تھا کہ نہ اس کی عمر ایسی تھی اور نہ تعلیم کہ وہ شادی کر لیتا' مگر یہ بات ماں کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اس پر تو جیسے دھن سوار ہو گئی تھی۔ لڑکیاں دیکھنا بھی شروع کر دی تھیں۔

اس کی دن رات کی یہ محنت رنگ لائی اور اسے شازلی کے لیے ایک لڑکی پسند آ گئی۔ اس روز ماں بہت خوش تھی اس کے چہرے پر ایسی الوہی چمک تھی کہ شازلی دیکھتا رہ گیا' تب اس نے سوچا کہ ماں کی خوشی اگر اسی میں ہے تو یہی سہی' پھر مہ پانو کی تصویر دیکھ کر تو اس کی رہی سہی مزاحمت بھی دم توڑ گئی۔

سترہ اٹھارہ سال کی مہ پانو کی تصویر میں کوئی ایسی بات تھی کہ جس نے شازلی کے دل کو میٹھی سی کسک بخش دی تھی۔

شادی ہوئی مہ پانو دلہن بن کر جب اس آنگن میں اتری تو برسوں سے ویران پڑے اس گھر کے در و دیوار سے جیسے خوشیاں پھوٹ پڑیں۔ اداسی اور سوگواری جیسے دم دبا کر کہیں بھاگ گئی تھیں۔

شازلی دل ہی دل میں ڈاکٹر کے علم کا قائل ہو گیا تھا۔ کتنی سچی بات کہی تھی اس ڈاکٹر نے کہ اس شادی سے تم اپنے آپ میں ایک بہتر تبدیلی محسوس کرو گے۔ اس نے واقعی خود کو تبدیل ہوتا محسوس کیا تھا۔ کہاں تو وہ شادی کے نام سے ہی بدک رہا تھا اب یہ حال تھا کہ مہ پانو کے صبیح چہرے سے اس کی نظریں ہی نہیں ہٹتی تھیں۔ دوسری طرف ماں کے اندر بھی ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی تھی۔

مہ پانو نے آتے ہی گھر کا انتظام خوش اسلوبی سے سنبھال لیا تھا۔ شازلی کو ماں کی طرف سے اطمینان حاصل ہوا تو اس نے دوبارہ سے اپنی پڑھائی کی طرف توجہ کی۔ زندگی ایک مخصوص ڈگر پر رواں دواں تھی۔ اس کی شادی کو چار ماہ ہو گئے تھے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔

ایک روز شازلی بازار سے سبزی گوشت لے کر گھر لوٹا تو اس نے دیکھا کہ مہ پانو کی آنکھیں روئی روئی سی ہیں' وہ سہمی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا مہو۔۔۔؟" اس کا اتنا ہی پوچھنا تھا کہ مہو سسک کر رو پڑی۔

"ارے۔۔۔ کچھ بتاؤ تو آخر ہوا کیا ہے؟" کچھ کہنے کے بجائے مہو اس کے سینے سے آ لگی اور بس روتی رہی۔ شازلی تو یکدم ہی پریشان ہو اٹھا تھا۔ مہو کو اس طرح سے روتے دیکھنا' وہ بھلا کب گوارا کر سکتا تھا۔ وہ ابھی اسے دلاسہ ہی دے رہا تھا کہ ماں کی کڑک دار آواز پر کرنٹ کھا کر رہ گیا۔ وہ اس کے سر پر کھڑی تھی۔ مہو گھبرا کر شازلی سے الگ ہو گئی۔

"شروع ہو گئیں تیری ڈرامے بازیاں؟ آ گئی تو اپنی

اصلیت پر۔۔۔ میرے بیٹے کے کان بھر رہی تھی میرے خلاف؟" ماں کے لہجے میں اتنی تپش تھی کہ شازلی حیران رہ گیا جبکہ مہو خوف سے سمٹ گئی تھی۔

"ن۔۔۔ نہیں تو اماں۔۔۔ م۔۔۔ میں نے تو۔۔۔"

"چپ کر تو۔" اس نے صفائی دیتی ہوئی مہو کو بری طرح جھڑک دیا۔ پھر شازلی سے مخاطب ہوئی۔

"اس کی چاپلوسی سے فرصت مل جائے تو دو گھڑی کے لیے ماں کی بھی سن لینا۔"

وہ اتنا کہہ کر ٹھک ٹھک کرتی ہوئی چلی گئی۔ شازلی گم سم سا ہو کر رہ گیا۔

"آ۔۔۔ آپ اماں کے پاس جائیے۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔" مہو نظریں جھکا کر بولی۔

اس نے اماں کے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ اماں دوپٹہ منہ پر رکھے رو رہی ہے۔ شازلی تڑپ کر ماں کے قریب پہنچا۔

"کیا ہوا ہے اماں؟ کچھ بتاؤ بھی تو نہ وہ کچھ بول رہی ہے نہ تم۔۔۔ صبح تک تو سب ٹھیک تھا پھر اچانک کیا ہو گیا۔۔۔؟"

"دیکھ شازلی۔۔۔ اگر تجھے ماں سے ذرا سی بھی محبت ہے تو اس مہو کو اچھی طرح سمجھا دے۔ تجھے پتا ہے اس نے کیا کیا ہے؟ تیرے جانے کے بعد میں نے اس سے کہا کہ مجھے ایک کپ چائے اور بنا دے۔ پہلے تو اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ میرے بار بار کہنے پر بولی۔

"کتنی چائے پیو گی اماں! صبح سے اب تک تین کپ چائے تو پی چکی ہو۔۔۔ کیا میں بار بار چائے کے برتن ہی دھوتی رہوں گی؟"

اس سے پوچھ' اسے کیا تکلیف ہے' میں دن میں دس بار چائے پیوں' یہ کون ہوتی ہے اعتراض کرنے والی۔ اب کیا اس گھر میں میرے کھانے پینے کی بھی گنتی ہو گی؟ ارے میرے شوہر کی کمائی ہے۔ میں دس بار چائے پیوں یا بیس بار۔۔۔ میں نے تجھے بتایا نہیں یہ پہلے بھی میرے ساتھ اس طرح کا سلوک کر چکی ہے لیکن اب اسے سمجھا دے۔۔۔ ارے میں تو بھولا گئی

تھی کہ میرے گھر میں رونق ہو گی' بہو میری خدمت کرے گی دعائیں لے گی۔ اسے تو مجھے چائے ناشتہ دینا بھی کھلتا ہے۔ ہائے کلثوم۔۔۔ اب یہی تیرا نصیب ہے کہ تو اپنے ہی گھر میں دانے دانے کو ترسے۔"

اماں اپنی سناتے سناتے پھر سے پھپھک کر رو پڑی۔ یہ سب سن کر اور ماں کو ایسے روتے دیکھ کر شازلی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"مہو!" وہ اتنی زور سے چیخا کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔ چند لمحوں بعد کانپتی ہوئی مہو اندر آئی۔ اسے دیکھ کر شازلی کو خود پہ قابو نہ رہا وہ اٹھا اور اس نے مہو کو بالوں سے پکڑ لیا۔

"تم۔۔۔ تمہاری یہ جرات تم میری ماں کے کھانے پینے پہ نظر رکھتی ہو۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے مہو کے نازک گالوں پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ تھپڑ کھا کر مہو الٹ کر پیچھے گری تھی۔ اسے اپنی صفائی کا موقع دیے بغیر شازلی نے دھنک کر رکھ دیا تھا۔ مہو اس کے پاؤں پڑ کر گڑگڑا رہی تھی۔

"مت مارو۔۔۔ مجھے مت مارو۔۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔۔۔ تمہیں اللہ کا واسطہ' میری بات سنو۔"

لاتوں اور گھونسوں سے اس کی اچھی طرح تواضع کرنے کے بعد شازلی بگولے کی طرح کمرے سے نکل گیا۔ بس نکلتے نکلتے یونہی اس کی نظر ماں کی طرف اٹھی تھی اور شازلی کو اپنے سارے جسم میں سرد سی لہر دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔ اسے لگا ماں کی جگہ دانت نکوستی دادی کھڑی ہے۔

آنکھوں میں ویسی ہی شاطرانہ چمک اور چہرے پر مکاری کے واضح تاثرات۔۔۔ وہ گھر سے باہر نکل گیا اور پتا نہیں کتنی دیر تک چلتا رہا' سڑکیں ناپتے وہ کافی دور نکل آیا تھا۔ جب بھی ماں کا چہرہ تصور میں ابھرتا' اسے جھرجھری سی آ جاتی اور جب مہو کا خیال آتا تو دل درد سے کٹنے لگتا۔ وہ جان چکا تھا کہ مہو بے قصور ہے۔

اس کے گھر میں پھر وہی پرانا قصہ دہرایا جا رہا ہے۔ گھر کے در و دیوار اس پرانے منظر سے پھر آشنا ہونے جا

رہے تھے۔ ماں نے دادی کا منصب سنبھال لیا تھا اور مہو وہ ماں کا روپ دھارتے جارہی تھی تو ..... تو کیا وہ اپنے باپ کی جگہ لے رہا تھا۔ وہ بھی تو اسی طرح ماں کی لگائی بجھائی پر بیوی پر تشدد کیا کرتا تھا۔ بعد میں شرمندہ ہوتا تھا جیسے کہ اس وقت وہ خود ہو رہا تھا۔

شازل نے درد سے پھٹتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اپنی بے بسی پر اسے رونا آگیا تھا۔ آج اسے اپنے باپ کی ذہنی کیفیت کا ٹھیک طرح اندازہ ہوا تھا۔ وہ بھی ماں کو مار پیٹ کر اسی طرح گھر سے باہر چلا جاتا تھا پھر کئی کئی گھنٹے واپس نہ پلٹتا تھا اور جس روز اس کی خون میں ڈوبی لاش گھر آئی تھی۔ اس روز بھی تو یہی ہوا تھا۔ وہ اسی ذہنی ابتری کے عالم میں گھر سے نکلا تھا اور واپسی ایمبولینس میں ہوئی تھی ..... تو کیا اس کا انجام بھی یہی ہوتا تھا ..... یہ سوچ کر اسے کپکپی سی چڑھ گئی۔ وہ واپس پلٹا اور تقریباً ”دوڑتا“ ہوا گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے دادی سے نفرت تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ دادی اس کے ماں باپ کے درمیان وجہ تنازع تھی اور اب جبکہ ماں میں اسے دادی کا عکس نظر آیا تو وہ برداشت نہیں کرپا رہا تھا۔

ماں جسے اس نے ہمیشہ شدت سے چاہا تھا۔ وہ اس سے بھلا کیسے نفرت کر سکتا تھا مگر ..... وہ گھر میں داخل ہوا تو ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ اسے وحشت نے گھیر لیا۔ جی چاہا واپس پلٹ کر بھاگ جائے مگر اندر اس کی مہو تھی جسے اس نے بے دردی سے مارا تھا۔ اسے اس کی تلافی کرنا تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اپنے کمرے میں آگیا۔

مہو بیڈ پر لیٹے ہولے ہولے سسک رہی تھی۔

شازل مجرموں کی طرح سر جھکائے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ اس کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی مہو نے آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سے سسک اٹھی۔

شازل کی شرمندگی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھا اور مہو کے قریب بیٹھ گیا پھر وہ روتی ہوئی مہو پر چھا گیا اور کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

☆ ☆ ☆

وہ ماں کے چہرے پر اس مکاری اور خباثت کو کھوج رہا تھا جو اس وقت مفقود تھی۔ اس وقت وہ اس کی ماں تھی خالصتاً ”اس کی ماں“ ..... دادی کا کہیں شائبہ تک نہ تھا۔ شازل نے اس کی گود میں سر رکھ دیا۔ وہ اس کے بالوں میں شفقت سے انگلیاں پھیرنے لگی .....

”ماں ..... تمہیں مہو اچھی نہیں لگتی ناں؟“ اچانک شازل نے پوچھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں الجھن بھری ہوئی تھی۔

”وہ تمہیں بہت بری لگتی ہے ..... بالکل ایسے ہی جیسے تم دادی کو بری لگتی تھیں ..... تم بھی تو اس کے بیٹے کے پیار میں حصہ بٹاتی تھیں جیسے مہو بٹاتی ہے ..... ہے ناں ماں؟“ شازل سرگوشی میں بول رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بے اختیاری میں بول رہا ہو۔

”تم بے قصور ہوتے ہوئے بھی ابا کے ہاتھوں مار کھاتی تھیں اور دادی اس تماشے سے بہت خوش ہوتی تھی۔ جس طرح آج مہو پٹی ہے تم بھی تو اسی طرح ..... پھر ..... پھر جب ابا مر گئے ..... ان کی موت تم دونوں کو کتنا قریب لے آئی تھی ناں ..... لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی دادی ہے جو تمہاری بوٹیاں نوچ ڈالنا چاہتی تھی۔ ابا کی موت کے بعد اس نے کیسے تمہیں اپنے پروں میں سمیٹ لیا تھا۔ ایک بات پوچھوں ماں؟“ اس نے ماں کی آنکھوں کو دیکھا جس میں اب اذیت ہلکورے لینے لگی تھی۔

”کیا تمہیں اور مہو کو قریب لانے کے لیے مجھے بھی ابا کی طرح مرنا ہوگا؟“ اس نے تو بس ایک سوال کیا تھا لیکن ماں کی آنکھوں میں ابھرتی اذیت کہہ رہی تھی کہ اب اس گھر میں رقابت اور حسد کے جذبے پر محبت اور صرف محبت کی حکومت ہوگی۔

☆

سمیرا گل

”بھابھی آجائیں۔“

وہ بمشکل تمام کاموں سے فراغت پاکر ابھی ٹی وی کے سامنے بیٹھی ہی تھی کہ دیورانی صاحبہ نے دروازے کی جھری سے اندر جھانکا اور اطلاع پہنچا کر یہ جا وہ جا۔

وہ اندر ہی اندر اچھی خاصی جزبز ہوئی تھی مگر پھر ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتی ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئی جہاں اس کا پسندیدہ ڈرامہ آرہا تھا۔

لیکن اگلے ہی پل وہ پھر سے سر پر آن کھڑی ہوئی تھی۔

"بھابھی! "دبسن جی" کے کمرے میں آپا ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔"

وہ ابھی سال بھر پہلے ہی بیاہ کر آئی تھی اسی لیے چھوٹی چھوٹی باتوں پر بوکھلا جاتی تھی جبکہ عنبرین نے تو اس زندان میں دس سال گزار دیے تھے اور رہائی پھر بھی نصیب نہیں ہوئی تھی بلکہ قفس سے نکل کر پر کٹنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔

"ایک تو یہ "دبسن جی" مر کر بھی ہمارے حواسوں پر ہر لمحہ سوار رہیں گی۔"

اس نے غصے میں ریموٹ پٹخ دیا تو ثنا اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"دشش! آہستہ بولیں اگر آپا نے سن لیا تو طوفان اٹھا دیں گی۔"

"تو اٹھا دیں طوفان' مجھے کوئی پروا نہیں۔ جس عورت کے مرنے پر مجھے شکرانے کے نفل ادا کرنے چاہئیں اس کے کمرے میں بیٹھ کر کون سی خوشگوار یادوں کو محسوس کروں۔"

وہ اس "شاہی فرمان" پر اندر تک زہر آلود ہو چکی تھی۔

"بھابھی پلیز۔" وہ منت بھرے لہجے میں بولی لیکن عنبرین پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا تھا۔

وہ اب تین بیٹوں کی ماں تھی اور اپنی دانست میں اس کے قدم اس گھر میں اب کافی مضبوط ہو چکے تھے اس لیے غلامی کا طوق اس نے اپنے گلے سے اتار پھینکا تھا اور اب بغاوت اس کے اندر جنم لے رہی تھی۔

"تم جا کر کہہ دو کہ میرے سر میں درد ہے اور میں آرام کر رہی ہوں۔" اسے شش و پنج میں کھڑا دیکھ کر اس نے ثنا کی مشکل آسان کی اور خود دوبارہ ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئی لیکن اب اس کا دھیان بھٹک چکا تھا۔

"یہ ناشتے کی ٹرے اٹھائے کہاں لے جا رہی ہو۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے لمبے گھنے بالوں کو بل دیتی اچانک پلٹی اور پھر ڈرتے ڈرتے دروازے کی درزوں سے جھانکا۔ باہر نوشین بھابھی کی بسن جی کے سامنے پیشی ہو چکی تھی۔

"عنبرین کو۔" اس کی بات بیچ میں سے ہی اچک لی گئی۔

"عنبرین کیا اب سال بھر نو بیاہتا ہی رہے گی۔" بھاری کڑک دار لہجہ۔

"سال بھر؟" اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔ ابھی محض تین روز قبل تو وہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی۔

بسن جی کو اپنے کمرے کا رخ کرتے دیکھ کر اس نے جلدی سے دوپٹہ اوڑھا اور مسہری پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ اگلے ہی پل کمرے کا دروازہ ایک دھاڑ سے کھلا تھا اور اب وہ بگڑے تیوروں سمیت کمر پر ہاتھ ٹکائے کھڑی اسے ہی گھور رہی تھیں۔

"السلام علیکم اماں جی!" اس نے اٹھ کر ادب سے سلام کیا جس پر وہ بدک کر دور ہٹیں۔

"تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ یہاں سب مجھے "دبسن جی" کہتے ہیں۔" ماتھے کی سلوٹوں میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا' وہ اپنی جگہ نادم سی ہو کر معذرت کرنے لگی۔

"آئی ایم سوری۔" جس پر وہ مزید سیخ پا ہو گئی تھیں۔

"یہ انگریزی کا رعب کسی اور پر جمانا۔ تم کیا مجھے جاہل سمجھتی ہو' مذاق اڑاتی ہو میرا۔" بسن جی نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا تھا' اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا جواب دے' مدد طلب نظروں سے اسلم کو ادھر ادھر کھوجا مگر وہ تو پہلے ہی وہاں سے کھسک چکے تھے اور بسن جی نے اس کی خاموشی کو نیم رضامندی تصور کرتے ہوئے واویلا مچانا شروع کر دیا تھا۔ گھر کے سب مہمانوں نے بڑھ کر دلہن کے کمرے کا رخ کیا۔

"اجمل ارے او افسر! او نسرین یہاں آ کر دیکھو یہ چھٹانک بھر کی لڑکی تمہاری ماں کو انگریزی میں گالیاں دے رہی ہے۔"

اور وہ کمرے کے بیچ و بیچ ہکا بکا کھڑی نا قابل فہم نگاہوں سے ایک ایک کے چہرے دیکھ رہی تھی جہاں چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔

پھر اجمل نے بغیر کسی تصدیق یا استفسار کے حکم سنایا۔

"عنبرین! بسن جی سے معافی مانگو۔" اور وہ کہہ بھی سکی تھی کہ معافی ہی تو مانگی تھی جس پر انھوں نے ایک محاذ کھڑا کر دیا تھا۔ اسے دوبارہ سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنے نادیدہ جرم کی معافی مانگنا پڑی تھی۔

"اور سنو ہمارے ہاں دن چڑھے تک سونے کا رواج نہیں ہے۔ کل سے منہ اندھیرے اٹھ جانا۔ مرغیوں کے ڈربے صاف کرنے اور انہیں دانہ ڈالنے کے بعد سارے صحن میں چھڑکاؤ کر کے جھاڑو لگانا ہے ناشتے کی ذمہ داری نوشین کی ہے۔ ہاں دوپہر کا کھانا کل سے تم بنایا کرو گی اور یاد رہے میرے چھوٹے موٹے سب کام بھی تمہاری ذمہ داری ہیں اور مجھے کبھی ایک سے دو مرتبہ آواز نہ لگانی پڑے۔"

حکمیہ لہجے میں ایک ایک کر کے سارے کام گنوا کر وہ اٹھ کر چلی گئیں تو پیچھے اس کے حلق سے نوالہ اترنا مشکل ہو گیا تھا۔

شام کے قریب چائے کی طلب نے بے چین کیا تو وہ اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ نوشین بھابھی وہیں لکڑیوں اور اپلوں کی آگ جلائے روٹیاں پکا رہی تھیں اسے دیکھ کر نظریں چراتے ہوئے بولیں۔

"کچھ چاہیے تھا۔" اور وہ جواب میں جیسے کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی' وہاں موجود کنستروں اور چینی' چاول وغیرہ کے ڈبوں پر موٹے موٹے تالے پڑے واضح دکھائی دے رہے تھے جن کی کنجیاں ہمہ وقت بسن جی کے پلو سے بندھی رہتی تھیں۔

اس نے تھوک نگلتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور خود فریج کی جانب بڑھ گئی لیکن اگلے ہی پل اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا' وہ بھی لاکڈ تھا۔

"عنبرین۔" نوشین بھابھی کی پکار پر اس نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تو وہ نرمی سے بولیں۔

"یہ جوتا باہر اتارو' بسن جی نے دیکھ لیا تو خفا ہو جائیں گی' انہیں کچن میں جوتوں سمیت آنا پسند نہیں ہے۔"

اور اس کی نظریں اپنے پیروں پر جم گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

گرمیوں کی طویل دوپہریں جس میں بے حال تھیں' وہ دوپہر کا کھانا بنا کر کچن سے نکلی تو بسن جی اپنے موٹے پایوں والی چارپائی پر منتظر بیٹھی تھیں۔

اس کا دل شاور لینے کو چاہ رہا تھا مگر ابھی ایک صبر آزما لمحہ اس کی راہ میں حائل تھا۔

انہیں کھانا کھلانا بھی کسی آزمائش سے کم نہیں تھا وہ بندے کو چکری کی مانند اپنے گرد گھما کر رکھتی تھیں۔

ابھی بھی وہ ٹرے سجائے ان کے سامنے کھڑی تھیں اور پھر سارے لوازمات تپائی پر منتقل کر دیے۔ انہوں نے ایک روٹی پر کریلے گوشت کا تھوڑا سا سالن نکالا اور باقی ڈونگا اسے کچن میں رکھنے کو کہا وہ رکھ کر واپس آئی تو اچار لانے کا حکم ملا۔

کچھ دیر بعد ان کا سالن کم ہو گیا تھا پھر اور سالن لانے کے لیے دوبارہ دوڑایا۔

"یہ پانی زیادہ ٹھنڈا ہے۔ اس میں موٹر چلا کر تازہ پانی ملا کر لاؤ۔"

وہ تابع داری سے سر ہلا کر پانی ملا لائی تو وہ ایک گھونٹ بھرتے ہوئے مزید گویا ہوئیں۔

"کم بخت نے اب زیادہ ہی گرم کر دیا ہے اس میں برف ڈالو۔"

عنبرین کا دل چاہا تھا اپنا سر پیٹ لے۔ وہ صرف کھانے پینے کے معاملے میں ہی نہیں بلکہ سارا دن مختلف کاموں کے دوران اسے ایسے ہی زچ کر کے رکھتی تھیں۔

اپنے کپڑے پہلے اُلٹے استری کروانے کے بعد پھر

سیدھے استری کرا کے انہیں پھر تہہ کرا کے الماریوں میں رکھتیں اور پہننے سے پہلے ایک بار پھر استری کرنے کو کہتی تھیں۔ سارے صحن میں پہلے پانی کا چھڑکاؤ کروا کر جھاڑو لگانے کو کہتیں اور پھر پونچھا پھرواتی تھیں۔

"تمہارے زیور کہاں ہیں؟" اس کی سونی کلائیوں پر نگاہ پڑتے ہی بسن جی نے قدرے اچنبھے سے دریافت کیا تھا وہ پانی میں نمک ہلانا بھول کر ٹکر ٹکر انہیں دیکھنے لگی پھر قدرے ہکلا کر جواب دیا۔

"سیف کی الماری میں رکھے ہیں۔" وہ جانتی تھی کہ اب بسن جی کیا ارشاد فرمانے والی ہیں اور وہی ہوا۔

"تو تمہیں ہماری عزت کا ذرہ بھر خیال نہیں ہے جاؤ جا کر سارا زیور پہنو۔"

اور وہ مرے مرے قدم اٹھاتی کمرے میں چلی آئی بھلا اتنی گرمی میں گلوبند، ہار، چوڑیاں، کنگن، جھمکے وہ کیسے پہن کر بیٹھ جاتی۔ اسے آج صحیح معنوں میں رونا آرہا تھا۔

اپنا استری شدہ سوٹ نکال کر شاور لینے کے بعد وہ ابھی بیڈ پر لیٹی ہی تھی کہ بسن جی کی کڑک دار آواز کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔

"جی بسن جی۔" اگلے ہی پل وہ ان کے سامنے تھی۔

"میرے بالوں میں تیل کی پالش کرو۔" ہونہہ اسے تھما کر وہ اپنی زلفیں کھول چکی تھیں۔ عنبرین نیند سے بوجھل پلکوں کو بمشکل جھپکتے ہوئے مالش کرنے بیٹھ گئی کچھ ہی دیر میں آپا بھی تک سک سے تیار بیگ کاندھوں پر ڈالے وہیں چلی آئی تھیں۔

باہر سے آتے اجمل نے ایک میٹھی سی نگاہ اس پر ڈالی تو اس کے لبوں پر شرمیلی تبسم بکھر گیا جسے آپا نے بطور خاص نوٹ کیا تھا۔

"اتنی گرمی میں تیل لگانے سے تو ویسے ہی بڑی الجھن ہوتی ہے بس کرو کی پالش اور اب میرے بالوں میں شیمپو ڈال کر دھو دے۔"

نازک اندام بسن جی کے بال دھونا بھی ایک کٹھن مرحلہ تھا پھر اس کے بعد انہوں نے کہنا تھا اب بال خشک کر دو حالانکہ وہ ابھی خود اچھی خاصی قابل رشک صحت کی مالک تھیں مگر مجال ہے جو کبھی اپنا ہی کوئی کام کر لیا ہو۔

"اجمل! مجھے ذرا بازار لے جاؤ۔" اجمل کو بیٹھتے دیکھ کر آپا نے فوراً "ٹوکا تو وہ متبسم سا کر بولا۔

"اب اتنی دوپہر میں بازار جا کر کیا کرو گی؟"

"مجھے اپنی نندوں کے جوڑے لینے ہیں۔ میں تو جب بھی میکے آئی ہوں ان کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لے کر جاتی ہوں۔"

فخر سے ہاتھ لہراتے ہوئے درپردہ یہ اسے ہی سنایا جا رہا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے شام میں لے جاؤں گا۔" وہ ٹانگیں پسارتے ہوئے سلمندی سے بولا تو آپا کو تو جیسے پتنگے ہی لگ گئے تھے۔

"دیکھا بسن جی! پہلے تو یہ ایسا نہیں تھا۔ بیوی کے آتے ہی کیسے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔"

"کیوں ری! کیا پٹیاں پڑھاتی ہے میرے پتر کو۔" بسن جی نے فوراً "ایکشن لیا تھا۔ اس کی شکایتی نظریں اجمل سے الجھیں تو وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔

"بسن جی! اس نے مجھے کیا کہنا ہے میں کوئی بچہ تھوڑی ہوں۔"

"دیکھا کیسے بیوی کی سائیڈ لے رہا ہے۔" آپا نے پھر مداخلت کی تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"چلو لے جاتا ہوں بازار۔"

اور آپا ایک جتاتی ہوئی نخوت بھری نگاہ اس پر ڈال کر اٹھ گئیں۔ ان کے جاتے ہی محلے کی دو عورتیں چلی آئی تھیں اور پھر جو بہوؤں کے خلاف محاذ کھلا وہ رات دیر تک چلا تھا لوگوں کی مثالیں دے کر انہیں سنانا بھی بسن جی کا من پسند مشغلہ تھا۔

☼ ☼ ☼

چند چھٹیاں اس کے سنگ گزار کر اجمل واپس چلا گیا تھا جب تک وہ یہاں تھا تب بھی بسن جی نے انہیں کہیں گھومنے پھرنے نہیں دیا تھا اب تو اسے بڑے بڑے برآمدوں اور محرابوں والی یہ حویلی بھی بند جیل کی مانند لگنے لگی تھی۔

شام میں امی کا فون آیا تو وہ چور نظروں سے ادھر ادھر جھانکتے ہوئے مدھم آواز میں بولی۔ "امی پلیز! مجھے کچھ دنوں کے لیے آکر لے جائیں۔"

بات کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ کبھی اپنے گھر والوں سے اتنا عرصہ دور نہیں رہی تھی۔ اور اب تو یہ دن گنتے گنتے ڈیڑھ مہینے پر محیط ہو چکے تھے۔

فون کے دوران بھی بسن جی اس کے پاس آکر بیٹھ جاتی تھیں۔ اجمل نے کئی بار فون کیا تھا اور وہ اس سے ہوں، ہاں سے زیادہ بات نہیں کر سکی تھی۔

وہ ہر ماہ گھریلو خرچے کے ساتھ اس کے لیے بھی مخصوص رقم بھیجتا تھا جو بسن جی نے دونوں بہوؤں کو دینے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کی تھی۔ باہر سے آنے والے شیمپو، کریمیں، لوشن اور صابن تک۔ بسن جی کے صندوق میں بند تھے اور ایک صابن کے ساتھ پورا مہینہ نکالنے کا حکم تھا۔

کھانے پینے والی ہر چیز کو تالے میں رکھا ہوا تھا۔ ایک بار دسترخوان سے اٹھ جانے کے بعد کسی کو دوبارہ کچن میں جھانکنے کی اجازت نہیں تھی اور اس کی حالت کچھ ایسی تھی کہ اسے دن میں کئی بار بھوک لگتی تھی۔ گرمی کی وجہ سے دل گھبراتا تو صندل کا ٹھنڈا شربت پینے کو دل چاہتا تھا جس پر وہ دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔

"اچھا تم پریشان نہ ہو میں شام میں علی کو بھیجوں گی اس کے ساتھ آجانا۔"

پیچھے دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے ریسیور رکھتے ہوئے وال کلاک کی سمت نظر دوڑائی۔ ابھی صبح کے گیارہ بجے تھے اور اس کی آنکھیں انتظار میں دروازے پر ٹنگ گئی تھیں۔ اندر ہی اندر وہ اپنی ساری تیاریاں مکمل کرتے ہوئے بے پناہ خوش تھی۔

شام کے قریب علی آیا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اس نے اسے ساتھ لے جانے کی بات کی تو بسن جی نے کہا۔

"کل میں خود اسے اپنے ساتھ ملوانے لے آؤں گی۔" انداز ایسا بے لچک اور حتمی تھا کہ وہ بے چارہ مزید کوئی اصرار ہی نہ کر سکا اور اس کے جانے کے بعد وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی بسن جی کے پاؤں دبانے لگی تھی۔

اگلے دن وہ اسے اپنے ساتھ لے جا کر گھنٹے دو گھنٹے کے لیے ملوا کر واپس لے آئی تھیں۔ اس کی امی نے کہا بھی تھا کہ اب کچھ روز ہمارے ہاں رہنے دیں جواب میں بسن جی کا وہی تنا تلا لہجہ۔

"اتنے سال اس گھر میں گزارے ہیں اور ویسے بھی پہلا بچہ ہے اب تو میں پورے نو مہینے اسے گھر سے باہر قدم نہیں نکالنے دوں گی۔ وہ تو کل بچے سے بائی بھرلی سو ملوانے لے آئی۔ اب تو چھلے کے بعد ہی خیر سے ملاقات ہوگی۔"

اور عنبرین کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ ابھی تو اس کا دوسرا مہینہ تھا اتنی لمبی سزا اسے سچ میں رونا آگیا۔ کچھ روز بعد اس کی چچازاد بسن نائمہ کی شادی تھی۔ وہ خود کارڈ لے کر ان کے گھر آئی تھی لیکن بسن جی نے صاف منہ پر انکار کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دھلے ہوئے کپڑے منڈیر پر پھیلاتے ہوئے اس کی نظر کیبل تار سے ٹکرائی تو اسے یاد آیا کہ اس کے جہیز کا ٹی وی ابھی تک ڈبے میں بند پڑا ہے اس نے مڑ کر سبزی بناتی نوشین بھابھی سے استفسار کیا۔

"بھابھی! یہ کیبل کا تار۔"

"میں نے ایک روز اپنے ٹی وی پر لگایا تھا۔ بسن جی نے اتار کر پھینک دیا۔"

"چلو جی اس سے بھی چھٹی ہوئی۔" اس کا دل

چاہنے لگا تھا کہ یہاں سے کہیں دور بھاگ جائے۔

چند روز پہلے اجمل نے اس کے لیے موبائل فون بھیجا تھا۔ بہن جی نے یہ کہہ کر صندوق میں رکھ دیا کہ "میں تم لوگوں کی نگرانیاں نہیں کر سکتی' جانے کس کس کو فون کرو گی۔اب ہر وقت تو میں تمہارے ساتھ نہیں ہوتی۔"

"بھابھی! یہ آپ نے ہی بہن جی کو اتنا سر چڑھایا ہے۔" سے سارا غصہ عنبرین پر آیا۔ جو بقول اس کے اللہ تعالیٰ کی گائے تھی اگر اس نے کبھی پلٹ کر جواب دیا ہوتا تو آج اسے اتنا ضبط تو نہ کرنا پڑتا۔

"اچھا تو تم سر سے اتار دو۔" وہ اس کی جانب دیکھ کر استہزائیہ ہنسی تو عنبرین نے "ہونہہ" کہتے ہوئے سر جھٹک دیا۔

"صبر کرو میری بہن! شروع کے یہ چند سال تو ہر لڑکی کے لیے مشکل ہوتے ہیں۔"

"شروع کے یہ چند سال ہی تو زندگی کا اثاثہ ہوتے ہیں بھابھی۔ دل چاہتا ہے خواہشوں کے سارے جگنو مٹھی میں قید کرلیں۔ خوشبو میں پھریں' اپنی مرضی کا کھائیں' پہنیں اوڑھیں' آزاد پنچھی کی طرح اڑ کر آسمان کو چھو آئیں۔ بس خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔ مگر بہن جی۔۔۔" اچانک حلق میں جیسے کڑوا بادام آ گیا تھا۔

"جس طرح کا سلوک ہمارے ساتھ کرتی ہیں' کل کو جب ہم حاکم اور یہ محکوم ہوں گی تو ہمارا دل چاہے گا کہ ہم ان کی خدمت کریں پھر لوگ کہتے ہیں کہ بہوئیں ہی بری ہیں لیکن وہ بری نہیں ہوتیں انہیں ان کا ماضی برا بنا دیتا ہے۔"

"عنبرین۔" ساتھ ہی اس کے نام کی پکار پڑ گئی تھی۔

"اب جانے کیا کام نکال کر رکھا ہو گا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے دل میں قیاس لگاتی۔ بہن جی کی خانقاہ میں حاضر ہوئی تو وہ دیسی گھی کا ڑھے اس کی منتظر بیٹھی تھیں۔

پہلے دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باتیں بگھارنے پر جی بھر کر صلواتوں سے نوازا گیا تھا کیونکہ ان دونوں کی آپس میں بول چال پر بھی پابندی تھی۔ مگر عنبرین کا سارا دھیان تو اس دیسی گھی کی کٹوری میں اٹکا تھا جس کی خوشبو کے تصور سے ہی اس کا جی متلانے لگا تھا۔ اس نے مدد طلب نظروں سے بھابھی کو دیکھا۔

"جانتی ہوں میں تم دونوں ایک جگہ مل بیٹھ کر میری برائیاں کرتی ہو مجھے راستے سے ہٹانے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں آلینے دو تمہارے خصم کا فون۔ کہتی ہوں بس کاغذ پر انگوٹھا لگا کر بھیج دے یہ نہیں ہے یہاں رہنے والی۔"

اور بھابھی کی رنگت اتنی سی بات پر ہی پھیکی پڑ گئی تھی۔

عنبرین کو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دیسی گھی ان کے بالوں میں لگانا پڑا اور پھر شام تک الٹیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اگلے روز اس کے پیٹ میں درد کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔

"بہن جی پلیز مجھے دوائی لادیں۔" درد سے کراہتے ہوئے اسے دوبارہ بہن جی کی منت کرنی پڑی تھی۔

"ارے تجھے بتایا تو تھا کہ ڈاکٹرنی صاحبہ بس جمعہ کے روز آتی ہے اور پھر اس نوعیت کا درد تو اس حالت میں ہوتا ہی ہے فکر کی کوئی بات نہیں۔"

وہ آرام سے کہہ کر پھر سے چھالیہ کترنے لگی تھیں۔

اس نے انگلیوں پر حساب کیا۔ جمعہ آنے میں ابھی پانچ روز باقی تھے اور درد تھا کہ بے حال کیے جاتا تھا اس رات بستر پہ لیٹتے ہوئے اسے بہن جی سے بے حد نفرت محسوس ہوتی تھی۔

"بھابھی! چائے۔" ثنا کی بات پر وہ چونکی۔ ڈرامہ کب کا ختم ہو چکا تھا ریموٹ سے ٹی وی آف کرنے کے بعد اس نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔

"تم چائے کیسے بنا لائیں۔"

"بہن جی کے مرنے کے بعد تینوں بھائیوں نے مل کر آپا کو گھر کا سارا انتظام سونپ دیا تھا۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ان کے شوہر نے انہیں طلاق دے کر خود دوسری شادی کرلی تھی۔ اور یوں وہ اپنی دس سالہ ازدواجی زندگی میں ناکامی کے بعد ان کے سروں پر مسلط ہو چکی تھیں۔

اور آپا نے ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ گھر کے سب افراد شام کے وقت بہن جی کے کمرے میں کچھ وقت گزارا کریں گے جہاں پندرہ روز جانے کے بعد آج عنبرین نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"آپ کو نہیں پتا حویلی میں انقلاب آیا ہے یا پھر یوں سمجھیں کہ کوئی معجزہ ہی رونما ہو گیا ہے کہ آپا نے کرسی کے علاوہ باقی بھی ہر چیز سے تالے اتار کر پھینک دیے ہیں اور گھریلو اخراجات کے نام پر جو رقم تینوں بھائی آپا کو بھیجتے تھے اس میں سے انہوں نے مجھے بھی اور آپ کو پانچ پانچ ہزار دیے ہیں کہ آپ دونوں کے بچے ہیں اور مجھے دو ہزار ملے ہیں۔"

ثنا نے خوشی خوشی ساری بات اس کے گوش گزار کی اور پانچ ہزار کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

ایک لمحے کے لیے تو عنبرین بھی اپنی جگہ ششدر رہ گئی تھی یہ تو سچ میں جادو ہی ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ایک تو یہ "بہن جی" مر کر بھی ہمارے حواسوں پر سوار رہیں گی۔"

وہ کمرے میں اکیلے بیٹھ بیٹھ کر تھک گئیں تو انتہائی بیزاری کے عالم میں اٹھ کر بھاوجوں کی خبر لینے آئی تھیں۔ جب ان کی سماعتوں سے یہ الفاظ ٹکرائے تو جیسے ان کے قدموں کو زمین نے جکڑ لیا۔

"شش۔ آہستہ بولیں اگر آپا نے سن لیا تو طوفان اٹھا دیں گی۔"

"تو اٹھا دیں طوفان مجھے کوئی پروا نہیں۔ جس عورت کے مرنے پر مجھے شکرانے کے نفل ادا کرنے چاہئیں اس کے کمرے میں بیٹھ کر کون سی خوش گوار یادوں کو محسوس کروں۔"

ان کا ہاتھ تاب کی جانب اٹھا اور پھر بے جان ہو کر پہلو میں گر گیا۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتی واپس بہن جی کے کمرے میں چلی آئیں۔

اس کمرے میں انہیں آج سے قبل اتنا حبس اور گھٹن محسوس نہیں ہوئی تھی۔

چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے انہوں نے آگے بڑھ کر کھڑکیاں کھول دیں۔ حد نگاہ تک پھیلے سرسبز شاداب کھیت سارے ان کی ملکیت تھے۔ بہن جی نے ساری عمر جاگیریں بنانے میں گزار دی تھی اور جب اس دنیا سے گئیں تو خالی ہاتھ تھیں یہ سب کس لیے تھا ان بہوؤں کے لیے جن پر پندرہ برس حکم چلانے کے باوجود ان کے دل میں اپنے لیے تھوڑی سی جگہ نہ بنا سکیں۔

آج ان کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہوئے ایک ہی خیال دل میں جڑ پکڑ تا تھا کہ بہن جی کے لیے تو میں ہوں۔ میرے لیے کون ہو گا۔ میری تو کوئی بیٹی بھی نہیں ہے۔ تب ہی اچانک تو ثمین' عنبرین اور ثنا کے چہرے ان کی نظروں میں گھوم گئے۔

انہوں نے سوچ لیا تھا کہ انہیں بہن جی کی طرح بہوؤں پر نہیں ان کے دلوں پر حکومت کرنی ہے۔ اس میں کچھ وقت تو لگتا تھا لیکن یہی ان کی نجات کا آخری راستہ تھا۔

فائزہ افتخار

ماں آج جاؤ

ستر کی دہائی لوگوں کو آج بھی متاثر کرتی ہے نجانے کیوں۔

فلموں ڈراموں میں بڑے بڑے گول چشمے کھلے پائنچے کے فلیپر 'بیل باٹم' مردوں کی لمبی لمبی مضحکہ خیز قلمیں پسلیوں تک کس کے باندھی پتلونیں اور ان پہ لگی بھدے بکل والی چوڑی چوڑی بیلٹس عورتوں کے اونچے جوڑے گالوں پہ لہراتی لٹ جیسے جلیل اکاگ کے تازیانے کی شکل دی جاتی' بڑے بڑے پولکا ڈاٹس کھوڑے چوڑے چیک والے پرنٹ' یہ سب آج کل بہت شوق سے دکھایا جاتا ہے۔ چاہے فلموں کے کوئی ڈریم سیکوئنس والے گانے ہوں' چاہے فلیش بیک کے مناظر' چاہے فینسی ڈریس شو ہو یا پھر کسی پارٹی کی تھیم۔

لیکن رنگ محل کے علاقے سنہری مسجد میں وہ گھر آج بھی ایسا ہے' جہاں کے لوگ اور ان کی بودوباش ستر کی دہائی کے حصار سے نکل ہی نہیں پائی۔

زمانہ بدلا' روایتیں بدلیں سوچ بدلی فیشن نئی آئے گئی گئے' رسم و رواج' نظریات سب کی کایا پلٹ ہوئی مگر اس گھر میں سالوں اور دہائیوں سے کسی تبدیلی کے آثار نظر نہیں آئے۔

اب جہاں ہر گھر میں اٹیچ باتھ وقت کی ضرورت ہے' اس گھر میں آج بھی داخلی دروازے پہ لمبی سی تنگ و تاریک اور سیمن کی ماری ادھڑے فرش والی ڈیوڑھی کے ایک سرے پہ بیت الخلا تھا اور گھر کے بیچ اترے والے آنگن میں سیڑھیوں کے نیچے بنا غسل خانہ' جس میں زبیدہ چاچی کے جہیز کا جست کا

مکمل ناول

حمام بھی رکھا تھا جس کے پیندے کو زنگ کھا رہا تھا اور بجتے زنگ کے قطرے غسل خانے کے چپس والے فرش پہ گہرے نارنجی دھبے چھوڑتے رہتے تھے۔

کبھی ڈیوڑھی میں قطار بنی رہتی، کبھی آنگن میں غسل خانے کے باہر سب اپنا اپنا تولیہ کاندھے پہ ڈالے، اپنا اپنا صابن ہاتھ میں لیے باری کا انتظار کر رہے ہوتے اور جو فرد اس وقت غسل خانے میں موجود ہوتا، اس سے با آواز بلند دریافت کر کے تسلی کر رہے ہوتے۔

"معیوندا اس کہ مر گیا ایں؟"

کچھ سال پہلے تاؤ جی نے حاتم طائی کی قبر پہ لات مارتے ہوئے آنگن میں بیٹھک کی دیوار کے ساتھ ایک واش بیسن بھی لگوا دیا تھا تاکہ کم از کم منہ ہاتھ دھونے اور منجن کرنے والوں کو اتنے طویل انتظار کی کوفت نہ اٹھانا پڑے۔ سالوں کے استعمال بلکہ کثرت استعمال کے بعد یہ واش بیسن جو کبھی ہلکا سرمئی ہوا کرتا تھا، آج ایک ناقابل شناخت سی گدلی سی رنگت میں تبدیل ہو چکا تھا اور غلاظت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

آج جہاں ماسیاں بھی سر دھونے کے لیے شیمپو اور نہانے کے لیے خوشبودار فلمی ستاروں والا صابن استعمال کرتی ہیں، نیساں اب بھی رات کو باقاعدگی سے آملے ریٹھے بھگوئے جاتے اور صابن تو وہی لال ہی تھا۔

باورچی خانے میں بھی ابھی تک دادی نے کھڑے ہو کے پکانے والا رواج داخل نہ ہونے دیا تھا۔ زمین پہ رکھے چولہوں کے ساتھ چوکی دھری تھی کہ بقول دادی کے کھڑے ہو کے پکانے سے برکت نہیں رہتی۔ اس کے دوسرے فائدے بھی بڑے تھے۔ پہلے تائی پھر چاچی دونوں ہی گھٹنوں اور جوڑوں کے درد کو بہانہ بنا کے کھانا پکانے سے معذوری ظاہر کر چکی تھیں کہ اس وزن کے ساتھ اور گھسے ہوئے جوڑوں کے ساتھ چوکی پہ اٹھنا بیٹھنا ان کے لیے محال تھا۔ ان کی بہوئیں بھی جب امید سے ہوتیں اسی مہان چوکی کی وجہ سے کھانا پکانے سے عارضی کنارہ کشی اختیار کر لیتیں۔

لاؤنج میریں ان سب کا ذکر فضول تھا۔ ڈیوڑھی کے دائیں طرف بنے دو کمرے جو تائی تاؤ اور چاچا چاچی کے تھے، بائیں طرف بیت الخلا بستر رکھنے کے اسٹور اور مہمانوں کی بیٹھک کے بعد چھوٹا سا آنگن تھا جس میں سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں ان کے نیچے بنا چکنے فرش والا غسل خانہ جس پہ آئے دن کوئی نہ کوئی پھسل کے اپنے گوڈے تڑواتا اور پھر لوہاری گیٹ کے جراح محمد صدیق کی جیبیں بھرتا رہتا تھا۔ آنگن میں ہی باورچی خانہ تھا اور اس کے ساتھ ایک آدھا تعمیر شدہ کوٹھڑی نما کمرا جس کی چھت تھی، تین اطراف دیوار بھی تھی اس میں چاچی کی بہو کے جہیز کی واشنگ مشین لگی تھی۔ جو چار سال پہلے اس گھر میں آئی تھی اور جس میں ابھی تک دادی، دادا، تائی، تاؤ، چاچا چاچی کے کپڑے دھلنا سختی سے منع تھا ان کے کپڑے ابھی تک ہاتھ سے دھلتے اور واہیرے میں گھر کے بنائے کالے صابن سے رگڑے جاتے۔ اسی کوٹھڑی میں دو موٹر سائیکلیں اور تین سائیکلیں بھی کھڑی تھیں۔

اوپر چار پانچ چھوٹے چھوٹے ڈربے نما کمرے دس بارہ سال پہلے بنائے گئے تھے جب تاؤ تائی اور چاچا چاچی نے اپنے بچوں کے گھر بسائے تھے۔ کمرے نیم تاریک تھے۔ ہوا کا گزر نہ ہونے کے برابر تھا۔ کمرے میں سامان بے تحاشا ٹھونسا گیا تھا اس وجہ سے ایک عجیب سیلن زدہ بو پورے گھر میں چکرائی پھرتی اس بو کا کوئی ایک نام یا پہچان نہیں تھی۔ اس میں فنائل کی گولیوں کی مہک بھی تھی، دادا کے چورن اور دادی کے گھٹنوں پہ لگائے بدبودار تیل کی بھی۔

گھر میں جو بھی کھانا پکتا اس کی بو بھی دیواروں سے ٹکریں مارتی پھرتی۔ گھر نہیں مختلف خوشبوؤں اور بدبوؤں کا مرکز تھا۔

☼ ☼ ☼

دن کا آغاز دادا جی کی کھانسی سے ہوتا۔ ان ہی کے اٹھانے سے مرغ بیدار ہو کے بانگ دیتا تھا۔

جن دنوں دادا جی کی کھانسی کو افاقہ ہوتا مرغ بھی ڈربے میں منہ لپیٹ کے دن چڑھے تک اونگھتا رہتا۔ یہ دو مرغے اور گیارہ مرغیاں ڈھیر سارے چوزوں کے ساتھ آنگن کے مکین تھے اور دادا جی اور دادی جی اس آنگن میں سال کے آدھے مہینے مکین رہتے۔ ساون بھادوں اور جاڑے میں ان کی چارپائیاں ڈیوڑھی میں بچھا دی جاتیں اور آدھی رات کو بیت الخلا جاتے تاؤ اور چاچا ان چارپائیوں سے ٹکراتے اور زیر لب بڑبڑاتے رہتے۔

"میری دوائیاں مک گئیں۔"

دادا جی کی آنکھ کھلی دادی جی شاید اسی انتظار میں ان کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ ان کو جاگتے دیکھ کے فوراً اطلاع دی۔ "اور نہ اشرف نے پوچھا ہے نہ جمیل نے۔"

"میرا اپنا حقہ ٹھنڈا پڑا ہے، کسی کو خیال ہی نہیں آیا۔"

اور دن چڑھتے ہی دونوں اپنے محبوب مشغلے میں مگن ہو گئے یعنی دنیا کی بے ثباتی، بیٹوں کی بے اعتنائی اور بہوؤں کی بے مروتی کے ساتھ ساتھ پوتے پوتیوں کی بدلحاظی کے رونے رونے لگے۔ ساتھ ساتھ وقفے وقفے سے ان گنت اور مختلف نوع کی بیماریوں کا تذکرہ بھی ہوتا رہا۔

☼ ☼ ☼

اور یہ تو تائی کا کرا تھا۔

دونوں ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔

دونوں کو نیا نیا شوگر کا مرض لاحق ہوا تھا اور اپنے بوڑھے ماں باپ کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے وہ بھی اب اپنی اپنی بیماریوں کا ذکر تقابلی تواتر سے کرنے لگے تھے۔ تائی جی ایک قدم آگے تھیں، بلکہ دو قدم۔ ایک تو اس لیے کہ انہیں شوگر وراثت میں ملی تھی۔ ان کا باپ کہ شوگر کا مارا تھا۔ تاؤ جی کی طرح شوگر کے معاملے میں نو دولتی نہیں تھیں اور دوسرا قدم اس لیے آگے تھا کہ انہیں شوگر کے ساتھ ساتھ بلڈ پریشر کا عارضہ بھی تھا۔

"اکمل ذرا کہنے میں نہیں رہا۔"

تاؤ جی نے چھوٹے والے بیٹے کا گلہ کیا جو ذرا بے دید سا تھا۔ بڑا اجمل ان کے ساتھ ہی اعظم کلاتھ مارکیٹ والی دکان پہ ہوتا تھا اور ان کا دست راست تھا۔ اکمل سے البتہ انہیں ہمیشہ شکوے رہے۔ ایک تو شادی سے پہلے ہی اس نے لڑ جھگڑ کے اپنی دکان الگ بنوائی اور رنگ محل مارکیٹ میں اور رہے شادی کے اگلے ہی سال ایسا خسارہ دکھایا کہ دکان سے سیدھا تھڑے پہ آگیا۔ آج کل اچھرے بازار میں کسی دکان کے باہر تھڑے پہ کٹ پیس لگاتا تھا اور سونے پہ سہاگہ بیوی

بھی کان کترنے والی آئی۔ ساس سے چاچی ساس سے دیورانی جٹھانی سب سے ٹھنی رہتی۔

"وہ تو شروع سے ہی اتھرا تھا' یاد ہے بچپن میں بھی ایک جیبڑ کھانے کے بعد کیسے آگے سے تن کے کھڑا ہو جاتا تھا۔"

"اب تو وہ بال بچوں والا ہو گیا ہے۔ جو کرے گا اس کے بچے بھی دیکھ رہے ہیں۔ کل کو اس کے آگے ہی آئے گا۔"

تائی جی نے واسکٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے کہا۔

"ہائے ہائے... خیری صلا... اللہ نہ کرے جو میرے اکمل کی اولاد اس کے حق میں بری ثابت ہو' البتہ روبینہ کے ساتھ بڑی بُری ہونی ہے۔ تم لکھوا کے رکھ لو۔"

روبینہ ان کی بہو تھی۔ ذات کی ککے زئی' ترج کے لڑاکا۔

☼ ☼ ☼

اور یہ چاچی اور چاچا کا گھر تھا۔

چاچا جی کی مل روڈ پہ دکان تھی۔ پرانی مشینوں کی۔ دونوں بچاس کے پیٹے میں تھے۔

تین بیٹیاں مناسب وقتوں میں بیاہ چکے تھے۔ دو کو انٹر تک' ایک کو بی اے تک پڑھایا اور بیس کا ہونے سے پہلے پہلے تینوں کو اپنے اپنے گھر کا کر دیا۔ چاچی' تائی کی نسبت بڑی سلیقہ شعار اور گھر گرہستن تھیں' سالوں انہوں نے پائی پائی جوڑ کے جہیز بنائے' لڑکیوں کو گھر گرہستی سکھائی' کالج تک پڑھایا بھی۔ بس ایک بیٹی ابھی بیاہنا باقی تھی۔ فریحہ جو بی اے کا امتحان دے رہی تھی اور اکلوتا بیٹا بھی جو دو بہنوں سے چھوٹا اور دو سے بڑا تھا۔ پڑھانے کی کوشش تو انہوں نے ندیم کو بھی کی تھی مگر وہ دسویں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک عجیب سا نخرہ جو عموماً "تین چار بہنوں کے اکلوتے بھائیوں میں آجاتا ہے' وہ اس میں تھا اور ایک مخصوص قسم کی بے زاری اور چڑچڑا پن جو تیس کے قریب آکے بھی شادی کے آثار نہ پانے پہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اس میں بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔

ندیم پہلے باپ کے ساتھ ہی مال روڈ پہ ہوتا تھا' اب اس نے دو ڈھائی سال پہلے موبائل ریپیرنگ وغیرہ کے کورس کر کے گھر کے پاس ہی ایک دکان کھول لی تھی۔ خوب چلتی تھی۔ بس ماں باپ کے سامنے اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ خصوصاً "شادی کے معاملے میں چاچی جی بیٹے کے لیے بہو لانے کے معاملے میں بہت محتاط تھیں۔ آخری بیٹی کو بیاہنے کے بعد کہیں بہو لانے کا ارادہ تھا اور آخری والی یعنی فریحہ کا بی اے کرنے کے بعد آگے بھی پڑھنے کا بھرپور ارادہ تھا۔ دراصل چاچی' تائی کے تجربے کے بعد بہت ڈر گئی تھیں۔ تائی کو بیٹے بیاہنے کے اتنے ارمان تھے کہ اکلوتی بیٹی کو نظر انداز کر کے پہلے بہوئیں لے آئیں اب بیٹے تھے کہ بیٹی پہ ہاتھ نہ دھرنے دے رہے تھے۔ اوپر سے آئے سال دونوں کے بچے پیدا ہو رہا تھا' خرچے اتنے بڑھ گئے تھے کہ بیٹی کے لیے کچھ بنانے کے واسطے بچتا ہی نہیں تھا۔

"ٹھنڈ تو جانے کا نام نہیں لے رہی تو بہ۔"

چاچی نے وزن خاصا بڑھا لیا تھا' اوپر سے جوڑوں کی تکلیف۔ سردی ہو یا گرمی۔ وہ ہر موسم سے اوازار رہتی تھیں۔

"شکر کرو کہ ٹھنڈ ہے' ورنہ لاہور میں تو فروری ٹھنڈا گزر جائے بڑی بات ہوتی ہے۔ اچھا ہے گرمی ابھی دور ہے ورنہ بجلی کے بل الگ اور لوڈشیڈنگ سارے مل کے مار دیتے ہیں بندے کو۔"

"جو بھی ہے ندیم کے ابا! مجھے تو سردیاں اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ گرمیاں اچھی ہوتی ہیں۔"

"ہاں ہاں' تمہیں تو گرمیاں اچھی لگیں گی۔ تمہارے ایک بھائی کی قلفی فالودے کی دکان ہے اور دوسرے کا ائیر کولر بنانے کا کاروبار ہے۔ ان کی تو کمائیاں ہی گرمیوں میں ہوتی ہیں۔"

چاچا جی نے قلموں میں اگتے سفید بالوں پہ خضاب لگاتے ہوئے چھیڑا۔

"تسی باز نہ آنا؟"

میکے کے نام آتے ہی وہ تپ گئیں۔ پہلے ہی میکے کا برا حال تھا' اوپر سے جب سے ایک ہی بھائی نے دوسری بیٹی بہن سے لے لی تھی تب سے وہ اٹھتے بیٹھتے چاچا جی پہ اپنے میکے کے احسان جتاتی رہتیں اور ان کے بڑے بھائی کی بے مروتی بھی' جس نے دونوں بیٹے بیاہتے ہوئے چھوٹے منہ بھتیجیوں کو نہ پوچھا تھا۔

"اچھا' ذرا ایک ہزار کا نوٹ تو دینا۔"

چاچا جی عرصہ دراز سے چاچی جی کو اپنا سیونگ اکاؤنٹ بنائے ہوئے تھے۔ پیٹرول' پان اور سگریٹ کے خرچے کے لیے بھی ان سے پیسے مانگتے۔

"وہ کس لیے؟"

وہ گھٹنوں پہ مرہم لگاتے لگاتے تیوری پہ بل چڑھانے لگیں۔

"اماں جی کی دوائیں لانا ہیں اور ابا جی کے لیے توت یام۔"

"ایک تو ان کی دواؤں کے خرچے ہی پورے نہیں ہوتے اور تھوڑے خرچے ہیں؟" وہ بڑبڑاتے ہوئے گریبان سے نوٹ نکالنے لگیں۔

"ندیم نے قسطوں پہ موٹر سائیکل لینا ہے۔ فریحہ کے لیے کنگن بننے ہیں۔ اس مہینے بستر بھی پورے کرکے جہیز کا ٹرنک بند کرنا ہے۔ اگلے مہینے سے برتن بھانڈے جمع کرنے ہیں۔ ان دوائیوں کا کوئی فائدہ تو نظر نہیں آتا۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے نوٹ نکال رہی تھیں اور چاچا جی کن انکھیوں سے بال رنگ رہے تھے۔ دل میں یقین جو تھا کہ ساری کڑواہٹ اور بڑبڑاہٹ کے باوجود چاچی نے ہزار کا نوٹ ان کی ہتھیلی پہ رکھ دینا تھا۔

☼ ☼ ☼

"چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔"

اجمل نے اپنی داڑھی میں سے جھانکتے سفید بالوں کو چن چن کے شکار کرتے ہوئے مسرت کو اطلاع دی جو شاید دھوبی گھاٹ سجانے کی تیاری میں تھی۔ گھر کے مختلف کونوں سے برآمد کیے میلے کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے بس باہر نکل ہی رہی تھی۔ شوہر کی اطلاع پہ اس کی تنگ پیشانی پہ ناگوار شکن نے جمائی ماری مگر نیک بیویوں کی طرح تیجے پہ اس اوازاری کی جھلک بھی ڈالے بغیر کہنے لگی۔

"ابھی گرم کرلاتی ہوں۔"

"نہیں چائے گرم کرنے سے مکروہ ہو جاتی ہے۔"

"نہیں جی؟" وہ حیران ہوئی۔ تنگ پیشانی اور بھی سکڑ گئی۔

"پیر صاحب نے بتایا ہے۔"

وہ اللہ جانے کس پیر صاحب کے ہاتھوں میں جا پڑا تھا۔ شلوار اونچی ہوئی' داڑھی رکھی گئی' پنج وقتہ نماز بھی شروع ہوئی۔ یہاں تک تو سب خوش تھے مگر گھر سے کیبل نکلوانا' باقیوں کو بھی اس کی ترغیب دینا' مسرت کو زبردستی چادر سے برقعے میں لانا' روبینہ (چھوٹے بھائی کی بیوی)' فریحہ (چاچا جی کی بیٹی) اور ارم (اپنی سگی بہن) ان سب کو اٹھتے بیٹھتے بھنوئیں ترشوانے' بالوں کی لٹیں نکالنے' نیل پالش لگانے' تو کبھی آستینیں چھوٹی پہننے پہ لیکچر دینا' ندیم (چچا زاد بھائی) کو زبردستی باجماعت نماز میں لے جانے کی کوشش کرنا' اپنی ماں اور چاچی کو خاندان بھر کی غیبت سے روکنے کی نصیحت کرنا' یہ سب کسی کو وارے نہیں کھاتا تھا۔

دادا جی جن کو گلہ تھا' پوتے انہیں پوچھتے نہیں ہیں' وہ بھی اجمل کو اپنی جانب آتے دیکھتے تو جھوٹ موٹ کے خراٹے بھرنے لگتے۔ منحوس ایسا تھا کہ موت کا منظر اور قبر کا عذاب کے پورے پورے باب زبانی رٹ رکھے تھے۔ ایسے خوف ناک نقشے کھینچتے لگتا کہ وہ جو عرصے سے بقول شخصے "قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے ڈر کے مارے فوراً" پیر واپس اوپر کھینچ لیتے۔

"تاں یہ چائے کیسے مکروہ ہو جاتی ہے گرم کرنے سے؟"

مسرت کے سوال پہ وہ پلٹ کے گھورنے لگا۔

"آگے سے سوال کرتی ہے جنتی عورت!"

ایک تو پیر صاحب کا چشمہ لگانے کے بعد اسے ہر بندہ جہنم کا باسی نظر آنے لگا تھا۔

"وِلی تو وجہ بتائی ہوگی پیر صاحب نے؟" اس بار ذرا دبک کے پوچھا گیا۔

"پیرو مرشد سے سوال نہیں کیے جاتے" اور نہ شوہر سے۔ جا۔ جاکے تازہ چائے بنا۔"

مسرت نے مصیبتوں سے اکٹھا کیا میلے کپڑوں کا ڈھیر فوراً" نیچے دے مارا۔

"دیکھتی ہوں روبینہ مل مار کے بیٹھ گئی تھی چولہے پہ۔ خالی ملا تو بنا دوں گی ورنہ سویرے سویرے اس ککھے کے متھے کون لگے۔" روبینہ پکی لاہورن تھی۔ اوپر سے ذات کی ککھے زئی۔

جنکا جو طبیعت کے ساتھ ساتھ زبان و لہجہ کا ایک مخصوص انداز ان لوگوں کی پہچان ہے۔ یہ ہمیشہ "ز" کو "ر" اور "ر" کو "ز" بولتے ہیں۔ اب چونکہ روبینہ مسرت کو مسوّت کہتی تھی تو تب سے وہ بھی اسے ژوبینہ کہنے لگی تھی مگر غائبانہ۔۔۔۔ اس کے سامنے اسے کچھ کہنے کی ہمت کسی میں کم ہی تھی۔

روایت چلی آرہی ہے کہ ککھے زئی بیرھیاں بچھاکے، چولہے بجھاکے سکون سے آمنے سامنے بیٹھ کے لڑا کرتے ہیں۔۔۔۔ سردیاں ہوں تو آگ جلالی جاتی ہے۔۔۔۔ لحاف پاس رکھ لیے جاتے ہیں یعنی پورے اہتمام اور فرصت کے ساتھ پورا موڈ بنا کے۔

☼ ☼ ☼

"بیڑا غرق۔"

روبینہ نے شوں شوں پھونکیں مارتے چولہے کو ٹھڈا رسید کیا۔

"اللہ اس حکومت کے گردے میں وڑ ڈالے جو چولہوں سے گیس بھی چھین کے اپنے خزانے میں بھر رہی ہے۔"

"حکومت کے گردے میں درد ہوا بھائی! تو وہ سرکاری خرچے پہ بیرون ملک علاج کے لیے چلی جائے گی اور یہ خرچا بھی ہمارے بلوں میں اضافہ کر کے نکالا جائے گا۔"

فریحہ جو کالج جانے کے لیے تیار تھی اور اب ناشتے کی تلاش میں آئی تھی فوراً" قابلیت جھاڑنے لگی۔

"ایک تو میری باری ساروں سے آخر میں آتی ہے اوپر سے گیس بھی رفع ہو گئی ہے۔"

فریحہ کو جان کی امان چاہیے تھی اس لیے کہتے کہتے رہ گئی کہ ساروں۔۔۔۔ سے آخر میں جائیں گی تو باری بھی آخر میں آئے گی۔

"اب میں تمہارے بھائی کو ناشتے میں کیا دوں' اپنا کلیجہ؟"

"مجھے جلی سڑی چیزیں موافق نہیں آتیں۔"

کچن کے باہر سنک پہ منہ پہ چھپاکے مار مار کے لال صابن کی جھاگ اڑاتے اکمل نے لقمہ دیا' ایک بس اس کی ہمت تھی جو موو مجاہد بن کے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال لیا کرتا تھا۔

"گھر سے نہیں ساڑ کے لائی تھی کلیجہ۔۔۔۔ تمہارے اس حویلے میں آکے سواہ ہوا ہے۔ تمہارے اگلے پچھلے مل کے بھونتے رہتے ہیں مجھے۔"

روبینہ آستین چڑھاکے اپنے مجازی خدا کے مزاج ٹھکانے لگانے لپکی اور فریحہ نے دودھ سوڈے کا گلاس ہی ناشتے کے نام پہ پینے کا ارادہ باندھا۔

☼ ☼ ☼

ارم بجھے دل کے ساتھ بجھے ہوئے گیروے رنگ کا جوڑا استری کر رہی تھی' جب تائی جی بڑبڑاتی اندر داخل ہوئیں۔

"بہت ہی زبان کھلتی جا رہی ہے روبینہ کی۔"

"بند بھی ہوئی کب تھی؟"

ارم کے ہاتھوں نے حرکت پکڑی۔ وہ ایسے زور لگا لگا کے استری پھیرنے لگی جیسے زیادہ زور لگانے سے بجھا ہوا رنگ لشکارے مارنے لگے گا۔

"سب اکمل کی چھوٹ ہے۔۔۔۔ ایسی زنانیوں کو ٹھڈے کی نوک پہ رکھنا چاہیے۔۔۔۔ گٹ موڑ کے دو چار کرارے ہاتھ مارے ہوں تو پھر دیکھو کیسے نکلتی ہے آواز۔"

"پھر تو زیادہ شور مچائے گی وہ۔۔۔۔ آپ کا خیال ہے روبینہ مار کھا کے دبنے والی عورتوں میں سے ہے۔"

ارم اسے بھابی وغیرہ کہنے کا تکلف نہیں کرتی تھی۔ چھوٹے بھائی کی بیوی اور ایسی بد زبان اور ہتھ چھٹ بیوی۔ اسے تو اوقات میں ہی رکھنا چاہیے۔

"میں تو ککھے زئیوں کی لڑکی لا کے پچھتا رہی ہوں۔"

"لانے کا شوق بھی تو بہت تھا۔"

استری کی رفتار اور تیز ہوئی۔ وہ وقت یاد آیا۔ جب چاچی جی بڑے خلوص سے ارم کے ہاتھ پیلے کرنے کے مشورے دیتی تھیں اور تائی جی اکمل کے لیے حور پری لانے کے لیے چپلیں گھسا رہی تھیں۔

"اب مجھے کیا پتا تھا ایسی نکلے گی۔"

"لوگ شکلوں سے دھوکا کھاتے ہیں۔ روبینہ کی تو شکل پہ لکھا ہے کہ وہ چنگیز خان کی نسل سے ہے۔۔۔۔ پھٹکار ماری صورت سے بھی آپ کو سمجھ نہ آئی پتا نہیں کیسے بال سفید کیے ہیں آپ نے۔ ضرور دھوپ میں ہی کیے ہوں گے۔"

"چل چل وڈی سیانی نہ بن۔۔۔۔" تائی جی بلبلا کے ڈانٹنے لگیں۔

"اور یہ جتنی چار سال پرانا جوڑا اتنا دبا دبا کے استری کرنے کی کیا ضرورت ہے تجھے؟ سستی نہیں ہے۔"

"لعنتی ہے چار سال پرانا ہے تب ہی تو دبا دبا کے استری کرنے کی ضرورت ہے۔ نیا تو ایسے بھی پہن لو تو جچ جاتا ہے مگر نیا قسمت میں کہاں۔"

"جب یہ نیا تھا تب کون سا لائیں مارتا تھا۔۔۔۔ پتا نہیں کیوں تو مسرت کی مشین میں کپڑے دھوتی ہے اس کا احسان الگ اور کپڑے جو برباد ہوتے ہیں وہ الگ۔۔۔۔ لوہے کی مشین تو کپڑے کا ناس مار دیتی ہے۔"

"لوہے کی مشین نہیں کالے صابن کا واویلا۔"

"تو تو دھو لیا کر پوڈر سے کپڑے' جو پوڈر مل مل کے نالنے پہ بھی ہاتھوں سے نہ اترے' وہ کپڑوں سے نکلنا ہے؟ ویسے بھی خوشبو والی چیزیں حرام ہوتی ہیں۔"

"یہ اجمل بھائی جان نے کہا ہوگا۔ ان کے پیر صاحب کو بڑا شوق ہے ہر دوسری چیز حرام کرنے کا۔"

"بکواس نہ کر۔۔۔۔ ایک تو میری اولاد اللہ والی ہے۔۔۔۔ دوسرا تو نرا بیوی جوگا اور تو زبان چلانے جوگی۔"

وہ چپل گھسیٹتی کمرے سے باہر نکلیں اور ارم استری کا پلگ کھسوٹ کر رونے بیٹھ گئی۔

"ہاں' میں صرف زبان چلانے جوگی۔۔۔۔ مجھے کسی اور جوگا رہنے جو نہ دیا کسی نے۔۔۔۔ سلیمہ اور حلیمہ کی طرح میرا بھی گھر بار ہوتا تو میں اسے سنبھالنے جوگی ہوتی۔۔۔۔ ان کی طرح میرے بھی بچے ہوتے۔۔۔۔ میں انہیں پالنے جوگی ہوتی۔"

☼ ☼ ☼
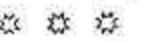
"ندیم! دکان پہ نہیں جانا؟"

چاچا جی نے نکلتے نکلتے ندیم سے پوچھا جو نور کا مارننگ شو لگائے' اسے حریصانہ نظروں سے تاڑ رہا تھا۔

"ٹھہر کے جاتا ہوں۔"

اکھڑے لہجے میں جواب ملا۔ نظریں ہنوز نور کے نور پہ جمی تھیں۔

"گیارہ تو بج گئے ہیں۔ آدھے گھنٹے کا راستہ ہے اور کتنا ٹھہر کے جانا ہے۔ رزق کو انتظار نہیں کراتے پتر!"

"مارکیٹ کھلتی ہی بارہ بجے ہے' میں گیارہ بجے جا کر کیا کروں؟ اور اتنے سویرے کون اپنے موبائل' کمپیوٹر اٹھاکے میرے پاس لائے گا مرمت کرانے۔" وہ پھاڑ کھانے کو دوڑا۔

اس کے انداز میں جو رکھائی' جو بدلحاظی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی' وہ چاچا جی کو باز رکھتی تھی اس کے منہ لگنے سے۔۔۔۔ ناگواری سے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے وہ نکلنے لگے۔۔۔۔ ندیم نے توجہ ایک بار پھر ٹی وی کی جانب مرکوز کرنا چاہی مگر اب نور بھی زہر لگ رہی تھی جبڑا ٹیڑھا کر کے بولتی ہوئی۔

☼ ☼ ☼
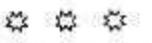
جس بے زار انداز میں دن کا آغاز ہوا تھا' وہ بے

زاری سارا دن ہی گھر کے ہر فرد کے مزاج پہ چھائی رہی

سوئی گیس دوپہر تین بجے تک نہ آئی۔ دوپہر کو گھر کی عورتوں نے بازار سے ٹھنڈے نان پکوڑے منگوا کے مزاج اور گرم کیے۔ دادی سے چونکہ نان چبایا نہیں جاتا تھا اور دادا سے پکوڑے پچائے نہیں جاتے تھے اس لیے دونوں نے جی بھر بھر کے اولاد کے رونے روئے۔

روبینہ نے اکمل کی اور اکمل نے روبینہ کی خوب مٹی پلید کی۔۔۔ اجمل کو چائے ٹھنڈی ٹھار ہی پینا پڑی سو اس لیے وہ بھی کام پہ نکلتے نکلتے مسرت کا ایسا بندوبست کر آیا کہ اب سارا دن مسرت نام کا کوئی جذبہ اس کے پاس بھولے سے بھی پھٹکنے نہ والا تھا۔

ندیم جب بھی دکان پہ پہنچا۔ وہاں اس کا دل جلانے کا مزید سامان موجود تھا۔ اس کے ایک دوست کی شادی کا کارڈ۔۔۔ دوست بھی وہ جو عمر میں تین چار سال چھوٹا تھا اور اس کی بھی دو بہنیں تھیں۔ اس کے گھر والوں نے تو اس کی بہنوں کا بہانہ بنا کے اس کی شادی نہ روکی تھی۔۔۔ وہ اور بھی کڑوا زہر ہو گیا۔

باپ الگ اپنی دکان پہ اکلوتے بیٹے کی بدتمیزی اور زبان درازی پہ جل کڑھتا اور آنے والے وقت کا تصور کر کے خوف زدہ ہوتا رہا۔

ارم کا گیروے رنگ کا جوڑا جو بہت وقت اور بہت بجلی لگا کے استری کیا گیا تھا۔ پہنتے ہوئے شانوں کے جوڑ سے ادھڑ گیا۔ وہ پھپھک پھپھک کے رو دی۔۔۔ ماں کے بھیجے نان پکوڑے بھی بیچ کروے مارے۔

ادھر تائی جی کو سارا دن الگ قلق رہا کہ اکمل صرف زبان کے جوہر کیوں دکھاتا رہا' اس نے روبینہ کی دھلائی کیوں نہ کی۔

☼ ☼ ☼

"یہ لو۔" ندیم نے ماں کے سامنے میرون اور گولڈن رنگ کا شادی کا کارڈ پھینکا۔

"یہ کیا ہے؟"

"توحید کی شادی ہے پرسوں۔" اس نے جیسے گھر کے صحن میں بم دھماکا ہونے کی اطلاع دی تھی۔

"کون توحید؟"

"میرے ساتھ والی دکان پہ ہوتا ہے۔ وہی جس کی امی ایک بار آپ کا پتہ بھی کرنے آئی تھیں۔"

"وہ طوطا ناکی؟"

"ہاں جس کے سامنے چائے کے خالی کپ رکھتے ہوئے بھی آپ کی تیوریاں نہیں اتر رہی تھیں وہی۔"

"ہاں تو وہ بھی تو شکر دوپہری منہ اٹھا کے آ گئے تھے دونوں ماں بیٹا اور بھلا میرا حال پوچھنے آئے تھے تو کوئی جوس کوئی پھل فروٹ تو لاتے۔۔۔ خالی ہاتھ کوئی کسی بیمار کا حال پوچھنے آتا ہے ایسوں کو ایسے ہی ٹرخاتے ہیں!"

پھر کچھ خیال آنے پہ متاسف ہوئیں۔

"لیکن تو مجھے پہلے بتاتا کہ توحید کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو میں چائے کے ساتھ بسکٹ سموسے رکھ دیتی۔ اس کی ماں سے بھی سیدھے منہ بات کرلیتی' حالانکہ وہ طوطا ناکی اس قابل تو نہیں تھی مگر خیر۔۔۔ مطلب کے لیے بندہ بڑا کچھ کرلیتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اپنی بہن نہیں نظر آتی تجھے' تیرا دوست کنوارا تھا اپنے کاروبار والا تھا تو فریحہ کے بارے میں ہی سوچ لیتا۔"

"مجھے کیا پتا تھا' اس کی شادی بھی ہونا ہے۔"

"کیا مطلب' اس کی شادی نہ ہونے والی کون سی بات تھی بھلا؟"

"اس کی دو بہنیں کنواری ہیں۔۔۔ مجھے تو یہی لگا جن کی بہنیں بیٹھی ہوں وہ شادی کا نام بھی نہیں لے سکتے۔ اب مجھے کیا پتا تھا یہ رواج صرف ہمارے ہاں ہے۔" اس نے موقع پاتے ہی جتا دیا۔

"اس کی بہنیں مانگی گئی ہوں گی خاندان میں' اس لیے بے فکر ہوں گے یا پھر کھاتے پیتے لوگ ہوں گے' چنگا چوکھا جہیز بنا رکھا ہو گا اس لیے بھی پروا نہیں کی ہو

گی۔۔۔ جہیز تگڑا ہو تو رشتوں کی کیا کمی۔"

"جہیز تو فریحہ کے لیے بھی سالوں سے جمع ہو رہا ہے۔"

"گدھے! رضائیوں اور برتنوں کو جہیز نہیں کہتے ۔۔۔ سونے کے نام پہ چھ تولے بھی نہیں جوڑا ابھی تک ۔۔۔ جب فرنیچر لینا پڑے تب لگ پتہ چل جاتا ہے۔" ندیم نے فرچے کا سن کے اور بھی دل برداشتہ ہو گیا اور چھت پہ چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"کیا حال ہے دادی!"

فریحہ کی شامت آئی تھی جو من کی موج میں آ کے دادی کو سلام کرنے آ گئی۔ ایک تو نا' فراغت بندے سے وہ وہ کام کروا لیتی ہے جس کے بارے میں اسے اچھی طرح پتا ہوتا ہے کہ اس کو کرنے میں نری ذلالت ہے' پھر بھی وہ بابندہ اکتا کے کر ہی بیٹھتا ہے کچھ نہ کچھ ۔۔۔

"تجھے خیال آ گیا دادی کا حال پوچھنے کا؟"

"خیال ہے تو پوچھ رہی ہوں دادی!"

"کہاں سے آ رہی ہے؟" دادی نے دیدے سکوڑ سکوڑ کر اس کا جائزہ لیا۔ "کالج سے۔"

"اتنا سرخی پوڈر لگا کے جاتی ہے تو کالج۔"

"میں ہیں سرخی پوڈر؟"

وہ بھونچکا رہ گئی۔ ہاں تھی سرمے کی ہلکی سی دم ضرور نکل رہی تھی پپوٹوں سے باہر اور تبت سنو کریم بھی صبح کیں ملی تھی چہرے پہ اب تو اس کی باقیات بھی نہ ہوں گی۔

"کون سا سرخی پوڈر دادی؟"

"یہ جو بلیاں (ہونٹ) لال کی ہوئی ہیں اور کلے جو پھٹنے والے ہو رہے ہیں ان پہ بھی لالیاں چو رہی ہیں۔"

"دادی! قسم لے لیں میں نے تو کبھی بازار یا خالہ' ماموں کے گھر جاتے ہوئے لپ اسٹک نہیں لگائی تو کالج جاتے ہوئے کیا لگاؤں گی۔"

"ایسے فیشن خالہ' ماموں کے گھر جاتے ہوئے نہیں' کالج جاتے ہوئے ہی ہوتے ہیں۔ سب پتا ہے مجھے' ایسے ہی تو لڑکیاں کالج جانے کے لیے نہیں مرتیں۔۔۔ بلا اپنی ماں کو۔۔۔ اسے کہتی ہوں' میرے جیتے جی یہ بے حیائی نہیں چلے گی۔۔۔ کالج جانا ہے تو برقع لے۔"

"برقع۔۔۔ کیا ہو گیا ہے دادی! میں نے کوئی میک اپ ویک اپ نہیں کیا۔ آپ کی نظر کمزور ہو گئی ہے۔"

"چالاک ماسی! نظر خراب ہو تو نظر نہیں آتا' جبکہ مجھے صاف نظر آ رہا ہے۔"

"قسم لے لیں دادی!" وہ روہانسی ہو گئی۔

"بے شک اپنے دوپٹے سے رگڑ کے دیکھ لیں' ذرا سا بھی میک اپ ہوا تو آپ کے دوپٹے پہ لگ جائے گا۔"

"میں کیوں اپنا نماز والا دوپٹہ۔۔۔ چٹا دودھ دوپٹہ پلید کروں؟"

"میک اپ سے دوپٹے پلید نہیں ہوتے دادی!"

"دیکھا۔۔۔ کر رہی ہے نا میک اپ کی حمایت۔"

"حمایت کی ہے صرف۔۔۔ میک اپ نہیں کیا' جا کے کسی سے بھی پوچھ لیں۔۔۔ میرے گالوں اور ہونٹوں کا اصل رنگ یہی ہے۔"

دادی نے فریحہ کی نقل اتاری۔ وہ تو ہنسنے لگی اور ارم کی سمجھ سے چونکہ سارا معاملہ بالاتر تھا' اس لیے وہ فکر فکر منہ دیکھ رہی تھی۔

"ارم کے ہونٹوں اور گالوں کا رنگ تو بغیر میک اپ کے کبھی لال نہیں ہوتا۔۔۔ تیرا کیسے ہو گا؟ تو کشمیر سے آئی ہے کیا؟ سادہ چہرہ تو ایسا ہی ہوتا ہے جیسا ارم کا ہے' پھیکا' پیلا۔۔۔ تیری طرح لشکارے نہیں مارتا۔"

فریحہ کی ہنسی کو بریک لگ گئی کیونکہ دادی کے بے لاگ تبصرے نے ارم کی ناک سے دھواں نکال دیا تھا۔ سو وہ پھنکاریں مارتی پیر پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

"لگتا ہے ارم ہانڈی چڑھا کے آئی تھی۔ شاید لگ گئی ہے تب ہی تا میں چڑھاتے گئی ہے۔"

دادی نے سادگی سے قیاس ظاہر کیا' جو فریحہ کے

ہونٹوں پہ پھر سے مسکراہٹ لے آیا اور دادی کے ہاتھ میں جوتی۔
"دفع اندر کر۔۔۔ آنے دے اپنی ماں کو' آج بات ہو کے رہے گی۔ بند کرواتی ہوں تیرا کالج آنا جانا۔"
فریحہ سہم کے وہاں سے کھسکی۔۔۔ وہ تو یونیورسٹی جانے کے ارادے باندھ رہی تھی اور ادھر کالج پہ پابندیوں کے پروگرام بن رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

جمعہ کا دن تھا۔ بچوں کے اسکول میں آدھی چھٹی تھی اور اگلے دن ہفتے کو ویسے ہی سرکاری چھٹی تھی صوبے بھر میں۔۔۔ اس لیے حلیمہ اور سلیمہ دونوں ہی بچے ہانکتی عین جمعے کی نماز کے وقت آ پہنچیں۔ دادی نماز حاجات سے فارغ ہو کے اب سورہ کہف کی تلاوت کر رہی تھیں۔ رکشے کی پھڑپھڑاتی مکروہ آوازوں پہ سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔ سلیمہ اور حلیمہ دونوں کے بچے ناقابل برداشت حد تک ذلیل تھے۔ دادی اور دادا کو تو بطور خاص ایسا زچ کر کے رکھتے کہ وہ بلبلا اٹھتے ماؤں کو فکر ہی نہ ہوتی تھی۔ وہ بچوں کو بھول بھال پرانی سہیلیوں اور پرانی انار کلی کے چکروں میں پڑی رہتیں' جب بھی میکے آتیں۔
"وہ دونوں پھر سے آ گئی ہیں۔۔۔ دفع ہونیاں!" روبینہ نے مسرت کے کمرے میں جھانک کے اطلاع دی۔
"ہائے میں مرجاواں۔۔۔ آج تو میری چھوٹی کو تپ بھی چڑھا ہوا ہے۔ حلیمہ کے بچوں کو تو خاص بیر ہے چھوٹی سے' اسے رلا رلا کے مارتے ہیں اور مار مار کے رلاتے ہیں۔ وہ تو حشر کر دیں گے بے چاری کا بخار میں۔"
"ان کی ماؤں نے ان کو اوڈ سکھلایا کیا ہے حشر خراب کرنے کے علاوہ' خیر میں تو ان کی سڑی بوتھیاں دیکھ کے اپنا دل نہیں ساڑنا چاہتی۔۔۔ میں جا رہی ہوں اپنی پھوپھی کے گھر۔"
روبینہ کے بڑے مزے تھے۔ ماں باپ گزر چکے تھے۔ گھر پہ دو بھائی تھے بس ایک شادی شدہ ایک غیر شادی شدہ۔ دل چاہتا تو بھائی کے گھر جا کے بھائی کے سینے پہ مونگ دلتی۔۔۔ دل چاہتا تو اچھرے میں پھوپھی کے گھر کو میکا بنا کے رہتی۔ بلکہ پھوپھی کے گھر میکے والے عیش زیادہ تھے۔ دراصل چھوٹے بھائی کی منگنی پھوپھی کی ہنجلی بیٹی سے کر دی تھی۔ منگنی کو ہو گئے تھے کوئی دو تین سال مگر شادی کا نام نہ لیا جا رہا تھا اور ہر بار شادی کی بات ہوتے ہوتے رہ جاتی تو صرف روبینہ کی کارستانی سے' وہ جانتی تھی ادھر پھوپھی کی ہنجلی بیاہ کے گھر سے نکلی' ادھر اس کا یہ میکہ نمبر دو ختم۔ ادھر پھوپھی بھائی کی ساس بنی' ادھر اس نے آنکھیں ماتھے پہ رکھ لینا ہیں ابھی وہ ہنجلی جو اس کے اپنے ہاں آنے پہ آگے پیچھے پھرتی ہے۔ بریانیاں پکاتی اور اس کی بچیوں کے سروں سے جوئیں لیکھیں نکالتی خوش رہتی ہے' بھابی بن کے اس نے بھی جوتے کی نوک پہ رکھنا ہے روبینہ کو۔ اس لیے اس سے جہاں تک ہو سکتا تھا' وہ چن چن کے روڑے سنبھال کے رکھتی جاتی تھی' جو موقع ملنے پہ شادی کے راستے میں اٹکائے جا سکیں۔
مسرت نے حسرت سے روبینہ کو دیکھا جو میکے جانے کی خبر سنا کے مستانی کمر ہلا ہلا کے جا رہی تھی۔ وہ آہ بھر کے رہ گئی۔ پیر صاحب کی صلاح کے بعد اجمل نے اس کے میکے جانے پہ بھی خاصی پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ وہ پشتنی تھی۔ پشتنوں میں لڑکیوں کی ہڈیوں تک میں شوہر کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سبق گھول دیے جاتے ہیں۔ انہیں اچھی تابعدار بیویاں بننے کا بڑا جنون ہوتا ہے۔ ایک اچھی فرخ عورت کی طرح یہ جراثیم مسرت میں بھی تھے۔ وہ دل مسوس کے رہ جاتی مگر شوہر کے آگے زبان چلانا۔ اس کے حکم کے خلاف جانا اس کی تربیت میں تھا' نہ فطرت میں۔
وہ بجھے دل کے ساتھ بچوں کے کھلونے ٹھکانے لگانے لگی ورنہ حلیمہ اور سلیمہ کے بچے ان کو ہمیشہ کے لیے ٹھکانے لگا دیتے۔ اس نے سارے اوٹ پٹانگ کھلونے' پانی والا پستول' منی بدنام ہوئی گانے پہ کمر مٹکانے والی آوارہ صورت گڑیا۔۔۔ شیلا کی جوانی بجانے والا پلاسٹک کا موبائل فون' ہم شکیل کے ننھے ننھے برتن اور چولہا۔۔۔ لنڈے کی ریڑھیوں سے لیے رنگ اڑے اور دھاگے نکلے روئی بھرے ہوئے کھلونے سب کو بیڈ کے نیچے لڑھکایا' لمبے کناروں والی چادر بچھائی جو تینوں طرف سے لٹک کے سارا مال کو چھپا گئی۔

☼ ☼ ☼

"اب تو میرے سوہرے بھی باتیں کرنے لگے ہیں امی۔" حلیمہ نے اچار کی پھانک پہ پراٹھے کا نوالہ لپیٹتے ہوئے کہا۔
"تیرے سوہرے چپ کب رہتے ہیں؟ اب کس بات پہ رال ٹپک رہی ہے ان کی؟"
ہر مشرقی ماں کی طرح چاچی جی کو بھی بیٹیوں کے سسرال والے بڑے زہر لگتے تھے اور ان کا داماد گھر آتا یعنی سسرال تو اسے پورا پورا وی آئی پی پروٹوکول ملتا۔۔۔ مگر پیٹھ پیچھے اس بات کا بھی روایتی ڈھنڈورا پیٹا جاتا کہ جلد بازی میں داماد کو پرکھ نہ سکے۔ سسرال تو ہر لڑکی کا کمینہ ہوتا ہے' اس میں نئی بات کیا ہے' مگر شوہر کے دل میں بیوی کا درد ہو تو اور کیا چاہیے۔۔۔ یہاں تو داماد ہی بیٹی کا نہیں بن رہا' دل کلس جاتا ہے اس کے ناز نخرے کرتے ہوئے' مگر کیا ہے جی۔۔۔ کرنا پڑتا ہے' داماد جو ہوا۔
"میں تو کہتی ہوں ندیم کی اب شادی کر دو۔"
حلیمہ نے تو مزے سے اچار کی پھانک چوستے ہوئے مشورہ دے دیا مگر چاچی جی کلس کے رہ گئیں۔
"ہاں اتنا آسان ہے نا اس کی شادی کرنا۔"
"مشکل بھی نہیں ہے۔ لڑکیوں کے لیے رشتے مشکل سے ملتے ہیں۔ لڑکوں کی تو آج کرنا چاہو' کل کر لو۔"
"ہاں لوگ تو لڑکیاں ہاتھوں میں لیے بیٹھے ہیں جیسے۔" چاچی نے خشمگیں نظروں سے پپو اور چٹوری بچی کو گھورتے ہوئے اچار کی شیشی ہی اس کے سامنے سے اٹھا لی۔ کم بخت چن چن کر آم کی پھانکیں نکالے جا رہی تھی۔ پیچھے رہ گئے تھے نرے لسوڑے اور مری مسلی ہری مرچیں۔
"تو نہ اتنی چھان پھٹک کرنا۔۔۔ ہم نے چاند جیسی بھابی لا کے کیا کر لیا ہے۔ بھائی کا دماغ ہی خراب کرنا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ماہ نور بلوچ ڈھونڈنے میں وقت ضائع کرنے کی۔۔۔ سیدھی سادی منہ متھا لگتی لڑکی لے آؤ۔"
"تمہاری تائی کون سی حور پریاں لائی ہے۔ وہ بھی اپنی طرف سے پوری سوری شکل کی بہوئیں لائی تھی۔ منہ متھا لگتی تو ایک طرف۔۔۔ مسرت کی تو آنکھیں ہی نظر نہیں آتیں' سوجے سوجے پپوٹے پہ۔۔۔ اور ماتھا اتنا تنگ جیسے رنگ محل کی گلیاں اور وہ روبینہ۔۔۔ اللہ معافی' بارہ مِن کی دھوبن شادی والے دن لہنگے میں ایسی لگ رہی تھی جیسے کسی نے گاؤ تکیے پہ زری کم خواب کا غلاف چڑھانے کے بعد سیا ہو' مگر دیکھ لو ایسی شکلیں ہونے کے بعد بھی انہوں نے ساس کو بھی نکیل ڈال دی ہے اور مردوں کو بھی۔"
"ہاں روبینہ کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر مسرت بھابی تو بڑی بھلی مانس ہے۔"
"دفع۔۔۔ بن مانس کہو۔۔۔ وہ تو سب سے میسنی ہے۔ وہی ہے جو ارم کی شادی نہیں ہونے دیتی۔ بیٹھی بیٹھی بڈھی ہو رہی ہے۔ اس دن میں نے دیکھا تھا کالی مہندی گھول کے بالوں میں لگا رہی تھی۔"
آخری جملہ رازداری سے کہا گیا۔
"لیکن لوگوں کی باتوں سے تو بچی ہیں نا۔ اچھے وقت پہ بیٹے بیاہ کے ان کی نظروں میں بھی سرخرو ہو گئیں' دنیا کی بھی' مگر ندیم کی بات پہ اب لوگ لے دے کرنے لگے ہیں کہ بیاہی بہنیں اس کا گھر نہیں بسنے دیتیں' کبھی آپ پہ الزام کہ ماں کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ اکلوتے بیٹے کو بہو کے ساتھ بانٹنے کا۔"
"لعنت ہے لوگوں کی سوچ پہ۔۔۔ ان کی لمبی زبانوں پہ۔۔۔ وہ جو مرضی بکواس کریں۔ میں نے ندیم کی شادی تب تک نہیں کرنی' جب تک فریحہ رخصت نہ ہو جائے۔۔۔ اس کے بعد اکلوتے بیٹے کو بانٹنا تو کیا' میں سالم کا سالم بہو کو دے دوں گی کہ بی بی تو جان اور تیرا

خصم۔۔۔ میں تو خود ندیم کے نخرے اٹھا اٹھا کے گھوں تک (ناک تک عاجز) ہو گئی ہوں۔ اتنی تو لمبی زبان ہے اس کی۔"

"اسی لیے ہے ناں۔ مجھے تو ڈر ہے وہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ کہیں خود سے نہ شادی کر لے۔"

"اتنی بھی لوٹ نہیں پڑی۔ کر کے تو دکھائے۔" چاچی نے جھورے پہلوان کے سے انداز میں ران پہ ہاتھ مار کے للکارا۔

"تو پھر فریحہ کی شادی کا سوچو۔" تنگ آ کے حلیمہ نے راگ بدلا۔

"اسے ابھی تو پڑھائے چلی جا رہی ہو۔ پڑھائے چلی جا رہی ہو۔ کون سا اس کی کمائیاں کھانا ہیں۔۔۔ رشتہ ڈھونڈو اور اگلے گھر کا کرو تاکہ بہو آ سکے۔"

"وہ ایم اے تو کر لے پہلے۔"

"چلو اب ایم اے کا سیاپا۔ ضرورت کیا ہے ایم اے کرانے کی بے چارہ ندیم ٹھیک کہتا ہے۔"

سلیمہ جو اندر کمرے میں بتیاں بجھائے اپنے لڈو جیسے گل تھوتھنے کو تھپک تھپک کے سلا رہی تھی اور اسی لیے چاہنے کے باوجود گفتگو میں حصہ نہیں لے پا رہی تھی۔ اس کے گہری نیند میں جاتے ہی فوراً کمرے سے باہر نکل آئی گفتگو میں اپنا حصہ ڈالنے۔

"بالکل صحیح کر رہی ہیں امی۔"

"ندیم کی شادی نہ کرے؟"

"نہیں۔۔۔ فریحہ کو پڑھا کے۔۔۔ تم نے اور میں نے جلدی شادی کر کے کیا پا لیا جو فریحہ پا لے گی۔۔۔ جس عمر میں میں چار چار بچے پال رہی ہوں اس عمر کی ابھی لڑکیاں بالیاں بنی پھر رہی ہیں۔۔۔ چھ سالوں میں تین بڑے آپریشن کرا کے بچہ میں رہا گیا ہے۔ بلڈ پریشر ہائی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے، چھائیاں، موٹاپا، تم اپنا حال دیکھ لو تمہارے برابر کی ہے ارم کنواری ہے اس لیے کڑی بنی پھرتی ہے اور تم عورت اوپر سے پیسے کی تنگی الگ۔ کوئی کام کی ڈگری اپنے پاس ہوتی تو ہم بھی سینہ ٹھونک کے میدان میں اترتیں۔ کچھ ہزار کمانے جوگی ہوتیں تو میاں پہ بھی رعب جمتا۔۔۔ سسرال والے بھی کم بکواس کرتے۔"

"عورت کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی۔" حلیمہ نے منمنا کے کہا۔

"تو تیرا اور میرا میاں تو مرد ہے۔ اس کی کمائی میں کتنی برکت ہے۔ کبھی فیس نہیں جاتی تو کبھی مکان کا کرایہ۔ روز کی چخ چخ، روز کی کل کل۔ فریحہ کے پاس ڈگری ہو گی تو نوکری بھی اچھی ملے گی۔ آج کل کمانے والیوں کے رشتے بھی اچھے آتے ہیں۔"

پھر کسی خیال کے تحت ماں کو مشورے سے نوازا گیا۔

"میں تو کہتی ہوں امی ندیم کی شادی جب بھی کرنا کوئی نوکری کرنے والی بہو لانا۔"

"لو۔۔۔ تو اس کو بہو لانے کا کیا فائدہ ہو گا۔ وہ تو گھر سے باہر رہے گی۔ کام کون کرے گا۔"

"باہر بھی کام کرے گی۔۔۔ اور صفائی دھلائی تو چند سو روپے کی ماسی بھی کر لیتی ہے۔ وہ دس پندرہ ہزار کما کے لائے گی اور سب سے اچھی بات۔۔۔ نوکری کرنے والی عورتوں کے پاس سسرال سے آزار اٹھانے کا وقت ہی نہیں بچتا۔ بے چاریاں باہر سے اتنی کھپ کر آتی ہیں کہ گھر آنے کے بعد نہ ساس سے منہ ماری نہ نندوں سے ٹھا ماری نہ شوہر کو شکایتیں۔۔۔ مزدوروں کی طرح منہ کھول کے سو جاتی ہیں۔"

سیانی بیٹی کی باتیں چاچی کے دل کو لگ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

یہاں حلیمہ بھائی کی شادی کے لیے زور لگا رہی تھی ادھر روبینہ پھوپھی کے گھر بیٹھی بھائی کی شادی پھوپھی پر اور ردو کروانے کے لیے زور لگا رہی تھیں۔ اس بار کوئی اور روڑا نہ ملا اٹکانے کو تو بھلی کے قدرے گداز ہوتے وجود کو نشانہ بنا ڈالا۔

"آئے ہائے پھوپھی! اسے کیا کھلا رہی ہو۔۔۔ پھول پھول کے دنبہ بنتی جا رہی ہے۔۔۔ کلے پھٹنے والے ہو رہے ہیں۔۔۔ ڈولے نکل لیے ہیں۔ اتنی چربی، دلہن بن کے کیا لگے گی؟ اپنا مذاق ہی بنوائے گی میں تو کہتی ہوں اسے کوئی ڈائٹنگ شائٹنگ کراؤ دو چار مہینے ابلی سبزیاں کھلاؤ اور سوپ سے دو چار پتیلیاں بھر کے چڑھاتے پلاؤ یا پھر ڈوڈا کا عرق، ساری چربی گھل جائے گی۔ پیٹ بھی اندر کرنے کے لیے حکیم پیو نکے کا چورن لے کر آؤ۔ پتلی میرا ویرا ویلا پتلا، چھنک، وڑنگا، جو ور برابر کا ہونا چاہیے ابھی چار مہینے صبر کر لو۔"

جی بھر کے رستے پر الفاظ کی ریڑھ مارتے ہوئے اس نے چار مہینے اور آگے کر دی شادی۔۔۔ پھوپھی کی زبان کی نوک پہ یہ طعنہ کئی بار آتے آتے رہ گیا کہ خود روبینہ اپنی شادی کے وقت چھ ماہ کی حاملہ نظر آتی تھی۔

☼ ☼ ☼

فریحہ بی اے کے امتحان دینے کے بعد فارغ تھی اور بیٹھا مکھیاں مار رہی تھی۔

آج پورے گیارہ دن بعد مسرت نے کپڑے دھونے کا ارادہ باندھا تھا۔ صحن میں میلے بساند مارے کپڑوں کا ڈھیر لگ رہا تھا اور ان پہ مکھیاں بھی بھنبھنا رہی تھیں۔ فریحہ اخبار کا رول بنا کے ان کا شکار کرتی وقت گزار رہی تھی۔

"فریحہ! آج شاہ عالمی چلیں؟" مسرت نے صلاح ماری۔

"اور یہ کپڑے؟"

فریحہ جانتی تھی یہ ڈھیر مغرب سے پہلے ختم نہیں ہونے والا اور ان کے ہاں ابھی تک مغرب کے بعد گھر کی عورتوں کا باہر خصوصاً" بازاروں میں نکلنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

"کل سہی۔۔۔" دراصل بازار جانے کی خرمستیاں اسے سوجھ ہی اس لیے رہی تھیں کہ کسی طرح کپڑے دھونے سے ایک دن اور نجات مل جائے۔

"ہائے نہیں بھالی گرمی بڑی ہے۔" اس کمسل مزدی بھائی تھی ورنہ آج تو موسم قدرے گوارا تھا۔

"چل بس۔۔۔ کانجی پلواؤں گی۔" کمال کا لالچ دیا گیا۔

"نہ۔۔۔ کانجی سے میرا گلا خراب ہو جاتا ہے۔"

"توبہ۔۔۔" مسرت کو طیش آ گیا۔ بھری بالٹی زمین پٹخی۔ نیل جھاگ سے بھرا سلیٹی رنگ کا پانی اس کی شلوار کو گھٹنوں تک بھگو گیا۔

"نخرے ہی نہیں ختم ہوتے۔۔۔ کالج بھی تو گرمی میں جاتی تھی تو۔"

"آپ روبینہ بھالی کو ساتھ لے جائیں۔۔۔ ویسے بھی ان کو شاپنگ کا شوق ہے۔"

"مگر مجھے اسے ساتھ لے جانے کا شوق نہیں ہے۔ اس کی نظر بچھو جیسا ڈنگ ہے۔ میں دو سو روپے بھی خرچوں تو منہ میں لے لیتی ہے میری شاپنگ۔۔۔ مجھے تو اس کے ساتھ شاپنگ کرنا راس ہی نہیں آتا۔"

"اور مجھے آپ کے سامنے بیٹھ کے مکھیاں تک مارنا راس نہیں آ رہا۔" وہ بڑبڑا کے اٹھنے لگی تھی کہ اندر لگے باوا آدم کے زمانے کے کالے رنگ کے فون کے ٹرٹرانے کی آواز گونجی۔

"سیاپا۔۔۔ فون کی گھنٹی اور مشین کی گھنٹی کی آواز کتنی ملتی ہے۔ آگے گھنٹی بجی تھی تو میں فون اٹھانے اندر بھاگی۔ صابن کی جھاگ سے تلک (پھسل) گئی۔"

اندر جاتی فریحہ نے مسرت کے پھسلنے پہ ہمدردی جھاڑنے کی بھی ضرورت نہ محسوس کی۔

"ہیلو۔"

ایسا منحوس موٹا بھدا ریسیور تھا کہ اٹھا کے کان سے لگاتے ہی بندے کا موڈ خراب ہو جائے اور بے زاری ہیلو نکلے۔

"ہیلو سلیمہ؟"

بڑی تر و تازہ سی آواز دوسری جانب سے آئی تھی وہ بھی مردانہ۔۔۔ فریحہ سمجھ گئی۔ یہ فون جرمنی سے آیا ہے۔ پاکستان کے مردوں کی بھلا اب ایسی بشاش اور جان دار آواز کہاں نکلتی ہے۔ بجلی کے بڑھتے بل۔۔۔ پٹرول اور ڈیزل کی قیمتیں۔۔۔ آئے دن کی ہڑتالیں۔۔۔ بیویوں کی کمیٹیاں۔۔۔ گرمی اور حبس، یہ سب مل کے ان کو اتنا خونخوار بنا دیتے ہیں کہ وہ ہر بات پھاڑ کھانے کے انداز میں کرتے ہیں۔

"میں فریحہ ہوں سرفراز انکل۔"

اس نے چہک کے کہا۔ سرفراز چاچا جی اور تایا جی کا بھائی تھا۔ دونوں کے درمیان کا۔ یعنی بیچ والا۔ مگر چونکہ جرمنی میں تھا عرصہ دراز سے..... اس لیے نہ کسی کا چاچا تھا نہ تایا.... صرف انکل تھا۔

"کون فریحہ۔" جرمنی والے انکل نے فریحہ کے جوش و خروش کو ٹھنڈا کر دیا۔

"جی.... میں آپ کی بھتیجی۔" بڑی شرمساری کے ساتھ تعارف کرایا گیا۔

"او.... اچھا" اچھا پا جی کی بیٹی۔ کیسی ہو بچے؟ اکمل اور اجمل ٹھیک ہیں؟"

"وہ ارم ہے.... میں فریحہ ہوں۔" وہ اور کھسیانی ہوئی۔

"ذرا ابا جی سے بات کراؤ۔"

اس بار سرفراز نے رشتوں کی تفصیل میں جانے کی زحمت نہیں کی۔

"ہولڈ کریں۔ فون وہاں تک لے جاتی ہوں۔"

وہ بھی روکھے سے لہجے میں کہہ کر جگہ جگہ پھنسی لمبی سی تار کو نکالتے ہوئے فون دادا جی تک لے جانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے کہا جی.... سرفراز کا فون آیا ہے جرمنی سے۔" تائی جی نے ہانپتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔

"فون آیا ہے ناں.... کوئی منی آرڈر تو نہیں آیا۔"

تاؤ جی ویسے ہی جلے بیٹھے تھے۔ آج پھر ہڑتال کی وجہ سے ان کی مارکیٹ میں شٹر ڈاؤن تھا.... اوپر سے سرفراز کا ذکر.... لوگوں کے بھی بھائی باہر جاتے ہیں مگر پیچھے سب کو یاد رکھتے ہیں.... لمبی لمبی رقمیں بھیج کے خاندان کی کایا پلٹ دیتے ہیں.... بھتیجوں بھانجوں یا دامادوں کو ویزے بھیجتے اور بلوا کے سیٹل کراتے ہیں مگر سرفراز ایسا بے دید نکلا.... کہ سال میں ایک دوبار فون کر کے بوڑھے ماں باپ کی خیریت دریافت کر لے تو وہ ہی بڑی بات ہے۔

"اس کا فون بغیر وجہ کے نہیں آسکتا..... ذرا پتا کرو۔"

"وجہ کیا ہوئی ہے.... گونگلوؤں سے مٹی جھاڑنے کے لیے سال بعد فون کر لیتا ہے.... اچھا ہے آج ابا جی کو بھی سویرے سویرے کوئی کوڑ چڑھی ہوئی ہے۔ اچھی اس کی بستی (بے عزتی) کر رہے ہوں گے۔"

تاؤ جی کا اندازہ درست تھا۔ اپنے بھیپھڑوں کی بوسیدگی کی پروا کیے بغیر.... اپنے بیٹھی حلق کی خستہ حالی کو بھلائے وہ زور و شور سے بیٹے پہ برس رہے تھے۔

"نامانیم.... بے ہدایتا.... عید بھی لنگ گئی تو نے پیو کو سلام کرنے فون نہ کیا۔"

"اور نہ ماں کا حال پوچھا۔"

دادی جو ساتھ جڑ کے بیٹھی تھیں.... فوراً لقمہ دینے لگیں۔

"اب کیا پتا کرنے کے لیے فون کیا ہے کہ پیو جیوندا ہے یا مر گیا؟"

"یا بے بے کے قل کب ہیں؟ یہ خبر لینی ہے؟"

دادی کا اگلا لقمہ۔

"چل چل.... وڈا آیا پتر.... ایسے ہوتے ہیں پتر؟ پردیس جا کے پچھلے ہی بھول گیا۔ بے فیض.... لوگوں کے پتر باہر جاتے ہیں تو ماں پیو کو عیش کراتے ہیں۔ ان کو رقمیں بھیجتے ہیں۔ ہوائی جہازوں کے ٹکٹ بھیجتے ہیں۔ ولایت کی سیر کراتے ہیں۔ کوئی حج عمرہ کرا کے ثواب کماتے ہیں۔ تو نے کیا کیا ہے؟"

"تری اک میم ویاہنے کے علاوہ۔" دادی کے لقمے جاری تھے۔

"ہم جئیں.... مریں.... تجھے فکر نہیں ہوتی.... تیرے بھائیوں کے کاروبار مندے ہوں.... ٹھنڈے ہوں۔ تجھے پوچھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ ان کے بیٹے بیاہے گئے۔ تو نے کبھی سلامی نہ بھیجی۔ ان کی کڑیاں رخصت ہو گئیں۔ تو نے داج جہیز کے نام پہ دھیلے کا تحفہ نہ بھیجا۔"

"مجھے تو لگ سونا تک نہ ڈالا۔"

اس بار دادا جی سے دادی جی کے لقمے ہضم نہ ہوئے سو وہ الٹا ان پہ برس پڑے۔

"توں تے چپ کر.... لچکریاں دیے جا رہی ہے۔"

دادی منہ سر لپیٹ کے ناراضی جتاتی پرے ہٹ گئیں۔

"ہاں ہاں مجھے جوانی میں کبھی منہ نہ لگایا تو نے.... بڑھاپے جوتی تھلے رکھا اب کیوں نہ بستی (بے عزتی) کرے گا۔"

دادی کے شرانگیز اور اشتعال انگیز بیان کا جواب دینے کو وقت ہی اب کہاں تھا دادا جی کے پاس۔ سو وہ منہ کھولے ریسیور سنبھالے حیرت سے سرفراز کی بات سن رہے تھے۔

"ابا جی.... میں آپ کے سارے گلے دور کرنے آ رہا ہوں.... پاکستان آ رہا ہوں.... نہ صرف میں بلکہ بیوی بچے بھی۔"

"ہیں.... پاکستان آ رہا ہے تو؟ بیوی بچوں سمیت۔"

دادی جی فوراً "تڑپ کے اٹھ بیٹھیں۔

☼ ☼ ☼

"سرفراز آ رہا ہے؟"

دادی کے ایک بار پھر دخل دینے پہ دادی جی نے گھور کے جھڑکا۔

"اس سے بات کر رہا ہوں تو ظاہر ہے وہی آ رہا ہے۔"

"خیر سے آ رہا ہے؟"

"خیر نال آ رہیا ایں توں؟"

دادی کا سوال دادا جی نے سرفراز سے الٹ دیا۔

"ہاں جی.... نوین کے رشتے کے سلسلے میں آنا تھا۔"

نوین ان کی بیٹی کا نام تھا۔ فریحہ کی ہم عمر۔ دادا جی نے معنی خیز ہنکارا بھرا.... سفید بالوں سے اٹی بڑی گھنی بھنویں اچکائیں اور فون بند ہونے کے اگلے ہی منٹ یہ خبر پورے گھر میں نشر ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"رہنا کہاں ہے سرفراز نے ٹبر سمیت۔"

تائی جی کو سب سے پہلے یہ فکر لاحق ہوئی۔

"ظاہر ہے اپنے گھر.... یہاں۔"

تایا جی کو یہ سوال خاص پسند نہیں آیا تھا۔

"میم بھی آئے گی ساتھ؟"

"یہ تو پتا نہیں.... اسی میم کا تو سارا سیاپا ہے۔ اسی نے تو خون کے رشتے الگ کیے تھے.... عورت چاہے پاکستان کے کسی گلے محلے کی ہو یا لندن امریکہ کی۔ سوہرے کسی کو بھی برداشت نہیں ہوتے۔"

"صحیح کہندے او.... صرف پو تھا ہی پتا کا شاہجم نہیں تھا اس میم کا.... اندر سے بھی چھلی تھی۔ میرے اکمل اور اجمل کتنے گوگلو سوہنے باؤ سے ہوتے تھے تب۔ جو دیکھتا تھا جپٹ جپٹ چومتا تھا۔ ان کی شرارتوں پہ واری صدقے ہوتا تھا۔ بس ایک یہ روکھی سڑی عورت تھی جوان پہ چیختی رہتی۔ ان کی شکایتیں کرتی رہتی تھی۔ ایسی عورتوں کی تو اولاد ہی نہیں ہوتی۔ اللہ سزا کے طور پر ان کی گود خالی رکھتا ہے۔ پتا نہیں اس کے بچے کیسے ہوں گے۔"

"کی پتا کسی کے لے کر پالے ہوں۔"

"نہ جی.... نوین تو ساری دادی پہ ہے۔ وہی چوڑی ناسیں "آگے کو نکلے دند.... اور دونوں منڈوں کے پکے رنگ چاچے پہ گئے ہیں۔ ہے تو وہ آپ لوگوں کی ہی نسل۔"

اس کے بعد تائی جی نے باقاعدہ دوپٹہ اٹھا کے شکر ادا کیا اللہ کے حضور۔

"شکر ہے میرے مولا کا۔ میرے تینوں بچوں میں سے کوئی دادی کول نہیں گیا۔"

☼ ☼ ☼

چاچا جی کے کمرے کا الگ ہی ماحول تھا۔

"سرفراز کی عادت نہیں بھولنے کی.... پھر واپس آنے پہ مانا کیسے؟"

چاچا جی کو رہ رہ کے اپنا اور سرفراز کا وہ جھگڑا یاد آ رہا

تھا جس کے بعد سرفراز تو بیاہتا انگریز بیوی کو لے کر واپس چلا آیا تھا۔

"تسی وی ویسے چنگی تیں کیتی سی۔" (آپ نے بھی ویسے ٹھیک نہیں کیا تھا۔)

پرانی باتیں یاد کر کے چاچی جی کو ہنسی سی آ گئی۔ دوپٹے کا گولہ منہ کے آگے دبا کے ہنسنے سے لہجے میں جتایا تو ہلکی سی مسکراہٹ چاچا جی کے ہونٹوں پہ بھی آ گئی۔

"بس کم عقلی۔"

مگر ساتھ ہی سرفراز کا سخت ترین ری ایکشن یاد آیا تو خجالت غصے میں بدل گئی۔

"لیکن سرفراز نے تو ذرا سے ہنسی مذاق پہ طوفان کھڑا کر دیا۔ ایسا اس میم کو لے کے بھاگا کہ آج تک نہیں لوٹا۔"

"اب لوٹ تو رہا ہے۔ وہ بھی بیٹی کے رشتے کے لیے۔" کمرے کے باہر کھڑا اپنی شرٹ استری کرتا ندیم چونکا۔

"بیٹی رشتہ۔" اس کے کان کھڑے ہوئے۔ دور کانوں میں کہیں شہنائیاں بھی گونجنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"مسرت بھابی۔۔۔ یہ مسٹر فراز تاؤ آ کیوں رہے ہیں؟" روبینہ کے سوال پہ مسرت کی پیشانی ان گنت شکنوں سے بھر گئی۔

"ایک بات کہوں روبینہ۔۔۔ مانے گی؟" اس نے منت کی۔

"ہاں بولو۔"

کہنے کو تو روبینہ نے بولا سا منہ بنا کے کہہ دیا۔ مگر اندر ہی اندر دل چھوٹا سا ہو گیا سکڑ کے۔

ہائے ہائے سو تو کہیں میرا لان کا جوڑا ہی نہ مانگ لے نیا والا۔

نہیں نہیں ضرور سو دو سو ادھار مانگے گی۔ نکڑ والے پارلر میں جا کے بال رنگوانے کے لیے۔

ہائے اللہ میں رات کا کھانا بنانے کا کام میرے سر نہ ڈال دے۔

لیکن اس کے اندازوں کے برعکس مسرت نے بڑی عاجزی سے بس یہ عرض کیا۔

"روبینہ تو سرفراز تاؤ کا پورا نام لینے کے بجائے صرف چھوٹے تاؤ کہہ دیا کر۔"

"کیوں 'پورا نام لینے پہ کرایہ آتا ہے؟"

"کرایہ نہیں آتا۔۔۔ مگر 'ز' بڑی دفعہ آتا ہے اور سنا ہے سرفراز تاؤ ذرا غصے کے کوڑے ہیں۔ ایسا نہ ہو اپنے نام کی رگڑ رگڑ سن کر غصہ کر جائیں۔"

"ویسے میں نے بھی سنا ہے سالوں پہلے ابا جی کی کسی بات پہ ناراض ہو کے گھر سے گئے تھے۔ مجھے کچھ سن گن ہے کہ کس بات پہ لڑائی ہوئی تھی؟"

"بس اتنا پتا ہے کہ مذاق مذاق میں کوئی بات چاچا جی نے ان کی میم بیوی کو لگا دی تھی۔ بس انہوں نے منہ ماری کی چھوٹے بھائی سے۔۔۔ دادا جی اور دادی جی نے چھوٹے بیٹے کی حمایت کی تو ماں باپ سے بھی ناراض ہو گئے۔۔۔ وہ دن اور آج کا دن پلٹ کے نہیں دیکھا۔"

"اب تو دیکھ رہے ہیں۔"

"سنا ہے اپنی لڑکی کا رشتہ کرانے آ رہے ہیں۔"

"کیوں ادھر امریکہ میں رشتہ نہیں مل رہا تھا؟"

"نہیں مل رہا ہو گا ناں۔۔۔ جب ہی تو آ رہے ہیں۔"

"ہائے ہائے۔۔۔ پہلاں ہی ڈبی جتنا گھر ہے اس پہ مہمان وہ بھی نجانے کتنے۔"

"سنا ہے چار بچے ہیں ان کے۔ میم بیوی نہ بھی آئی تو پانچ لوگ تو ہوں گے ہی۔"

"ہاں بچ۔۔۔ ان کو کیا سر پہ بٹھائیں گے۔"

"یہ سلیمہ حلیمہ بھی تو مہینہ مہینہ آ کے رہتی ہیں اپنے درجن بچوں کے ساتھ۔ ہو ہی جاتا ہے گزارا بلکہ اچھا ہے مہمانوں کے آنے کی وجہ سے ضرور امی جی نے بیٹیوں کو کہنا ہے کہ بھئی سامان باندھو اور اپنے گھر سدھارو۔ اگر مہمانوں کے آنے سے یہ بلائیں ٹلتی ہیں تو سو دفعہ آئیں ایسے مہمان۔"

"ہاں۔۔۔ تمہاری امی جی نے کہا اور سلیمہ حلیمہ نے باندھ لیا سامان۔۔۔ ہونہہ۔"

روبینہ نے حقیقت سامنے لا کے اس کا دل جلایا۔

"مجھے تو لگتا ہے اس گھر میں طوفان آنے والا ہے۔ حلیمہ سلیمہ بھی بچوں سمیت ادھر۔۔۔ اور امریکہ والے سرفراز تاؤ کے بھی ڈیرے ادھر۔۔۔ ہم گھر والوں کو ہی بوریا بستر باندھ کے کہیں اور دفع ہونا پڑے گا۔"

☼ ☼ ☼

"ہائے ہائے امی جی۔ آپ نے تو آنکھیں ہی ماتھے پہ رکھ لی ہیں۔" حلیمہ نے منہ بسور کے ماں سے کہا۔

"سمجھا کر۔۔۔ وہ بھی ٹبر لے کر آ رہا ہے۔ اتنے لوگ کدھر پورے آئیں گے ذرا سے گھر میں۔"

"جگہ تو دل میں ہوتی ہے۔" سلیمہ نے ڈائیلاگ جھاڑا تو تائی جی کو تپ چڑھ گئی۔

"تو پھر دل میں ہی جگہ بنا کے پڑ جا۔۔۔ کمرہ ان کے لیے خالی کرا دے۔"

"ہاں جی۔۔۔ امریکہ کے مہمان آ رہے ہیں۔ اس لیے سارے بے دید ہو رہے ہیں۔ سگی بیٹی کو سامان باندھ کے میکے سے نکلنے کے آرڈر دیے جا رہے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ ہمارا کچھ نہیں لگتا وہ۔ ہمارا بھی تو تاؤ ہے۔ ہم نے نہیں ملنا کیا اس سے؟"

سلیمہ ابھی ابھی جا کے بچوں کی نئی نیکریں شرٹیں لے کے آئی تھی۔ امریکہ والے چھوٹے نانا جی کے سامنے پہنانے کے لیے۔ اس لیے واپسی کے حکم پہ تپ سے زبان آگ اگلنے لگی تھی۔

"تو مل لینا۔۔۔ وہ کون سا گھڑی دو گھڑی کے لیے آ رہا ہے۔ بعد میں آ کے مل لینا۔ ابھی آتے ہی چالیس بندے اکٹھے دیکھے گا گھر میں تو گھبرا جائے گا۔ تجھے تو پتا ہے تیرا چھوٹا تایا چھوٹے دل کا ہے۔"

"سیدھی بات ہے امی جی! آپ لوگ نہیں چاہتے امریکہ سے آئے تحفوں کی ہوا بھی ہمیں لگے۔"

"تو کڑیے۔۔۔ سیدھی بات یہ بھی ہے کہ تو جو یہاں سے ہلنا نہیں چاہتی تو ان ہی تحفوں کی ہوا لینے کے لیے۔"

چاچی جی بھی سلیمہ کی ماں تھیں۔ پلٹ کے کرارا جواب دے کر منہ بند کرا لیا۔

مگر یہ منہ بس ایک سیکنڈ کے لیے بند ہوا تھا۔ اس کے بعد جو کھلا تو دونوں بہنوں نے میکے کبھی نہ آنے۔۔۔ مرنا جینا ختم کرنے اور ماں باپ کا خون سفید ہو جانے سے لے کر امریکیوں کی غلامی تک کے طعنے دے ڈالے۔ ساتھ ساتھ سامان پیک ہو رہا تھا۔

الگنی پہ لٹکے پیلے پڑتے لنگوٹ۔۔۔

کچن کی سلیب پہ مکھیاں بھنکاتے فیڈر۔۔۔ جن میں رات کا بچا دودھ اب پیلے رنگ کے دہی میں بدل چکا تھا۔

شاہ عالمی سے خریدے الم غلم کے باہر کو ابلتے شاپر۔ پرانے کپڑے جو سسرال سے بھر کے لائے گئے تھے۔ ان کے بدلے کل شام گلی میں آئے تانے سے لیے گھٹیا پلاسٹک کے ڈول۔۔۔ اور ٹوکریاں۔

چاچی جی سکون سے بیٹھی پھلیاں بناتی رہیں۔ اور ماؤں کی طرح انہیں بیاہی بیٹیوں کو سر چڑھانے کا خاص شوق نہ تھا۔ ہفتے کے ہفتے آتی تھیں۔ سو بسم اللہ۔۔۔ جو پکا ہوتا سامنے رکھا جاتا۔ جوائی نے آنا ہوتا تو پلاؤ، آلو گوشت وغیرہ کا اہتمام بھی ہو جاتا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں دس پندرہ دن گزارنے آتیں تب البتہ ضرور ناک تک عاجز آ جاتیں۔

پہلے دو دن تو ٹھیک گزرتے۔۔۔ تیسرے چوتھے دن سے ماں بیٹیوں میں ٹھننے لگتی۔ مگر شاباش ہے حلیمہ سلیمہ پہ۔۔۔ بڑا جگرا تھا بھئی۔۔۔ ثابت قدمی سے جمی رہتیں۔۔۔ ماں کے ماتھے کی سلوٹیں گنتی میں نہ لاتیں۔

دونوں بہنوں میں ایکا بھی بڑا تھا۔

اب بھی دونوں مشترکہ دکھ سمیٹے مشترکہ شاپنگ اکٹھی کرتے گھر سے نکلیں۔ مشترکہ طور پہ ہی کرایہ ملا کے چنگ چی رکشہ کرایا۔

☼ ☼ ☼

سارا گھر سرفراز کے آنے کی خبر پہ مختلف تبصرے کرنے اور طرح طرح کا ری ایکشن دینے کے بعد اب دل جمعی سے ان کے استقبال کی تیاریوں میں لگ گیا۔ جو بھی تھا۔۔۔ آخر خون کے رشتے تھے۔ کچی اینٹوں پہ کائی جم تو جاتی ہے۔ اترتی بھی اتنی آسانی ہی سے تھی۔

دادی جی نے کب کا سنبھال کے رکھا چکن کا آف وائٹ سوٹ نکالا۔۔۔ بھولی درزن کو سلنے دیا۔۔۔ عرصے بعد مہندی ۔۔۔ لیے کبھی بالوں پہ تھوپا کرتی تھیں۔ اب تو سر پہ ہی تھوپنی پڑتی تھی۔ چندیا کے ساتھ ساتھ گنتی کے چند بال بھی رنگے جاتے۔

دادا جی نے تاؤ جی سے اپنے پیروں کے ناخن ترشوائے کہ باہر سے آنے والے پوتے پوتیاں انہیں کواہی نہ سمجھ لیں۔ ایک تو رنگ پکا اوپر سے آنکھیں چھوٹی تیرا کوتے کے پنجوں جیسے سوکھے چرخ لیے ناخنوں والے پیر۔۔۔ چار خانے والا نیا تہبند کلف لگا کے استری کرایا گیا۔۔۔ ''کھیڑی'' کو موچی کے پاس لے جا کے ٹانکے لگا کے پہننے کے قابل بنایا۔۔۔ وانا صاحب نے باہر بیٹھے شعبدہ گروں سے عطر بھی خریدا تاکہ اس کے پھریرے لگا کے پسینے کی بدبو کے بھبکے کم کیے جا سکیں۔ حالانکہ اس عطر کی اپنی بو اتنی تھی کہ پاس سے گزرنے والا بوکھلا کے ناک میں انگلیاں دے لے۔

تاؤ جی اشرف نے دل پہ پتھر رکھ کے گھر کے باہر کی دیواروں پہ قلعی کرنے کا ارادہ باندھا۔۔۔ اندرونی دیواروں پہ کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور اس آدھے پونے اہتمام کے لیے بھی بیٹوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے بھائی سہیل سے بھی مالی مدد مانگی گئی۔

فریحہ نے پارلر جا کے نئے اسٹائل کے بال کٹوائے جو اگرچہ اس کے تکونے چہرے پہ بے حد بھدے لگ رہے تھے مگر وہ اپنے تئیں صنم بلوچ بن کے آنکھیں بالوں کی جھالر میں چھپائے بڑی مطمئن تھی۔

ارم نے نور تن ابٹن کی بڑی ڈبیا منگوائی ساتھ میں عرق گلاب۔۔۔ اور لگی صبح و شام رگڑائی کرنے چہرے کی۔۔۔ مگر برا ہو محلے کے پنساری والے کا۔۔۔ ابٹن تو اس نے پھر بھی ٹھیک دے دیا مگر عرق گلاب کی شیشی نجانے کس عشرے سے اس کی دکان کی سیلن زدہ شیلف میں پڑی سڑ رہی تھی۔ بھادوں کے حبس نے عرق گلاب کو تیزاب میں بدل کے رکھ دیا تھا۔ بیچاری کے چہرے پہ گندے ۔۔۔ سے دھبے پڑ گئے۔ جس پہ کھجا کھجا کے اس نے انہیں آبلوں کی شکل دے دی۔

اکمل اور اجمل البتہ اپنے میں مگن تھے۔

اجمل کو تو پھر بھی یہ فکر لاحق تھی کہ نجانے آنے والے پورے مسلمان بھی ہیں یا نہیں۔۔۔ اپنی میم چاچی تو نہ آنے۔ تو پھر بھی کچھ اطمینان تھا۔۔۔ مگر یہ شک بہرحال اپنی جگہ موجود تھا کہ چاچا سرفراز کی اولاد کلمہ گو ہے یا ماں کی طرح چرچ جانے کی شوقین۔ اس نے موت کا منظر نامہ کے سب سے بھیانک باب دوبارہ سے ذہن نشین کیے۔ جہاں جہاں بھول کے اٹکتا تھا وہاں سے دل لگا کے رٹے مارے۔

اکمل کو روبینہ نے ہی کچھ سوچنے سمجھنے یاد کرنے کی فرصت نہیں دی۔ وہ خوب اس کی جیبوں سے مال نوچ کھسوٹ کے نئے نئے جوڑے بنوا رہی تھی۔ جیسے امریکہ والے اس کی خوش لباسی کی داد دینے ہی تو اتنا پیسہ خرچ کرکے آ رہے ہیں۔ جامنی رنگ کا انار کلی فراک۔۔۔ نارنجی کڑھائی اور نارنجی چوڑی دار پاجامے کے ساتھ۔۔۔ ساتھ میں سبز دوپٹا۔۔۔ پوری بینگن کی دیگ بننے کا ارادہ تھا۔ سرخ جارجٹ کے جوڑے پہ کالے موتی اس نے خود ایسے بھدے اور بے تکے انداز میں ٹانکے تھے کہ دور سے دیکھنے پہ یہی گمان ہوتا تھا ڈھیر ساری مکھیاں جا بجا بیٹھی بھن بھن کر رہی ہیں۔ اور سب سے عمدہ تو وہ کالا کریپ کا ڈھیر ساری کلیوں والا کرتا تھا۔۔۔ جس کا پرنٹ بڑا ہی عجیب و غریب تھا۔ موٹے تازے سبز سیب اور سرخ انار بھی بنے تھے۔ انگور کے گچھے بھی۔۔۔ رنگ برنگی تتلیاں بھی چھپی تھیں۔۔۔ پشت پہ گدی کے نیچے بڑی نشیلی سی سبز رنگ کی آنکھ بھی تھی جو جاسوسی ماہیوں اور ناولوں کے سرورق پہ عموماً چھاپی جاتی ہے۔۔۔ دامن پہ موٹے موٹے لہو رنگ ہونٹ۔۔۔ پیٹ کے پاس تیر کھا دل

۔۔۔ آستینوں میں واحد کام کی چیز تھی۔۔۔ پھولوں کی بیل۔۔۔ نجانے یہ نادر اور عجوبہ پرنٹ اس نے باڑے کے کس پٹھان سے حاصل کیا تھا۔ دنیا کی ایسی کوئی چیز اس پہ چھپنے سے نہ رہ گئی تھی جو چارسدہ سے بنوں جانے والے ٹرک کے اوپر بنی ہو۔

دل تو مسرت کا بھی تھا ایک آدھ جوڑا نیا بنوانے کا۔ کم از کم ایئرپورٹ جانے کے لیے ہی سہی۔۔۔ مگر اجمل نے سختی سے منع کر دیا۔ نیا جوڑا بنوانے سے نہیں۔ ایئرپورٹ جانے سے۔۔۔ وہ کلس کے رہ گئی۔

ایئرپورٹ جانا کون سا غیر اسلامی کام ہے۔

''میں ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ غیر اسلامی ہے۔''

''اچھا جی وہ کیسے؟''

''جہاز کس نے بنایا؟''

''میری جانے بلا۔''

مسرت نے جلے بھنے انداز میں کہا تو اجمل کو جلال آگیا۔۔۔ فوراً ''گھرکی دی۔

''ٹیڑھا جواب دیتی ہے مجازی خدا کو۔''

وہ فوراً ''دبک گئی۔۔۔ منمنا کے کہا۔

''مجھے واقعی نہیں پتا جی۔''

''کسی انگریز نے بنایا تھا۔۔۔ کسی چوڑے نے' کسی کافر مشرک نے اور جس طرح چوڑوں کے برتن میں کھانا پینا حرام ہے۔ ان سے شادی بیاہ کاروبار حرام ہے اسی طرح ان کے بنائے جہازوں میں سفر کرنا بھی حرام ہے۔''

''تو لوگ حج عمرہ کرنے بھی تو ان ہی جہازوں پہ جاتے ہیں۔''

مسرت کے نکالے نکتے پہ پہلے تو وہ چیں بہ جبیں ہوا۔ پھر لولا لنگڑا سا جواز پیش کیا۔

''حج عمرے کی بات اور ہے۔ حج عمرے کی نیت کرتے ہی سب پلاک چیزیں پاک ہو جاتی ہیں۔''

اس کے بعد چونکہ بیوی نے عورت ذات ہونے کے باوجود لیس دینے کی۔۔۔ سوال اٹھانے کی اور سب سے بڑھ کر الا جواب کرنے کی گستاخی کی تھی' اس لیے اس کی پاداش میں اسے جہنمی ہونے کا فتویٰ سنا دیا۔

''زبان چلاتی ہے آگے سے۔۔۔ حجت کرتی ہے۔ نافرمان جہنمی عورت' تیری عاقبت مجھے سنورتی نظر نہیں آرہی مسرت۔''

''عاقبت تو بعد کی بات ہے' مجھے تو یہ اپنا حال بھی سنورا ہوا نہیں لگتا۔''

مسرت نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کے کہا۔

☆ ☆ ☆

''میں کیسا جی۔۔۔ سارے ایئرپورٹ جائیں گے کیسے؟''

''سوزوکی کروا لوں گا۔''

''کرائے پہ؟''

''ناں تو اور تیرا ماما مجھے مفت میں دینے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔'' تاؤ جی غصے میں بیوی پہ الٹ پڑے۔

''عمر ہو گئی اب تو میرے ماں پیو' ماے چاچے سارے مٹی ہو گئے۔ اب تو ان کو کوسنا بند کرو۔'' وہ بھی تاؤ کھا گئیں۔ ''ایک گل ہی پوچھی ہے ناں۔''

''سوزوکی پک اپ کرائے پہ لوں گا۔۔۔ میں' سہیل' اکمل' اجمل' ندیم چلے جائیں گے۔''

''خالی مرد؟''

''نہیں بھرے ہوئے مرد۔''

''توبہ اے جی تسی تے توپ دے منہ تے بیٹھے او۔'' (توبہ ہے جی آپ تو توپ کے دہانے پہ بیٹھے ہو۔)

''تو بھی تو سوال پہ سوال مارتی جا رہی ہے بھلیے لوکے۔۔۔ اور ایئرپورٹ پہ زنانیوں کا کیا کام۔''

''کیوں؟ ایئرپورٹ زنانیوں سے پردہ کرتا ہے اور کرایہ دے کرا تنی وڈی سوزوکی کرائے پہ لینی ہی ہے تو کیا خالی لے کر جاؤ گے۔ اس میں ہمارا سارا ٹبر پورا آجائے گا۔''

''ہمارا تو آجائے گا۔۔۔ سرفراز کا ٹبر کیا پیچھے پیچھے دوڑ لگاتا آئے گا۔۔۔ ان کے بھی چار پانچ جی ہیں اور پھر سامان بھی ہو گا۔ وہ کہاں رکھنا ہے۔''

''ہاں۔۔۔ سامان۔'' تائی جی کی آنکھیں چمکیں۔

''جوان کے استعمال کا سامان ہو گا۔ وہ بھی اور جو وہ

ہم ساروں کے لیے تحفے لائے گا بکسے بھر کے 'وہ بھی۔" تحفوں کے نام پہ تایا جی کے ہونٹوں پہ بھی ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"اکمل اور اجمل دونوں کی شادیوں پہ میں نے دو گھوڑا بوسکی کے سوٹ پہنے تھے۔ بڑا دل ہے اس بار ارم کی شادی پہ پینٹ کوٹ والا سوٹ پہنوں ٹائی لگا کر۔ وہ بھی ولایتی امریکہ سے آیا ہوا۔"

"اور سرفراز سے کہنا میرے لیے تو گوڈوں کی مالش کرنے والی مشین لے آئے۔"

"گوڈوں والی مشین؟؟"

"آہو۔ میں نے تب دیکھی تھی ٹی وی پہ۔ گھرر گھرر کرکے چلتی ہے۔ گوڈوں پہ رکھو چاہے گٹے پہ رکھو۔ مالش کرکے سارا درد ختم کردیتی ہے۔"

"پھر تو کہے گی۔ لک (کمر) پہ کھرک (خارش) کرنے والی مشین آگئی ہے۔ وہ بھی لے آؤ۔ ہاتھ پیرنہ ہلانا تم زنانیاں۔"

☼ ☼ ☼

اور ان سب کی سرگرمیوں سے بالکل الگ دو لوگ تھے جو ان مہمانوں کی آمد پہ ایک الگ سی دنیا بسا بیٹھے تھے۔

ایک ارم۔

اور ایک ندیم۔

ارم کو آس تھی شاید سرفراز چچا کے بڑے والے بیٹے کی نظروں میں اندھرا ناٹر آئے اور وہ اسے پسند کر لے۔

ندیم کو آس نہیں پکا یقین تھا، سرفراز چچا کی بیٹی کے لیے جس گوہر مقصود کی تلاش میں وہ لوگ پاکستان کی خاک چھاننے آرہے ہیں 'وہ وہی تھا ندیم سہیل۔

اس نے مچھلی کے انڈوں کا بنا تیل بڑے مہنگے داموں خرید کے اپنے آگے سے چٹیل ہوتے ماتھے پہ لگانا شروع کردیا تھا۔ تمباکو کھانے سے پیلے پڑتے دانتوں کی دوا تا صاحب کے باہر بیٹھے دندان ساز سے صفائی کرا کے انہیں چکا چوند کرالیا تھا۔

لنڈے سے جاکے تین چار شوخ رنگوں کی شرٹس بھی خریدی تھیں۔ ایک پہ لکھا تھا۔

I love newyork دوسری پہ پوپائے دی سیلر منہ ٹیڑھا کرکے پائپ پی رہا تھا۔ تیسری پہ میڈونا کا بڑا تباہ کن پوز تھا۔

ارم کی تیاریاں البتہ ذرا الگ قسم کی تھیں۔ اس نے وظیفے اور چلے شروع کردیے تھے۔ کسی رسالے میں پڑھا ہوا گھڑے اور چابی والا ٹوٹکا بھی کرنا شروع کر دیا۔ وہ جو جمعے کے جمعے دادی کی لعنتیں لینے کے بعد بارے بندھے نماز پڑھتی تھی 'اب مصلے سے ہی نہیں اٹھتی تھی۔ لمبی لمبی دعاؤں کے ذریعے اللہ کو راضی کرنے کی کوششیں۔

"اللہ میاں جی کچھ ایسی کشش پیدا کردو میری شکل میں۔ چاچا جی کو سارا امریکہ ایک طرف اور میں دوسری طرف نظر آؤں۔ ہائے ہائے 'نہیں یہ تو ذرا الٹی قسم کی دعا ہوگئی۔ نہیں نہیں اللہ میاں جی! چاچا جی کو نہیں ان کے بڑے والے سپوت کو کھینچے میری کشش نہیں مگر ہم میں سے تو کسی کو یہ بھی نہیں پتا کہ ان کا بڑا بیٹا کنوارا ہے یا شادی شدہ۔"

اب دعا میں رد و بدل کیا گیا۔

"اللہ میاں جی! چاچا جی کے کنوارے والے بیٹے کے دل میں میری محبت ڈال دے۔ (اوئے ہوئے۔ بہنوں والی محبت ہی نہ پیدا ہوجائے) نہیں نہیں اللہ میاں جی! اس کے دل میں میرے لیے عشق بلکہ رومانس بھردے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

☼ ☼ ☼

اللہ اللہ کرکے وہ دن آگیا۔ جب رات کے آٹھ بجے ان کی فلائٹ آنی تھی۔ صبح سے ایک ہاہا کار مچی تھی گھر میں۔ کچن میں مختلف پکوان پک رہے تھے۔ دادی کی چیخ و پکار الگ۔

"سرفراز کو میٹھی روٹی پسند تھی وہ ضرور بنانا۔"

"اوہو دادی۔ وہ امریکہ سے اتنا لمبا سفر کرکے آ رہے ہیں۔ آدھی رات کو انہیں میٹھی روٹی کھلادی تو

مروڑا ٹھیں گے انہیں۔" فریحہ نے پتے کی بات کی۔

"پھٹے دودھ کی رس ملائی بھی اچھی لگتی تھی اسے۔"

"چلو اب اچھا بھلا دودھ پھاڑو۔" چاچی جی نے بڑبڑا کے برتن پٹخا۔

"اور موتگرے پہ تو جان دیتا تھا۔"

دادی کی یادداشت مختلف میان نشر کررہی تھی۔

"مگر دادی اب موتگرے پھلنے کی بدبو ان کی جان نکالے گی۔"

"دفع دور۔ لکھ دی لعنت 'بو تھی پیڑی تے گلاں دی پیڑیاں لعنت ہوگی۔"

"میں تو ساتھ نہیں جاسکوں گا ابا جی۔" اجمل نے آکے تایا جی کو اطلاع دی۔

"کیوں؟ تجھے کیا تکلیف ہے۔"

"میں جماعت کے ساتھ جارہا ہوں۔"

اب تبلیغ کے دورے سے روک کر خود کو جہنمی بھی نہیں کہلا سکتے تھے۔ اس لیے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کے رہ گئے۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ جب بھی گھر میں اس کی ضرورت ہوتی کوئی ضروری کام ہوتا اسے تبلیغ کے لیے اچانک ہی کوئی ہنگامی دورہ کرنا پڑ جاتا۔

"اور میں نے بھی نہیں جانا۔"

اکمل نے آلو گوشت کے شوربے میں سنی انگلیاں چوستے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ تو نے کون سی تبلیغ دینی ہے اور کسے دینی ہے۔"

"مجھے آج یاروں دوستوں کے ساتھ باہر کھانا کھانے جانا ہے۔ کتنی چوپ۔"

"تو ادھر بیٹھا کیوں ڈبھ (ٹھونس) رہا ہے؟"

چاچی جی کو جلال آیا۔ ان کے نہ نہ کرتے بھی کم بخت ہٹھ کی دو تین اچھی بوٹیاں چن کے نکال لے گیا تھا۔

"وہ تو فلم کے بعد کھانا ہے۔ تین گھنٹے تک بھوکا بیٹھا رہوں کیا؟"

"ادھر خرچے پورے نہیں ہوتے۔ تجھے فلمیں دیکھنے 'یاروں کے ساتھ گھومنے اور کباب کھانے سے فرصت نہیں ہے۔"

"میرے پاس کہاں سے آنے ہیں پیسے یار خود لے کر جارہے ہیں سمجھے اور خود کھلا رہے ہیں کباب۔"

اب وہ بڑی پلیٹ میں مار مار کے اس میں سے گودا نکال رہا تھا اور سلاد کے لیے کھیرے کاٹتی روبینہ نے مارے پریشانی کے اپنی انگلی کاٹ لی کیونکہ آج اس نے اپنے جہیز کا چینی کا ڈنر سیٹ نکالا تھا اور گنوارا اکمل کے ہاتھ جو پلیٹ تھی اس میں وہ ٹھکا ٹھک ہڈیاں بجا رہا تھا۔ "پینڈو کہیں کا۔ یہ ہی سلور اسٹیل کی پلیٹوں میں کھانے کے لائق۔"

"آہو۔ بڑے ساہو کار ہیں ناں تیرے دوست 'کوئی پنکچر لگانے والا کوئی ٹکٹوں بلیک کرنے والا 'کوئی چنگ چی رکشوں میں گیس بھرنے والا۔ ان کی اتنی اوقات کہاں کہ وہ تجھے کباب کھلائیں 'فلمیں دکھائیں۔ وہ بھی تیرا ہی یار ہے ناں 'وہ تیلی جیسی مونچھوں والا زلفی 'وہ جس کی ماں دو مہینے پہلے مری تھی تو تبرکی کرانے کے لیے بھی مسجد میں جمعہ کے بعد چندہ جمع کررہا تھا۔"

تائی جی نے بخیے ادھیڑے تو اجمل بھی پیچھے نہ رہا یادداشت کھنگالنے میں۔

"اور ابا جی۔ وہ جیدا۔ جس کا باپ ہسپتال میں تھا تو ایدھی والوں کو فون کرکے خود کھسک گیا تھا وہاں سے شوہدا۔"

"اور تو اور ابا جی یہ ایک واڑی مجھے اپنے یار کے ولیمہ میں لے کے گئے۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے۔ میں نے زندگی میں پہلی واڑی ایسا ولیمہ دیکھا تھا جس میں کالے مٹر اور چنے چاول پکے تھے 'نالے رائتہ چٹنی رکھنے کی بجائے لسوڑے کا اچار رکھا تھا۔ توبہ۔ ایسے بھوکے ننگے یار ہیں ان کے۔"

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے کے مطابق روبینہ نے بھی گفتگو میں حسب توفیق حصہ ڈالا۔

باپ اور بھائی کے بیان نے اسے اتنا اشتعال نہیں دلایا تھا جتنا بیوی کے ڈالے حصے نے دلایا۔ وہ ہاتھ

میں پکڑی ہڈی پھینک کے چینی کی پلیٹ کو پرے ہٹاتا ..... شوربے کے چھینٹے اڑاتا ______ روبینہ کے سارے میکے کو نوازتا گھر سے نکل گیا۔

"بس جی... بری ہو گئی... اتنے سال ہو گئے مٹی پلید کراتے... ساڈوں کے سامنے ننگی گالیاں دے گیا ہے۔ کوئی نہیں ہے ٹوکنے والا۔"

"سب دین سے گمراہی کا نتیجہ ہے۔" اجمل نے فتویٰ دیا تو تاؤ جی اس پہ بگڑ گئے۔

"اوئے تجھے نہ نکل... یہ بتا میرے ساتھ کون چل رہا ہے ایئرپورٹ... ایک عمر گزار کے وہ پردیس سے واپس آ رہا ہے اور دو بندے بھی اسے لینے نہ جائیں۔ کتنا برا لگے گا اسے۔ نہ اکمل جا رہا ہے نہ اجمل۔ سہیل نے تو ویسے ہی نہیں جانا۔"

"اباجی... ویسے چاچا جی کے نہ جانے کے پیچھے راز کیا ہے؟ میرا مطلب ہے ان کی چھوٹے تاؤ سے ایسی کون سی بات ہوئی تھی جو..."

مسرت نے ٹوہ لینے کی کوشش کی مگر تاؤ اشرف نے جھڑک کے رکھ دیا۔

"بس بس پرانی باتوں کو کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہیں جاتا کوئی تو نہ جائے۔ دفع ہوں سارے۔ میں اکیلا چلا جاؤں گا اپنے ویر کو لینے۔"

وہ تو مسرت کا سوال ٹال کے نکل گئے مگر مسرت کے ساتھ ساتھ فریحہ کے تجسس کو بھی مزید ہوا دے گئے۔

"نی فریحہ! تجھے کچھ پتا ہے سالوں پہلے دونوں چاچوں میں کس بات پہ لڑائی ہوئی تھی؟"

"نہ... میں نے پوچھا بھی تھا اک بار امی سے مگر وہ ٹال گئیں۔"

"اپنے اباجی سے پوچھنا تھا ناں۔ لڑائی ان کی ہوئی تھی۔ انہیں زیادہ پتا ہوگا۔"

"لو... ان سے پوچھ کے میں نے شامت لانی ہے۔"

"مگر میں بھی اب پتا لگا کے رہوں گی۔"

"اس سے پہلے اندازہ نہ لگا لیں؟"

"چل پھر لگا اندازہ۔"

"میرا خیال ہے میرے اباجی کی چونکہ اب شادی نہیں ہوئی تھی... کنوارے تھے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے چھوٹے تاؤ جی سے فرمائش کی ہو کہ وہ انہیں بھی اپنے ساتھ امریکہ لے جائیں۔ انہیں وہاں سیٹ کریں اور ان کی نئی نویلی امریکن میم بیگم یعنی ہماری چچی صاحبہ کو ناگوار گزرا ہو۔"

"مجھے تو لگتا ہے چونکہ چاچا سہیل تب منڈے کھنڈے تھے۔ اب اتنے شوخے ہیں۔ تب تو اور بھی ہوں گے اور گھر میم آئی ہو تو چاہے وہ میم بھرجائی ہی کیوں نہ ہو، چھیڑنے کو دل کرا ہوگا۔ کوئی پونڈی ماری ہوگی۔"

"ہا... ہائے بھابی... میرے منہ پہ آپ نے میرے شریف اور باعزت اباجی پہ نظربازی اور اپنی بھابی کے ساتھ بدتمیزی کا الزام بھی لگا دیا... توبہ توبہ۔"

فریحہ باقاعدہ برا مان گئی۔

"الزام کب لگایا ہے۔ صرف اندازہ مارا ہے۔"

"بڑی بری طرح مارا ہے۔"

وہ بڑبڑا کے رہ گئی۔

٭ ٭ ٭

"اباجی تسی کی کرو گے اوتھے جا کے۔"

دادا جی کو ساتھ چلنے پہ آمادہ دیکھ کے تاؤ جی چیں بہ جبیں ہو رہے تھے۔

"کھوتیا! توں کی کرن جا رہیا ایں؟" (گدھے تو کیا کرنے جا رہا ہے۔)

"میں تو سرفراز کو لینے جا رہا ہوں۔"

"تو میں کون سا اسے واپسی کی ٹکٹ پکڑا کے دوبارہ امریکہ ٹورنے جا رہا ہوں... میں بھی ساتھ لے کر آؤں گا۔"

"اباجی ادھر سے ایئرپورٹ ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ ہے۔"

"پیدل؟"

"نہیں... گڈی پہ۔" وہ زچ ہو اٹھے۔

"تے فیر بک بک کیوں کر رہیا ایں۔" (تو پھر بک بک کیوں کر رہے ہو؟)

"توبہ۔"

مارے کوفت کے تاؤ جی کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اپنے بال نوچ لیں... اگر ہوتے تو... بال تو کب کے داغ مفارقت دے چکے تھے اب خجالت اور کوفت مٹانے کے لیے وہ اپنی چندیا پہ ناخن کے کھونٹے مارنے سے تو رہے۔

"اباجی... سوزوکی پک اپ پہ جانا ہے۔ ایک تو وہ اتنی اونچی ہے۔ آپ سے چڑھا نہیں جائے گا۔ اوپر سے اوکھے سوکھے ہو کے چڑھا بھی دیا تو آپ کا انجر پنجر ہل جائے گا اس سوزوکی کی سواری میں۔"

"او کج نہیں ہوتا۔"

"اور اودھر ایئرپورٹ پہ دو چار گھنٹے انتظار میں سوکھنا پڑے گا۔"

"کیوں؟"

"ایسا ہی ہوتا ہے اباجی... سامان باہر آنے میں بڑا وقت لگتا ہے۔"

"چل بہانے نہ بنا میرا پتر اتنے سالوں بعد گھر واپس آ رہا ہے۔ میں نہ جاؤں۔ ہو جی کر لو گل۔"

"اوہو ابا... تسی شوگر دے مریض... دل گھٹ جائے گا۔"

"لو! ایویں گھٹ جائے گا۔ میں نے روح افزا کی تھرماس بھی بھر دی ہے اور ساتھ میں روٹی والا ڈبہ بھی۔"

ارم نے دادا کے کاندھے سے لاڈ سے لٹکتے ہوئے کہا... آخر بڑوں کو راضی رکھنے میں ہی بھلا تھا کل کلاں کو چاچا سرفراز کا امریکن بیٹا اس پہ دل ہار جاتا تو یہی دادا جی آخری فیصلہ سنا سکتے تھے اور یہ فیصلہ ارم کے حق میں ہو، اس کے لیے اس کا دادا کی لاڈو بننا ضروری تھا۔

تاؤ اشرف نے کچا چبا جانے والی نظروں سے روح افزا کی بھری تھرماس اور سٹین لیس سٹیل کے چار منزلہ ٹفن کو دیکھا اور پیر پٹختے گھر سے نکلے... دادا جی لاٹھی ٹیکتے ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

٭ ٭ ٭

مسرت نے پلاؤ کے دیگچے کا ڈھکن اٹھا کے دیکھا۔ ایک تگڑی سی بوٹی اٹھا کے گرما گرم ہی منہ میں ڈالی اور منہ ہلا ہلا کے کھاتی دوسرے دیگچے میں پڑے زردے میں سے اوپر اوپر نظر آتے کاجو بادام چننے لگی۔ اب اس کا رخ روبینہ کے کمرے میں تھا جہاں وہ اکمل کی دی گالیوں کے گھاؤ سہلا رہی تھی اور اپنے ککے زئی خون کو ابلنے سے روک رہی تھی۔

"لعنت ہو گا... مکھی جیسی شکل والا۔ شکر نہیں کرتا میرے جیسی زنانی مل گئی... بدزبان شہدا۔"

"روبینہ! چل موقع اچھا ہے۔"

"کس بات کا؟" روبینہ نے مسرت کا منہ جلتے دیکھا تو دوبارہ پوچھا۔

"پلاؤ میں سے بوٹیاں چننے کا؟"

"نی نہیں نی۔۔۔ دادی کے گوڈے سے لگ کے پرانے راز اگلوانے کا۔"

"راز۔"

"راز نہیں 'راز وہ راز جو کوئی کھولتا ہی نہیں کہ آخر سرفراز چاچا جی اور سہیل چاچا جی میں لڑائی کس بات پہ ہوئی تھی۔"

"کھے تے سواہ گل ہوئی ہوگی۔ ساڈوں کی۔"

"نہیں روبینہ۔۔۔ پتا لگنا ضرور ہے۔ اب سرفراز چاچا جی پتا نہیں کتنے دن رہنے آرہے ہیں پتا نہیں کس نیت سے آرہے ہیں۔ ہمیں بھی ساری کہانی پتا ہونی چاہیے۔ خاص طور پہ یہ کہ کون صحیح تھا کون غلط کون سچا کون جھوٹا۔"

"پر بتائے گا کون؟"

"دادی۔۔۔ آگے تو دادا جی ان کے گوڈے سے گوڈا جوڑ کے بیٹھے ہوتے ہیں۔۔۔ آج ایئرپورٹ گئے ہیں۔ دادی ویسے بھی سڑی بیٹھی ہیں کہ انہیں ساتھ نہیں لے کے گئے مچ پر سے انکل اجمل اور چاچا جی کے نہ جانے کا بھی غصہ ہے۔ دیکھ لینا۔۔۔ میں نے دو سوال کرنے ہیں اور انہوں نے ساری کہانی فرفر سنا دینی ہے۔"

"منہ میں دند ہیں نہیں ان کے 'دو باتیں کریں تو ساہ پھول جاتا ہے۔ فرفر کیا سناتا ہے۔"

"چل تو سہی۔"

وہ روبینہ کا بازو کھینچتی پیچھے لے جانے لگی۔

ہم سفر ملتے گئے۔ قافلہ بنتا گیا کے مترادف دادی کے کمرے تک جاتے جاتے ارم اور فریحہ بھی ساتھ تھیں۔

اور وہی ہوا جو مسرت نے بڑے دعوے سے کہا تھا۔ دادی دو منٹ میں ہتھیار ڈالنے پہ تیار تھیں۔

"دیکھ لے۔ سہیل کے دل میں کتنا کوڑھ ہے۔ ابھی تک بھولا نہیں پرانی گلاں۔ نہیں تاں گیا سرفراز کو لینے۔ حالانکہ بے چارہ میرا سرفراز بھی تو سب کچھ بھلا کے واپس آرہا ہے ناں۔ گیا تھا جو یہ بھی دل کی کالک دھو کے اسے لینے چلا جاتا۔"

"اس کا مطلب ہے دادی! کالک چاچا جی کے دل میں تھی۔"

ارم کے کریدنے پہ فریحہ ذرا مائنڈ کر گئی۔ آخر اس کے والد بزرگوار کا ذکر خیر تھا۔

"جی نہیں۔۔۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔"

"چپ کرنی۔۔۔ میراثی تھے وہ جو دونوں ہاتھ پیٹ پیٹ کے تالیاں بجاتے۔۔۔ سچ تو یہ ہے قصور سارا سہیل کا تھا جو جوانی میں شوخا اور اوچھا بھی بڑا تھا اور میں نے اور تمہارے دادے نے اس کے لاڈ میں اس کا ساتھ اس لیے دیا کہ چلو نا سمجھ ہے۔ بس اس بات پہ سرفراز ناراض ہو گیا۔"

"مگر ہوا کیا تھا دادی۔"

"گل ایہہ اے کڑیو۔۔۔ کہ یہ ویلا تھا انیس سو اٹھہتر کا۔"

اور دادی فلیش بیک میں انیس سو اٹھہتر کے رنگین ماحول میں جا پہنچیں۔

راجیش کھنہ کی آنند۔۔۔

رشی کپور اور ڈمپل کپاڈیہ کی بوبی۔۔۔

زینت امان کی قربانی۔۔۔

خانہ ریاست 'طلعت حسین اور شکیل کی جوانی کے بلیک اینڈ وائٹ ڈرامے۔۔۔

مالا بیگم اور رونا لیلیٰ کے گانے۔۔۔

فلیپر۔۔۔ اونچے جوڑے۔۔۔ بڑے بڑے چشمے۔

کشور کمار اور آرڈی برمن کا عروج۔

ہپی لہری کی آمد آمد۔

(باقی آئندہ)

"محبت و حبت کچھ بھی نہیں۔۔۔ بس آج کل کی نوجوان نسل نے اپنے لیے پیدا ہونے والی مشکلات میں ایک اور کا اضافہ کر لیا ہے۔ اگر بڑے سمجھائیں کہ نہیں۔۔۔ تو بے راہ روی بپھرتی شوریدہ لہروں کا روپ دھار لے گی۔ جو ہر حد کو عبور کرنے والے سیلاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور جذبات کا یہ چیختا چنگھاڑتا سیلاب ہر چیز کو بہا کر لے جاتا ہے۔" رامین پیچھو نجانے کس کے سامنے اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑ رہی تھیں۔ اس کے اپنے کمرے میں جاتے قدم وہیں تھم گئے۔

بے راہ روی؟ جہاں بے راہ روی ہو وہاں محبت نہیں ہوتی۔" یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ وہ کمرے کی طرف مڑنے ہی لگی تھی۔ جب انجانی شخصیت کی آواز نے قدموں کو پھر جکڑ اتھا۔

"محبت تو بذات خود ایک خوبصورت احساس ہے۔ بے راہ روی تو بد صورتی اور برائی کا دوسرا نام ہے۔ یہ

حنا یاسمین

خوشی کے موسم

دونوں یکجا نہیں ہو سکتے۔ تم یہ ضرور کہو کہ نوجوان نسل بے راہ روی کا شکار ہے۔ مگر محبت کا وجود تو برحق ہے۔"

وہ جو کوئی بھی تھیں' وضاحت سے انہوں نے رامین پھپھو کی بات کو جھٹلایا تھا' کچھ لمحوں کے لیے اس کا دل عش عش کر اٹھا جو بندہ ہر وقت خود کو پرفیکٹ سمجھے' اس کی بات کو یونہی کوئی معمولی سا سمجھ کر رد کرے تو خوشی تو ہوتی ہے نا!

"تم نہیں سمجھو گی۔" رامین پھپھو کو شاید ان کا نقطہ نظر پسند نہیں آیا تھا۔ کان لگا کے سننا گو کہ ایک برا فعل ہے۔ لیکن دل اس گفتگو کو مزید سننے کا متمنی تھا۔

"میری بھتیجی غازیہ کو بھی میرے اتنے خوبرو بھتیجے سے محبت ہو گئی تھی۔ خود تو سانولی سی ہے' اوپر سے تعلیم بھی بس واجبی سی۔۔۔ جسٹ بی۔ اے کیا ہوا ہے۔ سچ فرحت! اماں بی کو پتا چلا تو سچ پوچھو تمہیں سنا غصہ آیا۔۔۔ انہوں نے فاروق بھائی سے صاف صاف کہہ دیا کہ اپنی بیٹی کو قابو میں رکھیں۔ شہروز کا تو تمہیں پتہ ہے۔ ہم بہنوں اور اماں کو اس سے کتنی محبت ہے؟ کتنی دعاؤں سے وہ ہوا ہے۔ ورنہ فیملی میں دور و نزدیک' سب کے گھر تو بس۔۔۔ بیٹیوں کی لائنیں لگی ہوئی ہیں۔"

"بس کرو' رامین! میں کم از کم یہ فضول بات ہضم نہیں کروں گی۔" خاتون کافی منہ پھٹ واقع ہوئی تھیں۔ اس لیے کھٹ سے جواب دیا تھا۔

"ٹی وی چینلز کھول لو' کوئی کہانی پڑھ لو۔ بیٹیوں کو پتہ نہیں کیا بنا دیا ہے۔ یہ اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں کی ناشکری ہی ہے۔ اسی لیے آئے روز معاشرے میں جہاں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ وہیں مصیبتیں اور آفتیں بھی ٹوٹ رہی ہیں۔ ہم پتہ نہیں انجانے میں کیا کیا کفر بول جاتے ہیں۔"

کمرے میں یک دم خاموشی چھا گئی تھی۔۔۔ یا تو خاتون سچ بولنے کی سنگین غلطی کر چکی تھیں' رنگ چڑھی سی رامین پھپھو اس دو ٹوک غیر متوقع جواب پر حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھیں۔

"میری بلا سے کچھ بھی ہو۔" وہ سر جھٹک کے کمرے کی طرف بڑھی۔ جہاں گھپ اندھیرے نے اس کا سواگت کیا تھا۔

ایک تو بھلا ہو دادی اماں کا جنہوں نے دونوں بہنوں کو ایسا کمرہ دیا تھا۔ جہاں دن کے وقت بھی لائٹ جلانا پڑتی تھی۔

وہ آگے بڑھی ہی تھی جب ٹانگ کسی چیز سے ٹکرائی تھی۔

"اوئی۔۔۔ آئی۔"

شاید اماں کی سلائی مشین سے ٹھوکر لگی تھی۔ وہ بھی ان کے بے کار وجودوں کی طرح بے کار تھی۔ اسی لیے ان ہی کے کمرے میں رکھی گئی تھی۔

"کیا ہوا۔؟" غازیہ کی آواز اندھیرے میں کسی روشنی سے کم نہ تھی۔ یعنی وہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔

"تم یہاں سوگ منانے لیٹی ہو تو کم از کم کھڑکی ہی کھول دیا کرو۔ اتنی زور سے ٹانگ لگی ہے۔" وہ جھنجلاتے ہوئے ٹانگ سہلانے لگی۔

"مجھے بس اندھیرے میں رہنے دو۔" غازیہ کی افسردہ سی دھیمی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے کمرے کے دروازے کے پیچھے لگے بورڈ سے بٹن آن کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ غازیہ کی بات پر اس نے پلٹ کے دیکھا تھا۔

"خیریت تو ہے؟" وہ چارپائی کی جانب بڑھی' ہاتھ اس کے بازو پر رکھا تھا۔

"او میرے خدا' غازی! تمہیں اتنا شدید بخار ہے۔" اسے اس کی حالت دیکھ کر مزید غصہ آنے لگا۔

"کیا ضرورت ہے اتنی ٹینشن لینے کی' گھر میں کسی کو کوئی پروا نہیں ہے۔ ابھی بھی رامین پھپھو اس بات کو معمولی واقعہ بنا کر اپنی کسی جاننے والی کے گوش گزار کر چکی ہیں۔"

"مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔" وہ رو دینے کو تھی۔۔۔

"نئی نئی بات ہے آہستہ آہستہ اس پہ گرد پڑ جائے گی۔ اب اس "شرمندگی" کو خود پر اتنا حاوی مت

کرو۔" وہ نرمی سے بولی۔

"غازی! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔" وہ چھوٹی تھی لیکن اپنی سمجھ کے مطابق اسے سمجھانا چاہ رہی تھی۔ دکھ تو اسے بھی ہو رہا تھا۔ "یہاں انسانوں کی کوئی قدر نہیں' سوچا کہ اس طرح کے جذبات کا عیاں ہو جانا؟۔۔۔۔ ہم تو پہلے ہی "بوجھ" ہیں۔ اوپر سے اس طرح کے روگ پال لیں۔ ہم دادی اور پھپھو کو خود ہی موقع دیں گے مزید باتیں بنانے کا۔ ہم تو ان دکھوں سے ابھی آشنا ہو رہے ہیں اور وہ جو کب سے بھگت رہی ہیں۔ مشکلات تو ان کے لیے بڑھی نا۔۔۔ باتیں تو انہیں سننے کو ملی نا۔۔۔"

"کیا مطلب تمہارا 'امی'؟"

"ہاں۔ میں امی کی ہی بات کر رہی ہوں۔" وہ بوجھل لہجے میں کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

"یا خدا! رامین پھپھو اگر مجھے خود ڈانٹ لیتیں تو اتنا سب کچھ نہ ہوتا۔" اسے اندازہ تھا کہ پھپھو نے بڑوں میں جب بات پھیلائی ہو گی تو امی کو کتنی سبکی اٹھانا پڑی ہو گی۔

☼ ☼ ☼

"اماں! وہ شہروز سے کہہ دیں کہ غازی کے وین والے سے ذرا بات تو کرے' بچی روز کالج سے لیٹ ہو جاتی ہے۔ وقت پر آجایا کرے۔" زینت بیگم برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ اماں جو شاید تسبیح پڑھنے میں مشغول تھیں' انہیں زینت بیگم کی مداخلت پسند نہ آئی تھی۔

"ایک ہی میرا بچہ ہے' وہ کتنے کام کرے' اس کے اپنے بھی سو کام ہیں۔ کم از کم یہ معمولی معمولی کام تو خود کر لیا کرو۔"

سبزیوں کا تھیلا اٹھائے کچن کی طرف جاتی فرزانہ بیگم نے فخریہ نظر زینت بیگم کی جانب اچھالی تھی۔ کپڑے دھوتی صبا کو بے حد برا لگا۔

"امی! میں بات کرتی ہوں۔" وہ نل سے ہاتھ دھو کر وہیں چلی آئی۔

"آئے ہے۔ تمہارا کیا کام ہے۔" دادی نے گھور کر دیکھا۔

"ظاہری بات ہے کچھ جو ایک ہے' تو معمولی کام ہمیں خود ہی کرنا ہوں گے۔"

"میرے منہ مت لگو۔" اماں کو اس کا لہجہ پسند نہ آیا تھا۔ "اگر لڑکیاں پیدا کر ہی لی ہیں تو ان کی کچھ تربیت بھی کر دیتیں۔" توپوں کا رخ امی کی طرف مڑا تھا۔ وہ پہلے ہی بیزار ہوئی بیٹھی تھیں۔ غصے سے اسے ڈانٹنے لگیں۔ جبکہ وہ اطمینان کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئی۔

یہ کوئی ایک دن کی بات نہ تھی۔ ان بہنوں کے کام شہروز بھائی پر حرام تھے۔ کالج میں داخلہ لینے کی بات ہوتی' کہیں ٹیوشن رکھوانی ہوتی یا کہیں لے جانا ہوتا۔ تائی اماں اور دادی سختی سے منع کر دیتیں۔

شہروز بھائی سامنے کمرے میں موجود ہوتے' تائی اماں صاف مکر جاتیں کہ وہ گھر میں ہی نہیں ہے۔

شہروز کو اجازت نہ تھی کہ وہ ان سے بات بھی کر لے' وہ بھی اس لیے کہ وہ ان کے معیار کی نہ تھیں۔

اس امتیازی سلوک نے جہاں انہیں حساس بنا دیا تھا۔ وہیں تائی اماں کی گردن میں ایک اور لوہے کی راڈ فٹ کر دی تھی۔ ان کے لیے دیورانی کو بھی اہمیت دینا مشکل ہو جاتا۔

رہی سہی کسر رامین اور فرحین پھپھو نے پوری کر دی۔ فرحین پھپھو تو خیر رہتی اتنی دور تھیں' کبھی کبھار آجاتیں تو سب سے ہنس بول لیتیں لیکن ان کی محفل میں بھی راجہ اندر کا رول شہروز ہی ادا کرتا۔

رامین پھپھو کا بھی راج دلارا وہی تھا۔ وہ کالج میں پڑھاتی تھیں۔ دادی اماں نے بیٹی کی ذمہ داری تو اس کے کندھوں پر ڈال دی تھی' جبکہ عمر میں ان سے کم اپنی پوتیاں انہیں کبھی نظر نہ آئی تھیں جنہیں ایک سہارے' ایک آسرے کی ضرورت رہتی۔

پھپھو کو کالج لے کر جانا اور لانا شہروز کی ذمہ داری تھی۔ غازیہ وین سے چلی جاتی' صبا نے تو میٹرک کے

بعد بڑھائی کو خیر باد ہی کہہ دیا تھا۔ وہ بھی ان الفاظ کے ساتھ کہ۔

"ہاں! آپ تائی اماں کے گھر کے کام سنبھالیں اور میں اپنے گھر کے۔۔۔ آخر ہمارے ڈھیروں ڈھیر کاموں کی فہرست کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بھی کسی کی ضرورت ہے۔ لیکن آپ کے پاس تو اتنی فرصت نہیں' ادھر کپڑے نکالے نہیں مشین سے۔ وہیں تائی اماں مشین کی آواز پر دوڑتی چلی آئیں کہ "زینت اور اشہوز اور اس کے ابا کے کپڑے تو دھو دو۔ گھٹنوں میں درد ہے۔" ادھر ہم روٹی کے انتظار میں چوہوں کی ریس لگائے پیٹ پکڑے بیٹھے ہوئے ہیں کہ ادھر سے آواز آتی ہے۔ "زینت اور اشہوز کے لیے تازہ روٹی تو پکا دو۔"

"تم لوگ زیادہ ہی زبان دراز ہوتی جا رہی ہو۔" صبا کی باتوں پر غازی کی ہنسی چھوٹ گئی تو اماں تپ ہی گئیں۔

"اگر وہ ایسا کرتی ہیں تو پھر کیا ہے؟ شہوز بھی تو میرا بیٹا ہے۔"

"مگر آپ اس کی ماں نہیں۔" وہ پھر بھی باز نہ آئی تھی۔ بہت کچھ سہنے والی زینت بیگم بیٹی کے معاملے میں بالکل بے بس تھیں۔ خود تو وہ برداشت کر جاتیں لیکن بیٹیاں برداشت نہ کرتیں ان کے دیے گئے جوابات ہمیشہ ان کی تربیت کو موضوع بحث بنا دیتے تھے۔ اکنامکس میں اچھے مارکس لینے پر رامین پھپھو نے شہوز کو کمپیوٹر گفٹ کیا تھا۔ غازیہ کے بھی بی اے میں اچھے نمبرز آئے تھے۔ مگر رامین پھپھو نے بس کھڑے کھڑے اسے مبارک باد دی تھی۔

"صبا! مجھے تو کبھی ایسے لگتا ہے کہ پھپھو ہماری ہیں ہی نہیں۔" وہ صبا کے سامنے آ کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگی۔ کیاری سے دھنیا توڑتی صبا نے آنکھوں کو دھوپ سے بچاتے ہوئے ایک آنکھ بند کر کے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"مجھے تو پتہ ہے کہ وہ ہماری پھپھو ہیں۔"

"تم ہر بات مذاق میں اڑا دیا کرو۔" وہ وہیں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ تنکے سے کیاری کی گیلی مٹی پر لکیریں کھینچنا شروع کر دیں۔

"پھپھو نے اتنے عام سے لہجے میں مجھے مبارک باد دی ہے۔ حالانکہ میرے بھی اچھے خاصے نمبرز آئے ہیں جبکہ شہوز کی خوشی کو کس طرح گھر بھر نے منایا ہے۔ ابا بھی اسے ہزار کا نوٹ تھما آئے ہیں۔ سگی بیٹی کی خوشی تو نظر ہی نہیں آئی۔"

"یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔" وہ ابھی بھی نارمل ہی لہجے میں بولی۔ غازیہ چپ سی ہو گئی۔ جب کلی دھنیا توڑ لیا تو اسے مٹھی میں دبا کر وہ کپڑے جھاڑتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"شاید تم یہ بات بھول جاتی ہو یا نئے سرے سے توقعات باندھ لیتی ہو۔" اس کی اتری ہوئی شکل کو دیکھ کر وہ گویا ہوئی "جب ہم چھوٹے تھے تو ایک نیا اسکول بیگ لے کر اگر پھپھو کو دکھانے چلے جاتے یا نیا جوتا ہی دکھانے چلے جاتے' تو پھپھو کوئی دھیان نہ دیتی تھیں جبکہ شہری کی ہر چیز کو سراہا جاتا۔ فرحین پھپھو کے بچوں کی ہر چیز کو قابل تحسین سمجھا جاتا۔ اتنا ہی کافی ہے جو جھکے منہ مبارک باد دے دی ہے۔ اور ویسے بھی پچھلے دنوں والا واقعہ کیا بھول چکی ہو؟ کیا شاندار کارنامہ سرانجام دیا تھا؟ شہوز بھائی کی طرف سے کیے گئے دو تین موبائل میسجز پر تم اپنا دل ہی انہیں دے بیٹھی تھیں۔ پھر رہی سہی کسر پھپھو کو بتا کر پوری کر لی۔ ابا' تائی امی اور سب کے سامنے جو تمہاری بے عزتی ہوئی تھی تم شاید بھول گئی ہو مگر میں نہیں بھولی۔ کیا پھپھو تمہاری دوست تھیں؟ کیا وہ تم سے فرینک تھیں؟ کیا تم کے دل کی باتیں ان سے کرنے چلی گئی تھیں۔؟"

وہ اس کی بہن تھی۔ لیکن کرخت لہجے میں اسے آڑے ہاتھوں لے رہی تھی۔

"میں تو یہ سمجھ کر پھپھو کے پاس گئی تھی کہ وہ کالج میں پڑھاتی ہیں۔ ایجوکیٹڈ ہیں' میری بات کو سمجھیں گی۔ عام لوگوں کی طرح تشہیر نہیں کریں گی۔۔۔ اگر کسی کو پسند کرنا بری بات نہیں۔ تو پھپھو آرام سے سمجھا بھی تو سکتی تھیں نا۔ چاہے پھپھو ہمیں اتنی اہمیت نہیں دیتیں لیکن میں تھی تو ان کی بھتیجی نا۔۔۔ سب کے سامنے تو انسلٹ کا احساس اتنی جگہ۔۔۔ جو شرم اور بے عزتی شہوز کے سامنے ہوئی' وہ میں بھول نہیں سکتی۔ تم اتنی بے رحمی سے مجھے بار بار آئینہ دکھانے کی کوشش مت کیا کرو۔۔۔ میں نے بھی تو اپنی انا اور وقار کے مجروح ہونے کا دکھ سہا ہے۔"

آنکھوں سے اترتے آنسوؤں کو پیتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھ گئی۔

"یہ ضروری تھا غازی!۔۔۔ مجھے بار بار تمہارا فضول توقعات کے پیچھے بھاگنا اور پھر خوار ہونا' اچھا نہیں لگتا۔" اس نے بند مٹھی میں پکڑے دھنیے کو مسلتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سردی کا آغاز ہو جانے سے پہلے ہی اماں نے دوبارہ سے روئی دھنوا کر رضائیاں بھرنے کا آرڈر جاری کر دیا۔

"جانے کتنی سردیاں اور گرمیاں گزر گئی ہیں۔ میری رامین ویسی ہی ہے۔ پھولوں کی طرح نرم و نازک۔ گزرتے وقت نے بھی اس کے روپ رنگ میں کوئی فرق نہیں ڈالا۔ بس اب اچھے گھر کی ہو جائے تو سکون کا سانس لوں۔"

باہر چارپائی بچھائے زینت بیگم کے سر پر کھڑے ہو کر رضائیوں کا کام مکمل کرواتی اماں نے سرگوشی کی۔ ڈنڈے کی مدد سے روئی پوری رضائی میں توازن کے ساتھ سیٹ کرتی زینت بیگم سے اماں کی تشویش برداشت نہیں ہوئی تھی۔ سیڑھیوں کے پاس کرسی ڈالے غازیہ کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ زینت نے نظر بھر کے بیٹی کی طرف دیکھا۔

"کیا میری بیٹیاں نظر نہیں آتیں؟ کبھی جو اماں ان کے بارے میں بھی سوچ لیں۔" غازیہ کا رنگ ذرا دبتا تھا مگر نقش بہت پیارے تھے۔

چمکتی دھوپ آنکھیں بند کیے دے رہی تھی۔ آسمان کی طرف دیکھنا مشکل تھا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے اپنی بیٹیوں کے اچھے نصیب کی دعا کرتے ہوئے آسمان کی جانب نظریں اٹھائی تھیں۔

"غازی! سالن چڑھا دو' تمہارے ابا آنے والے ہیں۔" غازیہ وہاں سے اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ جہاں صبا پہلے سے ہی آٹا گوندھنے میں لگی ہوئی تھی۔

"صبا! آج سالن بھی تم ہی بنا دو' میرا ٹیسٹ ہے۔"

"اچھا' بنا رہی ہوں۔" اس کے جلد مان جانے پر وہ اطمینان کی سانس لیے جیسے ہی مڑنے لگی۔ یکدم کچن میں داخل ہوتے شہوز سے ٹکرا گئی۔

"دھیان سے چلا کرو' ورنہ ٹھوکر بڑے زور سے بھی لگتی ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

فریج سے سبزی نکالتی صبا سے شاید برداشت نہیں ہوا تھا۔ "اتنا کمزور مت سمجھیں شہوز بھائی! وقت ہر ایک کو بہادر اور سمجھ دار بنا ہی دیتا ہے۔"

"لیکن جو وقت کے ساتھ بھی نہ سمجھے؟" وہ فریج سے اورنج جوس کی بڑی بوتل نکال کر اسے گلاس میں انڈیلتے ہوئے بولا۔

"پھر اس کا مطلب ہے کہ وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔" سبزی کا شاپر سلیب پر رکھ کر وہ اس کی طرف مڑی۔ وہ ابھی بھی نروس سی وہیں کھڑی تھی۔

صبا کو اس کا سہما سہما انداز ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔

"ٹیسٹ کی تیاری کچن میں کرو گی؟" اس نے ذرا غصے سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں جا رہی ہوں۔۔۔" وہ خفت زدہ ہو کے اپنے کمرے میں آ گئی۔

"بھلا میں اس کے سامنے کنفیوژ کیوں ہو جاتی ہوں؟ کیا تھا اگر مجھ سے یہ غلطی نہ ہوتی۔۔۔ میرا اعتماد تو قائم رہتا۔" وہ دل ہی دل میں خود کو سرزنش کر کے گہرے ملال کا شکار ہونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

ساون کی پہلی بارش برسی تھی۔ ٹپ ٹپ گرتی بوندیں ہمیشہ اسے سحر میں مبتلا کر دیتیں۔

"کتنی خوبصورت کائنات ہے اللہ تعالیٰ کی۔" نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں اس نے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ بارش سے دھلی دھلائی لال سرخ اینٹوں والی منڈیر پر بیٹھی چڑیا بھی اسے اپنی طرح اکیلی ہی لگی تھی۔

"کیا کر رہی ہو تم یہاں؟" صبا دھپ سے آ کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

وہ ایک دم ڈر گئی۔

"تمہیں کبھی تمیز نہیں آئی۔" وہ اپنا رخ اس کی طرف پھیر کر غصے سے بولی۔

"موسم انجوائے کیا جا رہا ہے۔" وہ اس کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر فریش کر بولی۔

نیچے صحن میں رامین پھپھو اور شہری کے قہقہوں کی آوازیں آئیں تو دونوں نے چونک کر منڈیر سے نیچے دیکھا۔ پھپھو شہری کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ جو ہاتھ میں جلیبیاں پکڑے آگے آگے بھاگ رہا تھا۔ غازی کے دل کی دھڑکن تو شہری کی ہنسی سے ہی ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ جبکہ صبا سوچ رہی تھی کیا تھا اگر وہ بھی اس منظر کا حصہ ہوتی۔ لیکن پھپھو نے کبھی انہیں خود سے فری ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ غازیہ کی کھوئی کھوئی سی کیفیت کو محسوس کر کے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں آ گئی۔

"میں سوچ رہی ہوں۔ میں پرائیوٹ ایف اے کر لوں۔" اس کا دھیان بٹانے کے لیے اس نے خود ہی بات چھیڑی۔

غازیہ یکدم گویا حیرت اور خوشی میں گھر گئی۔ وہ کافی دن سے اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ وہ تعلیم کا سلسلہ دوبارہ سے شروع کر دے۔ خود وہ اب ماسٹرز کر رہی تھی۔

"دراصل غازی! ہمارے اندر اور تو کوئی صلاحیت نہیں کم از کم اچھی شخصیت بنانے کے لیے تعلیم تو حاصل کر سکتے ہیں۔"

آج صبا کے لہجے میں وہی دکھ بول رہا تھا' جو ہمیشہ سے وہ خود محسوس کرتی آ رہی تھی۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ان کے وجود کو جس طرح نظر انداز کیا جاتا۔ اپنی ہی ذات کے گنبد میں مقید وہ کم مائیگی اور خود ترسی کا شکار ہوتی جا رہی تھیں۔ اس پر ستم یہ کہ رنگ روپ بھی دونوں نے ماں کا ہی چرایا تھا۔ اور ماں تو پہلے ہی دادی کے جوتے کی نوک پر تھیں۔ ان کا صرف اتنا قصور تھا کہ وہ ان کے خوبرو بیٹے کی سانولی سی عام نقوش والی بیوی تھیں' جو دادا ابو نے خدا ترسی میں اپنی بہن کا مان رکھنے کے لیے لے لی تھی۔ جبکہ تائی اماں خالص دادی کی پسند تھیں۔ خوبصورت چہرے والی خوش گفتار تائی اماں' سونے پر سہاگہ شہری کی ماں ہونے کا اعزاز بھی تائی اماں کے حصے میں آیا تھا۔ گھر کے واحد چشم و چراغ کی ماں ہونے کی وجہ سے ان کا رتبہ مزید بڑھ گیا اور صرف دو بیٹیوں کی پیدائش کے بعد کسی پیچیدگی کا شکار ہو کے نرینہ اولاد سے محروم زینت بیگم مزید بے اعتنائی کا شکار تھیں۔

☼ ☼ ☼

رامین پھپھو کے لیے ان کے کولیگ سر سلیم کا رشتہ آیا تھا۔ دادی کی گردن مزید تن گئی۔ دونوں بھائیوں نے بھی بہن پر دل کھول کر خرچ کیا۔ دادی نے سارا زیور رامین پھپھو کو چڑھا دیا۔ اور کچھ چیزیں شہروز کی دلہن کے لیے بڑی بہو کے سپرد کیں۔ جبکہ اپنا کم آمدنی والا چھوٹا بیٹا اور اس کی بیٹیاں انہیں نظر ہی نہ آئیں۔ زینت بیگم نے فاروق حسین کے سامنے دبی دبی زبان میں شکوہ کیا تھا حالانکہ یہ ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ مگر انہیں خاندانی زیور پر ساس کی ناانصافی پہ دکھ سا ہوا تھا۔

"جو میری بیٹیوں کے نصیب میں ہے' انہیں ضرور ملے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ اللہ کی ذات خود ہی کوئی بندوبست کر دے گی۔" ہمیشہ کی طرح انہوں نے نرم انداز میں بیوی کو دلاسا دیا تھا۔

شادی پر پھپھو کا لیا دیا سا انداز قدرے ٹھیک ہوا تھا۔ دونوں بہنوں نے بھی شادی میں بھرپور انداز میں حصہ لیا۔ ابا نے جتنے پیسے دیے' اسی میں اپنے کپڑے خود تیار کیے

شادی کی تاریخ ایک ماہ بعد رکھی گئی تھی اور وہ پیر کو تایا ابو اپائنٹمنٹ لیٹر لیے مزید خوشی کا پیامبر بن کر آئے تھے۔ شہری کو بینک میں شاندار جاب ملی تھی۔ دادی تو نہال ہوئے جا رہی تھیں۔ تایا ابو نے فوراً ہی غریبوں میں بانٹنے کے لیے دو دیگوں کا آرڈر دیا..... محلے میں مٹھائی بھی تقسیم کی گئی۔ خوشی میں دادی نے اپنی پرانی پاپاں تائی اماں کو دی تھیں۔ زینت بیگم حسب معمول کچن سنبھالے کھڑی تھیں..... اور پھپھو جو شہری کی بیسٹ فرینڈ تھیں' ان کے قہقہے گھر بھر میں گونج رہے تھے۔ صبا اور اسے بھی خوشی ہوئی تھی۔ دونوں نے شہری کو مبارک باد دی تھی' جسے اس نے اپنا حق سمجھتے ہوئے بڑے مغرورانہ انداز میں وصول کیا۔ شہری نے آج بلیک شرٹ پہن رکھی تھی اور خوشیوں سے چمکتے چہرے نے اس کی وجاہت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

غازی کو لگا کہ وہ زمین پر رہ کر چاند کی خواہش کیے جا رہی تھی۔ "خوش میں پھپھو جتنی ہی خوبصورت ہو گی۔" سرکش دل کی ان گنت دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے وہ نم آنکھوں سے کچن کی طرف بھاگی تھی۔ لیکن وہاں امی تھیں۔ اسے تنہائی چاہیے تھی وہ اپنے تاریک کمرے میں آ گئی..... بغیر لائٹ جلائے بے آواز آنسوؤں سے روتی چلی گئی۔

محبت کتنی بری ہے۔ نہ ملے تو تنہائیوں اور بے چینیوں کا نہ ختم ہونے والا عذاب ایک لاحاصل سفر۔ اور ہر پل برستی آنکھیں جو دنیا کے سامنے تماشا بنانے کو کافی تھیں۔

☼ ☼ ☼

پھپھو بیاہ کے پیا گھر گئیں۔ تو گھر خالی خالی سا لگنے لگا تھا۔ شہری بھی اب گھر میں کم ہی ٹکتا۔ جبکہ وہ اپنی ناسور بنتی محبت کو دل میں چھپائے پڑھائی میں گم ہو گئی۔ صبا بیچاری امی کے ساتھ گھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ اس کے ایم اے فائنل ایئر کے پیپرز تھے' اسی لیے اس کی پڑھائی کا بوجھ محسوس کرتے ہوئے صبا خود ہی اسے کچھ نہ کہتی۔ شہری کی جاب اور پھپھو کی شادی سے دادی کو جو خالی پن محسوس ہوتا اب وہ اسے ان دونوں کے ساتھ شیئر کرتیں۔ ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ دادی اب انہیں تھوڑی بہت اہمیت دینے لگی ہیں۔

پھر وہ حادثہ ان کی زندگیوں میں آیا جس نے ان سب کا اطمینان و سکون غارت کر کے رکھ دیا۔

شہری اپنے دوستوں کے ہمراہ کسی دوست کی شادی پر گیا تھا..... مگر وہاں کسی نے اسے اغوا کر لیا تھا۔ اغوا برائے "تاوان"..... تاوان بھی پچاس لاکھ کا مانگا گیا تھا۔ دادی تو سنتے ہی صدمے سے بیمار ہو گئیں۔ شہری تو ان کی جان تھا۔ غازی کو لگا کہ گزرنے والا ہر لمحہ اس کا خون خشک کر رہا ہو۔ تائی اماں کا رو رو کے برا حال تھا۔ صبا اور زینت بیگم نے حوصلے سے سب کو سنبھالا۔ تایا ابو اور ابو بے چارے تھانے کچہریوں کی طرف دوڑتے پھر رہے تھے۔ ان کے گھر میں گویا قیامت اتری ہوئی تھی۔

رامین اور فرحین پھپھو سنتے ہی فوراً آ گئیں.....

رامین پھپھو کا بھی رو رو کے برا حال ہو رہا تھا کہ ان لوگوں نے تاوان نہ ملنے پر جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔

غازی کے سجدے لمبے ہونے لگے۔ دادی کی تسبیحات بڑھنے لگیں۔ اس مشکل گھڑی میں تمام رشتہ داروں نے اپنا دامن بچا لیا۔ کسی نے کوئی امداد نہ کی۔ تائی اماں نے سارا زیور بیچا۔ زینت بیگم نے بھی تھوڑا بہت بیٹیوں کے لیے جمع شدہ زیور ان کے حوالے کیا۔ تائی اور دادی کی آنکھیں تشکر سے لبریز ہو گئیں۔ تائی اماں روتی ہوئی زینت بیگم سے لپٹ گئیں۔

"نہ بھابی! شہروز میرا بھی تو بیٹا ہے۔" روتی ہوئی زینت بیگم انہیں دلاسا دے رہی تھیں۔ فاروق حسین نے اپنے نام سے خرید امدنوں سے پڑا پلاٹ بیچ دیا۔ بیٹیوں کے نام پر جمع شدہ تھوڑا بہت پیسہ بینک سے نکلوایا اور ساری رقم بڑے بھائی کے حوالے کر دی

تھی۔ ان سب کی ان ہی کوششوں اور دعاؤں کا نتیجہ تھا جو ٹھیک پانچ دن بعد وہ لوگ صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے نیم بے ہوشی کی حالت میں اسے دروازے پر ڈال کر چلے گئے۔

تایا ابو نماز کے لیے نکلے تو بے ہوش بھتیجے کو دیکھ کر خوشی سے چیخ پڑے۔ ان کی چیخ پر سارا گھر باہر کو دوڑا۔ ابا ڈاکٹر کو بلانے دوڑے، غازی اور دادی شکرانے کے نفل پڑھنے کے لیے۔ تائی اماں اور امی کے آنسو ہی نہیں رک رہے تھے۔ شام تک شہروز کی حالت سنبھل گئی۔ لیکن وہ کمزوری بے حد محسوس کر رہا تھا۔ صبا نے آج سارا دن اس کی پسند کی ڈشز تیار کیں۔ باداموں والا دودھ بنا کے اسے پلایا گیا۔

تایا ابو نے بعد میں تحقیقات کرائیں تو پتا چلا کہ شہری کے دوستوں نے ہی اسے کڈنیپ کروایا تھا۔ دوست ان غنڈوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ تایا ابا کی زبانی جب انہیں پتہ چلا تو انہیں یقین ہی نہیں آیا۔ پھپھو کی شادی پر بڑھ چڑھ کے کام کرنے والے دوست اس طرح ایک دم بدل کے پیٹھ پیچھے وار کریں گے سب ہی حیران تھے۔

"جس ملک میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور دوسروں کو کھاتا پیتا دیکھ کر لوگ برداشت نہیں کر پاتے؟ اسی لیے تو ہمارے دین نے ہمیں نمود و نمائش سے منع کیا ہے۔" ابا نے سب کی حیران نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اپنے پرسکون اور مدلل لہجے میں کہا تھا۔

دادی اور تائی اماں ایک ہی چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ ابا اٹھ کر جانے لگے تھے۔ جب دادی نے انہیں آواز دی۔

"فاروق حسن! ذرا ٹھہرو۔ ادھر آ کے بیٹھ، میری بات سنو۔" وہ واپس آ بیٹھے باقی سب بھی متجسس نظروں سے دادی کی طرف دیکھنے لگے۔

"بہو! تم خود کہو۔" دادی نے تائی کو حکم دیا۔ وہ تھوڑی سی متذبذب ہوئیں۔ پھر مضبوط لہجے میں بولیں۔

"بھائی جی! مجھے پتا ہے کہ میں یہ درخواست کرنے کی اہل نہیں ہوں۔ لیکن اس حادثے نے مجھے اپنوں کی بڑی پہچان کروائی ہے۔" نمکین پانی ان کی آنکھوں میں اترنے لگا تھا۔ "آپ غازی کو میری بہو بنا دیں۔" گرانے کی بجائے بنل بناتی زینت بیگم کے ہاتھ سے مارے حیرت کے کروشیا نیچے جا گرا۔ صبا خوشی کے مارے اچھل ہی پڑی۔ بہن کی کیفیت اس سے ڈھکی چھپی تو نہ تھی وہ خود منہ کھولے ہونق بنی ہوئی تھی۔

"غازی! دو نفل پڑھ لو" صبا نے سرگوشی کی جبکہ وہ اپنی بے خودی پر شرمندہ ہوتی کمرے کی طرف بھاگی۔

"بھابی! غازی آپ کی ہی بیٹی ہے" فاروق حسن نے اپنی انا کو بالائے طاق رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ انسان انسان کے بھیس میں ہی بھلا لگتا ہے۔ فخر اور غرور کا چولا چڑھا کر اگر وہ خالق کی برابری کرے تو پھر وہ شیطان ہے۔

دادی اماں نے غازی کو دوبارہ بلوایا تھا اس کے ماتھے پر بوسہ دے کے اسے گلے سے لگایا۔

"میں بھی آپ کی بہو لگتی ہوں۔" صبا نے انتہائی بے چارگی سے کہا۔ اس کی بات پر سب مسکرا دیے۔ پھپھو نے آگے بڑھ کر صبا کو گلے لگایا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نم آنکھوں سے دیکھا۔

"پھپھو! شہروز بھائی سے پوچھا ہے؟" صبا پھپھو کے گلے لگتے ہوئے پریشان سی ان کے کان میں بولی۔

"بھلا اس سے پوچھے بغیر یہ ہو سکتا تھا۔" پھپھو نے مسکرا کر جواب دیا اور اس نے اطمینان کا سانس لے کر غازی کی طرف دیکھا۔ شدید خوشی اور دکھ میں ہمیشہ ساون کی جھڑی کے ساتھ آنسوؤں کی جھڑی لگائے وہ پاگل سی لڑکی آج برستی بوندوں میں خوشی کے ترانے گاتی چڑیا کو دیکھ رہی تھی۔ اور کھڑکی کا پردہ ہٹاتے شہروز کی نظر اس سانولی مگر خوب صورت نقوش والی اپنی معصوم سی کزن پر پڑی تھی، جس نے اس سے محبت کی جسارت کی تھی اور جواب اس کی شریک سفر بننے جا رہی تھی... آج دل نے عجیب لے میں دھڑک کے اس کی محبت کی گواہی دے دی تھی۔

★

مریم عزیز

ناولٹ

وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو مقصود انکل کے کمرے سے زور زور سے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ کچھ پریشان ہو کر نیہا کے قریب بیٹھ گئی۔

"تمہیں کیا ہوا؟" نیہا نے اس کی شکل دیکھ کر پوچھا۔

"انکل غصہ کیوں کر رہے ہیں؟"

"یہ غصہ نہیں، معمول کی ڈانٹ ہے جو شرجیل کو پڑ رہی ہے۔" نیہا کہہ کر دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی جبکہ وہ اس کے مطمئن انداز پر حیران ہوئی اور پھر گہرا سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" نیہا نے اسے کھڑے ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

"اپنے لیے چائے بنانے جا رہی ہوں، آپ پئیں گی؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ اور ہاں فریج میں دیکھ لینا، کباب یا سموسے ہوں گے وہ بھی فرائی کر لینا۔"

وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ کچن میں آکر اس نے چائے کے لیے پانی چڑھایا پھر کباب تلنے کی تیاری کرنے لگی۔ ابھی اس نے کباب تلنے کے لیے تیل میں ڈالے ہی

تھے کہ شرجیل کچن میں داخل ہوا۔ "ہیلو کزن! کیا ہو رہا ہے۔"

وہ اپنے دھیان میں تھی' اس کے زور سے بولنے پر ہل کر رہ گئی۔ اس کے یوں ڈرنے پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"اف توبہ! آپ نے تو مجھے ڈرا دیا۔"

شرجیل نے بغور اس کی اڑی رنگت دیکھی "کیا میں اتنا ڈراؤنا ہوں کہ ایک خوب صورت لڑکی مجھے دیکھ کر ڈر جائے۔"

"میں آپ کی شکل کی نہیں آپ کی اچانک انٹری کی بات کر رہی ہوں۔"

"تم یہ سب کیا کر رہی ہو۔" اسے چائے کے ساتھ کباب تلتے دیکھ کر وہ پوچھنے لگا۔

"چائے بنا رہی ہوں اور کباب فرائی کر رہی ہوں۔" اس نے سادہ سا جواب دیا۔

"تم مہمان ہو' تم کیوں کر رہی ہو' نیہا کہاں ہے۔"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی نیہا خود ہی آگئی۔

"رومیعہ ہمارے گھر مہمان ہے' تمہارا کام ہے اس کی مہمان نوازی کرو۔ الٹا تم اس سے کام کروا رہی ہو۔" شرجیل کے کہنے کی دیر تھی' نیہا کی زبان سے شرارے نکلنے لگے۔ "تمہیں کیا تکلیف ہے۔ میں کام کروں یا نہیں اور تمہیں کیوں اس کا اتنا درد ہو رہا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کام کر رہی ہے۔

ابھی ابو سے شکایت کر دی تو دو منٹ میں گھر سے باہر نظر آؤ گے۔"

"تم صرف اپنی فکر کرو۔ سر پہ بیٹھی ہو ہمارے۔"

رومیعہ نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ اچھا بھلا ماحول خراب ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

کھانا کھانے کے بعد وہ نیہا کے ساتھ چھت پر آگئی نیہا کی سہیلی کا فون آگیا تو وہ نیچے چلی گئی۔ رومیعہ قدرے فاصلے پر دیوار کے پاس جا کر کھڑی ہوئی اور نیچے گلی میں دیکھنے لگی۔ تب ہی اس نے شرجیل کو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس نے رخ موڑے رکھا۔

"ہاؤ۔" وہ اس کے قریب آکر زور سے بولا تو وہ مڑ کر اطمینان سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم ڈری نہیں۔"

"میں نے آپ کو اوپر آتے دیکھ لیا تھا۔"

"اچھا۔" شرجیل نے مایوسی سے اسے دیکھا وہ سر جھکائے اپنے ناخنوں سے کھیل رہی تھی۔

"تم مجھ سے ناراض ہو؟"

"نہیں تو۔" وہ یونہی مصروف انداز میں بولی۔

"تو پھر کل سے مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہی ہو۔ اب یہ مت کہنا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس کے انکار کرنے کا موڈ دیکھ کر اس نے فوراً ٹوک دیا۔

"کل آپ نے جس طرح نیہا سے بات کی مجھے اچھا نہیں لگا۔"

"تم نے دیکھا نہیں' بدتمیزی اس نے شروع کی تھی۔"

"لیکن آپ کو یوں طنز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ان کی شادی نہیں ہو رہی تو اس میں ان کا کیا قصور ہے۔ یہ تو قسمت کی بات ہے' جب اللہ کا حکم ہوگا' ہو جائے گی۔ آپ بھائی ہو کر ایسی باتیں کریں گے تو ظاہر سی بات ہے انہیں برا لگے گا۔" شرجیل کچھ نہیں بولا تھا۔

"آپ نیہا سے ایکسکیوز کرلیں۔" وہ دھیمی آواز میں کہہ کر پیچھے ہو گئی' شرجیل نیہا کی طرف بڑھ گیا۔ رومیعہ نیچے آگئی۔

☼ ☼ ☼

یہ اس کی پھوپھو کا گھر تھا۔ مقصود انکل پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ اس کا کزن شرجیل ایم اے کر کے فارغ تھا' جس کی وجہ سے انکل سے اکثر اسے ڈانٹ پڑتی تھی اور نیہا اس کی کزن اٹھائیس سال کی تھی۔ شکل و صورت کی مناسب تھی۔ بی اے کے بعد

تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ پچھلے چھ سالوں سے اس کے رشتے کی تلاش جاری تھی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکا تھا۔ رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ کافی چڑچڑی ہو گئی تھی۔ نیہا اس سے سات سال بڑی تھی لیکن رومیعہ کو اسے باجی کہنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کی امی اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ جبکہ ابو کی صرف ایک ہی بہن تھیں شازیہ پھوپھو' نیہا کے خشک رویے کے باوجود وہ اسی رشتے کی وجہ سے یہاں آجاتی تھی۔

ہوش سنبھالتے ہی اس نے خود کو پھوپھو اور ان کی فیملی کے بہت قریب پایا تو لازمی بات ہے انسیت تو ہو گی لیکن جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی یہ انسیت کچھ زیادہ بڑھ گئی' جب اس کا نام شرجیل کے ساتھ لیا جانے لگا۔ ان دونوں کی باقاعدہ منگنی تو نہیں ہوئی تھی لیکن بڑوں میں یہ بات طے تھی۔ ان دونوں نے بھی کبھی باقاعدہ ایک دوسرے سے پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن ایک دوسرے کے جذبات سے آگاہ ضرور تھے۔ رومیعہ کی امی کا بس چلتا تو ایف اے کے بعد ہی اسے شرجیل کے سنگ رخصت کر دیتیں لیکن ایک مسئلہ نیہا کا تھا۔ جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی' شرجیل کی شادی کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا اور دوسرا مسئلہ شرجیل کی نوکری کا تھا' جب تک وہ برسر روزگار نہ ہو جاتا شادی ممکن نہ تھی۔ یہ سب مسئلے اپنی جگہ لیکن رومیعہ اپنے مستقبل کی طرف سے مطمئن تھی۔ جلد یا بدیر دلہن تو اسے شرجیل کی ہی بننا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو خطاب فون پر بات کر رہے تھے۔ وہ ایک نظر ان پر ڈال کر ڈریسنگ روم میں چلی گئیں' جب چینج کر کے واپس آئیں تو فون بند ہو چکا تھا اور خطاب صاحب سامنے دیکھتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ وہ مسکراتی ہوئیں ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئیں اور لوشن اٹھا کر خطاب صاحب کے سامنے بیڈ کے دوسرے کونے پر بیٹھ گئیں۔

"کیا بات ہے' بڑا مسکرایا جا رہا ہے۔ لگتا ہے کسی پرانی سہیلی کا فون تھا۔"

ان کی بات سن کر خطاب صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ "آپ جیلس ہو رہی ہیں بیگم صاحبہ۔" انہوں نے غور سے شمع کا چہرہ دیکھا۔ "ویسے اگر میں تمہیں بتا دوں کہ میں کس سے بات کر رہا تھا' تم واقعی خوش ہو جاؤ گی۔"

"اچھا! ایسا کون ہے؟" وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"میں عمر سے بات کر رہا تھا۔" پاؤں پر مساج کرتا ان کا ہاتھ رک گیا تھا۔ "کل وہ پاکستان آ رہا ہے۔"

لوشن کی بوتل پر ان کے ہاتھ کی گرفت کمزور ہو گئی اور اگلے ہی پل بوتل نیچے کارپٹ پر گر گئی۔ ان کی آنکھوں کی حیرت پہلے بے یقینی اور پھر آنسوؤں میں بدل گئی۔ خطاب صاحب نے انہیں رونے سے روکا

نہیں۔ کافی دیر بعد خاموشی میں ان کی آواز ابھری۔

"خطاب! آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کررہے۔"

"شمع!" انہوں نے کچھ ناراضی سے ان کا نام لیا۔ "میں ایسی بات مذاق میں کیوں کروں گا' جس کا تعلق تمہاری سانسوں سے جڑا ہے۔"

شمع سر جھکا کر ہونٹ چبانے لگیں۔ "مجھے ابھی بھی یقین نہیں آرہا۔ وہ واقعی آرہا ہے۔۔۔ بارہ سال بعد۔۔۔ تو کیا اس کی نفرت ختم ہوگئی۔ اس نے ہمیں معاف کردیا؟" وہ سوالیہ نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگیں تو خطاب صاحب نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں تسلی دی۔

"شمع! کوئی اولاد اپنے ماں باپ سے نفرت کرسکتی ہے؟" اور شمع نے جس طرح شاکی نظروں سے انہیں دیکھا' وہ مسکرادیے۔

"سب بھول جاؤ جو ہوا۔ اب ہمارا بیٹا آرہا ہے۔ اس کے استقبال کی تیاریاں کرو۔"

"ہاں! مجھے اپنے بیٹے کے استقبال کے لیے اس کے شایان شان تیاریاں کرنا ہیں۔" وہ پرجوش انداز میں کہتی ہوئی کھڑی ہوگئیں۔

"سرداراں! سرداراں!" ان کی تیز پکار پر وہ بھاگنے کے انداز میں کچن سے باہر آئی تھی۔

"خیریت بھابھی۔" وہ پریشانی سے ان کی شکل دیکھنے لگی۔

"سرداراں! عمر آرہا ہے۔" انہوں نے سرداراں کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر گھما ڈالا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر ڈالیں۔ دوسری طرف سرداراں کی وہی حالت تھی' جو تھوڑی دیر پہلے ان کی تھی۔

"آپ سچ کہہ رہی ہیں بھابھی! بابا آرہا ہے؟"

"ہاں سرداراں! وہ آرہا ہے۔ کل وہ میری آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ بارہ سال بعد میری آنکھوں کی پیاس بجھے گی۔ اس کا بچپن' جوانی۔۔۔ میں تصویروں میں ہی دیکھتی رہی۔" انہوں نے لاؤنج کی دیوار کی طرف دیکھا جو عمر کی تصویروں سے بھری تھی۔

"سرداراں! تمہیں یاد ہے نا' جب میں اور خطاب پہلی بار عمر کو لے کر آئے تھے۔" خاموشی پر انہوں نے مڑ کر دیکھا' پھر چلتی ہوئی اس کے سامنے آگئیں اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"میں بھی کتنی پاگل ہوں نا سرداراں! تم سے پوچھ رہی ہوں کہ تمہیں عمر اور عمر سے وابستہ باتیں یاد ہیں۔۔۔ تم کیسے بھول سکتی ہو' میں نے تو اسے صرف پیدا کیا تھا' تم نے تو اسے پالا تھا۔ تمہارے ہاتھ میں بڑا ہوا تھا' پھر بتا نہیں کہاں کمی رہ گئی میرے پیار میں یا تمہارے۔" کہتے ہوئے انہوں نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ ان کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔

سرداراں سے فرط مسرت کے باعث کچھ بولا ہی نہیں گیا' بس ان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکال کر ان کے کندھے پر رکھ دیا۔

ساری رات وہ سونے کی کوشش کرتی رہیں لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر جسم دکھنے لگا تھا۔ نظر جیسے گھڑی پر ٹھہر سی گئی تھی اور رات جیسے رک سی گئی تھی۔ پانچ بجتے ہی انہوں نے خطاب کو آواز دی اور وہ ایک ہی آواز پر اٹھ گئے۔ ان کے فوراً "اٹھ جانے پر وہ مسکرادیں۔

چھ بجے خطاب ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوگئے اور وہ بے چینی سے سارے گھر میں چکرانے لگیں۔ ہر چیز تیار تھی' بس آنے والے کا انتظار تھا۔ اس کی تصویر کے آگے کھڑے ہو کر وہ اس کے ایک ایک نقش کو آنکھوں کے رستے دل میں اتارنے لگیں۔ تب ہی باہر خطاب کی گاڑی کا ہارن بجا اور ان کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوگئی تھی۔ سرداراں بھی کچن سے نکل کر باہر کی طرف بھاگی۔ جبکہ وہ وہیں صوفے کے سہارے کھڑی تھیں۔ ان کی ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ ان کی نظریں دروازے پر جیسے رک سی گئیں۔ پھر خوشی سے جگمگاتے چہرے کے ساتھ پہلے سرداراں پھر خطاب اور ان کے پہلو میں وہ۔۔۔ ان کی نظریں جیسے ساکت ہوگئیں۔

"کتنا بڑا ہوگیا ہے۔" اس کا قد خطاب سے بھی اونچا تھا۔ "خوب صورت بھی ہوگیا ہے۔" سیاہ جیکٹ میں اس کی رنگت کتنی نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔

"شمع! دیکھو میں تمہارے بیٹے کو لے آیا ہوں۔" خطاب ان کے پہلو میں آکر کھڑے ہوگئے جبکہ وہ ان کے بالکل سامنے تھا۔ ان کے اتنے قریب کہ وہ اسے چھو سکتی تھیں۔ وہ اسے ساتھ لگا کر اس کا ماتھا چوم کر اپنی ممتا کی پیاس بجھانا چاہتی تھیں لیکن وہ ایسا کر نہیں سکیں۔

ان بارہ سالوں میں اس کے قد اور چہرے میں کافی فرق آگیا تھا لیکن چہرے کی سختی اور آنکھوں کی بے گانگی اب بھی برقرار تھی۔ ہونٹوں پر آج بھی مسکراہٹ نہیں تھی۔ ان دونوں کو یوں خاموشی سے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے دیکھ کر خطاب صاحب بولے تھے۔

"بھئی شمع کچھ تو بولو۔" پھر بیٹے کی طرف متوجہ ہوئے۔ "عمر! لگتا ہے تمہارے ماں کو ابھی تک یقین نہیں آیا کہ تم آگئے ہو ورنہ جب سے میں نے انہیں بتایا ہے کہ تم آرہے ہو' پاگلوں کی طرح سارے گھر میں پھر رہی تھیں۔ تمہاری پسند کے کھانے بھی بنائے ہیں۔ کیوں بھئی سرداراں! ناشتے میں کیا ہے۔" وہ سرداراں کی طرف گھوم گئے۔

"سب کچھ ہے بھائی جی! جو ہمارے عمر بابا کو پسند ہے۔"

ان کے مخاطب کرنے پر عمر نے مڑ کر اسے دیکھا' جو کچن کے دروازے میں کھڑی تھی۔ "بابا! مجھے بھوک نہیں' میں نے جہاز میں سینڈوچ لے لیے تھے۔"

شمع نے اس کی آواز کے رعب کو اچھی طرح محسوس کیا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! میں نے تمہارے لیے اتنا کچھ بنایا ہے۔ میری خاطر تھوڑا چکھ لو۔" سرداراں کے کہنے پر اس نے خطاب صاحب کو دیکھا تو وہ اس کا بازو تھام کر ڈائننگ روم کی طرف بڑھنے لگے پھر پیچھے مڑ کر ساکت کھڑی شمع کو دیکھا۔

"آؤنا شمع!" انہوں نے چونک کر خطاب کو دیکھا جو عمر کے ساتھ ڈائننگ روم میں داخل ہورہے تھے۔ ان کی آنکھیں یکا یک آنسوؤں سے بھر گئیں۔ بیگانگی کی دیوار ابھی تک قائم تھی۔ وہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئیں تو وہ بیٹھ چکا تھا اور سرداراں ایک ایک چیز اٹھا کر اس کے آگے رکھ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے جا کر خطاب کے دائیں طرف بیٹھ گئیں۔ انہوں نے محسوس کیا وہ صرف ان ہی سے نہیں بلکہ کسی سے بھی بات نہیں کررہا۔ خطاب بھی تھوڑی تھوڑی دیر میں خود ہی اسے مخاطب کررہے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ معذرت کرکے کھڑا ہوگیا۔ خطاب صاحب نے گہرا سانس لے کر شمع کو دیکھا جو سر جھکائے آنسو ضبط کرنے میں مصروف تھیں۔ خطاب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ڈبڈبائی نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"آپ نے دیکھا خطاب! وہ اب بھی ویسا ہی ہے۔ اس نے اب تک ہمیں معاف نہیں کیا۔"

"فضول باتیں سوچ کر دل چھوٹا نہ کرو۔ اتنے سال اکیلے رہ کر انسان ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ شکر کرو اس کے مزاج کی وہ شدت پسندی کم ہوگئی ہے اور جہاں تک معاف کرنے کی بات ہے' اس کا یہاں آنا' وہ بھی اپنی مرضی سے' اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہمیں معاف کرچکا ہے۔ اس کے دل میں جو غلط فہمیاں ہیں اب اسے ہم نے اپنے پیار سے دور کرنا ہے اور اب اسے جانے نہیں دینا۔ تم سمجھ رہی ہو نا شمع۔"

خطاب صاحب نے ان کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا تو انہوں نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دو دفعہ دستک کے بعد بھی جب دروازہ نہ کھلا تو انہوں نے دھیرے سے ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھلتے ہی اے سی کی خنک ہوا نے ان کا استقبال کیا۔ کمرے میں ٹی وی کی روشنی پھیلی تھی جبکہ وہ بیڈ پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ وہ بیڈ کے قریب جا کر کھڑی ہوگئیں۔ اس کے پاؤں بیڈ سے نیچے لٹک رہے تھے۔ ایک بازو تکیے کے نیچے اور دوسرا سر کے نیچے تھا۔ وہ بے ساختہ مسکرا

دیں۔ بچپن کی یہ عادت آج بھی برقرار تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئیں اور پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ اس کی آنکھوں میں ذرا سی جنبش ہوئی اور پھر اس نے پوری آنکھیں کھول دیں۔ سر گھماتے ہی اس کی نظران پر پڑی تو وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ اس کے یوں اٹھنے پر وہ شرمندہ سی ہو گئیں۔ اس نے ذرا کی ذرا نظر گھما کر انہیں دیکھا۔

"آپ کو مجھ سے کوئی کام تھا۔"

"نہیں۔" وہ بہت دھیرے سے بولی تھیں۔ "میں تو صرف تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ تمہارا دل لگ گیا ناں یہاں۔"

"دل وہاں لگایا جاتا ہے جہاں مستقل رہنا ہو' جب مجھے یہاں رہنا ہی نہیں تو دل لگانے کا فائدہ۔"

اس کے جواب پر شمع کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں اتر آئیں۔

"رہنا نہیں ہے۔" انہوں نے حیرت سے دہرایا "کیوں نہیں رہنا عمر! یہاں تمہارے ماں باپ ہیں۔ تمہارا گھر ہے۔ بزنس ہے جسے تم نے سنبھالنا ہے۔ وہاں کیا ہے جبکہ تم اپنی پڑھائی بھی کمپلیٹ کر چکے ہو۔"

وہ استہزائیہ انداز میں مسکرا کر پورے کا پورا ان کی طرف گھوم گیا۔ "میرے خیال میں میرے لیے یہاں بھی کچھ نہیں ہے اور کون سے ماں باپ کی بات کر رہی ہیں آپ۔ وہ ماں باپ جنہوں نے تیرہ سال کی عمر میں مجھے سات سمندر پار پھینک دیا۔ اس وقت جب مجھے آپ کی بے حد ضرورت تھی۔"

"عمر میری جان!" وہ بے اختیار ہو کر اس کی طرف بڑھیں اور اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "تمہیں خود سے دور کرنا ہمارے لیے آسان نہیں تھا۔ تم ہماری جان ہو۔ دل پر پتھر رکھ کر تمہیں خود سے دور کیا تھا۔ صرف تمہاری بھلائی کے لیے تمہارے ذہنی سکون کے لیے۔"

ان کا اتنا کہنا ہی تھا کہ اس نے جھٹکے سے ان کا ہاتھ ہٹا کر پیچھے کیا۔ "مطلب کیا ہے آپ کا؟ آپ شروع سے ہی مجھے ایسے ٹریٹ کرتی تھیں جیسے میں پاگل ہوں اور آخر میں سچ مچ ہی پاگل بنا دیا۔"

"عمر!" وہ تڑپ کر رہ گئیں۔

"میں پچھلی باتیں نہیں دہرانا چاہتا۔ میں یہاں کیوں آیا' مجھے نہیں پتا' لیکن اتنا ضرور بتا دوں کہ آپ لوگوں کے لیے نہیں آیا اور نہ ہی میرا ارادہ یہاں سیٹ ہونے کا ہے۔ اب مجھے ان تنہائیوں کی عادت ہو گئی ہے۔"

وہ کہہ کر رکا نہیں' تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ بھاگنے کے انداز میں اس کے پیچھے لپکیں لیکن وہ گاڑی لے کر نکل چکا تھا۔ ان کی انگلیاں تیزی سے خطاب کا موبائل نمبر ملانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

ڈائننگ روم میں وہ تینوں موجود تھے لیکن اتنی خاموشی تھی کہ صرف پلیٹوں میں کبھی کبھی چمچے لگنے کی آواز آرہی تھی۔ شمع کی توجہ کھانے کی طرف نہیں تھی۔ وہ مسلسل بے چینی سے خطاب کی طرف دیکھ رہی تھیں' جو کھانے کے دوران وقتاً فوقتاً عمر پر نظر ڈال رہے تھے۔ پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر گلا کھنکھار کر وہ عمر کی طرف متوجہ ہوئے۔

"عمر!" ان کے پکارنے پر وہ ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"دیکھو بیٹا! ابھی تمہیں پاکستان آئے کچھ دن ہوئے ہیں۔ تمہیں راستوں کا بھی علم نہیں اور دوسرے یہاں کے حالات بھی اچھے نہیں ہیں۔ لوگ گن پوائنٹ پر نقصان پہنچا جاتے ہیں۔ باہر جاؤ تو ڈرائیور کو ساتھ لے جایا کرو۔" ان کے بولنے کے دوران وہ ہاتھ روکے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اسی طرح دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"پہلی بات تو یہ کہ میں ہر کام اکیلا کرنے کا عادی ہوں۔ میں امریکہ میں نہ روم شیئر کرتا تھا اور نہ ہی ڈرائیو کرتے ہوئے کوئی مجھے ساتھ پسند ہے اور دوسری بات یہ کہ میں بچہ نہیں ہوں کہ راستہ نہ ملا تو کھو جاؤں

گا اور جہاں تک حالات کی بات ہے تو گن پوائنٹ پر کیا ہوگا' زیادہ سے زیادہ میرا والٹ یا گاڑی لے جائیں گے یا مجھے گولی مار دیں گے۔"

اس کے بے رحم تجزیے پر دونوں نے دہل کر اسے دیکھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ کندھے اچکا کر بولا شمع کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ دل تو خطاب صاحب کا بھی جیسے کسی نے مٹھی میں لیا تھا لیکن وہ کنٹرول کر گئے تھے۔

"تمہارے لیے یہ کتنا آسان ہے عمر! شاید تمہیں خود سے پیار نہیں لیکن ہم دونوں کی دنیا تو تم سے شروع ہو کر تم پر ختم ہوتی ہے۔ خدانخواستہ اگر تمہیں کچھ ہو جائے تو شاید وہ ہماری زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

اب کی بار وہ کچھ نہیں بولا۔ بس دوبارہ چمچہ اٹھا لیا۔ شمع اور خطاب بھی خاموشی سے پلیٹ پر جھک گئے۔ اس کے موبائل کی بیپ بجی تو وہ ایکسکیوز کر کے اٹھ گیا۔ جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

وہ کتاب کب سے آگے رکھے بیٹھی تھی لیکن پڑھنا محال تھا۔ نظر بار بار بھٹک کر کچن کی طرف جاتی جہاں نیو موجود تھیں۔ برتن پٹخنے کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ تب ہی باہر بائیک رکنے کی آواز آئی اور وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ کون آیا ہے اور پہلی بار اس نے سوچا کاش! آج اور خاص طور پر اس وقت نہ آتا۔

اس نے دروازہ کھولا تو باہر مسکراتا ہوا شرجیل تھا۔ جبکہ اس کو مسکرانے میں بڑی دقت پیش آئی تھی۔ کچن سے نکلتی نیو شرجیل کو دیکھ کر رک گئی تھیں۔

"السلام علیکم ممانی! کیسی ہیں آپ۔" شرجیل کے پوچھنے پر انہوں نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا اور کمرے میں چلی گئیں جبکہ شرجیل حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ "ممانی کو کیا ہوا ہے۔"

"کچھ نہیں' ایسے ہی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ اندر چلیں۔"

"نہیں یہیں ٹھیک ہے۔" وہ صحن میں رکھے تخت پر بیٹھ گیا۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ ہمارے تایا کے بیٹے کی شادی ہے۔ نیہا کو شاپنگ پر جانا ہے۔ اس نے کہا تمہیں لے آؤں۔"

رومیصہ نے مڑ کر کمرے کی طرف دیکھا جہاں اس کی امی موجود تھیں۔

"شرجیل! میں ضرور چلتی لیکن آج امی کا موڈ ٹھیک نہیں۔ مجھے نہیں لگتا امی مجھے جانے کی اجازت دیں گی۔"

"ممانی کیوں منع کریں گی۔ میں خود ان سے بات کرتا ہوں۔" وہ اٹھنے لگا۔ رومیصہ فوراً بولی۔

"آپ بات نہ کریں۔ امی کو آپ پر ہی غصہ ہے۔"

"کیوں؟" وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"آج میری کلاس فیلو آئی تھی۔ اپنے بھائی کا پروپوزل لے کر۔"

"واٹ؟" شرجیل کو جھٹکا لگا۔ "تم نے اسے بتایا نہیں تم انگیجڈ ہو۔"

رومیصہ نے سر جھکا لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی نیو کمرے سے باہر نکل آئیں۔

"شرجیل! مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔ دیکھو بیٹا! تمہاری اور رومیصہ کی بات طے ہے۔ یہ صرف ہم جانتے ہیں' لوگ نہیں۔ آج جس طرح رومیصہ کی کلاس فیلو اپنے بھائی کا پروپوزل لے کر آئی ہے کل کو کوئی اور بھی آسکتا ہے۔ کب تک ہم اپنی بیٹی کو بٹھا کر رکھ سکتے ہیں۔ آج سے کتنے سال پہلے بھائی صاحب اور باجی نے رشتے کی بات کی تھی۔ اس کے بعد سے مسلسل خاموشی ہے۔ کچھ دیر اور گزری تو ہمیں کچھ اور سوچنا ہوگا۔" نیو نے دو ٹوک بات کی اور ان کا جو مطلب تھا' وہ شرجیل کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ رومیصہ نے شکایتی نظروں سے ماں کو دیکھا "یہ آپ نے اچھا نہیں کیا امی!"

"میں نے جو بھی کیا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے اگر اس کے بعد بھی شرجیل نے کوئی مثبت قدم نہ اٹھایا تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔"

☼ ☼ ☼

اسے اکیلا آتا دیکھ کر نیہا کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"رومیعہ نہیں آئی؟" اس نے منہ سے جواب دینے کے بجائے سر نفی میں ہلایا۔

"کیوں؟" اس کے سوال پر شرجیل نے غصے سے اسے دیکھا۔

"میں تمہارا یا اس کا نوکر نہیں لگا ہوا جو تمہارا حکم ہو تو اسے لے آؤں اس کا حکم ہو تو واپس چلا جاؤں۔" اس کے غصیلے انداز کو نیہا نے ناسمجھی سے دیکھا جبکہ وہ غصے سے گھورتا ہوا اندر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو شازیہ فون پر کسی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔ وہ ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ بات کرتے ہوئے شازیہ نے غور سے بیٹے کے بگڑے ہوئے زاویے دیکھے اور مختصر بات کر کے فون بند کر دیا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"آپ اور ابو کل ہی ماموں کے گھر جائیں اور میری اور رومیعہ کی شادی کی بات کر کے آئیں۔"

"تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی؟" "نہیں امی! اتنے سال ہو گئے ہیں اس بات کو ممانی سخت خفا ہیں۔ آپ کو پتا ہے رومیعہ کے رشتے آ رہے ہیں۔"

پھر اس نے نیو کے ناراض ہونے والی ساری بات بتادی۔ شازیہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"امی پلیز آپ ابو سے بات کریں۔ میں یہ نہیں کہتا میری شادی کر دیں ابھی لیکن میری اور رومیعہ کی باقاعدہ منگنی کر دیں تاکہ انہیں کوئی ٹینشن ہو نہ مجھے پلیز امی!" اس کے ملتجی انداز پر وہ گہرا سانس لے کر بولیں۔

"ٹھیک ہے میں تمہارے ابو سے بات کرتی ہوں۔"

"تھینک یو امی!" وہ ایک دم ان کے گلے لگ گیا۔

☼ ☼ ☼

ان کی بات کے دوران وہ پورے انہماک کے ساتھ فائل پر نظریں دوڑاتے رہے۔ لیکن جوں ہی ان کی بات ختم ہوئی انہوں نے عینک کے اوپر سے انہیں گھورا۔ جس کا صاف مطلب تھا انہیں شازیہ کی بات پسند نہیں آئی۔

"کون سی ملٹی نیشنل کمپنی میں اسے جاب ملی ہے کتنی تنخواہ ہے اس کی۔" مقصود صاحب حسب توقع غصہ میں آ گئے۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم نے اور تمہارے بیٹے نے کیا سوچ کر یہ بات کی ہے۔ دس پندرہ لاکھ کما لیے ہیں اس نے؟ بہن کے فرض سے سبکدوش ہو گیا ہے؟ میں پرویز کے سامنے سوال کروں تو کس بنا پر۔ وہ پوچھے گا تمہارا بیٹا کرتا کیا ہے۔ کیا جواب دوں گا میں؟"

"آپ کی بات درست ہے مگر وہاں نیو بہت پریشان ہے۔ رومیعہ کے رشتے آ رہے ہیں۔ وہ کب تک ٹالتی رہے گی انہیں۔ میں صرف یہ چاہ رہی ہوں کہ شرجیل اور رومیعہ کی باقاعدہ منگنی کر دیتے ہیں۔ جلد یا بدیر اللہ نے چاہا تو شرجیل کو نوکری مل ہی جائے گی پھر نیہا کا مناسب رشتہ ملتے ہی ہم شرجیل اور نیہا کی اکٹھے شادی کر دیں گے۔" شازیہ کی بات پر مقصود صاحب چپ ہو گئے۔

اگلے جمعہ کو سادگی سے خاندان کے افراد جمع کر کے انہوں نے رومیعہ اور شرجیل کی منگنی کر دی۔ محلے میں مٹھائی بانٹی گئی تو سب کو ان کے رشتے کا علم ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

لاؤنج میں دو افراد بیٹھے تھے لیکن خاموشی ایسی تھی جیسے وہاں کوئی موجود نہ ہو۔ وہ ہاتھ میں ریموٹ لیے چینل سرچ کر رہا تھا جبکہ وہ کبھی اسے اور کبھی اسکرین کو دیکھ رہی تھیں۔ تب ہی دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا۔ اندر داخل ہونے والی ہستی کو دیکھ کر شمع

بے اختیار مسکرائی تھیں۔ جبکہ عمر اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہاں تک کہ وہ چلتی ہوئی لاؤنج کے درمیان عمر کے بالکل سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"ہائے برو! (Hi Bro) بڑے افسوس کی بات ہے پہچانا نہیں مجھے۔"

عمر ایک دم کھڑا ہوا تھا۔ شناسائی کا احساس اس کی آنکھوں میں چمکنے لگا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ شمع نے خوشگوار حیرت سے عمر کو دیکھا۔ جب سے وہ آیا تھا۔ انہوں نے پہلی بار اس کو یوں مسکراتے دیکھا تھا۔

"شزا۔۔۔ یہ تم ہو کتنی بڑی ہو گئی ہو۔" اس کے کہنے پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

پھر وہ شمع کی طرف مڑی۔ "کیسی ہیں آپ آنٹی!" وہ ان کے گلے لگی پوچھ رہی تھی۔

"میں تو ٹھیک ہوں تم سناؤ اچانک کیسے آ گئیں۔"

"کل اماں کو فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ برو آیا ہوا ہے تو مجھ سے ایک پل بھی وہاں رکا نہیں گیا۔ جو پہلی بس ملی اس میں بیٹھ کر آ گئی۔" کہنے کے ساتھ اس نے مسکراتی نظروں سے عمر کو دیکھا جو اسے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا اور شمع کو افسوس ہو رہا تھا کہ انہیں یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا کہ وہ شزا کو بلوا لیں۔

"اماں!" سرداراں کو دیکھتے ہی وہ بھاگ کر ان کے گلے لگ گئی۔

"میری تم سے بات ہوئی تھی تم نے بتایا نہیں کہ تم آ رہی ہو۔"

"بتا دیتی تو سرپرائز تو نہ رہتا۔ اب یہ سب چھوڑیں اور مجھے کچھ کھانے کو دیں سخت بھوک لگی ہے اور برو! امریکہ کے بغیر اداس تو نہیں ہوئے۔" وہ ایک بار پھر عمر کے سامنے تھی۔

کتنا اچھا لگتا ہے ناں جب گھر کے سب افراد اکٹھے ہوں اور پھر خوش بھی ہوں اور ان کے قہقہوں کے ساتھ گھر کے در و دیوار بھی مسکرائیں جیسے اب شزا کے آنے سے انہیں محسوس ہو رہا تھا۔ شزا سے ان کا خون کا رشتہ نہیں تھا۔ وہ سرداراں کی بیٹی تھی اور

سرداراں خطاب کی دور پار کی رشتہ دار تھی۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد خطاب اسے یہاں لے آئے۔ ان کی شادی کو چھ برس گزر گئے تھے لیکن ان کی گود سونی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی سن لی۔ سات سال بعد ان کے گھر عمر پیدا ہوا۔ عمر کی پیدائش کے بعد وہ بیمار ہو گئیں۔ تب یہ سرداراں ہی تھی جس کی وجہ سے وہ عمر کی طرف سے بے فکر ہو گئی تھیں۔ عمر ایک سال کا تھا جب انہوں نے سرداراں کی شادی کروا دی لیکن پتا نہیں اس کی قسمت میں کیا لکھا تھا۔ تین سال بعد وہ بیوگی کی چادر اوڑھ کر ایک سال کی بچی کے ساتھ پھر ان کے گھر آ گئی لیکن سرداراں کے آنے سے انہیں عجیب سا سکون ملا تھا۔ کیونکہ عمر کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھیں۔ چار سال کی عمر میں اس کی طبیعت میں عجیب جارحانہ پن تھا۔ اسکول جاتے ہوئے اسے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا لیکن اس کی شکایتیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ آج فلاں بچے کو مارا۔ آج فلاں کی کتابیں پھاڑ دیں۔ گھر میں بھی اس کی یہی کیفیت تھی اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کا جارحانہ پن بڑھتا جا رہا تھا۔ حالانکہ وہ اور خطاب ہر ممکن طریقے سے اس کی ہر بات پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ شاید یہی بات اس کی جارحانہ طبیعت کو مزید تقویت پہنچاتی تھی۔

عمر پانچویں کلاس میں تھا جب انہوں نے سوچا اپنی فیملی کو بڑھایا جائے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار انہوں نے عمر سے کر دیا۔

"عمر! تمہیں بہن اچھی لگتی ہے یا بھائی؟" وہ جوس پی رہا تھا گلاس ٹیبل پر رکھ کر انہیں دیکھنے لگا۔

"آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

"کیونکہ میں اور تمہارے پاپا سوچ رہے ہیں کہ تم اکیلے ہو تمہارا کوئی بھائی یا بہن بھی ہونا چاہیے۔"

"مجھے کوئی بہن یا بھائی نہیں چاہیے۔" اس کے سنجیدہ اور دو ٹوک انداز پر ان کی مسکراہٹ سکڑ گئی تھی

"لیکن بیٹا! بہن بھائی کی ضرورت تو سب کو ہوتی ہے۔ وہ آپ کے دوست آپ کے ساتھی ہوتے ہیں۔"

"مجھے کسی دوست' کسی ساتھی کی ضرورت نہیں۔"
وہ کہہ کر کھڑا ہو گیا جبکہ وہ کتنی دیر تک اس کے لہجے پر غور کرتے رہی تھیں۔ وہ دوبارہ پلٹا۔
"اور اگر میرا کوئی بھائی یا بہن آیا تو I will kill them (میں اسے جان سے مار دوں گا) اور شمع اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

خطاب صاحب نے بے یقینی سے اپنی بیوی کو دیکھا۔
"عمر نے ایسا کہا؟" انہیں اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ دس سال کا بچہ اتنی بڑی بات کہہ سکتا ہے۔
شمع نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس روئے جا رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر ان کے قریب آ گئے۔
"تم رو نہیں شمع! عمر ابھی بچہ ہے اور تم جانتی ہو وہ دوسرے بچوں کی نسبت مختلف ہے۔ اس نے جذبات میں آ کر ایسی بات کہہ دی' جب اپنے بہن بھائی کو دیکھے گا تو خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔" شمع نے روتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔
"خطاب! جو چیز میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھی اور محسوس کی ہے ناں! وہ آپ نے نہیں دیکھی۔"
خطاب صاحب کچھ دیر انہیں دیکھتے رہے پھر کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کا رخ عمر کے کمرے کی طرف تھا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے وہ کمپیوٹر پر گیم کھیل رہا تھا۔ وہ اسکرین دیکھنے لگے تھوڑی دیر بعد انہوں نے جھرجھری لی۔ اتنا پر تشدد گیم تھا' وہ ہر چیز کو توڑتا جا رہا تھا۔
"عمر!" انہوں نے بے ساختہ اسے زور سے آواز دی۔ ریموٹ پر چلتی اس کی انگلیاں تھم گئی تھیں۔ اس نے گردن گھما کر انہیں دیکھا' تو وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔
"کیا ہو رہا ہے؟"
"گیم کھیل رہا ہوں۔" وہ سی ڈی بدلتے ہوئے بولا۔
"پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔"
"گڈ۔" وہ مختصر سا جواب دے کر دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔
"عمر! آپ نے اپنی مما سے کہا آپ کو بھائی یا بہن نہیں چاہیے' کیا آپ اپنے پاپا سے شیئر کرو گے آپ نے ایسا کیوں کہا۔"
عمر نے ان کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ خطاب صاحب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بولنے کا حوصلہ دیا۔
"چھوٹے بچوں سے سب پیار کرتے ہیں تو جب کوئی لٹل کڈ ہمارے گھر آئے گا تو آپ اور مما مجھ سے زیادہ اسے پیار کریں گے اور یہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔" اس کی معصوم سوچ پر انہیں حیرت بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی۔
"نہیں عمر! ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔" ان کے کہنے پر اس نے سر نفی میں ہلایا۔
"میرا فرینڈ تھا بروز' اس کی ممی بھی اس کی بہن لینے گئی تھیں۔ اس کی بہن تو آ گئی لیکن ممی نہیں آئیں۔ اس کے پاپا اس کی نئی ممی اور نئے بہن بھائی لے آئے۔ اس کے پاپا اس سے بالکل پیار نہیں کرتے تھے اور پھر ایک دن وہ بھی اپنی ممی کے پاس چلا گیا۔"
اس کی آواز بھاری ہوئی تو وہ خاموش ہو گیا جبکہ خطاب صاحب بالکل ساکت بیٹھے تھے۔ عمر کی حساس طبیعت کیا سوچ رہی تھی ان کی سمجھ میں آ رہا تھا۔
"مجھے ایسے بہن بھائی نہیں چاہئیں جن کی وجہ سے میری مما مجھ سے دور ہو جائیں یا آپ مجھے پیار نہ کریں۔"
"عمر! ایسا نہیں ہو گا" انہوں نے اسے پچکارنا چاہا لیکن اس نے ان کے ہاتھ ہٹا دیے۔
"مجھے نہ کوئی دوست چاہیے اور نہ کوئی بہن بھائی۔ سنا آپ نے؟" وہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ کتنی دیر دروازے کو دیکھتے رہے' پھر تھکے ہوئے انداز میں اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی شمع نے انہیں دیکھا۔ ان کا اترا ہوا چہرہ انہیں بہت کچھ سمجھا گیا۔ وہ عمر کو سمجھانے گئے تھے لیکن اب انہیں سمجھا رہے تھے۔
"شمع! وہ بہت Sensitive (حساس) ہے میں نے تمہیں اس کے دوست کے بارے میں بتایا تھا ناں! اس نے اس کے فادر کی ہیوی اور اس کی موت کا کافی اثر لیا ہے۔ ویسے بھی شمع ڈاکٹر نے تمہیں کسی بھی قسم کا رسک لینے سے منع کیا ہے۔ تمہاری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ ہماری فیملی کمپلیٹ ہے۔ میں' تم' عمر اور ہمیں کیا چاہیے۔"
انہوں نے ان کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا اور ایک بار پھر وہ خاموش ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

عمر اور شہزا ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ عمر کے ہاتھ میں سفید فرولا پپی (پلا) تھا۔
"ارے یہ کس کا ہے بھئی!" شمع نے مسکراتے ہوئے اس پپی کو دیکھا' جسے عمر گود میں لیے سہلا رہا تھا۔
"آنٹی! یہ ہمیں راستے سے ملا ہے۔" شہزا نے جواب دیا۔
"بیٹا! یوں کسی کی کوئی چیز نہیں اٹھا لیتے۔ وہاں آس پاس کسی سے پوچھنا تھا۔" شہزا نے اب جواب دینے کے بجائے عمر کو دیکھا' جو بڑے مگن انداز میں پپی سے کھیلنے میں مصروف تھا۔
"عمر! بیٹا! مما کچھ پوچھ رہی ہیں۔" خطاب صاحب کے کہنے پر اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔
"مجھے یہ بہت اچھا لگا ہے پاپا! میں اب اسے اپنے پاس رکھوں گا۔ اگر کوئی لینے بھی آیا تو میں نہیں دوں گا۔ چلو شہزا!" شہزا کو اٹھنے کا کہہ کر وہ لان میں نکل گیا۔ ان دونوں کے باہر نکلتے ہی شمع نے ناراضی سے خطاب صاحب کو دیکھا۔
"خطاب! آپ نے عمر کو منع کیوں نہیں کیا۔؟
نہیں کس کا پپی ہے۔ یہ گلیوں میں گھومنے والا کوئی پالتو نہیں۔ باہر سے منگوایا ہوا لگتا ہے۔ ظاہر ہے کسی کا ہو گا اور اب نہ ملنے پر وہ لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔"
"شمع! ایک تو تم بہت جلد چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتی ہو۔ تم نے دیکھا نہیں عمر اس کے ساتھ کتنا خوش لگ رہا ہے۔ اول تو کوئی نہیں آتا اگر کوئی آیا بھی تو ہم یہ پپی خرید لیں گے۔ اس پپی کی قیمت میرے بیٹے کی خوشی سے زیادہ تو نہیں ہو گی۔"
شمع انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔ عمر کی خوشی کے لیے پتا نہیں انہیں کیا کیا قربان کرنا ہو گا۔
وہ ایک پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ چوکیدار نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔ خطاب صاحب کے پیچھے پیچھے وہ بھی لاؤنج میں آ گئیں۔ وہاں ایک معزز آدمی اور ایک بچہ' جو عمر کا ہی ہم عمر لگ رہا تھا' بیٹھے تھے۔ خطاب صاحب اس آدمی سے ہاتھ ملا کر سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔
"سوری! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" خطاب صاحب معذرت خواہ انداز میں سامنے بیٹھے شخص کو دیکھنے لگے۔
"جی!" آپ مجھے نہیں جانتے' میرا نام صفدر بھٹی ہے۔ میں اس لین میں بنگلہ نمبر 08 میں رہتا ہوں۔ تین دن پہلے ہمارا پپی گم ہو گیا تھا۔ ہمارے چوکیدار نے بتایا کہ اس نے ہمارے پپی کو آپ کے بیٹے کے پاس دیکھا ہے۔ یہ میرا بیٹا عبداللہ ہے۔ اسے جانور پالنے کا بہت شوق ہے۔ اس کی ضد پر ہم نے امریکہ سے وہ پپی امپورٹ کیا تھا۔" انہوں نے تفصیل سے بتایا۔
"دیکھیں صفدر صاحب! بات ایسی ہے کہ آپ کا پپی واقعی بہت خوب صورت ہے۔ ہمارے بیٹے کو بھی وہ بہت پسند ہے ہم وہ پپی آپ سے خریدنا چاہتے ہیں۔" سامنے بیٹھے بچے نے مضطرب انداز میں اپنے باپ کو دیکھا جبکہ باپ کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔
"لیکن اسے بیچنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"ہم اس کی دگنی قیمت دینے کو تیار ہیں۔"

"میں آپ سے ایک بار کہہ چکا ہوں کہ میں اسے نہیں بیچوں گا۔ آپ خوامخواہ اصرار مت کریں۔ آپ ہمارا پپی واپس کر دیں۔ آپ کی مہربانی ہو گی۔" سادہ سے لفظوں میں کہتے ہوئے ان کا لہجہ بہت کمزور تھا۔ اس سے پہلے کہ خطاب کچھ بولتے شمع نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں روک دیا۔ "میں لے لاتی ہوں" شمع کہہ کر عمر کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر انہوں نے گہرا سانس لیا اور ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔ عمر اور شہزا پپی کے ساتھ کھیل رہے تھے۔

وہ وقت سے مسکرائیں۔ "عمر! باہر اس کے اونر آئے ہیں۔" عمر کی ہنسی سکڑ گئی تھی۔ پپی پر اس کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔ "وہ اسے لینے آئے ہیں۔" انہوں نے شہزا اور عمر کو دیکھا۔ ان کے کہنے پر عمر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "میں اسے نہیں دوں گا آپ انہیں منع کر دیں۔"

"تمہارے پاپا کہہ رہے ہیں وہ تمہیں اس سے اچھا پپی لا کر دیں گے۔ تم اسے واپس کر دو۔"

"آپ انہیں منع کر دیں میں نہیں دوں گا۔" وہ ایک دم چیخ کر بولا۔ تب ہی خطاب صاحب اندر داخل ہوئے۔ شمع نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے عمر کی طرف دیکھا جو غصے سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس جا کر پیار سے سمجھاتے رہے لیکن جب وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو مجبوراً انہیں غصے سے پپی اس سے چھیننا پڑا۔ وہ تو پپی لے کر چلے گئے لیکن شہزا اور شمع کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ منٹوں میں اس نے کمرا الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ آخر میں اس نے خود کو باتھ روم میں بند کر لیا۔ وہ کتنی دیر تک دروازہ بجاتی رہیں یہاں تک کہ ان کی ہتھیلیاں سرخ ہو گئیں۔

اتوار کی وجہ سے وہ صبح دیر تک سوتے رہے۔ صبح دس بجے ناشتہ لے کر جب وہ باہر آئے تو انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔ عمر نہ صرف کمرے سے باہر تھا بلکہ خوشگوار موڈ میں شہزا اور شمع کے ساتھ ناشتا کر رہا تھا۔

وہ حیران ہوتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔

"گڈ مارننگ پاپا!"

"وری گڈ مارننگ میری جان!" وہ بے حد خوش ہو کر بولے۔ "میں نے رضا سے بات کی ہے وہ دو تین دن میں آپ کے لیے بہت اچھا پپی لا دے گا۔"

"اٹس او کے پاپا!" اس نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور گلاس میں بچے جوس کا بڑا سا گھونٹ لیا۔ "او کے پاپا میں پلے گراؤنڈ جا رہا ہوں۔" وہ اپنا بیٹ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ خطاب صاحب نے مسکرا کر شمع کو دیکھا۔ تب ہی سرداراں اندر داخل ہوئی۔ جس کا چہرہ معمول سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ وہ ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں مارکیٹ تک گئی تھی۔ راستے میں کوٹھی نمبر 08 کے آگے رش دیکھا تو رک گئی۔ پتا چلا کل ان کے پپی کا کسی نے گلا کاٹ کر مار دیا ہے۔"

"کیا انہوں نے دیکھا کس نے اسے مارا ہے۔" شمع نے جب پوچھا تو ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

"وہ نہیں لیکن اس کی لیکن پر ان دونوں کی سانسیں رک گئی تھیں۔" "میں نے کل بابا کو رات کو باہر سے آتے دیکھا تھا۔ ان کے ہاتھوں اور کپڑوں پر خون لگا تھا۔" سرداراں کچھ دیر بت بنے دونوں میاں بیوی کو دیکھتی رہی پھر لاؤنج سے باہر نکل گئی۔

"ایسا کب تک چلے گا خطاب! غصہ اپنی جگہ لیکن اتنی سفاکی... ایک معصوم جانور کو مار دیا۔ کل کو وہ کسی انسان کو بھی مار سکتا ہے۔ اوہ میرے خدا۔" انہوں نے سر پکڑ لیا۔ جبکہ خطاب صاحب پُرسوچ انداز میں ٹیبل کی سطح کو گھور رہے تھے۔

"میں کسی سائیکاٹرسٹ سے بات کرتا ہوں۔" وہ کرسی دھکیل کر کھڑے ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد انہوں نے عمر پر اور زیادہ توجہ دینا شروع کر دی۔ عمر کے پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری خطاب صاحب نے لے لی اور گھر میں شمع اور سرداراں ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے۔ خطاب صاحب نے اسے پپی بھی منگوا دیا تھا۔ ایک سال آرام سے گزر گیا تھا۔ میٹرک اس نے اچھے گریڈ کے ساتھ پاس کیا تو اس کی فرمائش پر خطاب صاحب نے اسے بائیک لے کر دے دی۔ اب جب وہ قدرے مطمئن ہونے لگے تھے تو حادثہ ہو گیا۔

وہ سرداراں کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ ابھی آدھے راستے میں تھیں، جب انہیں خطاب کا فون آیا۔ انہوں نے فوراً انہیں گھر آنے کو کہا تھا۔ ان کی پریشان آواز سن کر ان کا دل سکڑ گیا۔ انہیں لگا کچھ بہت برا ہو گیا ہے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ گھر داخل ہوئیں۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر خطاب اور عمر پر پڑی۔ انہیں صحیح سلامت دیکھ کر انہوں نے گہرا سانس لیا۔ لیکن یہ اطمینان عارضی تھا عمر کی حالت قابل اطمینان نہیں تھی۔ اس کی شرٹ کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ شرٹ کے دامن پر خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ بال بکھرے تھے۔ جبکہ چہرے پر بھی جا بجا خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ بے اختیار عمر کی طرف بڑھیں۔

"عمر میری جان یہ کیا ہوا۔" اس کے زخم چھوتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

"مت بہاؤ آنسو اس کے لیے۔ یہ اس قابل نہیں کہ اس سے ہمدردی کی جائے۔ درندگی اور سفاکی کی کوئی حد ہوتی ہے۔ تمہیں پتا ہے اس نے آج کیا کیا ہے؟" خطاب صاحب نے غصے سے بولتے ہوئے سپاٹ چہرہ لیے عمر کو دیکھا۔ جبکہ شمع پریشانی سے کبھی عمر اور کبھی غضبناک تیور لیے خطاب کو دیکھ رہی تھیں۔

"آج اس نے اپنی گاڑی سے ایک لڑکے کو ٹکر مار دی اور بجائے اس کے کہ اپنی غلطی پر معذرت کرتا، الٹا اس لڑکے سے ہاتھا پائی کرنے لگا۔ لوگ اسے مارتے ہوئے تھانے لے گئے تھے۔ وہاں سے لے کر آ رہا ہوں صاحبزادے کو۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے لیکن اس کے پاگل پن کی مجھے کوئی حد نظر نہیں آتی۔ ایک عمر لگتی ہے عزت کے ساتھ نام بنانے میں اور یہ کبھی چوری کر کے کبھی مار پیٹ کر کے میری عزت کو خاک میں ملانے پر تلا ہے۔"

عمر نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں انہیں کوئی شرمندگی نظر نہیں آئی جس نے ان کا غصہ اور بھڑکا دیا۔

"بے شرمی دیکھو اس کی، کوئی ملال کوئی پچھتاوا نہیں۔ مجھے گھور رہا ہے۔ کیا کچھ نہیں کیا اس کے لیے۔"

"کوئی احسان نہیں کیا آپ نے مجھ پر۔" وہ ایک دم کھڑا ہو کر بدتمیزی سے بولا۔ خطاب صاحب ایک پل کے لیے اسے دیکھ کر رہ گئے، دوسرے ہی پل ان کا ہاتھ گھوما تھا اور اس کے گال پر اپنا نشان چھوڑ گیا۔ شمع نے بے ساختہ سینے پر ہاتھ رکھا جبکہ عمر نے بڑی بے یقینی سے باپ کو دیکھا۔ بہت زور دینے پر بھی اسے یاد نہیں آیا کہ کبھی اس کے ماں باپ نے اس کو انگلی سے بھی چھوا ہو۔

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔" خطاب صاحب نے اسے کمرے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ "فکر کرتا ہوں تمہارا کوئی علاج۔"

ان کی دھمکی پر عمر نے ہونٹ بھینچ کر انہیں دیکھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی خطاب صاحب نڈھال انداز میں صوفے پر بیٹھ گئے اور دونوں ہاتھوں میں اپنا سر گرا لیا۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا شمع! جو ایک معصوم جانور کو یوں بے دردی سے مار سکتا ہے، وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں اس لڑکے کو ہسپتال میں دیکھ کر آ رہا ہوں۔ اتنی بے دردی سے مارا ہے عمر نے اسے، خدانخواستہ اگر وہ مر جاتا تو جانتی ہو کیا ہوتا۔ پھانسی ہو جاتی اسے۔" شمع کا سارا وجود بے جان ہو گیا تھا۔

"پچاس ہزار اس لڑکے کے گھر والوں کو دے کر آیا ہوں اور پچاس ہزار پولیس کو۔ ابھی تو معاملہ رفع دفع ہو گیا، لیکن اب مزید میں کسی حادثے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔" وہ موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگے۔

جس ماہر نفسیات کے پاس عمر کا علاج چل رہا تھا۔ اس نے خطاب کو مشورہ دیا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے عمر کو خود سے دور بھیج دیں۔ پہلے تو خطاب صاحب نے اس بات پر غور نہیں کیا۔ لیکن پپی کی موت اور پھر

اس لڑکے پر جان لیوا حملے نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ امریکہ میں ان کے ایک بے اولاد دوست تھے' خطاب صاحب نے انہیں اپنی مجبوری سنائی تو انہوں نے خوشی خوشی عمر کی ذمہ داری قبول کرلی۔ جبکہ عمر کے جانے کا سن کر شمع بیٹے سے اکھڑ گئیں۔ جس اولاد کی خاطر انہوں نے دوبارہ اپنی گود ہری نہیں ہونے دی۔ اسے خود سے دور کرنا انہیں گوارا نہیں تھا۔ لیکن خطاب صاحب نے انہیں ماضی میں عمر کی غلطیوں اور مستقبل میں اس کا انجام سمجھا کر راضی کر ہی لیا تھا۔

کل عمر کی فلائٹ تھی اور شمع کو یوں لگ رہا تھا جیسے کل عمر نہیں ان کی روح ان سے جدا ہو رہی ہو۔ وہ آنکھیں بند کیے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے عمر کے بارے میں سوچ رہی تھیں' جب دروازہ کھلنے کی آواز پر انہوں نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ عمر دروازے کا ہینڈل تھامے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں۔ ان کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ وہ آہستہ سے چلتا ہوا ان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ ان کے قریب بیٹھ کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"مما میں آپ سے ہر اس بات کے لیے معافی مانگتا ہوں جس سے آپ کو اور پاپا کو تکلیف ہوئی ہے۔ آپ پاپا سے کہیں مجھے کہیں مت بھیجیں۔ میں آئندہ ایسا کچھ نہیں کروں گا جس سے آپ لوگوں کو پرابلم ہو۔ میں آپ کے اور پاپا کے بغیر نہیں رہ سکتا مما پلیز!" آخر میں روتے ہوئے اس نے پیشانی ان کے ہاتھوں پر ٹکا دی۔ اس کے آنسو ان کے ہاتھوں پر گر رہے تھے اور قطرہ قطرہ ان کا دل پگھل رہا تھا۔ اس وقت ان کا دل چاہ رہا تھا وہ خطاب کی نصیحتیں' ڈاکٹر کی ہدایتیں سب بھول کر اپنے بیٹے کو سینے سے لگالیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ ان کی ذرا سی کمزوری عمر کے مستقبل کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ تب ہی دروازہ کھلا۔ ان دونوں نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا۔

"پاپا! میں نہیں جاؤں گا۔" انہیں دیکھ کر وہ اپنے مخصوص اکھڑ انداز میں بولا تھا۔ خطاب صاحب نے غصے سے اسے دیکھا۔

"یہ بحث اب فضول ہے۔ تمہاری کل سیٹ کنفرم ہے اور وہاں تمہارا داخلہ بھی ہو چکا ہے۔ میں دیکھتا ہوں تم کیسے نہیں جاتے۔ ابھی تک تم نے میری صرف نرمی دیکھی ہے سختی نہیں۔" ان کے آخری جملے پر عمر نے شاکی نظروں سے شمع کو دیکھا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

اور پھر وہ چلا گیا۔ جانے سے پہلے وہ کسی سے مل کر نہیں گیا۔ ان کی شکایت پر خطاب نے کہا کہ "وقتی غصہ ہے' کچھ سال دور رہے گا۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا اور پھر کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہا ہے۔ آتا جاتا رہے گا۔" لیکن وہ ان دونوں کی خام خیالی تھی۔ اس کا غصہ شاید بدگمانی اور پھر نفرت میں بدل گیا۔ بارہ سال گزر گئے وہ کبھی پاکستان نہیں آیا۔ شروع کے چند سالوں کے بعد وہ امریکہ اس سے ملنے گئے تو انہیں دیکھ وہ دوسری اسٹیٹ چلا گیا اور جب تک وہ وہاں رہے' وہ واپس نہیں آیا۔ وہ جب بھی اس سے ملنے کا ارادہ کرتے' وہ کسی دوسرے شہر یا ملک کا رخ کرلیتا۔

شمع اب اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکی تھیں کہ اچانک وہ آگیا۔ وہ سمجھیں ان کی ماستا اور ان کی دعائیں اسے کھینچ لائی ہیں۔ وہ بدل گیا ہے۔ لیکن وہ تو آج بھی ان سے ناراض تھا۔

"آنٹی!" شہزا کی آواز پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"بیٹو کے لیے چاند جیسی دلہن ڈھونڈنا شروع کر دیں۔ بیٹو شادی کے لیے مان گئے ہیں۔"

وہ دونوں اس موضوع پر بات کر رہے تھے مگر شمع ماضی کی تلخ یادوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ شہزا کی بات سن کر مسکرانے لگیں۔

"مجھے شادی کرنی ہے یا نہیں یا کس سے کرنی ہے' اس کا فیصلہ میں خود کروں گا۔ اس کا حق میں کسی کو نہیں دوں گا چاہے وہ رشتے میں میرے ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں۔ جب میں خود اس قابل ہوں کہ اپنے فیصلے کر سکوں تو میں کیوں کسی کی رائے لوں۔" شمع کا

چہرہ آن واحد میں لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ ان پر ایک نظر ڈال کر وہ باہر نکل گیا۔ شہزا تاسف سے شمع کو دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"تم مجھے کہاں لے آئی ہو۔ تمہیں معلوم بھی ہے کہ مجھے پبلک پلیس سے سخت الجھن ہوتی ہے۔" ہجوم کو دیکھ کر اس نے شہزا سے کہا۔

"اگر آپ امریکہ سے میرے لیے کچھ لے آتے تو میں کیوں آپ کو یہاں لاتی اب جلدی سے جیب ڈھیلی کریں مجھے بہت ساری شاپنگ کرنا ہے۔"

عمر نے بحث نہیں کی اور اس کے پیچھے چلنے لگا۔ شہزا ایک جیولری کی دکان میں گھس گئی۔ پندرہ منٹ تک جب شہزا کی مصروفیت میں کوئی فرق نہ آیا تو وہ اسے بتا کر باہر نکل آیا۔

باہر موسم بہت اچھا تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ ستون کے قریب کھڑے ہو کر وہ آتے جاتے لوگوں کا جائزہ لینے لگا پھر کچھ خیال آنے پر اپنا موبائل نکالا اور ٹریول ایجنٹ کا نمبر ملانے لگا' جب ایک رنگین آنچل آ کر اس کے چہرے پر رک گیا۔

☼ ☼ ☼

چل چل کر اس کے پاؤں شل ہو گئے تھے لیکن نیہا کو پتا نہیں کیسا ٹورس لینا تھا۔ وہ نیہا کو یہ کہہ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ تھک گئی ہے کہ کہیں اس کا موڈ نہ خراب ہو جائے۔ کیونکہ شرجیل سے باقاعدہ منگنی کے بعد وہ اس سے خفا خفا سی تھی۔

"نیہا! جو کچھ لینا ہے جلدی لو ورنہ گھر چلو۔ فضول چکر لگوا رہی ہو۔" جو بات رومیصہ نے کہنا تھی وہ شرجیل نے کہہ دی تھی۔

"تم تھک گئے ہو تو کہیں بیٹھ جاؤ — میں رومیصہ کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔"

رومیصہ نے ایک بے بس نظر شرجیل پر ڈالی اور چار و ناچار نیہا کے ساتھ چل پڑی۔ نیہا ایک اسٹال کے پاس رک گئی' جہاں بے حد رش تھا۔ وہ ایک سائیڈ پر کھڑی ہو گئی اور دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی۔ نیہا وہاں سے فارغ ہوئی تو اس نے اس کے پیچھے جانے کے لیے قدم بڑھائے لیکن ایک قدم بڑھاتے ہی اسے رکنا پڑا۔ اس کا دوپٹہ کہیں اٹک گیا تھا۔ اس نے ذرا سا گردن گھما کر دیکھا اور پھر حیرت کے مارے پوری گھوم گئی۔ اس کے دوپٹے کا کونا ستون کے پاس کھڑے شخص کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے مڑنے پر اس نے بھی اسے دیکھا۔ رومیصہ نے اس شخص کی نظروں کو اپنے چہرے پر ٹھہرتے محسوس کیا تھا۔ ان نظروں میں جانے کیا تھا کہ اسے اپنا چہرہ دہکتا محسوس ہونے لگا۔ اس نے اپنا دوپٹہ کھینچا' اس کے باوجود نہ اس نے نظروں کا زاویہ بدلا اور نہ ہی اس کا دوپٹہ چھوڑا۔ رومیصہ نے گھبرا کر اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ لوگ اپنے دھیان میں تھے لیکن کچھ لوگ ان کی طرف متوجہ بھی ہو گئے تھے۔ رومیصہ یکدم پریشان سی ہو گئی۔ اتنے ہجوم میں بھی اسے اس شخص سے عجیب سا خوف محسوس ہوا تھا۔ وہ دو قدم چل کر اس کی طرف بڑھی۔

"میرا دوپٹہ۔" رومیصہ نے بہت آہستگی سے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

اس نے دوپٹہ چھوڑ دیا اور وہ ایسے بھاگی جیسے موت کا فرشتہ اس کے پیچھے لگا ہو۔

"نیہا! میرا خیال ہے گھر چلتے ہیں۔ باقی شاپنگ کل کرلیں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی بس یہ چوڑیاں لے لیں۔" یہ کہہ کر نیہا پھر چوڑیوں کے اسٹال کی طرف مڑ گئی۔ رومیصہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ کہیں نہیں تھا وہ ہر سیکنڈ کے بعد ارد گرد نظر بھی ڈال رہی تھی۔ وہ شخص نہ جانے کیوں اس کے حواسوں پر سوار ہو گیا تھا۔

"تم بھی لے لو۔" نیہا کے کہنے پر اس نے پہلے چونک کر نیہا کو اور پھر چوڑیوں کو دیکھا اور پھر سر جھٹک کر سارا دھیان چوڑیوں پر لگا دیا۔ ملٹی شیڈ میں بہت خوب صورت چوڑیاں تھیں۔ اس نے کچھ چوڑیاں اٹھا کر پہن لیں۔ اس کی نازک کلائیوں میں وہ بہت

اچھی لگ رہی تھیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے جونہی چوڑیوں والے سے قیمت پوچھنے کے لیے سر اٹھایا۔ اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی بلکہ ہاتھ میں پکڑی چوڑیاں بھی گر گئیں۔ وہ شخص بالکل اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"کیا ہوا۔" اس کو یوں ساکت کھڑے دیکھ کر نیہا نے پوچھا تھا۔ "تمہاری طبیعت زیادہ خراب لگ رہی ہے۔ چلو گھر چلتے ہیں۔" نیہا کے کہتے ہی وہ تیزی سے مڑ گئی۔

"برو!" وہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا' جب شزا کی آواز پر رک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہ بھاگتی ہوئی اس کی طرف آ رہی تھی۔

"کہاں جا رہے ہیں میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہی تھی۔" اس کے قریب پہنچنے پر وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ عمر نے مڑ کر اس طرف دیکھا' وہ نہیں تھی۔ وہ بے چینی سے اجنبی چہروں میں تلاش کرنے لگا۔

"کیا ہوا' کس کو ڈھونڈ رہے ہیں۔" اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے شزا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں چلو۔" وہ چل پڑا' لیکن چند قدم چل کر اس نے پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنی زندگی میں اسے کئی چہرے اچھے لگے تھے' لیکن یوں کسی چہرے نے بے چین نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں وہ کون تھی' کہاں رہتی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ اپنے محسوسات وہ کسی سے شیئر کرنا چاہتا تھا۔ شزا کا خیال آتے ہی اس نے گھڑی کی طرف دیکھا' جہاں رات کے ایک بج رہے تھے۔ اس بتانے کا ارادہ صبح تک ملتوی کر کے وہ کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ سارا لان اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ کہیں کہیں بلب کی روشنی تھی۔ "مجھے اسے ڈھونڈنا ہو گا۔"

اس نے کھڑکی کے پٹ پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے ہوئے تھے۔

"مجھے اسے حاصل کرنا ہے' ہر صورت۔"

بہت سالوں بعد پھر پہلا سا جنون اس کے اندر آگیا تھا۔

اگلی ہی صبح وہ موجود تھی۔

اتنے دنوں سے آپ نے کیا طریقہ اختیار کیا ہوا ہے' صبح نکل جاتے ہیں رات کو دیر سے آتے ہیں۔"

"میں ایک لڑکی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"اوہ ۔۔۔ ذرا وضاحت کریں گے' یہ لڑکی کون ہے۔"

"اس دن ہم مارکیٹ گئے تھے نا' وہاں نظر آئی تھی۔ پھر وہ لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گئی۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔"

اس کے پُرعزم انداز پر شزا نے ابرو اچکا کر دیکھا۔ معاملہ کافی سیریس لگتا ہے۔

"کیا وہ بہت خوب صورت ہے۔"

"ہاں' کم از کم مجھے تو وہ دنیا کی خوب صورت ترین لڑکی لگی تھی۔" وہ سامنے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا جیسے وہاں اس کی تصویر لگی ہو۔

"اس لیے آپ نے اپنی سیٹ کینسل کروائی ہے۔" عمر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ٹریول ایجنسی سے فون آیا تھا۔" شزا نے اس کی حیرت دور کی۔ "آپ تو کہہ رہے تھے مجھے کسی پاکستانی لڑکی سے شادی نہیں کرنا۔"

شزا نے طنزیہ انداز میں اسے پچھلی بات کا حوالہ دیا۔ عمر نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تاول اٹھا کر باتھ روم میں چلا گیا۔

"میں انکل آنٹی کو بتاؤں؟" جب وہ باہر آیا تو شزا نے پوچھا عمر کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ ان سے ڈسکس کرنا' میں ضروری نہیں سمجھتا۔"

"برو وہ آپ کے ماما پاپا ہیں۔ آپ سے پیار کرتے ہیں۔ آپ کی شادی ان کی کتنی بڑی خواہش ہے۔"

"پلیز شزا! اس ٹاپک کو رہنے دو۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں۔ پتا نہیں وہ کب ملے گی اور کتنا انتظار کرنا ہو گا۔" اس نے سختی سے شزا کی بات کاٹ دی۔

☼ ☼ ☼

"عمر وہ آنکھیں بند کیے اسی کے تصور میں گم تھا کہ شمع کی آواز پر اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔"

"کہیں جانے کے لیے تیار لگ رہی ہیں۔"

"تمہارے پاپا کے فرینڈ کے بیٹے کی شادی ہے۔ میں اور خطاب چاہ رہے تھے کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔"

"آپ جانتی ہیں مجھے فنکشن اور خاص طور پر شادی کے فنکشن بالکل پسند نہیں۔" اس کے روکھے لہجے پر ایک پل کے لیے وہ چپ ہو گئیں۔

"ہاں جانتی ہوں لیکن تم اتنے عرصے بعد آئے ہو تو سب تم سے ملنا چاہ رہے تھے۔ اسی بہانے ملاقات ہو جائے گی تمہاری سب سے۔"

انہوں نے ذرا ٹھہر کر پھر کہا۔ "اگر تم چلو گے تو مجھے اچھا لگے گا۔" عمر نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا وہ بڑی آس سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ جانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن پتا نہیں کیسے وہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

"میں تیار ہو کر آتا ہوں۔" شمع کتنی دیر حیرت سے وہاں کھڑی رہیں۔

کتنے سالوں بعد وہ پاکستانی شادی کی تقریب' خاص طور پر مہندی کی تقریب میں شرکت کر رہا تھا۔ ہر طرف مہکتے رنگین آنچل تھے۔ فضا میں موسیقی کا شور تھا۔ خطاب صاحب اور شمع نے اسے ساتھ اندر آنے کو کہا تھا لیکن وہ شامیانے سے باہر آگیا۔ باہر نکل کر وہ بلا سوچے سمجھے ایک طرف چلنے لگا۔ سامنے اسے رہائشی عمارت نظر آئی۔ وہ اپنی دھن میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ لمبا کاریڈور تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ بلا اجازت اندر آگیا ہے۔ وہ پلٹنے ہی والا تھا جب چوڑیوں کی آواز سنائی دی۔ وہ غیر ارادی طور پر مڑا اور مڑتے ہی جیسے ساکت ہو گیا۔ وہ خیال بالکل حقیقت کے روپ میں اس کے سامنے تھا۔ اورنج اور پیلے رنگ کے فراک پاجامے کے ساتھ ڈھیروں ہم رنگ چوڑیاں پہنے وہ آئینے کے سامنے کھڑی چوٹی بنا رہی تھی۔ عمر کی طرف اس کی پشت تھی۔

وہ بے خود سا ہو کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ پراندہ کو گرہ لگا کر جوں ہی اس نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ سامنے نظر آتا عکس اسے ساکت کر گیا۔ وہ اس کے قریب آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی حیرت ایک دم ڈر میں بدل گئی وہ تیزی سے پلٹی۔ وہ اس سے ذرا ہی فاصلے پر تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے واضح اثرات تھے۔ دل کا ڈر اس کے چہرے سے بھی جھلکنے لگا۔ جبکہ اس کے برعکس عمر کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔

"ہائے آئی ایم عمر' عمر خطاب۔" اپنا تعارف کروانے کے ساتھ اس نے ہاتھ بھی بڑھا دیا۔

"ہم پہلے بھی مل چکے ہیں مارکیٹ میں۔ شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ اس دن بھی تم غائب ہو گئیں۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ کہتے ہوئے ایک قدم مزید آگے بڑھا تو وہ سہم کر پیچھے ہٹی تو دیوار سے ٹکرا گئی پھر باہر نکلنے کے لیے آگے بڑھی لیکن وہ ایک دم سامنے آگیا وہ ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اس بدتمیزی پر اس کا دل چاہا کہ ایک تھپڑ لگا دے لیکن ایک تو وہ کبھی بھی اتنی بہادر نہیں رہی دوسرا اس طرح کی صورت حال سے کبھی اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا' سو وہ کچھ نہ کر پائی۔

"میں نے تمہارا نام پوچھا ہے۔" اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے نام پوچھے بغیر اسے جانے نہیں دے گا۔ بدقسمتی سے وہ بالکل اکیلی تھی۔ اس کے کپڑوں پر مہندی لگ گئی تھی' وہ اسے صاف کرنے آئی تھی اور یہ شخص پتا نہیں کہاں سے آگیا تھا اور کیوں اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر دوبارہ اسے دیکھا جو دیوار کی مانند اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ایک بار پھر ہمتیں مجتمع کر کے آگے بڑھی تھی لیکن دوسرے ہی قدم پر اسے لگا گویا زمین نے اسے جکڑ لیا ہو۔ عمر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی اتنی جرأت پر اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اسے اپنی بے بسی پر یک دم رونا سا آ گیا۔ عمر نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا اور اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ ایسے وہاں سے بھاگی جیسے اگر تھوڑی

دیر مزید وہاں کھڑی رہی تو قیامت آجائے گی۔ عمر کتنی دیر اس راستے کو دیکھتا رہا' جہاں سے وہ گئی تھی' پھر یک دم شامیانے کی طرف بھاگا۔

اندر رونقیں عروج پر تھیں۔ وہ متلاشی نظروں سے ایک ایک چہرے کو دیکھنے لگا اور پھر وہ اسے نظر آگئی۔ وہ کسی لڑکی کے ساتھ حواس باختہ کھڑی تھی۔ اس کے قریب کھڑے لڑکے کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ ان کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ خطاب صاحب کی پکار پر رک گیا۔

"عمر! ادھر آؤ میں تمہیں اپنے دوستوں سے ملواؤں۔"

اس نے دوبارہ پیچھے مڑ کر دیکھا وہ ایک بار پھر غائب ہو چکی تھی جبکہ وہ لڑکا وہیں موجود تھا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

"پاپا! آپ اس لڑکے کو جانتے ہیں۔"

خطاب صاحب نے کچھ حیران ہو کر سامنے دیکھا۔ کچھ دیر تک دیکھنے کے بعد انہوں نے اسے پہچان لیا۔

"ہاں' یہ ہماری کمپنی کے لیگل ایڈوائزر مقصود صاحب کا بیٹا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"پاپا! میں تھک گیا ہوں گھر جانا چاہتا ہوں۔" کافی دیر تک وہ اسے دوبارہ نظر نہ آئی تو اس نے خطاب صاحب سے کہا۔

اب اس کے ہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔

"پاپا! میں مقصود صاحب کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ان کے گھر جائیں میرا رشتہ لے کر۔" خطاب صاحب حیران ہو کر اسے دیکھنے لگے۔

"لیکن بیٹا کیا آپ ان لوگوں کو جانتے ہیں۔"

"جانتا تو نہیں ہوں لیکن مجھے شادی اسی لڑکی سے کرنا ہے۔" اس سے پہلے خطاب کچھ کہتے شمع بول پڑیں۔

"ٹھیک ہے' ہم کل ہی ان کی طرف چلے جائیں گے۔" عمر نے بے ساختہ شمع کی طرف دیکھا اور مزید کوئی بات کیے بغیر اٹھ گیا۔ اس کے جاتے ہی شمع خطاب صاحب کی طرف مڑیں۔

"خطاب! ہم بات پکی ہوتے ہی شادی بھی جلد کر دیں گے۔"

"ارے بابا آرام سے' پہلے لڑکی تو دیکھ لو۔" خطاب صاحب ان کے جذباتی پن پر ہنس پڑے۔

"وہ جیسی بھی ہو گی' مجھے پسند ہو گی۔ میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ عمر شادی کے بعد یہیں رہنے لگے گا۔ ہمیں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔" خطاب صاحب شمع کی کیفیت سمجھ سکتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کیا کہا انہوں نے پاپا!" عمر نے بے تابی سے پوچھا۔

"اگلے جمعہ کو منگنی کا کہہ دیا ہے۔" خطاب صاحب نے بتا دیا۔

"تو گویا وہ مان گئے؟" عمر حیران ہوا۔

"کیسے نہیں مانتے' میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔ کوئی انکار کر سکتا ہے بھلا۔" اب کے شمع نے جواب دیا۔ عمر مسکرا دیا۔

"آپ کو اچھی لگی ماما!" عمر نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! اچھی ہے۔" شمع نے سادہ انداز میں جواب دیا۔

"نام کیا ہے اس کا؟" عمر کا اگلا سوال تھا۔ شمع نے الجھ کر خطاب صاحب کو دیکھا کہ عمر نے لڑکی پسند کر لی مگر نام معلوم نہیں ہے۔ "نیہا۔"

"نیہا۔" اس نے ہلکے سے دہرایا' پھر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد شمع اور خطاب دیر تک یہی سوچتے رہے کہ اس عام سی لڑکی میں عمر کو کیا نظر آیا جبکہ وہ عمر میں بھی اس سے بڑی لگ رہی تھی۔ ان کے لیے بس اتنا کافی تھا کہ عمر اب امریکہ واپس نہیں جائے گا اور پھر اس کے مزاج کی تلخیاں بھی کم ہونے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ڈرائنگ روم میں سب کے درمیان عمر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ چہرے پر خوشی کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ شمع اور خطاب اپنے بیٹے کو خوش دیکھ کر مسرور تھے اور مقصود صاحب اپنی بیٹی کے لیے اتنا اچھا رشتہ ملنے پر ممنون تو تھے ہی' خیر پسند تھی مگر خطاب صاحب نے بھی اسٹیٹس کا فرق نہیں دیکھا نہ دونوں کی عمروں کا اور نہ ہی ہونے والی بہو کی عام صورت کی پروا کی۔ انہیں صرف اپنے بیٹے کی خوشی درکار تھی۔

سب ہلکی پھلکی باتوں میں مصروف تھے' جب شازیہ نے شرجیل کو آواز دی۔

"شرجیل! رومیصہ سے کہو کولڈ ڈرنک لے آئے۔"

تھوڑی دیر بعد رومیصہ خود ہی ٹرالی گھسیٹتی ہوئی اندر آئی۔ اس کے سلام کرنے پر سب کی نظریں اس کی طرف اٹھی تھیں۔

گلاس تھام کر اس نے بڑے اشتیاق سے نیہا کے ہونے والے منگیتر کو دیکھا لیکن اسے دیکھتے ہی دم بخود رہ گئی۔ ہاتھ میں پکڑا گلاس زمین پر گر کر کرچیوں میں تبدیل ہو گیا۔

عمر ایک دم کھڑا ہوا اس کے کھڑے ہوتے ہی باقی سب بھی حیرت کے مارے کھڑے ہو گئے۔ عمر کے چہرے پر حیرت ہی حیرت بکھری تھی۔

"کیا ہوا رومیصہ۔" شازیہ نے قریب آکر تشویش سے اسے دیکھا تو اس نے تھوک نگل کر سر نفی میں ہلایا۔

"شمع بہن یہ رومیصہ ہے میری بھتیجی اور ہونے والی بہو۔"

عمر کی نظریں اس پر جمی تھیں۔ شازیہ کے تعارف کروانے پر اس کے قریب دھماکا ہوا تھا۔

"آپ کس لڑکی کو دیکھ کر گئی تھیں۔"

اس کی نظریں رومیصہ پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کی نظروں میں اتنی تپش تھی کہ وہ ایک سیکنڈ رکے بغیر باہر نکل گئی اور اس کے پیچھے عمر بھی تیزی سے نکل گیا۔ شمع حواس باختہ ہو کر اس کے پیچھے بھاگیں مگر وہ گھر سے باہر نکل گیا اور جب تک وہ اس کے قریب پہنچیں' وہ گاڑی لے کر جا چکا تھا۔

وہ کتنی دیر تک پتھرائی نظروں سے آنکھوں سے اوجھل ہوتی کار کو دیکھتی رہیں۔ ایک بار پھر عمر انہیں لوگوں کی نظروں میں ذلیل کر گیا تھا۔ ان لوگوں سے کس طرح معذرت کی' یہ الگ کہانی تھی۔ اصل فکر انہیں عمر کی تھی' سب کچھ اس کی مرضی سے ہو رہا تھا' پھر وہ کیوں اس طرح سے چلا آیا۔ سارا راستہ ان دونوں میاں بیوی نے مضطرب انداز میں طے کیا۔ گیراج میں عمر کی گاڑی دیکھ کر دونوں تقریباً" بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

عمر کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی انہیں جھٹکا لگا تھا۔ سارا کمرا بکھرا پڑا تھا۔ دروازہ کھلنے پر عمر نے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا کرسٹل کا گلدان دیوار پر دے مارا۔

"چلے جائیں آپ لوگ۔ میں کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ آپ لوگ ہمیشہ سے میرے لیے غلط فیصلے کرتے رہے ہیں۔ اب بھی غلط کیا۔ میں ہی پاگل تھا' جو آپ لوگوں پر بھروسا کر لیا۔" اس نے کارپٹ پر بکھرے ٹکڑوں کو لات مار کر مزید بکھیر دیا۔

"خدا کے لیے عمر! صاف بات کرو' میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" شمع روہانسی ہو گئیں۔

"جس لڑکی کا میں نے کہا تھا' اس کا نام رومیصہ ہے۔"

"لیکن وہ تو ان کی ہونے والی بہو ہے۔" شمع حیرت سے بولیں۔

"میں کچھ نہیں جانتا' وہ کس کی کیا ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں اگر مجھے وہ نہ ملی تو میں خود کو مار ڈالوں گا یا پھر اسے۔"

شمع کے آنسو ایک دم ٹھٹھر گئے۔ کئی سال پہلے کا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ خون میں لت پت وہی ۔۔۔ انہوں نے عمر کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تنا

اجنبی لگ رہا تھا اور وہ جو ایک امید جاگی تھی کہ عمر ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گا' ختم ہونے لگی تھی۔

"عمر! تمہیں اس لڑکی سے شادی کرنا ہے نا میں کرواؤں گی۔" شمع کے کہنے پر عمر کے ساتھ خطاب صاحب نے بھی چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

"شمع!" خطاب صاحب نے انہیں ٹوکنا چاہا۔ مگر وہ عمر کی طرف بڑھیں اور اس کے مقابل جا کر کھڑی ہو گئیں۔

"تم نے اس لڑکی سے شادی کرنا ہے نا! میں کرواؤں گی۔" شمع نے اپنی بات دہرائی۔ "لیکن تم مجھ سے ایک وعدہ کرو تم ہمیں چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔" شمع نے آنسو بھری نظروں سے اسے دیکھا تو وہ ان کے گلے لگ گیا۔

"آئی لو یو مما! آئی لو یو ویری مچ۔"

"کتنے سالوں بعد وہ یوں بے اختیار ہو کر ان کے گلے لگا تھا۔ اس ایک پیار بھرے لمس کے لیے شمع کچھ بھی کرنے کو تیار تھیں جبکہ ان سے کچھ فاصلے پر کھڑے خطاب صاحب بری طرح الجھ گئے تھے۔

اگلے ہی دن وہ نیو کے سامنے بیٹھی تھیں۔

"دیکھیے! میں ابھی تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ رومیصہ کے ابو آئیں گے تو میں ان سے بات کر کے ہی آپ کو جواب دے سکوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ہمیں آپ کی ہاں کا انتظار رہے گا۔" شمع نے پر یقین انداز میں کہا۔

☼ ☼ ☼

ساری بات سن کر پرویز صاحب نے انہیں ایسے دیکھا جیسے ان کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔

"تم حواسوں میں تو ہو' ایسا سوچا بھی کیسے تم نے؟" پرویز صاحب کے غصیلے انداز پر نیو کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"میں حواسوں میں ہوں اسی لیے ایسی باتیں کر رہی ہوں۔ میں آپ کی طرح اپنی بیٹی کی دشمن نہیں ہوں۔ ایسے رشتے کو ٹھکرانا کفران نعمت ہوتا ہے۔ اکلوتا بیٹا ہے ان کا۔ صاحب جائیداد ہے۔ خوب صورت' پڑھا لکھا خاندانی لوگ۔"

"تمہیں ہو کیا گیا ہے نیو! رومیصہ کی منگنی ہو چکی ہے شرجیل کے ساتھ۔ کیا تمہیں یہ یاد کروانا ہو گا۔ وہ رشتہ نبھانے کے لیے آیا تھا۔ پتا ہے نا تمہیں' میری بہن کو کتنا صدمہ ہوا ہے' ان لوگوں کی اس حرکت پر یاد رکھو' میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا' جس سے میری بہن ناراض ہو۔ وہ اگر ابھی گئی ہیں تو تمہیں ان سے معذرت کر لینا چاہیے تھی۔"

"وہ بہت اصرار کر رہی تھیں۔ پچاس تولے سونا' گھر' حق مہر اور اس کے علاوہ جو ہم چاہیں۔ اتنا کچھ وہ رومیصہ کے نام کرنے کو تیار تھیں۔ پھر بھی میں معذرت کر لیتی؟"

"ہاں' پھر بھی۔" پرویز صاحب نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ اپنی بہن سے کہیں جتنا مسز خطاب دے رہی ہیں' وہ بھی اتنا سونا اور اتنا بینک بیلنس رومیصہ کے نام لکھ دیں۔ میں انہیں منع کر دوں گی۔" ان کے چیلنج کرنے والے انداز پر پرویز صاحب نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا جبکہ باہر دروازے کے باہر کھڑی رومیصہ کا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ برتن دھوتے ہوئے شرجیل کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ کافی دن سے اس کا کوئی فون نہیں آیا تھا۔ ڈور بیل پر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ باہر کوریئر والا کھڑا تھا۔

"آپ کے لیے یہ پارسل اور بکے ہے۔ یہاں سائن کر دیں۔"

رومیصہ نے حیرت سے ان دونوں چیزوں کو دیکھا۔ گلاب کے پھولوں کا بہت خوب صورت بکے تھا۔ کمرے میں آ کر اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے قریب رکھے گلدان میں سجا دیا اور بڑے اشتیاق سے پارسل کھولا۔ اس میں بے حد خوب صورت سفید رنگ کا سوٹ تھا' اس کی مسکراہٹ کچھ ہلکی ہوگئی۔ اس نے پارسل کو الٹ پلٹ کر دیکھا' کسی کا نام نہیں تھا۔ فون کی گھنٹی پر وہ تیزی سے کھڑی ہوئی۔ "ہیلو۔"

"کیسی ہو روی!"

وہ حیران ہوئی۔ اس نام سے اسے آج تک کسی نے نہیں پکارا تھا اور وہ بھی مردانہ آواز۔

"میں تمہیں سسپنس میں نہیں ڈالوں گا۔ عمر بات کر رہا ہوں۔" رومیصہ اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی۔

"فون بند مت کرنا پلیز میں تمہارے گھر کے باہر ہی کھڑا ہوں اور جانتا ہوں گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اگر تم نے مجھ سے بات نہ کی تو مجبوراً مجھے اندر آنا ہو گا۔"

وہ اس کی باخبری پر شدید حیران ہوئی۔

"پھول ملے تمہیں؟" رومیصہ نے مڑ کر گلدان میں سجے پھولوں کو دیکھا۔ اور سوٹ دیکھا تم نے' میں نے کبھی لیڈیز شاپنگ نہیں کی۔ کل یہ سوٹ مجھے اچھا لگا' خیال آیا تم اس سوٹ میں خوب صورت لگو گی' بالکل کسی پری کی طرح۔"

"اچھا سنو تم یہ سوٹ پہن کر مجھ سے مل سکتی ہو" اس نے فرمائش کی وہ اپنی کہے جا رہا تھا۔ رومیصہ نے آنسو صاف کر کے خود کو بولنے کے لیے تیار کیا۔

"آپ... آپ پلیز یہ سب مت کریں۔ میں اپنے کزن سے انگیجڈ ہوں اور اپنے منگیتر کو پسند بھی کرتی ہوں۔ میں اس کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتی آپ پلیز..." کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی اور جب دوبارہ آواز آئی تو اس میں نرمی غائب تھی۔

"اپنے بارے میں ایک بات بتا دوں۔ مجھے جب کوئی چیز پسند آ جاتی ہے تو جب تک میں اسے حاصل نہیں کر لیتا' چین سے نہیں بیٹھتا۔ اور تم تو میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن چکی ہو۔ آج تو تم نے کہہ دیا کہ تم اپنے منگیتر کو پسند کرتی ہو لیکن آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ انڈر سٹینڈ!" ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

فون رکھ کر اس نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔ اس کے آنسو بڑی روانی سے بہہ رہے تھے' کچھ دیر وہ پھولوں پر نظریں ٹکائے کھڑی رہی' اگلے ہی پل اس نے جارحانہ انداز میں پھولوں کو نوچ کر پتیوں میں بکھیر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ رومیصہ کے آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے جبکہ شرجیل کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔

"کب سے ہو رہا ہے یہ سب؟" شرجیل کو اپنی ہی آواز اجنبی لگی تھی۔

"دو ہفتے ہو گئے ہیں۔ وہ مسلسل پھول بھیج رہا ہے۔" "شرجیل! میں عجیب عذاب میں پھنس گئی ہوں' بہت ڈر لگنے لگا ہے۔ آج بھی بہت مشکل سے باہر آئی ہوں۔"

"مجھے ممانی سے ایسی امید نہ تھی۔ سب کچھ جانتے ہوئے انہوں نے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کی۔ روپے پیسے کے لالچ میں انہوں نے خاندانی رشتے داؤ پر لگا دیے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ممانی کی سوچ اتنی گھٹیا بھی ہو سکتی ہے۔" اس کے لہجے میں اتنی تلخی اور کڑواہٹ تھی کہ رومیصہ سر جھکا کر رہ گئی۔

"قصور تمہارا بھی ہے' تمہاری کوئی کمزوری ہو گی جو وہ عمر خطاب... اس حد تک پہنچا ہے۔ پہلی دفعہ ہی تمہیں ایک تھپڑ لگا دینا چاہیے تھا۔"

"شرجیل! آپ بھی مجھ پر شک کر رہے ہیں؟ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں آپ کے علاوہ... نہ میں نے کبھی دولت کو اہمیت دی ہے اور جہاں تک تھپڑ لگانے والی بات ہے میں ایسا نہیں کر سکتی۔ پتا نہیں کیوں' مجھے اس سے بہت خوف آتا ہے۔" وہ رو پڑی تھی۔

"اچھا تم یہ رونا بند کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چلو تمہیں گھر چھوڑ دوں۔"

وہ چہرہ صاف کر کے کھڑی ہو گئی۔ شرجیل کے پیچھے

بائیک پر بیٹھتے ہوئے اسے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس نے چونک کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا لیکن اسے ایسا کچھ نظر نہیں آیا جو عجیب ہو وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

شرجیل نے منگنی کی انگوٹھی واپس کر دی تھی۔ رو رو کر اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ وہ کتنی دفعہ اسے فون کر چکی تھی مگر فون مسلسل بند مل رہا تھا۔ پتا نہیں کس امید پر اس نے دوبارہ نمبر ملایا تو بیل جانے لگی۔ آخری بیل پر اس نے فون اٹھایا اس کی آواز سنتے ہی وہ بولی۔

"کیوں کیا آپ نے ایسا؟" جواباً" شرجیل نے گہرا سانس لیا۔

"وہ شخص پاگل ہے روسیعہ! اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں تمہارے آس پاس بھی نظر آیا تو وہ مجھے مار دے گا۔" روسیعہ نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"اور آپ ڈر گئے؟ بس آپ کی نظر میں میری اتنی ہی اہمیت ہے؟"

شرجیل نے اس بات کا فوری کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر ٹھہر کر بولا۔

"مجھے دبئی میں جاب مل گئی ہے۔" شرجیل نے اس بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

روسیعہ نے فون بند کر دیا تھا۔ اب سننے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ اس کی نظریں بھٹکتی ہوئی بیڈ کے کونے پر جا رکیں، جہاں تازہ گلاب کے پھول تھے۔ بارش ہو یا طوفان، وہ پھول بھیجنا نہیں بھولتا تھا۔ اس کی نظریں پھولوں پر جم سی گئیں۔

"روسیعہ دیکھو بیٹا! تم سے ملنے کون آیا ہے۔" نینو کی آواز پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی کسی اپنے کے ہونے کی آس میں اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ لیکن دروازے میں کھڑی شمع کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کی جوت ماند پڑ گئی۔ شمع نے غور سے اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھا اور اس کے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔

"تمہاری امی نے بتایا تھا کہ تمہاری طبیعت خراب ہے۔ میں نے سوچا "اپنی بیٹی کا حال احوال ہی پوچھ لوں" انہوں نے مسکرا کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"میں پہلے بھی کئی بار آ چکی ہوں لیکن تمہاری امی اور پاپا نے اب ہاں کی ہے اور اب میں تمہاری اجازت لینے آئی ہوں۔ بیٹا! مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹانا۔ عمر ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ ہم نے بہت سال اس کے بغیر گزارے ہیں۔ اب اتنے سالوں بعد وہ ہمارے پاس آیا ہے۔" اب کی بار روسیعہ نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"بیٹا! اگر تم نے اس سے شادی نہ کی تو وہ پھر ہمیں چھوڑ کر چلا جائے گا۔" آخر میں ان کی آواز بھرا گئی تھی روسیعہ اسی طرح بغیر کسی جنبش کے انہیں دیکھتی رہی۔

"عمر تم سے بہت محبت کرتا ہے۔" انہوں نے اس کے گال کو چھو کر کہا۔

"لیکن میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔" اس کے کہنے پر شمع نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"جی ہاں میں آپ کے بیٹے سے شدید نفرت کرتی ہوں۔ کیا سمجھتے ہیں آپ لوگ "آپ کے پاس دولت ہے تو آپ سب کچھ خرید سکتے ہیں۔۔۔ کسی کی بھی زندگی۔۔۔ کسی کی بھی محبت۔۔۔ آپ کو معلوم تھا ناں، میں اپنے کزن سے منسوب ہوں "پھر کیوں آئیں آپ ہمارے گھر۔۔۔ اور آپ کا وہ شدت پسند بیٹا۔۔۔ کیا کیا اس نے۔۔۔ میرے کزن کو اغوا کر لیا۔ گن پوائنٹ پر اسے مجبور کیا کہ مجھے چھوڑ دے۔" شمع کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔

"وہ اسے دھمکی دے کر مجبور کر سکتا ہے مجھے نہیں۔ وہ اپنی دولت سے میری محبت نہیں خرید سکتا۔" اس کے الفاظ کی طرح اس کا لہجہ بھی سخت تھا۔ شمع نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

"ایسا مت کہو بیٹا!" ان کا لہجہ ملتجی ہو گیا۔ "میں مانتی ہوں اس نے غلط کیا، لیکن جو بھی کیا تمہاری محبت میں کیا۔ مجھ پر ترس کھاؤ بیٹا! میری ممتا کی خاطر ہاں کر دو۔ ہم سب تمہیں بہت محبت دیں گے۔ سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھیں گے۔ پلیز بیٹا!" انہوں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے لیکن وہ اس وقت بالکل بدلحاظ ہو گئی تھی۔ نینو تیزی سے آگے بڑھیں اور ان کے ہاتھ کھول دیے۔

"آپ پلیز ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ روسیعہ ابھی پریشان ہے۔ میں اسے سمجھاؤں گی۔ آپ اطمینان رکھیں۔"

وہ کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا اور کمرے سے نکل گئیں۔

ان کے جانے کے بعد نینو نے اسے بہت سمجھایا۔ پیار سے، غصے سے۔۔۔ لیکن اس کی 'نہ' 'ہاں' میں تبدیل نہ ہوئی۔ اس بات کو ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ پھولوں کا سلسلہ اس کے انکار کے بعد بھی جاری تھا۔

آج وہ کافی دنوں بعد کالج گئی تھی۔ کالج میں بھی اس کی طبیعت اکتائی اکتائی ہوئی رہی۔ واپسی میں وہ مرے مرے قدموں سے بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی کہ ایک گاڑی بالکل اس کے قریب آ کر رکی۔ اس نے ذرا سا سر گھما کر دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور گھوم کر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔ غصے کی لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ آج پہلی بار اسے خوف کے بجائے غصہ آیا۔

"تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں۔" غصے میں بھرا عمر اس کے سامنے تھا۔ روسیعہ نے نظریں اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ راستہ چھوڑیں میرا۔" اس نے کہتے ہوئے ایک طرف سے نکلنا چاہا وہ پھر اس کے سامنے آ گیا۔

"مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے۔" روسیعہ نے ایک نفرت بھری نظر اس پر ڈالی اور زور کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

"یہ تھپڑ مجھے پہلے ہی لگا دینا چاہیے تھا تاکہ تمہاری اتنی جرات نہ ہوتی۔ تم نے میری خاموشی کا بہت غلط فائدہ اٹھایا ہے۔ دوبارہ کبھی میرے راستے میں مت آنا۔ مجھے نفرت ہے تم سے۔"

اس کے آخری جملے پر عمر کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھرنے لگیں۔ یکدم اس نے سختی سے روسیعہ کا بازو تھاما اور اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی' اس نے طوفانی انداز میں گاڑی چلا دی۔ گاڑی کو انجان راستوں پر بھاگتے دیکھ کر وہ چیخی۔ "گاڑی روکو۔" اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا لیکن وہ ناکام رہی تھی۔

"گاڑی روکو ورنہ میں کود جاؤں گی۔" اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن گاڑی کے دروازے لاک تھے۔

کچھ دور جا کر گاڑی رک گئی۔ وہ کوئی پہاڑی علاقہ تھا۔ جس پر کوئی ریسٹ ہاؤس بنا ہوا تھا۔

اتر کر وہ اس کی طرف آیا۔ دروازہ کھول کر اس کا بازو پکڑا اور ایک جھٹکے سے باہر کھینچا اور پھر اور یونہی کھینچتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کی طرف لے جانے لگا۔ اندر پہنچ کر اس نے اس کا بازو چھوڑا اور دروازہ لاک کر کے اس کی طرف مڑا۔

"تم شاید جانتی نہیں ہو' آج تک کبھی مجھ پر کسی نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ تمہاری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو میں اس کا ہاتھ توڑ دیتا لیکن تم۔"

وہ اشتعال سے بولا پھر دو قدم چل کر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا مسئلہ ہے اس میں۔" اس کو قریب آتے دیکھ کر وہ پھر گھبرا گئی تھی مگر ہمت کر کے بولی۔

"آپ کو کیا لگتا ہے' آپ کی اس حرکت سے میں ڈر جاؤں گی؟ خوف اور لالچ سے جس طرح آپ نے میرے کزن کو مجھ سے دور کر دیا' کیا سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں سے مجھے بھی قابو کر لیں گے؟ ہرگز نہیں۔۔۔ میں کبھی آپ کی بات نہیں مانوں گی۔ بے شک آپ

مجھے جان سے مار دیں۔ میں ہرگز آپ سے شادی نہیں کروں گی اور اگر آپ نے کوئی اور حرکت کرنے کی کوشش کی تو میں اپنی جان خود بھی لے سکتی ہوں۔ آپ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ آپ سے محبت کی جائے۔" رومیصہ کی بات پر عمر نے دونوں بازوؤں سے اسے تھام لیا۔ رومیصہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"میں تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں تو تمہیں کیا لگتا ہے 'میرا ارادہ غلط ہے؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم میرے لیے بہت قابل احترام ہو۔ میں تم پر کوئی بری نظر برداشت نہیں کر سکتا تو میں خود کس طرح تمہارے ساتھ برا کر سکتا ہوں۔" رومیصہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسے بازو سے پکڑے پیچھے دھکیلنے لگا یہاں تک کہ وہ پیچھے رکھے صوفے سے ٹکرا کر اس پر گر گئی پھر خود گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"تم مجھ سے شادی کر لو رومی!" وہ اس کے قدموں میں بیٹھ کر التجا کر رہا تھا۔ میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا رومی! دنیا کی ہر خوشی دوں گا۔ جو تم کہو' جیسے تم کہو' میں سب کروں گا تمہارے لیے۔"

وہ تھوڑی دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا پھر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"میں نے زندگی میں جس چیز کی خواہش کی' حاصل کر لی لیکن تم چیز نہیں ہو' میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہو۔ میں تمہیں حاصل کرنا نہیں' پانا چاہتا ہوں۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔" رومیصہ اٹھ کر اس سے کچھ فاصلے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

"کتنی محبت کرتے ہیں آپ مجھ سے۔" عمر نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ "خود سے بھی زیادہ۔"

"کیا کر سکتے ہیں میرے لیے۔"

"سب کچھ' جو تم کہو۔" رومیصہ کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ "یہ پہاڑی دیکھ رہے ہیں۔" "اس سے کود جائیں۔" رومیصہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

وہ تھوڑی دیر تک یوں ہی اسے دیکھتا رہا جیسے اسے اپنی نظروں میں محفوظ کر رہا ہو' پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ کئی راتوں تک سو نہیں سکی تھی۔ جیسے ہی آنکھ بند کرتی' اس کا چہرہ سامنے آ جاتا۔ آنکھیں کھولتی تو ہر جگہ وہی کھڑا نظر آتا۔ سارا دن چپ بیٹھی رہتی۔ کبھی رونے لگتی' کبھی متوحش ہو کر چلانے لگتی۔ نیلو اور پرویز صاحب رومیصہ کی اس حالت سے بہت پریشان تھے۔ انہیں لگتا ان کی بیٹی کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ خوشیاں روٹھتی جا رہی تھیں۔ لیکن قدرت کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا۔

عمر مر گیا تھا اور اسے خون میں لت پت بے حس و حرکت دیکھ کر خطاب صاحب کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی۔ شمع امریکہ شفٹ ہو گئیں۔ پرویز صاحب رومیصہ کو لے کر تعزیت کے لیے گئے تھے مگر سرداراں نے ان سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ سرداراں نے رومیصہ کو عمر کی قاتل کہا۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھی رومیصہ کو اس نے دل کھول کر بددعائیں دی تھیں۔ اس کی وجہ سے ان کے گھر کی خوشیاں اجڑ گئی تھیں۔

چار سال گزر گئے تھے۔ وہ سنبھل ضرور گئی تھی مگر بھولی ہرگز نہیں تھی۔ شرجیل بھی دبئی سے لوٹ آیا تھا اور رومیصہ سے شادی کے خواہاں تھا مگر رومیصہ نے صاف انکار کر دیا تھا کہ اب اس کی زندگی میں شرجیل کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی۔ پرویز صاحب اور نیلو سمیت خود شرجیل نے بھی اسے راضی کرنے کی بہت کوشش کی مگر ہر بار اس نے سختی سے منع کر دیا۔ آئندہ اس موضوع کو چھیڑنے سے بھی سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس کے دل میں شرجیل جیسے لالچی اور بزدل انسان کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"اسلام علیکم۔" شزا نے مسکراتے ہوئے سلام کیا۔

"تم آفس نہیں آئیں۔ میں نے فون کیا تو آنٹی نے بتایا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے سو میں آفس سے سیدھی تمہاری طرف آ گئی اور یہ تمہارے لیے لائی ہوں۔" اس نے سرخ گلابوں کا بکے اس کے سامنے کیا تو وہ کتنی دیر اسے دیکھتی رہی اور پھر گہرا سانس لے کر اسے اپنے سینے پر رکھ لیا۔ تب ہی نیلو ٹرالی لے کر اندر داخل ہوئیں۔

"بیٹا! تم دوست ہو اس کی' سمجھاؤ اسے اب شادی کر لے۔ ہماری تو یہ سنتی نہیں' ماں باپ ساری عمر تو ساتھ نہیں رہتے۔ اتنا اچھا رشتہ گھر میں موجود ہے۔ اس کی پھوپھو کا بیٹا۔"

"امی پلیز۔" رومیصہ نے ان کی بات کاٹی۔ نیلو گہرا سانس لے کر باہر نکل گئیں۔ شزا اسے دیکھنے لگی۔

"تم کیوں کر رہی ہو ایسا۔ کیا تم کسی کو پسند کرتی ہو۔"

رومیصہ نے گہرا سانس لیا جیسے کوئی بوجھ سینے سے ہٹانا چاہتی ہو۔

شزا اور رومیصہ تین سال سے ایک ساتھ جاب کر رہی تھیں۔ دونوں میں بہت بے تکلفی تھی' شزا بہت مخلص دوست تھی سو' رومیصہ نے آج اسے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"شزا! تم نے کبھی کسی سے نفرت کی ہے؟"

"نہیں۔" شزا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں نے کی ہے اور بے انتہا کی ہے۔ اور جانتی ہو نفرت کی انتہا کیا ہوتی ہے۔" شزا ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"نفرت کی انتہا محبت ہوتی ہے۔ میں نے جس شخص سے نفرت کی' مجھے اسی سے محبت ہو گئی۔ بے حد محبت۔ لیکن اس وقت' جب وہ نہیں رہا۔"

"کیا مطلب؟" بہت غور سے سنتی شزا نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ اس دنیا میں نہیں رہا اب۔" اور شزا اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔

"ایک شخص جو مر چکا ہے، تم اس کے لیے اپنی زندگی برباد کر رہی ہو؟" شہزا اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کی دماغی حالت پر شک ہو۔

"میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کر رہی شہزا! وہ شخص بہت عجیب تھا۔ ایک جنون دیکھا ہے میں نے اس کی آنکھوں میں اور مجھے لگتا ہے جیسے مرتے مرتے وہ اپنا جنون میرے اندر منتقل کر گیا ہے۔ میں نے اس کی محبت کی ناقدری کی ہے مگر اب میں ساری زندگی اس کی محبت کے نام پر گزارنا چاہتی ہوں۔ یہ سزا میں نے خود اپنے لیے چنی ہے کیونکہ وہ میری وجہ سے مرا ہے شہزا!" وہ کتنی دیر تک اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔

"محبت کو کبھی آزمانا نہیں چاہیے لیکن مجھ سے یہ غلطی ہو گئی۔ میں نے اسے کہا 'اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو اس پہاڑی سے کود جاؤ اور وہ کود گیا شہزا! میرے کہنے پر اس نے جان دے دی کوئی کرتا ہے اتنی محبت۔۔۔"

رومیعہ نے شہزا کی طرف دیکھ کر سوال کیا جبکہ وہ رومیعہ کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

"اس آدمی کا نام کیا تھا۔" یہ سوال کرتے ہوئے شہزا کا رواں رواں جواب کا منتظر تھا۔

"عمر خطاب۔" اور شہزا کا پورا وجود زلزلے کی زد میں آگیا تھا۔

"تم سے کس نے کہا، وہ مر گیا ہے۔" شہزا کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔

"اس کی بوا جی نے، میں گئی تھی اس کے گھر۔ اس کے والد کی بھی ڈیتھ ہو گئی۔"

شہزا نے ہونٹ بھینچ لیے۔

☆ ☆ ☆
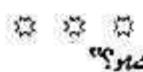
"ہیلو برو! کیسے ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ تم بتاؤ تم نے بوا سے کیا کہا ہے۔ وہ پریشان ہیں۔"

"وہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے آپ یہ بتائیں۔ آپ کی روی کا اصل نام کیا ہے۔"

عمر کی دل کی دھڑکن تیز ہوئی تھی۔ ایک عرصے بعد کسی کے منہ سے اس کا ذکر سنا تھا۔

"رومیعہ۔" اس کے نام لینے پر شمع نے چونک کر دیکھا۔

"برو! آپ پاکستان آجائیں۔ میں آپ کو ایک لڑکی سے ملوانا چاہتی ہوں۔ تین دن بعد میری سالگرہ ہے۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی میرے پاس ہے۔"

اس کی کچھ سنے بغیر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ عمر بری طرح الجھ گیا تھا۔ اسی الجھن بھرے انداز میں اس نے سرداراں کی طرف دیکھا جنہوں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ وہ اور شمع حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔

"بیٹا! میں تمہاری مجرم ہوں۔ مجھے سزا دو۔" اس نے سرداراں کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور پھر اس نے جو حقیقت بتائی، دونوں ماں بیٹے ساکت رہ گئے۔

"سرداراں! کیوں کیا تم نے ایسا؟" شمع غصے سے پھٹ پڑیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا بھابی! بابا کومے میں تھے۔ آپ کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ خطاب بھائی اس دنیا میں نہیں تھے۔ ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا کہ پتا نہیں کب انہیں ہوش آتا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ وہ لڑکی دوبارہ سامنے آئی اور پھر شادی کے لیے نہ مانی تو پتا نہیں بابا پھر کیا کر دیں۔ اس لیے میں نے بابا سے کہہ دیا کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہی کہ نہ وہ ہوگی، نہ بابا کوئی الٹی سیدھی حرکت کریں گے اور اس سے بھی کہہ دیا کہ بابا مر گئے۔ میں نے آپ دونوں کی بہتری کے لیے ایسا کیا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ لڑکی بھی بابا سے۔۔۔ عمر! میرے بچے مجھے معاف کر دو۔" سرداراں نے ایک بار پھر عمر کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

☆ ☆ ☆
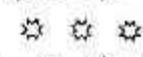
"شہزا! پلیز یار! میرا بالکل موڈ نہیں۔"

"تمہارے موڈ کی ایسی کی تیسی۔ میں اپنی برتھ ڈے پر خاص طور پر تمہیں لینے آئی ہوں اور تم ہو کہ نخرے کیے جا رہی ہو۔ چلو شاباش تیار ہو جاؤ۔ میں انکل آنٹی کو بھی ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔"

شہزا کی سالگرہ تھی۔ اس کا موڈ نہیں تھا مگر وہ خود اسے لینے آئی تھی۔ ناچار اسے راضی ہونا پڑا۔ تیار ہونے کے لیے اٹھی تو شہزا بولی۔

"سفید رنگ پہننا۔" اور الماری کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ ایک لمحہ کو رک گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر شہزا کی طرف دیکھا لیکن وہ کمرے سے جا چکی تھی۔ وہ کتنی دیر یونہی کھڑی رہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

آنسو صاف کر کے اس نے سفید سوٹ نکالا جو پانچ سال پہلے کسی نے بڑے پیار سے اسے بھیجا تھا۔

شہزا کے گھر میں کافی رونق تھی۔ اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔

"امی! میں شہزا کے پاس جا رہی ہوں۔" وہ لان سے اٹھ کر اندر لاؤنج کی طرف بڑھی تھی کہ ایک آواز نے اسے رکنا پڑا۔

"روی!" اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ یہ آواز، یہ نام۔۔۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ بالکل اس کے سامنے تھا۔ اس نے پلکیں جھپکیں۔ اس کے ارد گرد ساری چیزیں گھومنے لگیں۔ گرنے سے پہلے اس نے اسے تیزی سے اپنی طرف بڑھتے دیکھا تھا۔

ہوش میں آتے ہی اس نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ سب ہی تھے اس کے آس پاس مگر وہی نہیں تھا بس۔ اس کے اچانک بے ہوش ہو جانے پر سب پریشان ہو گئے تھے مگر اب سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ شہزا کے کمرے میں تھی۔ اپنے لیے سب کو پریشان دیکھ کر وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"میں ٹھیک ہوں اب۔ آپ چلیں میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"

سب مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے باہر چلی گئیں۔ "شہزا! میں ابھی آتی ہوں کہہ کر نکل گئی۔ وہ اکیلی تھی کمرے میں۔ دل پتا نہیں کیوں گھبرا رہا تھا۔ آنسو رک ہی نہیں رہے تھے۔

کھلے دروازے کی دہلیز میں وہ رک گیا۔ وہ اس کے بالکل سامنے بیڈ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور اس پر نظر پڑتے ہی تیزی سے کھڑی ہو گئی۔ آنسوؤں سے سامنے کا منظر دھندلا گیا تھا۔ وہ آہستہ سے چلتا ہوا اس کے بالکل قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ سُن سی کھڑی تھی۔ عمر نے اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے اٹھا کر چہرہ اونچا کیا اور بہت نرمی سے اس کے آنسو صاف کیے۔

"تم میرے سامنے ہو، پھر بھی مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

"آپ مجھے چھوڑ کر کیوں گئے تھے۔" عمر ابھی تک سانس روکے کھڑا تھا۔ رومیعہ کی بات پر اس نے رومیعہ کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔ "میں تمہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا۔ میں کوما میں چلا گیا تھا اور جب ہوش آیا تو بوا نے کہا کہ تم۔۔۔ رومیعہ! میں بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ اس وقت مجھے لگا، مجھے اپنے ماں باپ کی نافرمانی کی سزا ملی ہے۔ مگر شاید قدرت کو مجھ پر رحم آگیا اور تم مجھے دوبارہ مل گئیں۔" رومیعہ نے اس کے سینے سے سر اٹھا کر دیکھا۔

"اب تو آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گے ناں؟" عمر اس کی آنکھوں میں چھپے ڈر کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

"بالکل نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔"

"عمر! ہم بہت عرصہ ایک دوسرے سے دور رہے ہیں۔ پلیز اب یہ دوریاں ختم کر دیں۔"

رومیعہ کے دبے دبے لفظوں میں محبت کے اظہار پر عمر کا رواں رواں سرشار ہو گیا تھا۔ اس نے رومیعہ کے گرد بازوؤں کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

ایسی محبت کا ہی تو وہ طالب تھا۔ "اب کوئی دوری نہیں رہے گی۔" اس نے قدرے جھک کر کہا تو رومیعہ نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔

☆

حرا قریشی

"آداب عرض ہے سرتاج!" ناجیہ نے آگے کو جھک کر عالیان کو آداب پیش کیا تھا اور ایسے استقبال پر عالیان کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"وعلیکم آداب شہزادی ناجیہ!" عالیان نے بڑے اسٹائل سے جواب دیا اور دونوں ساتھ ہی وردہ کے بالکل سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"ناجیہ۔۔۔ میرا مطلب ہے بھابھی ناجیہ! اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ آج کل کے فیشن کا چوڑی دار پاجامہ اور خوب گھیر والی فراک زیب تن کر کے آپ پچھلی صدی کی کوئی مغلیہ شہزادی بن گئی ہیں اور ویسی ہی اردو بول کر بھائی کو زیر کر لیں گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔ کیونکہ آپ کا اگلا جملہ آپ کی اعلا قسم کی اردو کے سب راز فاش کرنے والا ہے۔" وردہ نے چڑانے والی مسکراہٹ سجا کر ناجیہ کو تپانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

"پچھلی صدی کی مغلیہ تو نہیں، لیکن شہزادی سے کم بھی نہیں لگ رہی۔" عالیان نے محبت پاش نظروں سے اپنی بدذوق بیگم کو دیکھا، جنہوں نے شادی کے ایک ہفتے بعد پہلی دفعہ بقول وردہ 'مغلیہ شہزادیوں والا لباس پہنا تھا۔ اپنی تعریف پر ناجیہ کی گردن مزید اکڑ گئی۔

"کوئی بات نہیں سرتاج! اک لیجئے دیکھیے ہم اس کا ہر طنز "فرخندہ پیشانی" سے برداشت کریں گے۔ آخر یہ ہماری اکلوتی نند ہے۔" ناجیہ نے ایک ہاتھ اٹھا کر کسی شہزادی کی طرح ہی اپنے دربار میں گستاخی کرنے والی کو جیسے معاف کیا تھا۔ اس کے اس اسٹائل پر تپی ہوئی وردہ کے مزید پتنگے لگ گئے تھے۔

"سرتاج کی بچی! میرے بھائی کو ایک ہفتے میں قابو کر لیا۔ پہلے کتنا غصہ کر رہی تھیں کہ کہاں پھنسا دیا وردہ، اور اب میرے طنز "فرخندہ کی پیشانی" سے برداشت کروائیں گی۔" وردہ نے "فرخندہ کی پیشانی" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"یہ فرخندہ کون خاتون ہیں اور آخر ان سے ایسا کون سا جرم سرزد ہو گیا ہے کہ ان کی پیشانی کو یہ سزا دی جا رہی ہے؟" عالیان نے خاندان کی خواتین کے نام ذہن میں دہراتے ہوئے ان دونوں سے پوچھا تھا۔

"اوہو بھئی! کوئی خاتون نہیں۔۔۔ میں نے بس 'خندہ' کو 'فر' لگا دیے ہیں۔ جانتی ہوں نا! وردہ کے طنز کیسے ٹھنڈے ٹھار ہوتے ہیں۔ اگر پیشانی کو ٹھنڈ لگ گئی تو پھر باقی کے طنز کون جھیلے گا؟" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے وردہ کی طرف دیکھا اور وردہ ان دونوں کے اس طرح مل کر چڑانے پر واک آؤٹ کر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"حق ہا۔۔۔ بدلتی ہیں رنگ دوستیں کیسے کیسے"

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے 'میری اور ناجیہ کی مثالی دوستی ہونے کے باوجود حالات ایسے کیوں ہو گئے؟ ابھی تو عالیان بھائی اور ناجیہ کی شادی کو ایک ہفتہ ہی ہوا ہے۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ پچھلی کہانی میں ناجیہ کی بدذوقی کے مظاہروں کے بعد میں نے آئندہ اس کی کسی بھی ادبی قسم کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا مگر آپ تو ناجیہ کو جانتے ہیں نا؟ وہ اور ہار مان لے۔ ناممکن! اسے ہر حال میں بھائی کے سامنے خود کو باذوق ثابت کرنے کا جنون سوار ہو گیا ہے اور افسوس کہ اس جنون کا نشانہ میں بھی بنتی ہوں، بلکہ زیادہ تر میں ہی بنتی ہوں کیونکہ بقول ناجیہ "تم ہاتھ جھاڑ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی ہو۔" مگر میں اب کسی بھی طرح کا رسک لینے کو تیار نہ تھی۔ ایک دفعہ کی شرمندگی ہی کافی تھی۔ مجھے اسی سے ناجیہ کے ادبی ذوق کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔

اس کی اردو ہضم کرنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں ہے۔ عالیان بھائی کی تو چلو عادت ہے، ہر بات میں کوئی نہ کوئی شعر گھسیڑے بغیر ان سے بات ہی نہیں ہوتی، مگر میری دوست، جس سے میں ڈھیروں ڈھیر باتیں کرنے کی عادی تھی، جسے بھابھی بنا کر لانے کے بعد گپ شپ کرنے کے کتنے ہی خواب دیکھے تھے۔ وہ بھی اب کالی باتوں کے جواب میں کسی شعر سے کام چلانے لگی ہے۔ عام سے اشعار ہوتے تو میں بھی "فرخندہ کی پیشانی" سے برداشت کر لیتی مگر جیسے شعر ناجیہ سناتی ہے وہ سن کر میرا فشار خون بڑھنے لگتا ہے۔ خیر! میں برداشت کر رہی ہوں۔ جو بھی ہے ناجیہ میری دوست کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ شاعری کا بھوت میں نے ہی اس کے سر پر سوار کیا تھا (ارے نہیں اپنے بھائی کو بھوت نہیں کہہ رہی) اب اتارنا بھی مجھے ہی ہے ورنہ میری بھولی بھالی دوست نے تو طوطا بلکہ طوطی بننے کے سارے ریکارڈز توڑ ڈالے ہیں۔

☼ ☼ ☼

"تندیٔ باد مخالف سے نہ گھبرا اے رباب۔"

"یہ تو چلتی ہی تمہیں نیچے گرانے کے لیے ہے۔"

پہلا مصرع ناجیہ نے رباب کو سنبھالتے ہوئے کہا تھا اور دوسرا عالیان کی طرف سے آیا تھا۔ یہی "دکھ" تو وردہ کو کھائے جاتا تھا۔ دوست تو دوست، اس کا اپنا بھائی بھی ناجیہ کے ساتھ مل گیا تھا اور ایسے اشعار صبح و شام سنانے لگے تھے۔

لیکن سے راولپنڈی ایکسپریس کی اسپیڈ کو مات دیتی

تیزی سے نکلتی ورده زوردار طریقے سے اندر جاتی رباب سے ٹکرائی تھی اور اس ٹکر کی آمد کا سبب بنی تھی۔

"اگر ابھی میں اسے نہ سنبھالتی تو یہ زمیں بوس ہو چکی ہوتی۔" ورده کے گھورنے پر نادیہ نے مسکراہٹ چھپا کر سنجیدہ ہونے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہر وقت جلدی میں ہی رہنا۔ کون سا تم ٹرین میں سفر کرتی ہو جو وہ چھوٹی جا رہی ہے؟ خود تو تم سفر کرتی نہیں ہو لیکن ہمیں کروائی ہو۔ اردو والا نہیں انگریزی والا "سفر"۔" اس طوفانی ٹکراؤ کے بعد رباب کے کچھ ہوش ٹھکانے آئے تو وہ ورده پر برس پڑی تھی۔

"یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑ گیا ہے۔ دوست دوست نہ رہا بھائی بھائی نہ رہا اور کزنز... جنہیں منتیں کر کے روکا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں مزے کریں گے ان کے دماغ بھی عرش سے ایک منزل نیچے آنے کو تیار نہیں ہیں۔" ورده جلے کٹے انداز میں کہتے ہوئے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں تو نیچے کی منزل پر اے سی جو نہیں ہے۔ اب اتنی گرمی میں بھی جو اتفاق سے لائٹ آجائے اور کراچی والوں کو اے سی چلانے کا موقع مل جائے تو کون پاگل ہوگا جو نیچے آکر کچن میں گھسے گا؟" رباب نے دوسری کرسی گھسیٹی اور بیٹھنے ہی لگی تھی کہ ورده نے روک دیا۔

"میں وہ واحد پاگل ہوں جس نے مہمان نوازی کے شوق میں بالکل یہی کیا۔ چائے کا پوچھنے آرہی تھی کہ کون کون پیے گا اب تم خود ہی بناؤ چائے۔ مجھ سے مزید گرمی برداشت نہیں ہو رہی اور نہ ہی بھوک۔" ورده نے کہتے ہوئے اپنی پلیٹ قریب کھسکائی اور کھانا شروع ہو گئی تھی۔ رباب کو شاید ورده کی حالت پر رحم آ گیا تھا ورنہ کافی دیر سے ڈائننگ روم میں پنکھے چلنے کے باوجود وہ گرمی کا شور مچا رہی تھی۔

"میں بنا لیتی ہوں چائے۔" نادیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ شاید اسے بھی اپنی معصوم نند (بقول نند کے) پہ کچھ ترس آ گیا تھا جو صبح ناشتہ بنانے کے لیے اتنی گرمی میں کچن میں گھسی ہوئی تھی اور نادیہ کو کچن کے کسی کام کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیا تھا۔

"ارے نہیں بھابی! آپ بیٹھیں میں بنا لوں گی۔" رباب کہتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"ہاں رباب کو کرنے دو ورنہ اس کی عادتیں خراب ہو جائیں گی۔ ایک دفعہ آرام کی عادت پڑ جائے تو پھر کام نہیں ہوتا۔" ورده نے کچھ دیر پہلے کا بدلہ اتارتے ہوئے نادیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھر سے بٹھا لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پھر کیا فیصلہ کیا؟ کہاں چلنا ہے؟" عالیان نے ناشتہ کرتے ہوئے ان سب سے پوچھا تھا جو دو دن سے کہیں گھومنے کے پلانز بنا رہے تھے۔ شادی کے بعد بڑے تو سب اپنے اپنے گھر جا چکے تھے لیکن کچھ کزنز رک گئے تھے۔ مگر چھوٹی خالہ کی فوزیہ نے رکنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہی فوزیہ جس کی شاعری سے ڈر کر ورده نے عالیان کی شادی نادیہ سے کروائی تھی۔ رباب اور ناصر بڑی خالہ کے بچے تھے۔ ویسے اتنے بچے بھی نہیں تھے۔ رباب نادیہ کی ہم عمر تھی اور ناصر رباب سے تین سال چھوٹا تھا۔ چچا کی ماریہ اور حنا بھی رک گئی تھیں۔ پھپھو کی ایمن کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ وہ آدھے سے زیادہ وقت سو کر گزارنے کی شوقین تھی اس لیے کم کم ہی نظر آتی تھی۔

"کراچی کے حالات اس قابل کہاں ہیں کہ کہیں تفریح کے لیے جایا جائے۔ ویسے تو بیچ (ساحل سمندر) پر جانے کا موڈ ہو رہا ہے لیکن ابھی کچھ دن رک جاتے ہیں۔" ماریہ ہمیشہ کی ڈرپوک تھی۔ شب برات پر ایک پٹاخے کی آواز ہی اسے ڈرانے کے لیے کافی ہوتی تھی۔

"میرے خیال سے آپ لوگ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور ہنی مون پر چلے جائیں۔ واپس آئیں گے تو پھر کہیں کا پروگرام بنائیں گے۔" ایمن نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"ہم دونوں بعد میں چلے جائیں گے۔ ابھی تو تم سب کے ساتھ کسی پروگرام کی بات ہو رہی ہے۔" نادیہ نے بڑی فراخدلی دکھائی۔

"ہمیں کباب میں ہڈی بننے کا ہرگز شوق نہیں ہے۔ اور نہ ہی آپ کی یہ قربانی قبول کی جائے گی۔ اس لیے فیصلہ ہو گیا۔ پہلے آپ دونوں کہیں گھوم کر آئیں تب تک ہم کسی اور پروگرام کا ڈیسائڈ کریں گے۔" ورده نے عالیان اور نادیہ کی مزید "نہ" سننے سے پہلے ہی پروگرام فائنل کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"آپ سو رہے ہیں۔ آپ سو رہے ہیں۔" ناصر نے بچوں کی آنکھوں کے سامنے پینڈولم ہلاتے ہوئے بارعب آواز میں کہنے کی کوشش کی۔

"سو نہیں رہے۔ رو رہے ہیں۔ کیوں صبح صبح معصوموں کے پیچھے پڑ گئے ہو؟" ناصر پچھلے آدھے گھنٹے سے کسی ٹھیلے سے لائی گئی ہپناٹزم کی بوسیدہ کتاب میں سے پڑھ پڑھ کر برابر والوں کے بچوں کو ہپناٹائز کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ پہلے تو شوق میں دونوں بچے خوشی خوشی ہپناٹائز ہونے کو تیار ہو گئے تھے لیکن آدھے گھنٹے تک جب ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے طریقے کو بھی ناکام ہوتے دیکھا تو بور ہو گئے مگر چاکلیٹس کے لالچ میں صبر کیے تھے۔

"مجھ سے آپ لوگوں کی طرح دس بجے تک نہیں سویا جاتا۔ میں ایک دفعہ جاگ جاؤں تو دوبارہ نہیں سو سکتا۔" ناصر نے کہتے ہوئے اپنی ہپناٹزم کی کتاب پھر کھول لی تھی۔

"کیا تم ضمیر ہو جو ایک دفعہ جاگ جائے تو سلانا مشکل ہوتا ہے؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آخری دفعہ ہم نے تمہیں ناصر کے نام سے ہی پکارا تھا۔"

"ورده آپی! ضمیر ہوتا تو سویا رہتا۔ آج کل کے زمانے میں ضمیر کہاں آسانی سے جاگتے ہیں؟ اور آپ کو پتا نہیں ہے یہ انگلش کی مشہور ترین ہپناٹزم کی کتاب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں سے کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور کام کرے گا۔" ناصر نے ابھی ہار نہیں مانی تھی لیکن بچے موقعے سے فائدہ اٹھا کر بھاگ لیے تھے۔ ہاں میز پر رکھی چاکلیٹس اٹھانا نہیں بھولے تھے۔

"لیکن تم انہیں ہپناٹائز کر ہی کیوں رہے تھے؟" حنا نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے "آپ سو رہے ہیں" کی گردان سن سن کر اسے واقعی نیند آنے لگی تھی۔ اور ایمن جو دن رات سونے کو تیار رہتی تھی وہ تو صوفے پر بیٹھے بیٹھے کب کی سو چکی تھی۔ اللہ جانے اسے اتنی نیند کیوں آتی تھی۔

"وہ اس لیے کہ ان سے پتا کر سکوں کہ سنڈے کو ان کے ابا حضور کس وقت آرام فرماتے ہیں تاکہ جب وہ سوئیں تو آم توڑے جا سکیں مگر آپ لوگوں کو بس بیٹھ کر بور ہونا ہے۔ اچھا خاصا کام بننے والا تھا۔" ناصر نے کتاب بند کرتے ہوئے ان سب کی کم عقلی پر ماتم کیا تھا اور لاؤنج کی کھڑکی سے نظر آنے والے برابر والوں کے آم کے درخت کو حسرت سے دیکھا۔

عالیان اور نادیہ کو ہنی مون پر گئے ایک ہفتہ ہونے والا تھا۔ اور اس ایک ہفتے میں ان لوگوں نے صرف موویز ہی دیکھی تھیں اور اب شدید بوریت طاری ہو رہی تھی۔

"پچیس روپے کی یہ کتاب خریدی پچاس روپے کی چاکلیٹس۔ اس سے بہتر تھا آم خرید کر لے آتے۔ برابر والے انکل کو اگر پتا چل گیا کہ ہم نے ان کے درخت سے آم توڑے ہیں تو وہ ہمارے سر توڑ دیں گے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے پوری گلی میں ان کی دہشت پھیلی ہوئی ہے۔ کوئی ان کے درختوں کو نظر اٹھا کر دیکھ لے تو ان سے برداشت نہیں ہوتا۔ تم تو پھر آم توڑنے کی بات کر رہے ہو۔" ورده نے ناصر کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"کل بھائی اور نادیہ آجائیں گے تو پھر کہیں گھومنے چلیں گے۔" ورده نے ان سب کے ساتھ خود کو بھی

دلا سا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اتنا سناٹا کیوں چھایا ہوا ہے؟" ناصر نے لان میں بیٹھے عالیان اور چائے کے کپ سمیٹتی وردہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے۔"

عالیان نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تھا۔

"بہت نامعقول حرکت ہے۔ اداسی سے کہیں 'اندر کمرے میں جا کر سوئے۔ اگر پڑوسیوں نے دیکھ لیا تو فوراً "لڑنے آجائیں گے کہ یہ شریفوں کا محلہ ہے' یہاں دن دیہاڑے آم توڑنا جرم ہے اور اداسی کا اس طرح بال کھول کر دیواروں پر سونا تو اس سے بھی بڑا جرم ہے۔" ماریہ نے ناصر کو کل کا واقعہ یاد دلایا تھا جب آم توڑنے پر ناصر کی پڑوسی انکل نے اچھی خاصی عزت افزائی کر دی تھی اور ان سب نے اس کا خوب مذاق اڑایا تھا۔

"یہ اداسی بڑی "وہ" ہے۔" حنا نے بہت دکھ سے کہا تھا۔

"وہ کیا؟" وردہ نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی جو فلموں کی ہیروئنز ہوتی ہیں۔" حنا نے سوچتے ہوئے کہا۔

"معصوم؟" ناصر نے جیسے کسوٹی حل کرنے کی کوشش کی۔

"میں نے پاکستانی فلموں کی بات نہیں کی۔ میرا مطلب تھا دیدہ دلیر۔ بہت دیدہ دلیر ہے اداسی جو دیواروں پر بال کھول کر سو رہی ہے۔" حنا نے بالکل "بلبلے" والی حنا دل پذیر کے اسٹائل میں کہا تھا۔

"ویسے یہ اداسی کا اصل چکر کیا ہے؟ مجھے تو کسی دیوار پر کوئی سوتا نظر نہیں آرہا۔" ناصر ابھی تک عالیان کے شعر میں اٹکا ہوا تھا۔

"ہونا کیا ہے۔ ناجیہ بھابھی پہلی دفعہ ایک دن رکنے کے لیے میکے گئی ہیں اور عالیان بھائی کو ہر دیوار پر اداسی نظر آرہی ہے۔" وردہ نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔

"حیرت ہے۔ واقعی عالیان بھائی؟ آپ اسی لیے اتنے افسردہ ہیں؟" ناصر نے بڑی مشکل سے ہنسی روکی تھی۔

کون اس راہ سے گزرتا ہے
دل یونہی انتظار کرتا ہے
دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے
دل تو اپنا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

عالیان نے بات کا سیدھا جواب دینے کے بجائے غزل سنا دی تھی۔

"میں بھابھی پچھلی سیڑھیاں پھلانگ کر آئیں گی؟ اگر خالہ کو پتا چل گیا کہ اس گھر میں کیا کیا ہو رہا ہے تو طوفان آجائے گا۔ کسی دیوار پر اداسی سو رہی ہے تو کہیں بھابھی کو چپکے سے دیوار پھلانگ کر آنا پڑ رہا ہے۔ آخر سوہیں وہ اس گھر کی۔ چھپ کر کیوں آئیں گی؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی؟"

"ناصر کیا کہتا پھرتا ہے کچھ نہ سنو تو بہتر ہے
دیوانہ ہے دیوانے کے منہ نہ لگو تو بہتر ہے۔"

عالیان کا سیل فون بجنے لگا تو وہ ناصر کی بات کا جواب دیتے ہوئے اٹھا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔

دوسری طرف ناجیہ تھی۔

"لینے آجاؤں؟" عالیان نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا۔

"سرتاج! میں نے اس لیے کال نہیں کی۔ مجھے ابھی وردہ سے کام تھا۔ لینے آپ کل آجایئے گا۔" ناجیہ کے کہنے پر عالیان کے چہرے پر ایک دفعہ پھر اداسی پھیل گئی۔

تیرے جمال کا پرتو ہے سب حسینوں پر
کہاں کہاں تجھے ڈھونڈوں کدھر کدھر جاؤں

"عالیان نے بڑے دکھ سے شعر پڑھا تھا۔

"ابھی مجھے ادھر آئے مشکل سے چھ گھنٹے ہوئے ہیں اور آپ دوسری حسینوں میں مجھے ڈھونڈنے نکل پڑے؟" ناجیہ کی غمگین آواز سنائی دی۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں 'لینے آجاؤں؟ ویسے امی کہہ رہی تھیں شاید فوزیہ کے آنے کا بھی پروگرام بن رہا ہے۔" عالیان کو بخوبی اندازہ تھا کہ ناجیہ کو فوزیہ سے کتنی شدید چڑ تھی۔

"اچھا! آپ مجھے ایک گھنٹے تک لینے آجائیں۔" ناجیہ کی بات پر اس نے بمشکل ہنسی روکی۔

"او کے! اللہ حافظ۔" تیر نشانے پر لگا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے کی چھائی ہوئی اداسی مسکراہٹ میں بدل چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپا کا فون تھا۔ کہہ رہی تھیں فوزیہ سب کو بہت یاد کر رہی ہے۔ میں نے کہا ہماری طرف بھیج دو۔ دو ہفتوں کے لیے بھیج رہی ہیں۔ اچھا ہے گا سب بچوں کے ساتھ وہ بھی انجوائے کر لے گی۔ ابھی فوزیہ سے پوچھ کر بتائیں گی کہ اگلے ہفتے بھیجیں گی یا اسی ہفتے۔" امی کہتے ہوئے نماز پڑھنے اٹھ گئی تھیں۔

"ہم نے کوئی امیوزمنٹ پارک کھولا ہوا ہے، جو وہ یہاں آکر انجوائے کرے گی۔ پہلے تو رکی نہیں۔ کیسے صاف منع کر دیا تھا۔ اب کیسے آنے کو تیار ہو گئی؟ میں بتائے دے رہی ہوں ناجیہ! مجھے فوزیہ کی نیت پر شک ہے۔ تم مقابلے کی تیاری پکڑ لو۔ تمہاری اور عالیان بھائی کی شادی میں ہر بات کے جواب میں کوئی دکھ بھرا شعر سنائی تھی۔ میں نے تو بات کرنا ہی کم کر دیا تھا۔ ہاں مگر عالیان بھائی پہلے کی طرح ہی بات کر رہے تھے۔ اب ان بے چارے کو کیا پتا کہ فوزیہ ان سے شادی کرنے پر دل و جان سے تیار تھی۔ یہ تو میں ہی تھی جو تمہاری محبت میں دلہن کا رول ادا کر گئی۔"

"وردہ نے ناجیہ کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ اس وقت اس کی دوستانہ و نندانہ محبت نے خوب جوش مارا تھا۔

"صرف میری محبت میں؟ تمہاری خود جان جاتی ہے فوزیہ کی شاعری سن سن کر۔ اچھا اب سوچ کیا کروں؟ دیکھو پہلے میں نئی نئی دلہن تھی۔ فوزیہ کے طنزیہ اشعار اگنور کر دیے تھے۔ لیکن اس دفعہ میں نے سوچ لیا ہے میں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گی۔" ناجیہ نے جوش سے کہا۔

"دیکھو! میرا مشورہ ہے 'فوزیہ سے شاعری میں مقابلہ کرنے کی کوشش مت کرنا۔ جتنی شاعری اسے رٹی ہوئی ہے اتنی تم دن رات پڑھو تو بھی مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ہاں اس کے علاوہ کچھ سوچتے ہیں۔" وردہ نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"ہرگز نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ میں بالکل بھی نہیں اپناؤں گی۔ مجھے فوزیہ کو دکھانا ہے کہ صرف وہ ہی نہیں میں بھی شاعرانہ مزاج رکھتی ہوں 'بلکہ اسے یقین دلانا ہے کہ میری اور عالیان کی شادی ہوئی ہی اسی وجہ سے ہے' ایک دفعہ اسے یقین آجائے تو بس پھر میری جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے گی۔ تم ایسا کرو مجھے کچھ اور شعراء کے نام بتاؤ۔ میں آج ہی انٹرنیٹ پر سرچ کر کے ان کی معیاری شاعری رٹ لوں گی۔ دیکھنا وہ اگلے ہفتے ہی آئے گی۔ تمہاری اس کزن کو نخرے کرنے کی بہت عادت ہے۔ بہت ٹائم ہے۔ میں آرام سے سب اچھی طرح رٹ لوں گی۔" ناجیہ نے پرعزم انداز میں کہتے ہوئے کاغذ اور قلم اٹھایا تھا۔

"ماشاء اللہ جواب نہیں آپ کا بھابھی محترمہ! پہلے کی ساری شرمندگی بھول کر آپ ایک دفعہ پھر وہی ڈرامہ کرنے کو تیار ہیں۔ اور مزے کی بات' اس دفعہ میں نے منتیں بھی نہیں کیں۔" وردہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"رات گئی بات گئی۔ ویسے بھی وہ شرمندگی والی

کہانی اب پرانی ہو گئی ہے۔ نئی بات کرو۔ سیدھی طرح شعراء کے نام بتا رہی ہو یا میں تمہارے بھائی سے ہی پوچھ لوں۔ کہہ دوں گی شاعری پڑھنے کا دل چاہ رہا ہے۔ وہ کلیات اقبال، کلیات غالب اور پتا نہیں کس کس کی کتابیں نکال کر سامنے رکھ دیں گے اور میں ایسی مشکل شاعری سے بچنے کے لیے قل ہی پڑھتی رہ جاؤں گی۔"

دھمکی آمیز لہجے میں شروع کی جانے والی بات میں اختتام تک مسکینی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔ وردہ کو بھی اپنی نئی نویلی بھابھی پر ترس آ گیا جو زبردستی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر معصومیت طاری کرنے کی کوشش میں ناکام ہو رہی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے لکھو۔ محمود شام۔" وردہ نے دل پر پتھر رکھ کر پہلا نام بتایا تھا۔

"او محمود شام تو بھی شروع ہو گئیں تم۔ وردہ میں تمہاری اس عادت سے سخت پریشان ہوں۔" ناجیہ نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ آواز میں کھلی کچھ دیر پہلے کی مصنوعی مسکینی پر اب غصہ غالب آ گیا تھا۔

"میری کون سی عادت سے؟" وردہ کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

"یہی چن چن کر مشکل اور ایسے شعراء کے نام بتاتی ہو جن کا میں نے نام ہی نہ سنا ہو۔ پھر غصہ کرتی ہو کہ میں بھول گئی۔ اور ویسے بھی مجھے دن کے لیے شاعری چاہیے۔ شام میں تو عالیان آفس سے آ چکے ہوں گے تو ہم مل کر مقابلہ کر لیں گے فوزیہ کا۔ اس لیے ایسے شعراء کا بتاؤ جن کی شاعری دن میں استعمال کی جا سکے اور نام بھی ایسے ہوں کہ میں کنفیوژ نہ ہوں کہ یہ آدمی ہیں یا عورت۔ پچھلی دفعہ کے ندا اور فرحت جیسے نام نہ بتا دینا۔"

ناجیہ نے اپنا مسئلہ ذرا تفصیل سے بتایا اور وردہ کو اس کی دماغی حالت پر جو شک تھا وہ اب یقین میں بدل گیا۔ اگر عالیان بھائی ناجیہ کے یہ ارشادات سن لیتے تو پتا نہیں ان کا کیا ری ایکشن ہوتا۔ "دن، شام اور شاعری استعمال" جیسے الفاظ پر وردہ نے صبر کا گھونٹ پیتے ہوئے کوئی آسان اور مشہور نام سوچا جو ناجیہ کو آسانی سے یاد رہ سکے۔

"قتیل شفائی۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد بالآخر وردہ کو ایک مشہور شاعر کا نام یاد آ ہی گیا تھا۔

"زبردست! بالکل ایسے ہی نام ہونے چاہئیں۔ فوزیہ کو پتا تو چلے نا کہ اگر اس نے عالیان پر بری نظر ڈالنے کے بارے میں سوچا بھی تو میں اس کا کیا حشر کرنے والی ہوں۔" ناجیہ نے فوراً نام لکھ لیا تھا۔ آواز میں کھنک دوگنا بڑھ گئی تھی۔

"اب اس نام سے فوزیہ کو کیسے پتا چلے گا کہ تم اس کا کیا حشر کرنے والی ہو؟" وردہ نہ چاہتے ہوئے بھی الجھ بیٹھی تھی۔

"بیوقوف ہو تم۔ شاعر کا نام ہے قتل صفائی۔ ایک دو دفعہ اس کے سامنے یہ کہہ دوں گی تو کافی ہو گا۔ یعنی میں اتنی صفائی سے اس کا قتل کروں گی کہ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ مگر تم گھبراؤ نہیں۔ میں کوئی قاتل نہیں ہوں۔ صرف فوزیہ کو دھمکانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ اگر اس نے کسی سے شکایت کی تو کہہ دوں گی میں تو قتیل شفائی کی بات کر رہی تھی۔" ناجیہ نے سمجھانے کے ساتھ ساتھ وردہ کو تسلی بھی دی تھی۔

"اچھا کیا" بتا دیا ورنہ میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ میری کزن کی جان خطرے میں ہے۔" وردہ نے ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے اگلا نام سوچنا شروع کیا۔

"بھئی میں تو نام بتا رہی ہوں، تم خود ہی اپنی سمجھ کے حساب سے انہیں "خطرناک" بنا لو۔ کہاں تمہاری سمجھ، کہاں مجھ حقیر کی سمجھ۔ ایک شاعر کا نام ہے اختر شیرانی۔ یہ بھی لکھ لو۔ اب یہ مت سمجھ لینا کہ ان کی شاعری میں شیرینی مٹھاس گھلی ہوتی ہے اور تمہارے لیے بے کار ہے کیونکہ تم تو تیکھی کھلی شاعری رٹنا چاہ رہی ہو تاکہ فوزیہ کے طنز کے جواب میں تاک تاک کر تیکھے شعروں سے حساب بے باق کر سکو۔"

وردہ نے نام بتانے کے ساتھ ساتھ وضاحت بھی دی تھی کہ کہیں وہ پھر غلط سمجھ کر ایک اور شاعر کو مسترد نہ کر دے۔

"یہ ہوئی نا بات! پرفیکٹ۔ اور میں کیوں غلط سمجھنے لگی؟ اب میں اتنی بھی بدذوق نہیں ہوں۔ اس نام سے ہی شیر اور اس کی بیوی شیرنی کی دہاڑ سنائی دے رہی ہے۔ ان کی شاعری سن کر تو فوزیہ لرز ہی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔" ناجیہ کی اپنی ہی منطق تھی اور اب تو وردہ نے اس کی اوٹ پٹانگ منطق سن کر اپنا سر پیٹنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ آخر انسان کب تک اپنا سر پیٹ سکتا ہے؟ روز کی دردسری کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔

"بات ہو گئی میری آپا سے۔ فوزیہ تو اگلے ہفتے آنے کا کہہ رہی تھی۔ میں نے بات کی اور کہا اسی ہفتے آ جاؤ تو بڑی مشکل سے مانی ہے۔ چار دن بعد آ رہی ہے۔"

فوزیہ کے اسی ہفتے آنے کی خبر سن کر ناجیہ نے انگلیاں دانتوں تلے دبا لی تھیں۔ اور وردہ کی چیخوں نے در و دیوار ہلا دیے تھے۔ (نہیں وہ اوور ایکٹنگ ہرگز نہیں کر رہی تھی۔ وجہ کچھ اور تھی۔ بدقسمتی سے انگلیاں ناجیہ کی نہیں وردہ کی تھیں۔ وہ جو ناجیہ کو ہمت دلانے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھی تھی اس نے ٹینشن میں اسی کی انگلیاں چبا ڈالیں۔ اس کی نرم و ملائم انگلیاں جن پر مساج کر کے وردہ نے انہیں مزید ملائم بنایا تھا ناجیہ کے خنجر جیسے دانتوں کی تاب نہ لا سکیں۔ فلک شگاف چیخیں مارنا تو اس کا حق تھا۔ اور اس سنگین واقعے کے بعد بھی اگر ناجیہ سمجھ رہی تھی کہ وردہ فوزیہ سے مقابلہ کرنے میں اس کی مزید مدد کرے گی تو یہ اس کی بھول تھی۔

شہناز صدیق

ممانے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا ڈاکٹر عائش ملک کو حسب معمول فائل میں سر دیے منہمک پایا۔

"عائش بیٹا! کتنی دفعہ کہا ہے کہ ہسپتال کا کام ہسپتال میں ہی رکھا کرو مگر تم میری سنو تب نا۔" اپنے خوبرو بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے حسب عادت ٹوکا۔

"کام کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میری پیاری مما کے لیے میرے پاس ٹائم نہیں ہے" آیئے پلیز۔"

فائل بند کرتے وہ مسکرائے اور پھر ان کا ہاتھ تھام کر قریب ہی بٹھالیا۔ وہ اندر تک نہال ہوگئیں۔

"بہت تھک جاتے ہو گے اتنے بڑے ہسپتال کی ذمہ داری اکیلے سنبھالنا بھی تو بہت مشکل ہوتا ہوگا۔"

انہوں نے محبت سے ان کے ماتھے سے بال سمیٹے تو وہ تمام فائلز ایک سائیڈ پر کرتے ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئے۔

"میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آئی تھی۔"

"جی کہیے' میں سن رہا ہوں۔" وہ ہمہ تن گوش ہوگئے۔

"میں چاہتی ہوں کہ اب تم شادی کرلو۔ تم تو صبح شام ہسپتال کے چکروں میں گم رہتے ہو' کبھی تو

مکمل ناول

www.Paksociety.com

ساری ساری رات نہیں آتے۔ پیچھے میں اتنے بڑے گھر میں بولائی بولائی پھرتی رہتی ہوں۔ تمہیں ماں کی تنہائی کا ذرا احساس نہیں۔"

ان کے اتنا جذباتی ہونے پر وہ حیران رہ گئے۔ پہلے کب بھی انہوں نے اس طرح بات کی تھی۔ انہوں نے لمبا سانس ہوا میں خارج کرتے ہوئے ان کے دونوں ہاتھ تھامے۔

"میں آپ کی فیلنگز سمجھ رہا ہوں مگر پلیز آپ بھی تو میری مجبوری سمجھئے۔ ابھی تو ہسپتال کی کنسٹرکشن مکمل ہوئے کچھ ماہ ہوئے ہیں۔ ابھی بہت کام کرنے باقی ہیں اور آپ کہہ رہی ہیں کہ میں شادی کرلوں۔" مکمل تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنی مصروفیت گنوائی۔

"میں کچھ نہیں جانتی' ہوتے رہیں گے سارے کام بھی ساتھ ساتھ' بہو ہر وقت تمہارے ساتھ نہیں چپکی رہے گی۔" وہ حتمی انداز میں بولیں۔

ڈاکٹر عاشر ملک کے ماتھے پر پرسوچ لکیریں ابھرنے لگیں۔

"او۔ کے' آپ میری شادی کرنا چاہتی ہیں نا تو ٹھیک ہے مگر پھر میری بھی ایک شرط ہے۔" وہ کافی دیر بعد بولے۔

"ہاں' ہاں کہو۔۔۔ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔" ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ان کے لیے یہی بہت بڑی بات تھی کہ وہ راضی ہوگئے تھے۔

"لڑکی ڈاکٹر ہونی چاہیے اور وہ بھی ہارٹ اسپیشلسٹ۔"

وہ خاموش سی ہوگئیں۔

"کیوں' کیا ہوا؟" جب وہ کافی دیر کچھ نہ بولیں تو انہوں نے ابرو اچکاتے پوچھا۔

"لڑکی ڈاکٹر ہو' یہ تو ٹھیک ہے مگر ہارٹ اسپیشلسٹ ہو۔ کیا یہ ضروری ہے؟" وہ پرسوچ انداز میں بولیں۔

"ہاں۔۔۔ بالکل۔"

"تم نے مجھے اچھی خاصی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اب کہاں سے میں اسپیشلسٹ ڈھونڈتی پھروں اور وہ بھی ہارٹ۔"

انہوں نے اپنے ڈیشنگ ہینڈسم بیٹے پر محبت بھری نظر ڈالی اور مسکرادیں۔

☼ ☼ ☼

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کاش میں اک گلاب کا پھول ہوتا' اس طرح تمہاری توجہ کے دائرے میں تو رہتا۔" وہ بہت دھیان سے گلاب کے پودوں کی تراش خراش کررہی تھی جب بارز عباد کی آواز پر سرعت سے پلٹی۔ وہ سینے پر دونوں بازو لپیٹے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں شوق کا ایک جہان آباد تھا۔ مخصوص نرم گرم تاثر جو اسے روبرو پاتے ہی خود بخود آنکھوں میں آن سماتا' آئمہ اسد کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔

"آپ۔۔۔!" متحیر آنکھوں میں قندیلیں روشن ہونے میں لمحہ لگا۔ چہرے پر کئی رنگ آکر ٹھہر گئے۔

"کب آئے۔۔۔؟" ہاتھوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے وہ روبرو آکھڑی ہوئی گویا کررہی تھی جیسے بھول ہی گئی' یاد رہا تو مقابل استادہ وجود جو نجانے کب سے مکمل استحقاق سے اس کے دل کے سنگھاسن پر پورے طمطراق سے براجمان تھا۔

"مجھے دنیا میں آئے 25 سال ہوچکے ہیں۔" ڈارک براؤن آنکھوں کی حدت میں شرارت ناچنے لگی۔

"میرا وہ مطلب تو نہیں تھا۔" وہ خجل سی گردن جھکا گئی۔ صاف شفاف سیدھی مانگ کو دیکھتے۔ "عباد کی نظروں کی لو مزید بڑھنے لگی۔" "تو پھر کیا مطلب تھا تمہارا؟"

"میں آپ کے کراچی سے آنے کی بات کررہی ہوں۔" اس نے نگاہیں اٹھائیں بارز عباد کچھ نہیں بولا تھا۔ ہنوز جذبے لٹاتی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ بہت دیر بعد آئمہ نے ہی پلکیں جھپکتے نظروں کو جھکایا تھا۔

"آئمہ! تم کسی دن مجھے پاگل کرکے چھوڑوگی جانتی ہو' یہ ایک ہفتہ تمہارے بغیر میں نے کتنی مشکل سے گزارا' ایک ایک لمحہ' سو سو صدیوں پر محیط تھا۔"

فسوں خیز بے تاب سرگوشیوں کو وہ دھیرے دھیرے اپنی سماعتوں میں انڈیل رہا تھا۔ ڈارک براؤن آنکھوں سے پھوٹتی روشنیاں اسے بہت خاص بہت اہم ہونے کا یقین دلا رہی تھیں۔

"ارے عباد! تم کب آئے؟" سحر ٹوٹ چکا تھا' دونوں نے خود کو کمپوز کرنے میں لمحہ لگایا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے۔" دونوں ہاتھوں سے بال سنوارتے اس نے نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے قریب آتی اریزا کی طرف دیکھا۔ "کیسا رہا تمہارا ٹور؟"

آئمہ خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ابھی اس کے من پسند لنچ کا بھی تو انتظام کرنا تھا۔

"بہت زبردست' مگر تم سب کو بہت مس کیا۔" دونوں ہی قریب پڑی کین کی چیئر پر بیٹھ گئے۔

"ہمیں یا آئمہ کو۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے چھیڑا تو وہ بھی ہنس دیا۔

☼ ☼ ☼

"ارے کلاس سے تعلق رکھنے کے باوجود آپ کی سوچ اتنی دقیانوسی کیوں ہے مما! مائیں تو خود اپنے بچوں کو پرمیشن دیتی ہیں کہ وہ اپنے اندر چھپے ٹیلنٹ کو آزمائیں۔ آپ کیسی ماں ہیں جو میرے ٹیلنٹ کو دیمک لگانا چاہتی ہیں۔" وہ بدلحاظی سے بولی۔

مما کتنی دیر ساکت انداز میں اپنی نازوں پلی کو دیکھتی رہیں' جس نے پہلے کبھی اس انداز میں ان سے بات نہ کی تھی۔

"یہ تم کس لہجے میں بات کررہی ہو اریزا' میں اور تمہارے پاپا اس فیلڈ کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ویسے بھی اب تمہاری شادی کی عمر ہے' ٹیلنٹ آزمانے کی نہیں۔" وہ حتمی انداز میں بولیں۔

"آخر کیا برائی ہے اس فیلڈ میں۔ آج کل بہت سی اچھی فیملی کی لڑکیاں ٹیلی ویژن میں پروگرام کررہی ہیں۔ ان کے پیرنٹس کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

"مگر ہمیں ہے' سمجھیں تم۔" وہ سختی سے بولیں۔ "آئندہ اس بارے میں مجھ سے بات مت کرنا۔" انگلی اٹھاتے ہوئے انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا اور پھر اسے سنجیدگی سے گھورتی باہر کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ وہیں صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھی سر دونوں ہاتھوں میں تھامے سسکنے لگی۔ اسی وقت دستک دیتے ہوئے آئمہ اندر داخل ہوئی۔

"ارے آپ کو کیا ہوا؟" اسے روتے دیکھ کر وہ سرعت سے اس کے قریب آئی تھی۔ "کیا پھر سے مما کے ساتھ بحث ہوئی ہے؟"

"آئمہ! کیا میری خواہش اتنی بری ہے کہ جس کے لیے مجھے اتنا تڑپایا جارہا ہے۔" بھاری آواز میں کہتے ہوئے اس نے یک لخت سر اٹھایا۔

"آپ کی خواہش بری نہیں ہے آپی! مگر مما بھی غلط نہیں ہیں۔ ساری بات ماحول کی ہے۔ ہمارے گھر

کا ماحول اس کی اجازت نہیں دیتا۔" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح بات کرے کہ وہ بدگمان بھی نہ ہو اور اس کا نقطہ نظر بھی سمجھ جائے۔

"ماحول انسان خود بناتا ہے اور اگر تمہیں مما غلط نہیں لگتیں تو ظاہر سی بات ہے میں غلط لگتی ہوں۔"

"ایسی بات نہیں ہے آپی۔"

"ایسی ہی بات ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔

یہ لگتا تھا اسے دوسروں سے بدگمان ہونے میں۔

"تمہارے کہنے کا جو بھی مطلب ہو مگر تم اور مما یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ مجھے اس فیلڈ میں ہر صورت جانا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" وہ ضدی لہجے میں کہتی واش روم میں گھس گئی۔ آئمہ نے سر تھام لیا۔ وہ اس کے ضدی پن سے اچھی طرح واقف تھی۔

☼ ☼ ☼

دھاڑ کی آواز سے دروازہ کھلا تھا۔ آئمہ جو کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھی' بری طرح چونکی پھر بارز کو سنجیدگی سے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر حیران سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بارز کیا ہوا ہے؟ سب خیریت تو ہے؟" اس نے اسے اتنا سنجیدہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لیے اس کا پریشان ہونا لازم تھا۔

"کیا تم نہیں جانتیں ___" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بہت چبا چبا کر بولا۔ اس نے آہستہ سے سر نفی میں ہلا دیا۔

"میں ابھی تایا ابو کے کمرے سے آرہا ہوں ___"

"او" ___ اس کی سمجھ میں سب آ گیا۔ وہ کسی حد تک ایسے ردِعمل کی توقع کر رہی تھی۔ اپنے لیے اس کی دیوانگی سے اچھی طرح آگاہ جو تھی۔ "بارز میری بات سنیں ___"

"تم سنو ___" اس کی بات تیزی سے کاٹتے اس کے ہاتھ خود بخود اس کے کندھوں پر آ ٹھہرے۔

"تم کہیں نہیں جاؤ گی اور اس معاملے میں ہم میں مزید کوئی بات نہیں ہوگی سمجھیں۔" اس نے اپنی طرف سے بات ہی ختم کر دی۔

"لیکن بارز!"

"بس آئمہ۔" اس نے حتمی انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ "میں اس معاملے میں بحث نہیں چاہتا۔" اس کے متذبذب چہرے پر سنجیدہ نظر ڈالتے ہوئے وہ پلٹ گیا اور وہ متاسف سی کتنی دیر وہاں کھڑی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ پردے برابر کر کے جیسے ہی کھڑکی کی طرف بڑھی اتنی رات کو بارز کو لان میں ٹہلتے دیکھ کر حیران رہ گئی مگر پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ بھی لان کی طرف بڑھ گئی۔

"بارز! یہ کیا حرکت ہے' اتنی سردی میں رات کے اس پہر یہاں کیا کر رہے ہیں' اگر سردی لگ گئی تو۔" وہ فکرمندی سے گویا ہوئی جب اس نے برہم سی نظر اس کے متفکر چہرے پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں کا خفگی بھرا تاثر آئمہ اسد کے اندر تک اتر گیا۔

"ادھر آئیں' ادھر آ کر بیٹھیں۔" اس کا ہاتھ تھام کر وہ سنگی بینچ کے پاس لے آئی' وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ "یہ کیا بچپنا ہے ___ میں کون سا عمر بھر کے لیے جا___" بارز نے بہت نرمی سے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے اس کا جملہ پورا ہونے سے روکا۔

"آئندہ اس طرح کی بات پھر کبھی اپنی زبان پر مت لانا۔ میں ایک دن کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا اور کہاں اتنا عرصہ۔" وہ روٹھا روٹھا سا کسی معصوم بچے کی طرح لگا۔

وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ "اور پچھلے دنوں جو آپ پورا ایک ہفتہ مجھ سے دور رہے تھے وہ کیا تھا جناب۔" بہت دلکش انداز میں چھیڑا گیا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تایا ابو کو میں کبھی انکار نہیں کر سکتا اور ان ہی کے کام سے میں کراچی گیا تھا۔"

"تو یہ بھی تو آپ کے تایا ابو کی ہی خواہش ہے۔" وہ اسے اصل پوائنٹ پر لے ہی آئی۔

"مجھے تمہارے اسپیشلائزیشن کرنے پر اعتراض

نہیں ہے آئمہ! بلکہ خود سے دور جانے پر اعتراض ہے۔" پھر وہ اک آس سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیوں تم مجھ سے اتنا دور جانا چاہتی ہو۔ کیا رہ لو گی میرے بغیر؟" اور یہ وہ سوال تھا جو وہ چاہتی تھی کہ بارز اس سے کبھی نہ پوچھتا اسے اپنے ضبط کی طنابیں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"جب تم خود بھی مجھ سے دور نہیں رہ سکتیں تو پھر کیوں۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"میں اپنے پاپا کی خواہش پوری کرنا چاہتی ہوں بارز! پلیز مجھے کمزور مت کریں۔ مجھ سے دور رہنا جتنا آپ کے لیے مشکل ہے اتنا میرے لیے بھی کٹھن ہے مگر میں اپنے پاپا کو ایک دفعہ پھر سے مایوس ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ پلیز آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔"

وہ نظریں چراتے ہوئے بے وجہ ہی ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"بارز! مجھے آپ بھی بہت عزیز ہیں اور پاپا بھی۔ آپ مجھے اجازت نہیں دیں گے تو میں نہیں جاؤں گی مگر پھر میں ساری زندگی خود سے نظریں نہیں ملا پاؤں گی۔ جب جب پاپا کو دیکھوں گی پچھتاووں کے ناگ ڈستے رہیں گے۔"

اس نے یک لخت سرخ نظریں اٹھائیں۔

"کب تک جا رہی ہو؟" بہت دیر بعد اس کے ہونٹوں نے جنبش کی۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ وہ بمشکل سن پائی۔

"اگلے ہفتے۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہی بولی جو اتنا سرخ تھا کہ اسے لگا ابھی خون چھلک پڑے گا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جب وہ اپنی برداشت کو حد سے زیادہ آزماتا تھا تو اس کا چہرہ اسی طرح سرخ ہو جایا کرتا تھا۔

اس کے اندر ہونے والی جنگ سے بھی وہ بے خبر نہیں تھی مگر لاکھ چاہنے کے باوجود بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

"بہت سردی ہے' چلو اندر چلتے ہیں۔" اس کی سوچوں کے تسلسل کو بارز کی آواز نے توڑا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بارز ___" بڑھتے قدموں کو روک کر اس نے آہستہ سے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"ناراض تو نہیں ہیں۔" وہ اک آس سے پوچھ رہی تھی۔ اس نے لمبا سانس ہوا میں خارج کیا اور پھر دھیرے سے مسکراتے ہوئے نفی میں گردن ہلا دی۔ ایک بہت بڑا بوجھ تھا جو اسے سرکتا ہوا محسوس ہوا۔

☼ ☼ ☼

آئمہ اسد نے تیاری مکمل کرنے کے بعد آخری نظر قد آدم آئینے میں جھلکتے دمکتے اپنے وجود پر ڈالی اور پھر مطمئن ہوتی بالوں کو برش کرنے لگی۔ اس کے جانے سے پہلے مما نے ایک چھوٹی سی پارٹی ارینج کی تھی۔

اس کی تمام فرینڈز اسے باربی ڈول کہہ کر پکارتی تھیں۔ گلابی رنگت اور نیلی آنکھوں والی آئمہ اسد سچ مچ کسی باربی ڈول سے کم نہ تھی۔

اسی وقت مما اندر داخل ہوئیں' اسے دیکھتے ہی ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اتنی معصومیت' اتنی دلکشی' انہوں نے بے ساختہ نظروں ہی نظروں میں اس کی نظر اتاری۔ پھر اس کی جھنجھلائی صورت دیکھتے ہوئے وہ بے اختیار مسکرائیں۔

"کیا ہوا ___ منہ کیوں بنا رکھا ہے؟" قریب آتے انہوں نے نرمی سے اس کے ہاتھ سے دوپٹہ تھاما اور پھر اسے فولڈ کرتے اس کے ایک کندھے پر سیٹ کر دیا۔

پھر ڈریسنگ ٹیبل پر جھک کر کاجل کی ڈبی اٹھاتے اس کے کان کے پیچھے ٹیکا لگا دیا۔ اپنی سادگی اور تابعداری کی وجہ سے وہ ہمیشہ اریزا اسد سے نمبر لے جاتی تھی۔

"جلدی سے نیچے آجاؤ۔ مہمان ویٹ کر رہے ہیں ___" محبت بھری نظر ڈالتے وہ پلٹ گئیں تو وہ ایک دفعہ پھر سے خود کو آئینے میں دیکھنے لگی۔

بارز کسی کام سے اندر آیا تھا' آئمہ اسد کو سج سج سیڑھیاں اترتے دیکھ کر وہیں ٹھٹک کر رک گیا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر آئمہ کی جیسے ہی نظر اس کے مبہوت

انداز پر بڑی وہ جھینپتی ہوئی نظریں جھکا گئی ان آنکھوں کے والہانہ تیور اس سے مخفی تو نہیں تھے اور اس ارتکاز کو وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی' پہلے بھلا کب وہ ایسے روپ میں اس کے سامنے آئی تھی۔ جھجک اور شرم ایک فطری سا عمل تھا۔ وہ ان آنکھوں کے حصار سے ہمیشہ ہار جاتی تھی اس وقت بھی نروس ہوتی بے وجہ انگلیاں چٹخانے لگی۔

"پلیز یارز۔۔۔!" وہ ہلکا سا منمنائی۔ وہ چونکا ضرور تھا مگر دیکھنے کے انداز میں رتی برابر فرق نہ آیا۔ قدم قدم اس کی طرف بڑھتے وہ ہر چیز فراموش کرچکا تھا حتیٰ کہ خود کو بھی۔

"یارز! تمہیں پاپا بلا رہے ہیں۔" وہ جیسے ہی اس کے مقابل آکر کھڑا ہوا اریزہ اسد کی پرزور پکار پر پہلے چونکا اور پھر ایک عدد زبردست گھوری سے اسے نوازا۔

"تمہیں ہماری جاسوسی کے علاوہ بھی کوئی کام ہے؟" اس کی بے وقت کی انٹری اسے اچھی خاصی کوفت میں مبتلا کرگئی۔

وہ کھلکھلاتی ہوئی ان کے قریب آئی۔

"آئمہ سوری گائز' نہ چاہتے ہوئے بھی میں اکثر غلط ٹائم پر انٹری دے دیتی ہوں مگر اس دفعہ میرا کوئی قصور نہیں ہے' میں تو پاپا کا میسج لے کر آئی ہوں۔" وہ افسوس سے گردن نفی میں ہلاتے ہوئے بولی جبکہ آنکھوں میں بھرپور شرارت تھی۔

"وہ۔۔۔ وہ آپی میں تو آ ہی رہی تھی۔" آئمہ ہکلا کر رہ گئی۔

"بھئی تمہیں اب کسی کی آنکھیں چھوڑیں گی تو تم آؤ گی نا اور ویسے بھی آج لگ بھی غضب کی رہی ہو۔" اس نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا تو آئمہ بوکھلائے ہوئے باہر کی طرف دوڑی جبکہ عباد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے سر پر کوئی چیز ہی ماردیتا جو اس وقت واقعی کسی ولن سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ ابھی کپڑے تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی جب اس کے موبائل پر میسج ٹون بجی۔

"میں چھت پر تمہارا ویٹ کررہا ہوں۔"

"اس وقت۔۔۔" میسج پڑھنے کے بعد اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا جو رات کا ایک بجا رہا تھا۔ اس وقت اسے مجھ سے کیا کام ہوسکتا ہے' وہ الجھتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے جیسے ہی وہ آخری زینے پر پہنچی یارز کو گرل سے ٹیک لگائے محو انتظار پایا۔

"کیا بات ہے' اس وقت کیوں بلایا ہے سب خیریت تو ہے؟" اس نے پہنچتے ہی پوچھا۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ اور نرمی سے اس کی کلائی تھام لی۔

"اپنی آنکھیں بند کرو۔" اس انوکھی فرمائش پر وہ الجھی۔

"کیا مجھ پر اعتبار نہیں؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے نرمی سے پوچھا۔ وہ چند پل اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی' جہاں اس کا عکس نمایاں تھا اور پھر آہستہ سے آنکھیں بند کرلیں۔

"اعتبار کا شکریہ۔" اسے کندھوں سے تھامتے ہوئے وہ چند قدم چلا اور پھر ایک جگہ لاکر چھوڑ دیا۔

"اب تم آنکھیں کھول سکتی ہو۔" اس نے ہولے سے آنکھیں کھولیں۔۔۔ اور پھر حیران رہ گئی۔

"یارز' یہ سب یہ" پوری چھت کو حیرت سے دیکھتے اس نے یارز کی طرف دیکھا جو سینے پر ہاتھ باندھے مسکرا رہا تھا۔

"او مائی گاڈ۔" اپنے قدموں کے نیچے دیکھنے کے بعد اس نے ایک دفعہ پھر سے پوری چھت کو دیکھا حیرانی' ستائش' بے یقینی' اشتیاق کیا کچھ نہ تھا اس کی آنکھوں میں۔ اس نے بے اختیار پاؤں کو جوتی سے آزاد کیا۔ اس کے پیروں کے نیچے پھولوں کی پتیوں سے بنا ایک بہت بڑا دل تھا۔ دل کے اوپر سے ہی پھولوں کی پتیوں سے چھپی راہداری بنائی گئی تھی جس کے دونوں اطراف ننھے منے دیے روشن تھے۔ راہداری سیدھی سامنے رنگ برنگے پھولوں سے سجے جھولے تک جا رہی تھی۔ جھولے کے دائیں طرف چھوٹا پھر بڑا پھر اس سے بھی بڑا تین عدد شمع دان سجائے ان میں چھوٹی اور بڑی مختلف رنگوں کی شمعیں جلائی گئی تھیں۔ بائیں طرف تین عدد گملے رکھنے کے بعد ان کے سامنے تین بڑے باؤلز کو پانی سے بھر کر رکھا گیا تھا جن میں گلاب کی پتیوں کے علاوہ ننھی منی کینڈلز روشن تھیں۔ جھولے کے پیچھے لگا سفید باریک پردہ جو ہوا سے ہلتے ہوئے اس ماحول کو مزید سحر زدہ سا بنا رہا تھا۔ وہ اس ماحول میں ایسی کھوئی کہ پلکیں تک جھپکنا بھول گئی۔

"یارز! یہ' یہ سب آپ نے میرے لیے کیا۔" اس نے اس سحر زدہ پر طلسم ماحول سے بمشکل اپنی نظروں کو ہٹاتے یارز عباد کی طرف دیکھا۔ اس نے دھیما سا مسکراتے سر اثبات میں ہلا دیا۔ نظریں ہنوز اس کے چہرے پر جمی رہیں' جس پر کئی رنگ آکر ٹھہر چکے تھے۔

اسے یہ سب کچھ اک حسین خواب کی طرح لگا۔ ذرا سی بے احتیاطی سے جیسے آنکھ کھلنے کا ڈر ہو۔ بہت نرمی سے اس نے پھولوں بھری راہداری پر چلنا چاہا تھا۔ جب عباد نے اس کی کلائی تھامی متعجب نظریں سرعت سے اٹھی تھیں۔

"ابھی نہیں۔" اس کے چہرے پر نظر ڈالتے وہ اس کے قدموں میں جھکا۔ آئمہ کی آنکھیں مزید متحیر ہوئیں۔ اس نے ایک نظر اس کے موتی گلابی پاؤں پر ڈالی اور دوسری اس کے حیران چہرے پر پھر مسکراتے ہوئے اپنی جیب سے چھوٹے چھوٹے دل والی وائٹ گولڈ کی پازیب نکال کر بہت احتیاط سے اس کے پاؤں میں پہنا دیں۔

"ہوں۔۔۔ اب چلو۔" اٹھتے ہوئے بولا۔ اس کا ہاتھ تھام کر چلتے ہوئے اس کی نظر متعدد بار اپنے پاؤں کی طرف اٹھ چکی تھی' جن میں نفیس سی پازیبیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ جھولے کے قریب آتے ہی عباد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ اک خواب کے عالم میں بیٹھ گئی۔ جھولے پر وزن پڑتے ہی جھولے نے آہستہ سے حرکت کی اور پھر بے شمار پھولوں کی بارش میں جیسے وہ نہا سی گئی۔

"او مائی گاڈ۔۔۔" اس کے ہونٹ بے پناہ خوشی کے احساس سے خود بخود مسکرانے لگے۔ اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے وہ سارے پھول دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لینا چاہتی تھی۔

نیلی آنکھوں کی چمک میں کئی گنا اضافہ ہوچکا تھا۔

"آئی کانٹ بلیو دس یارز کہ یہ سب آپ نے میرے لیے کیا۔" اس کی آواز بھرپور خوشی سے کپکپا سی گئی۔ عباد اس کے قریب ہی جھولے پر ٹک گیا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے آئمہ! تمہارے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں' کچھ بھی ایوری تھنگ۔ تم میرے لیے بہت اسپیشل ہو۔" وہ محبت سے لبریز آواز میں بولا تھا۔ آئمہ اسد پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"جانتی ہو جب میں تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے تم پر باربی ڈول کا گمان گزرتا ہے۔ کانچ کی گڑیا کا تصور ابھرتا ہے۔ اپنی شدتوں' اپنے جذبوں کے ہاتھوں مجبور ہوکر بہت بار میرا دل چاہا کہ میں تمہارے گالوں کو چھوکر ان کی نرماہٹ کو محسوس کروں مگر نجانے میرے دل میں یہ وہم کیوں بیٹھ گیا ہے کہ میں تمہیں چھوؤں گا تو تم ٹوٹ جاؤ گی۔" بہت بے تاب سرگوشی تھی۔ آئمہ اسد کی دراز پلکیں لرزتی ہوئی اس کے گلابی عارضوں پر سایہ فگن ہوگئیں۔

"تمہیں اللہ نے بہت فرصت سے بنایا ہے آئمہ! اور میں خوش قسمت انسان ہوں جس کی زندگی کا تم حصہ ہو۔ تمہاری صورت جتنی پیاری ہے تمہاری سیرت اس سے بھی زیادہ پیاری ہے۔" یارز عباد کی آواز جذبوں سے بوجھل ہوتی جارہی تھی اور آئمہ اسد اپنے دل کی دھڑکن کو با آسانی سن رہی تھی جو تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی۔

"میں نہیں جانتا کہ تمہارے بغیر یہ عرصہ کیسے گزاروں گا مگر یہ یاد رکھنا آئمہ کہ کوئی ہے جس کے لیے تمہارے بغیر ایک ایک پل کاٹنا بہت مشکل ہوگا اور جو ہر وقت تمہاری دید کی پیاس آنکھوں میں لیے رستہ تک رہا ہوگا۔ جس کے دل کی دھڑکنیں تمہیں

اور صرف تمہیں پکار رہی ہوں گی۔" آئمہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"اتنی محبت کرتے ہیں مجھ سے؟" اس نے پانیوں سے بھری آنکھیں اٹھائیں۔

"ہاں۔۔۔ اس سے بھی زیادہ۔ تمہارے وجود کے سامنے تو کبھی کبھی میں اپنا وجود بھی فراموش کر دیتا ہوں۔" اس نے مکمل سچائی کے ساتھ اعتراف کیا۔

"میں بہت خوش قسمت ہوں بارز! نجانے کس نیکی کے عوض اللہ نے مجھے آپ کی پرخلوص محبت عطا کی۔" اس کے آنسو لڑھکتے ہوئے گالوں پر بہنے لگے۔ بارز عباد نے بہت نرمی سے انہیں اپنی پوروں پر سمیٹا تھا۔

"آج تم نے میری دیرینہ خواہش پوری کر دی ہے آئمہ! حالانکہ تمہاری آنکھوں میں آنسو میں کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا مگر۔۔۔" وہ رکا تو آنکھیں بولنے لگیں۔ آئمہ نے ناسمجھی سے سر اٹھایا تو وہ مسکرا دیا۔

"آج مجھے یقین آ گیا ہے کہ یہ کانچ کی گڑیا میرے نرمی سے چھونے پر نہیں ٹوٹے گی۔" آنکھوں کی بڑھتی لو میں مچلتی شرارت نے اسے لمحے کے ہزارویں حصے میں پلکیں جھکانے پر مجبور کر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے۔" اس کی بولتی نظروں سے بچنے کے لیے وہ یکلخت اٹھ کھڑی ہوئی۔ جب بارز نے بہت نرمی سے اس کی کلائی تھامی تھی۔

"یہ لمحے بہت قیمتی ہیں آئمہ! انہیں یادگار بنا دو۔"

اس دلنشیں استدعا پر وہ اپنے دل کی دھڑکنیں سنبھالتی دوبارہ بیٹھ گئی۔ خاموشی میں محو رقص۔۔۔ محبت چار سو بولنے لگی۔ دونوں ہی چاہت کی بارش میں بھیگنے لگے۔ چودھویں کے چاند کی تیز روشنی میں وہ دیوانے ہاتھوں میں ہاتھ لیے بیٹھے ایک دوسرے کی دھڑکنیں سننے میں مگن تھے۔ بے خودی سی بے خودی تھی، وارفتگی سی وارفتگی تھی۔ ہلکا ہلکا متحرک جھولا انہیں دور کسی خوابوں کے نگر کی سیر کروا رہا تھا۔ پو پھٹتے ہی آئمہ نے اس کے کندھے سے سر اٹھایا تھا۔ بارز عباد نے بھی اسی وقت آنکھیں کھولیں۔ دونوں کی آنکھیں محبت کے معتبر احساس سے لبریز اک تقدس کی لپیٹ میں تھیں۔ پھولوں بھری راہداری پر چلتے نجانے کس احساس کے زیر اثر اس نے پلٹ کر بارز عباد کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتی چلی گئی۔

کوئی عہد و پیماں نہ باندھے گئے تھے مگر ان دونوں کی دھڑکنیں ایک دوسرے سے مربوط ہو چکی تھیں۔ آہستہ سے نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ بارز عباد کتنی دیر وہاں کھڑا محبت کے اس دلفریب مسحور کن احساس میں بھٹکتا رہا۔ آج کی صبح اس کی زندگی کی حسین ترین صبح تھی۔

اور پھر وہ بارز عباد کے دل کو سونا کر کے چلی گئی۔ بہت سے دن بارز عباد کو اپنے دل کو سمجھانے میں لگے۔ اسے گئے ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے لوٹنے کے دن گننے لگا۔ ہر گزرتا دن اسے صدیوں پر محیط لگنے لگا۔ کسی بندھی روٹین کے مطابق وہ صبح آفس جاتا اور پھر گھر لوٹتے ہی کمرے میں بند ہو جاتا۔ جب کبھی دل کو سمجھانا مشکل ہو جاتا تو بے ساختہ اس کی انگلیاں اس کا نمبر ڈائل کرنے لگتیں۔ اس کی آواز سنتے ہی دل پنجرے میں قید پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگتا تو وہ ڈائری میں رکھی اس کی تصویر کو گھنٹوں دیکھتا رہتا۔ وہ جانتا تھا کہ آئمہ کی حالت بھی اس سے مختلف نہ ہو گی وہ بھی تو پریم دیوانی تھی۔ یہاں تو وہ سب کے درمیان تھا جبکہ وہ وہاں تنہا۔ وہ کتنے مشکل دور سے گزر رہی تھی بارز عباد کو اس کا اچھی طرح اندازہ تھا۔

☆ ☆ ☆

"آخر آپ کو اعتراض کس بات پر ہے۔ اللہ نے مجھے حسن دیا ہے تو گھر بیٹھ کر ضائع کیوں کروں۔ پلیز مما! آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔" جھنجلاتے ہوئے آخر میں وہ منتوں پر اتر آئی۔ "میں کوئی برا رول۔۔۔ نہیں کروں گی۔ میں آپ سے پرامس کرتی ہوں۔ آپ کی عزت کا احساس ہے مجھے۔" ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے وہ امید و بیم کی سی کیفیت میں بولی۔

"اگر تمہیں ہماری عزت کا احساس ہوتا تو تم ایسی گھٹیا خواہش ہی نہ کرتیں۔" وہ برہم سی گویا ہوئیں۔

"کیا گھٹیا ہے اس میں بتائیں مجھے۔ سب لڑکیوں کو اس طرح کی آفرز نہیں ملا کرتیں۔ یہ تو میرے حسن کو دیکھتے۔۔۔"

"کیا حسن حسن کی رٹ لگا رکھی ہے تم نے؟" وہ درمیان میں ہی ٹوکتے ہوئے سختی سے بولیں۔

"آئمہ بھی تو خوب صورت ہے بلکہ تم سے بھی زیادہ فیاضی سے اللہ نے اسے حسن سے نوازا ہے۔ اس کے دماغ میں تو ایسا خلل نہیں آیا۔" انہوں نے غصے سے کہتے ہوئے جیسے اسے آئینہ دکھانا چاہا۔

"یہاں آئمہ کا کیا ذکر؟" وہ ناگواری سے بولی۔ سچ تھا کہ حسن کے معاملے میں وہ اس سے بہت آگے تھی اور یہی ایک نگیٹو پوائنٹ تھا جو اریزا کو سلگانے کے لیے کافی ہوتا۔ بہت بار آئمہ کو دیکھ کر وہ سوچتی اتنا حسن اس کے کس کام کا ہے۔ محبت تو اسے عام شکل و صورت کے بارز عباد سے ہی ہوئی تھی۔ اگرچہ یہی حسن اس کے پاس ہوتا تو وہ دنیا پر چھا چکی ہوتی۔ عام شکل و صورت کی تو وہ بھی نہیں تھی مگر جہاں آئمہ اسد کی بات آ جاتی، اریزا اسد کو خود میں کمی کا احساس ہوتا تھا ورنہ اس نے اپنے لیے ہر آنکھ میں ستائش ہی دیکھی تھی۔

"آپ چاہیں کچھ بھی کہہ لیں مگر مجھے اپنا خواب ہر صورت پورا کرنا ہے۔" ہٹ دھرمی سے کہتے وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور پھر تن فن کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ جبکہ سنبل بیگم کے لیے بہت کچھ سوچنے کو چھوڑ گئی۔ آئمہ اسد جتنی کم گو، نرم خو اور فرمانبردار تھی اریزا اسد اتنی ہی ضدی، ہٹ دھرم اور لاپروا طبیعت کی مالک تھی۔ بالآخر ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے وہ مطمئن ہو گئیں۔ بس انہیں اب اس معاملے میں اسد صاحب سے بات کرنی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کھانا گرم کروں تمہارے لیے؟" وہ جیسے ہی تھکے تھکے انداز میں گھر داخل ہوئے مما کو جاگتے پا کر حیران رہ گئے۔

"مما! آپ ابھی تک سوئیں نہیں؟"

"تم جانتے ہو جب تک تم گھر نہیں آ جاتے میرا دھیان تمہاری طرف ہی لگا رہتا ہے۔" وہ خفا خفا سی بولیں تو ڈاکٹر عائش ملک کو ان پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

"میری پیاری سی مما ناراض نظر آ رہی ہیں کیا میں وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟" لاڈ سے کہتے انہوں نے انہیں قریبی صوفے پر بٹھایا۔

"اتنا انجان بننے کی ضرورت نہیں ہے، سب کچھ جانتے ہو تم۔" انہوں نے اک برہم سی نظر ان کے پرکشش خدوخال پر ڈالتے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یہ بھرپور خفگی کا اک انداز تھا۔

ڈاکٹر عائش ملک بے ساختہ مسکرا دیے۔

"مما! آپ سب کچھ جانتی ہیں پھر کیوں ضد کر رہی ہیں؟"

"میں ضد کر رہی ہوں یا تم بے وجہ کی ضد پر اڑے ہوئے ہو۔" وہ تیزی سے بولیں۔

"میں ضد کب کر رہا ہوں بلکہ میں تو آپ کی خواہش کو پورا کرنا چاہتا ہوں۔" ان کا انداز مضبوط اور شائستہ تھا۔

"یہ ضد نہیں تو اور کیا ہے عائش! کہ لڑکی ڈاکٹر ہو اور وہ بھی ہارٹ اسپیشلسٹ۔ اب مجھے نہیں مل رہی تو میں کیا کروں۔" وہ اچھی خاصی جھنجلائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ "دو سال سے اوپر کا عرصہ ہو گیا ہے مجھے لڑکی ڈھونڈتے۔" وہ انہیں کافی تھکی تھکی سی لگیں۔

"مما! مل جائے گی۔ آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔ آپ تو ابھی سے گھبرا گئیں۔" انہوں نے نرمی سے ان کے ہاتھ تھامے تو انہوں نے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"میری بات کو غور سے سنو عائش!" ان کے انداز پر وہ بے ساختہ چونکے۔

"تم بہت من مانی کر چکے ہو اب اور نہیں۔ تم دنیا کے انوکھے مصروف انسان نہیں ہو۔ اس دور میں ہر

انسان بڑی ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شادی کرنے کے لیے وہ بڑھاپے کا انتظار کرے۔ تمہاری عمر شادی کے لیے پرفیکٹ ہے۔ مصروفیت زندگی کا ایک حصہ ہے اور یہ زندگی کے ساتھ ساتھ ہی چلتی رہتی ہے۔ میں تمہارے لیے لڑکی پسند کر چکی ہوں۔ ڈاکٹر تو نہیں ہے مگر خوب صورت بے انتہا ہے۔ جیسی بہو مجھے چاہیے بالکل ویسی ہے۔ انکار کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ اس کے بعد میں اپنی زندگی میں دوبارہ کبھی اس ٹاپک پر تم سے بات نہیں کروں گی۔" وہ سنجیدگی سے بولیں تو ڈاکٹر عائش ملک کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

"لیکن مما۔"

"میں کچھ سننا نہیں چاہتی عائش! لڑکی کی تصویر تمہارے کمرے میں ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر مجھے جواب دینا۔"

مضبوطی سے کہتے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں جبکہ عائش کتنی دیر پر سوچ انداز میں اسی صوفے پر بیٹھے رہے پھر لمبا سانس ہوا میں خارج کرتے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ مما نے کبھی اتنی سختی سے ان سے بات نہیں کی تھی۔ وہ مسلسل اسی بارے میں سوچے گئے۔ لاپروائی سے کوٹ صوفے پر پھینکا، جھنجلائے ہوئے انداز میں ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور پھر گرنے والے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئے۔

ان کی طبیعت میں ٹھہراؤ تھا۔ بہت سلجھی ہوئی شخصیت اور صاف ستھری سوچ کے مالک تھے۔ بہت ترتیب سے زندگی جینے کے عادی تھے۔ بے ترتیبی، لاپروائی اور لاابالی پن سے انہیں شدید چڑ تھی۔ ان کا کمرہ بھی ان کی شخصیت کی طرح ایک ترتیب اور سلجھاؤ کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

وہ ان لوگوں میں سے تھے جو خود سے زیادہ دوسروں کی پروا کرتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں چاہے خود کچھ بھی سہنا پڑے۔ یہ ہسپتال انہوں نے غریبوں کی مدد کے لیے بنوایا تھا۔ ان دنوں وہ آخری مراحل سے گزر رہا تھا اور اسی بیچ ہی مما ان کی شادی کے لیے حساس ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ ان کے احساسات سمجھ سکتے تھے، وہ ایک ماں تھیں اور غلط نہیں سوچ رہی تھیں۔

اچانک ہی ان کی نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑے خاکی لفافے پر پڑی تو بے ارادہ ہی انہوں نے اسے تھام لیا اور پھر اس میں سے تصویر نکال کر دیکھنے لگے۔ اچھی خاصی خوب صورت لڑکی تھی۔ مما کی تعریف غلط نہ تھی۔

تھوڑی دیر تصویر کو دیکھنے کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ وہ آج کی رات مما کو پرسکون نیند دینا چاہتے تھے۔

☼ ☼ ☼
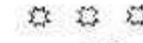
"واٹ۔۔۔ آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں" مما کی بات سن کر وہ یوں اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو یوں بھڑک رہی ہو۔" وہ ناگواری سے بولیں۔

"مگر مما! آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں ابھی شادی کروں گی۔" اسے ابھی تک اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"تمہیں شادی کے لیے کون کہہ رہا ہے۔ ابھی صرف انگیجمنٹ ہوگی۔" وہ بے نیازی سے بولیں تو اس کا پارہ چڑھنے لگا۔

"مگر میں اس انگیجمنٹ کے لیے تیار نہیں ہوں۔ مجھے کچھ بننا ہے۔" وہ بد تمیزی سے بولی۔

"بی ہیو یور سیلف اریزا! تم دن بہ دن بدتمیز ہوتی جا رہی ہو۔ اس لیے میں نے اور تمہارے پاپا نے یہ فیصلہ کیا ہے تاکہ تمہارے سر سے ایکٹرس بننے کا بھوت اتر جائے۔"

"پاپا کی مرضی بھی اس میں شامل ہے؟" اسے یقین نہ آیا۔ آج تک پاپا نے کبھی ان دونوں پر اپنی مرضی نہیں تھوپی تھی۔ یقین آتا بھی تو کیسے؟

"ہاں تمہارے پاپا کی مرضی بھی اس میں شامل ہے۔ لڑکے کو وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ لوگ شریف ہیں۔ لڑکا ہارٹ سرجن ہے۔ چھوٹی سی فیملی ہے۔ ایک لڑکا اور دوسری اس کی ماں۔ تمہیں زیادہ جھنجھٹ میں پڑنا نہیں پڑے گا۔ میں تصویر رکھ کر جا رہی ہوں۔ دیکھ لینا۔ اگر روبرو ملنا چاہو تو بھی ہمیں اعتراض نہیں۔ تمہیں ہر طرح کی آزادی دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم ہماری عزت کو سرعام نیلام کرنے کا سوچو۔" وہ حتمی انداز میں بولیں۔

"لیکن مما۔"

"بس اریزا! اس معاملے میں اب میں مزید ایک لفظ نہیں سنوں گی۔" انہوں نے سختی سے کہا اور ایک سنجیدہ نظر اس کے متذبذب چہرے پر ڈالتی باہر نکل گئیں، جبکہ وہ پریشان سی بیڈ پر ٹک گئی۔

"میں ابھی شادی کیسے کر سکتی ہوں۔ میرا ایکٹرس بننے کا خواب اس کا کیا ہوگا۔ مجھے خود اس لڑکے سے صاف بات کرنا ہوگی۔ وہ ہی اس شادی سے انکار کر دے تو اچھا ہے۔"

سوچتے ہوئے اس نے بے خیالی میں ہی تصویر پکڑ لی۔ جیسے ہی اس کی نظر تصویر پر پڑی وہ بری طرح چونکی اور پھر پلکیں جھپکائے بغیر کتنی دیر تصویر کو دیکھتی رہی۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت سے چہرے دیکھے تھے مگر اسے خود سے اقرار کرنا پڑا کہ اتنی گریس فل، رعنائی اور اتنا پرکشش چہرہ اس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔

"او مائی گاڈ۔۔۔! اتنا زبردست بندہ' پاپا نے میرے لیے۔۔۔ میرے لیے چنا۔" کچھ لمحوں کے لیے جیسے وہ سب کچھ بھول گئی۔ "جس کی شخصیت تصویر میں اتنی شان دار ہے وہ حقیقت میں کیسے دکھتے ہوں گے۔"

اس نے بے ساختہ سوچا۔ اس کا دل بہت تیز تیز دھڑک رہا تھا اور اس کی آنکھیں اس انسان کو حقیقت میں دیکھنے کے لیے بے قرار تھیں۔ اپنی بدلتی کیفیت اس کی اپنی سمجھ سے بھی بالاتر تھی۔

وہ خاموش ہو گئی۔۔۔ نہ اقرار کیا اور نہ انکار۔ مما اس کی خاموشی کو رضامندی سمجھتے ہوئے منگنی کی تیاریاں کرنے لگیں۔ کچھ وقت کے لیے ہی سہی مگر ایکٹرس بننے کا بھوت اتر چکا تھا۔ انگیجمنٹ کے فنکشن پر جب اس نے روبرو ڈاکٹر عائش ملک کو دیکھا تو پھر دیکھتی ہی رہ گئی۔ اسے اپنی خوش بختی پر مغرور ہونے میں لمحہ لگا تھا۔ بلیک سوٹ میں وہ کوئی یونانی دیوتا ہی لگ رہے تھے۔ انگیجمنٹ میں موجود سب لوگوں پر ان کی شخصیت کا سحر چھانے لگا۔ وہ ساحر جیسے ہی اریزا اسد کے قریب آکر بیٹھے اس کی ہتھیلیاں نم ہونے لگیں۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ بھی کسی سے پزل ہو سکتی ہے۔

"سنبل! ماشاء اللہ تمہارے داماد تو کروڑوں میں ایک چنا ہے۔" کسی جاننے والی نے جیسے ہی ان کے کان میں سرگوشی کی انہوں نے تفاخر سے گردن اٹھاتے ہوئے اسٹیج کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر عائش ملک کی شخصیت انہیں اریزا پر چھائی ہوئی سی لگی۔

وہ ہر طرح سے اریزا اسد سے آگے تھے اس سے زیادہ بھلا ایک ماں اور کیا چاہ سکتی ہے۔ انہوں نے بے ساختہ تشکر بھرا پرسکون سانس ہوا میں خارج کیا۔ تالیوں کی گونج میں ڈاکٹر عائش ملک نے اریزا کو انگوٹھی پہنائی تھی۔ اس سارے عمل میں اس کی نظریں ان کے ہاتھوں سے سجے سرخ و سفید ہاتھوں پر بھٹکتی رہیں۔ اسے اپنی قسمت پر رشک سا آنے لگا۔ آنے کے پیپرز ہو رہے تھے سو بہت چاہنے کے باوجود وہ نہ آسکی تھی۔ بارز عباد دل مسوس کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"کروں یا نہ کروں۔۔۔ اچھا نہیں کرتی' وہ کیا سوچیں گے۔" وہ بڑبڑائی۔ مگر پھر تھوڑی دیر کے بعد دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ان کا نمبر ملا رہی تھی۔

"ہیلو!" دلکش بھاری آواز پر اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ فون کر تو لیا تھا مگر اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کیسے کرے۔ اس نے بے ساختہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"ہیلو کون بات کر رہا ہے۔" ایئر پیس سے دوبارہ آواز ابھری تو اس نے خود کو بولنے کے لیے تیار کیا۔

"وہ وہ میں" اریزا بمشکل بولی۔

"اریزا آپ۔" ان کی آواز میں حیرانی واضح

محسوس کر سکتی تھی۔
"جی میں۔۔۔" وہ فقط یہی کہہ سکی۔ دھڑکنوں کی سرپٹ دوڑ نے اسے علیحدہ پریشان کر چھوڑا تھا اوپر سے ان کا رویہ وہ خوامخواہ جھنجلانے لگی۔
"اریزا! سب خیریت تو ہے؟" ڈاکٹر عائش ملک کے اس جملے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ اچھی خاصی تپ گئی۔ اب بھلا انہیں فون کرنے کے لیے جواز درکار تھا۔ اس کا انا کی اکڑ پن تملاتے ہوئے باہر آنے کو مچلنے لگا جسے وہ بمشکل کنٹرول کرتی سنجیدگی سے بولی۔
"میرا فون کرنا آپ کو برا لگا؟"
"نہیں۔۔۔ مگر میں حیران ضرور ہوا ہوں۔" وہ صاف گوئی سے بولے تھے۔
"اس میں حیران ہونے والی کون سی بات ہے بلکہ میں تو آپ کے فون کی منتظر تھی۔"
"اتنی بولڈنس۔۔۔" دوسری طرف وہ چند لمحوں کے لیے جیسے خاموش سے ہو گئے۔
"آپ فون پر بات کرنے کو معیوب سمجھتے ہیں؟" ان کی خاموشی کو محسوس کرتے جیسے اس نے نتیجہ اخذ کرنا چاہا۔
"نہیں۔۔۔ میں فون پر بات کرنے کو معیوب نہیں سمجھتا بلکہ ضرورت پڑنے پر روبرو ملنے کو بھی غلط نہیں سمجھتا۔" انہوں نے سچائی سے اعتراف کیا۔ اریزا اسد کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑتے گئے۔ یعنی بندہ اتنا ٹف نہیں تھا' وہ آرام سے قابو کر سکتی تھی۔
"اگر میں آپ کا ہسپتال دیکھنا چاہوں تو۔۔۔" اب وہ قدرے مطمئن انداز میں کہہ رہی تھی۔
"موسٹ ویلکم۔۔۔ مجھے خوشی ہو گی۔" اس دوران وہ پہلی بار ہلکا سا مسکرائے۔ یہ تو ان کا فیورٹ ٹاپک تھا۔
"اوکے پھر میں کل کسی ٹائم چکر لگاؤں گی۔"
"اوکے اللہ حافظ پھر کل ملاقات ہو گی۔"
ان کے کہنے پر اسے مجبوراً" رابطہ منقطع کرنا پڑا ورنہ وہ ابھی لمبی چوڑی بات کے موڈ میں تھی۔
"مغرور' گھمنڈی شخص' نجانے خود کو کیا سمجھتا ہے۔ اگر اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہ کر دیا تو میرا نام بھی اریزا اسد نہیں۔" وہ سرتاپا سلگتے ہوئے بولی تھی۔ ڈاکٹر عائش ملک کا سرسری سا انداز گفتگو اس کے تن من میں آگ لگا گیا تھا۔ نہ کوئی دلربا سی سرگوشی' نہ اس کے حسن کی قصیدہ گوئی' نہ اگلی ملاقات پر ملنے کی بے تابی۔ وہ جتنا بھی کڑھتی کم تھا۔ پہلے کب کبھی ایسا رویہ دیکھنے کو ملا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیسا لگا آپ کو میرا یہ چھوٹا سا ہسپتال؟" پورا ہسپتال دکھانے کے بعد کیبن میں آتے ہی انہوں نے شائستگی سے پوچھا۔ وہ کیا جواب دیتی اس نے صحیح طرح سے کچھ دیکھا ہوتا تو کچھ کہہ پاتی۔ وہ تو گردوپیش سے غافل ان کے وجود میں ہی گم رہی تھی۔
وہ کتنے نفیس انداز میں چلتے ہیں۔ ان کے بات کرنے کا انداز کتنا شائستہ اور دلکش ہے۔ ان کی آواز میں کتنا ٹھہراؤ اور کشش ہے۔ ان کی آنکھیں کتنی سیاہ اور روشن ہیں۔ ان کے بالوں کا اسٹائل کتنا زبردست ہے۔ ان کے سرخ و سفید چہرے پر کلین شیو کتنا سوٹ کرتا ہے' وہ جب مسکراتے ہیں تو اردگرد اک سحر سا چھوڑ دیتے ہیں۔ آج صحیح معنوں میں اسے اپنی قسمت پر رشک آیا تھا اور ممی پاپا پر ٹوٹ کر پیار۔ جنہوں نے اس نفاست و شائستگی کے دیوتا کو اس کے لیے چنا۔
"کس سوچ میں گم ہیں؟" اس کی بے توجہی پر انہوں نے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ تو وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔
"آپ کی اسمائل بہت خوب صورت ہے عائش مگر آپ اتنی کم اسمائل کیوں پاس کرتے ہیں۔" کہنا کچھ چاہتی تھی مگر کہہ وہ گئی جو سوچ رہی تھی۔
وہ بری طرح چونکے اور پھر لب بھینچنے میں لمحہ لگایا ان کے بے حد سپاٹ اور سنجیدہ چہرے نے جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس دلایا۔ وہ خجل سی مسکرا دی۔
"بہت خوب صورت ہسپتال ہے آپ کا۔" فضا کے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر پھر عائش کے ہونٹوں پر بھولے سے بھی مسکراہٹ نہ آ سکی۔ انہیں

عورتوں کی بے باکی پسند نہ تھی مگر وہ یہ اریزا اسد کو کیسے بتاتے۔
"کیا لیں گی آپ۔۔۔؟" کافی دیر کے بعد وہ بولے تھے۔
"جو آپ کھلانا چاہیں۔" اس کی نظروں کی بے اختیاری انہیں کافی ناگوار گزر رہی تھی۔
"آپ کا کیبن بہت خوب صورت ہے۔۔۔ بالکل آپ کی طرح۔" اگلا جملہ اس نے دل میں ادا کیا۔ وہ انہیں کس حد تک سمجھنے لگی تھی مگر اس دل کا کیا کرتی جو انہیں دیکھتے ہی بے قابو ہونے لگتا۔
"تھینک یو۔ یہ تو میری چھوٹی سسٹر ڈاکٹر ہے۔" وہ جو انٹر کام پر بات کر رہے تھے بے ساختہ چونکتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔
"پاپا کو ڈاکٹر بہت پسند ہیں۔ وہ مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے مگر میں نے انکار کر دیا۔ اتنی ٹف اسٹڈی سے تو میرے چہرے کی ساری فریشنس خراب ہو جاتی مگر آئمہ سدا کی پاپا کی فرماں بردار بیٹی۔ پاپا کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے جت گئی۔ اب ہارٹ اسپیشلائزیشن کے لیے فارن گئی ہوئی ہے۔"
عائش بری طرح ٹھٹکے۔ اندر عجیب سی خواہش نے انگڑائی لی مگر نظرانداز کرتے ہوئے انہوں نے بے ساختہ سر جھٹکا۔
"آپ کو ڈاکٹرز کیوں نہیں پسند؟"
"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ مجھے ڈاکٹر پسند نہیں۔ اگر مجھے ڈاکٹرز ناپسند ہوتے تو آج میں آپ کے روبرو بھی نہ بیٹھی ہوتی۔ مجھے اتنی ٹف اسٹڈی کوفت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اسی لیے تو میں نے فائن آرٹس رکھی تھی۔"
وہ اپنی جگہ پہ پہلو بدل کر رہ گئے۔
رات وہ مما سے کہہ رہے تھے۔
"مما! آپ جانتی ہیں کہ اریزا کی چھوٹی سسٹر اسپیشلائزیشن کے لیے فارن گئی ہوئی ہے۔"
"ہاں۔۔۔ تو؟" ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔
"تو یہ کہ آپ میری خواہش کو اچھی طرح جانتی تھیں۔" انہوں نے خواہش پر قدرے زور دیا۔ اک جھماکا ہوا تھا اور مما کو سب یاد آ گیا۔
"مجھے بھی انگیجمنٹ کے بعد معلوم ہوا تھا' اور ویسے بھی ہم نے کون سا اسے دیکھ رکھا ہے نجانے کیسی شکل و صورت کی ہو گی جبکہ اپنی اریزا تو ماشاءاللہ لاکھوں میں ایک ہے۔ تمہارے لیے لڑکی تلاش کرنے کے لیے میں بہت تھکی ہوں۔ تمہارے جوڑ کی لڑکی کا ملنا تو جیسے ناممکن تھا مگر اب اللہ کا شکر ہے کہ جوڑی تو اچھی بنی کوئی انگلی تو نہیں اٹھائے گا۔"
وہ تفاخر سے بولیں تو عائش ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

آئمہ کے لوٹنے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ فون پر اس سے بات کرنے کے بعد شکیل بیگم نے اریزا کی شادی کی تاریخ طے کر دی۔ اسی دوران اریزا اسد کو ایک فلم کی آفر ہوئی۔
اس کی دوست آزلہ کے انکل ڈائریکٹر تھے۔ آزلہ کے گھر پر ہی اس کی ملاقات ان سے ہوئی تھی۔ اتنی بڑی آفر پر وہ تو ہواؤں میں اڑنے لگی۔ اسے اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہ آیا۔ اس کے خوابوں کی تعبیر کا وقت آ گیا تھا۔ مما سے تو بات کرنا ہی فضول تھا سو اس نے عائش سے روبرو بات کرنے کا سوچا۔ اپنی خوشی میں وہ یہ بات بھی بھول گئی کہ شادی میں کتنے کم دن رہ گئے ہیں۔
وہ ان کے روبرو بیٹھی کتنی دیر سے لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی اور ڈاکٹر عائش ملک پریشانی سے اس کے متذبذب چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔
"اریزا! سب ٹھیک تو ہے؟" خاموشی جب طویل ہو گئی تو وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکے۔ اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔
"مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے عائش!" انگلیوں کو مروڑتے ہوئے وہ بولی۔
"ہاں کہو میں سن رہا ہوں۔" وہ ہمہ تن گوش ہوئے

اور ساتھ حیران بھی کہ آخر ایسی کیا بات تھی کہ اس جیسی بولڈ لڑکی کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔

"میں گھر کی چار دیواری میں گھٹ گھٹ کر مرنا نہیں چاہتی عائش! کچھ بننا چاہتی ہوں۔ شروع سے ہی مجھے ایکٹریس بننے کا شوق تھا مگر ممایاپا میری اس خواہش کے سخت خلاف تھے۔"

ڈاکٹر عائش ملک کے ماتھے پر ناگواری کی سلوٹیں ابھرنے لگیں۔ چہرا ایک تناؤ کی گرفت میں آنے لگا مگر وہ اس سے بے خبر اپنی ہی کہے گئی۔

"آج مجھے ایک فلم کی آفر ہوئی ہے۔ میں کسی صورت اس فلم کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔ ممایاپا سے بات کرنی ہی فضول ہے۔ اسی لیے میں نے آپ سے بات کرنے کے بارے میں سوچا پلیز آپ تو مجھے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ایسا گولڈن چانس ہر کسی کو نہیں ملتا اور میں کسی صورت اسے مس کرنا نہیں چاہتی پلیز آپ ....."

"آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟" وہ جو دانتوں پر دانت جمائے سنجیدگی کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے اس کی ناقابل برداشت گفتگو سن رہے تھے۔ اس کی بات کاٹ کر بولے۔

"صرف اتنا کہ آپ مجھے پرمیشن دے دیں۔ میں شادی کے بعد یہ فلم کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ بہت روانی سے بولی تھی۔ ڈاکٹر عائش ملک کے چہرے کے عضلات کا تناؤ بڑھنے لگا۔ لب بھینچے وہ کتنی دیر اس کی طرف دیکھتے رہے۔

"اگر میں پرمیشن نہ دوں تو..... میری سوچ بھی آپ کے ممایاپا سے مختلف ہرگز نہیں ہے۔" غصے پر قابو پانے کے باوجود ان کے لہجے کی ٹھنڈک نے اریزا کو بے ساختہ چونکنے پر مجبور کیا تھا۔

"آخر اس میں برائی کیا ہے عائش؟"

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس میں اچھائی کیا ہے؟" وہ دوبدو بولے۔

اریزا اسد نے بھرائی ہوئی آنکھوں سے ان کے سرد انداز کو دیکھا اور پھر بھاگتے ہوئے کیبن سے باہر آ گئی۔ جبکہ ڈاکٹر عائش ملک نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

☼ ☼ ☼

جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ آئمہ اسد جیسے ہی ایئرپورٹ کے احاطے میں داخل ہوئی بارز عباد کو تیزی سے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے بھی اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ ایک دوسرے کے روبرو آ کھڑے ہوئے۔ ایسا لگا جیسے ایک دوسرے کو صدیوں بعد دیکھ رہے ہوں۔

پھر بہت آہستہ سے بارز نے اس کا ہاتھ تھاما اور پارکنگ میں کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ آئمہ کے پورے وجود کی جان جیسے اپنے ہاتھ میں آن سمائی۔ کتنا مس کیا تھا اس نے اس لمس کو کتنی بار اسے اس کی یاد نے کمزور کیا تھا مگر وہ ڈٹی رہی اپنے فیصلے پر صرف پاپا کی خاطر۔

"مجھے لگتا ہے کہ آج میں ڈرائیو نہیں کر پاؤں گا۔" وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا۔

"کیوں.....؟" وہ حیران ہوئی۔

"یہ تم خود سے پوچھو۔" براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا گیا۔ جہاں اسے اپنا عکس واضح اور شفاف دکھائی دیا۔ اس کی پلکیں لرزی تھیں اور پھر انہیں گلابی عارضوں پر سایہ فگن ہونے میں لمحہ لگا۔

یقیناً" وہ اس کی بے خودی پر دلفریب چوٹ کر رہا تھا۔ بارز عباد نے بہت دلچسپی سے اس دلفریب منظر کو دیکھا۔

اتنا عرصہ امریکہ میں گزارنے کے باوجود بھی وہ ویسی کی ویسی تھی۔ بارز نے مسکراتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☼ ☼ ☼

"واؤ..... عائش بھائی کا گھر تو بہت زبردست ہے۔" شاندار کھڑی عمارت پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اس نے بے ساختہ تعریف کی۔ بارز عباد اسے گیٹ پر اتار کر جا چکا تھا۔ وہ ستائشی نظروں سے دیکھتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

ماہ پارہ بیگم فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ اتنی خوب صورت لڑکی کو پر اعتماد قدموں سے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ بات مختصر کرتے ہوئے انہوں نے استفہامیہ نظروں سے اس من موہنی صورت کو دیکھا۔

"السلام علیکم آنٹی!" انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر آئمہ مسکراتے ہوئے ان کے قریب آئی۔ وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اتنی خوب صورتی، اتنی معصومیت، اتنی نزاکت جیسے وہ پلک جھپکنا تک بھول گئیں۔ انہیں خود سے اقرار کرنا ہی پڑا کہ اتنی دلکش کم سے کم انہوں نے اپنی زندگی میں نہ دیکھی تھی۔

"میں آئمہ اسد ہوں آنٹی جی..... اریزا آپی کی چھوٹی سسٹر۔" ان کی اندرونی کیفیت سے بے خبر اس نے خود ہی تعارف کا مرحلہ نبھایا۔ وہ بری طرح چونکیں اور پھر جیسے دم بخود رہ گئیں۔

"کیا ہوا آنٹی جی.....؟" انہیں حیرت زدہ دیکھ کر وہ پوچھ رہی تھی۔

"کچھ نہیں....." وہ بمشکل مسکرائیں۔ "آؤ بیٹھو۔" اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے انہوں نے قریب ہی بٹھا لیا۔ اس کے ہاتھ کی نرمی کو ان کی انگلیاں بھرپور انداز سے محسوس کر رہی تھیں۔

"آنٹی جی! عائش بھائی کہاں ہیں؟" ارد گرد دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ایکچوئلی میں آپ سے اور عائش بھائی سے ملنے آئی تھی۔" اس نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں بیٹا! مگر تمہارے عائش بھائی کے آنے میں ابھی تھوڑا وقت ہے۔" ان کی نظریں ابھی بھی اس کے چہرے پر پھسل رہی تھیں۔

"کوئی بات نہیں تب تک میں آپ سے باتیں کرتی ہوں۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں مسکرائی۔

ماہ پارہ بیگم کو لگا کہ عائش کی شادی میں وہ بہت جلد بازی سے کام لے چکی ہیں۔

"میں تمہارے لیے کچھ لے کر آتی ہوں۔" وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آنٹی! کیا آپ مجھے اپنا گھر دکھائیں گی؟" چائے پینے کے بعد اس نے کہا تو وہ مسکراتے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"یہ عائش کا کمرہ ہے۔" سارا گھر دکھانے کے بعد وہ اسے عائش کے کمرے میں لے آئیں۔ "تم اندر چلو میں ملازمہ کو لنچ کے بارے میں بتا کر ابھی آتی ہوں۔" وہ آہستہ سے سر اثبات میں ہلاتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

"واؤ..... زبردست۔" کمرے کی ایک ایک چیز کو اس نے سراہتی نظروں سے دیکھا پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ڈاکٹر عائش ملک کی لارج تصویر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ تصویر کو غور سے دیکھنے کے بعد اسے اپنی بہن کی قسمت پر رشک آیا۔ اسی وقت ڈاکٹر عائش ملک کمرے میں داخل ہوئے۔ انجان لڑکی کو اپنے کمرے میں اپنی تصویر کے روبرو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ دبیز قالین کی وجہ سے آہٹ نہیں ہوئی تھی اسی لیے ان کی موجودگی سے بے خبر آئمہ تصویر کو بغور دیکھتی رہی۔ آخر انہیں گلا کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلانا پڑا وہ چونکی پھر یکلخت پلٹی..... اور ڈاکٹر عائش ملک جیسے سب بھول گئے۔ دل کی رفتار ایک دم تیز ہوئی سارا وجود جیسے عجیب سی تبدیلی کی گرفت میں آنے لگا۔

کچھ تھا کچھ پہلے سے مختلف 'الگ' کچھ انوکھا جسے وہ سمجھ نہیں پائے۔ نظروں کو یہ چہرہ بہت اپنا بہت مانوس لگا۔

"ارے عائش بھائی آپ.....!" وہ مسکرائی۔ "میں آئمہ اسد ہوں اریزا کی چھوٹی سسٹر۔"

وہ کیا کہہ رہی تھی چند انچ کے فاصلے کے باوجود وہ سن نہیں پائے۔

"عائش بھائی آر یو اوکے؟" ان کے ساکت وجود کے سامنے اس نے ہاتھ لہرایا۔ وہ چونکے وہ ایسی دنیا سے واپس لوٹے تھے جس کے وہ کبھی باسی نہ تھے۔

"ارے عائش بیٹا! تم آگئے۔" اسی وقت مما کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے خالی خالی نظروں سے مما کی طرف دیکھا اور پھر بیگ اور کوٹ صوفے پر رکھتے ہوئے خاموشی سے واش روم میں گھس گئے۔ بہت کوشش کے باوجود بھی وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو نارمل نہیں کرپائے تھے۔ آئمہ اسد ہکا بکا ان کے ردعمل کے بارے میں سوچتی ہی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ صبح بیڈ سے اٹھتے ہوئے وہ لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں آ کھڑے ہوئے۔ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے جیسے وہ اپنے اندر نئی توانائی بھر رہے تھے۔ اپنی کل کی حالت پر وہ ابھی تک حیران تھے۔ آئمہ اسد کو اپنے روبرو دیکھ کر ایک عجیب سی یاسیت اور خالی پن انہیں اپنے اندر محسوس ہونے لگا تھا۔ انہیں ایسے محسوس ہوا کہ ان کی بہت پیاری چیز ایک عرصہ گم رہنے کے بعد جیسے ایک دم ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی ہو۔ کچھ کمی تھی جس کا انہیں شدت سے احساس ہوا۔ وہ بہت نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ دوسروں سے بات کرتے تہذیب اور شائستگی کا دامن ہرگز نہ چھوڑتے اپنے سلجھے ہوئے بھاؤ کی وجہ سے وہ ہر دلعزیز تھے مگر آئمہ اسد کے سامنے آتے ہی جیسے ان کے پاس الفاظ ختم ہو گئے۔

"آخر یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟" اپنے دل کی تیز تیز دھڑکتی دھڑکن انہیں عجیب سی الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس طرح پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ کیا سوچتی ہوگی میرے بارے میں کہ میں کتنا ال مینرڈ ہوں وہ مجھ سے ملنے آئی اور میں نے اس سے بات تک نہ کی۔ مما بھی مجھ سے شکایت کر رہی تھیں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ان کے تخیل میں اس کا حیران چہرہ ابھرا تو وہ اچھے خاصے جھنجلا کر رہ گئے۔ دل نے ایک دفعہ پھر سے تیز دھڑکنا شروع کر دیا۔ انہوں نے بے بسی کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

آنکھیں موندتے ہی اک دلنشیں سراپا چھم سے تصور میں آ کھڑا ہوا۔ بہت تیزی سے انہوں نے آنکھیں کھول لی تھیں۔

"تو کیا اس تیز ہوتی دھڑکن کا تعلق آئمہ سے ہے۔" جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے بڑبڑائے اور پھر انہیں اپنے ہر سوال کا جواب ملتا گیا۔ "پہلی نظر کی محبت۔۔۔"

ہاں ڈاکٹر عائش ملک کو 32 سال کی عمر میں آئمہ اسد سے پہلی نظر کی محبت ہو چکی تھی۔

"او مائی گاڈ۔۔۔!" یہ ادراک کوئی بہت خوش کن نہ تھا۔ انہوں نے اپنا سر سامنے پڑی گلاس ٹیبل پر ٹکا دیا۔

☼ ☼ ☼

"آپی! عائش بھائی کچھ مغرور سے نہیں؟" رات وہ اریزا کے کمرے میں بیٹھی کہہ رہی تھی۔

"نہیں تو مگر تمہیں کیسے لگا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"بس مجھے وہ کچھ سڑیل اور مغرور سے لگے۔" وہ انتہائی صاف گو واقع ہوئی تھی۔ اس وقت بھی لگی لپٹی رکھے بغیر بولی۔ اس کے کمنٹس پر اریزا کافی الجھ گئی۔

"ٹھیک ہے اگر بندہ قابل اور انتہا کا ڈیشنگ ہو تو غرور آ ہی جاتا ہے۔ مگر دوسرے کو کسی خاطر میں نہ لانا یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ڈاکٹر عائش ملک کے رویے نے اسے اچھا خاصا دلبرداشتہ کیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ ایسے تو بالکل نہیں۔ ہاں ذرا کم گو ہیں۔" اریزا کو اس کی باتوں پر یقین نہ آیا۔ اس لیے دفاعی انداز میں بولی۔

"کم گو تو نہ کہیں گونگے کہیں۔ قسم سے اتنی خوشی خوشی گئی تھی مگر انہوں نے میرے ساتھ کسی قسم کی کوئی بات ہی نہ کی۔" وہ دل کی بات کبھی دل میں نہیں رکھتی تھی اس دفعہ بھی بھرپور سچائی سے بولی۔ اریزا اٹھ سی گئی اور پرسوچ نظروں سے کتنی دیر اس کی طرف دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر عائش ملک بہت تیزی سے پورچ کی طرف بڑھ رہے تھے جب نہ جانے کس احساس کے زیر اثر وہ ایک دم رکے اور پھر تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی نہ تھا۔ اک مانوس سی کیفیت کے زیر اثر ایک دفعہ پھر سے ارد گرد دیکھنے لگے۔ "کچھ تھا" کچھ ایسا جسے وہ پہلے بھی پوری شدت سے محسوس کر چکے تھے مگر کیا؟ نہیں وہ الجھ کر رہ گئے۔ اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے ابھی وہ آگے قدم بڑھانا ہی چاہتے تھے جب دائیں طرف پھولوں کی باڑ میں انہوں نے آئمہ اسد کو کھڑے پایا۔

"اف۔۔۔ تو یہ وجہ تھی کہ دل کے بے قابو ہونے کی۔" ہوا میں پر درد لمبا سانس خارج کرتے ہوئے وہ بے اختیار ہی اس کی طرف بڑھتے گئے۔

وہ کانٹوں میں الجھا اپنا دوپٹہ چھڑانے میں اتنی مگن تھی کہ ان کی موجودگی کو محسوس ہی نہ کر سکی۔ سی ایک نوکیلا کانٹا جیسے اس کی انگلی میں چبھ گیا۔

عائش نے تیزی سے اس کا ہاتھ اپنی طرف کھینچا تھا۔ وہ بوکھلاتے ہوئے پلٹی۔

"یہ کیا حرکت ہے آئمہ! اس طرح دوپٹہ چھڑایا جاتا ہے۔" نرمی سے ڈپٹتے انہوں نے اس کی انگلی کو بغور دیکھا جس سے خون کا ننھا سا قطرہ نکل آیا تھا۔ جیب سے رومال نکال کر انہوں نے انگلی پر رکھا اور پھر احتیاط سے دوپٹہ چھڑانے لگے۔ اس سارے عمل کے دوران آئمہ اسد حیران حیران سی ان کی طرف دیکھتی رہی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟" ان کی نظر جیسے ہی اس کے متعجب چہرے پر پڑی تو پوچھے بغیر نہ رہ سکے۔

"نہیں کچھ نہیں۔" وہ آہستہ سے سر نفی میں ہلا گئی۔

"کب آئیں آپ۔۔۔؟" انہوں نے نرمی و اپنائیت سے پوچھا۔ آئمہ کو حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا مگر پھر خود کو سنبھالتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ممانے آنٹی کے لیے کچھ چیزیں بھیجی ہیں وہی دینے آئی تھی مگر پھر نظر جیسے ہی اتنے خوب صورت پھولوں پر پڑی تو میں ان کے پاس آنے سے خود کو روک نہیں پائی اور پھر نجانے کیسے میرا دوپٹہ کانٹوں میں الجھ گیا۔" ان کی اپنائیت پر اسے اتنی خوشی ہوئی کہ بے وجہ ہی تفصیل بتالی گئی۔

"چلیں پھر اندر۔" سر اثبات میں ہلاتے ہوئے وہ اندر کی طرف بڑھ گئے۔ تو وہ بھی حیران حیران سی ان کے پیچھے ہولی۔

"یہ ویسے تو بالکل بھی نہیں جیسا تاثر انہوں نے پہلی ملاقات میں چھوڑا تھا۔" اس نے بے ساختہ سوچا۔

"کس ہسپتال کو جوائن کر رہی ہیں آپ؟" انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھے آدھا گھنٹے سے اوپر ہو چکا تھا۔ جب انہوں نے شائستگی سے استفسار کیا۔ ماپارہ بیگم ابھی ابھی اٹھ کر کچن میں گئی تھیں۔

"ابھی تک تو نہیں سوچا آپی کی شادی کے بعد کوئی فیصلہ کرپاؤں گی ہو سکتا ہے آپ کا ہسپتال جوائن کر لوں۔" بہت ہلکے پھلکے انداز میں اس نے اپنا ارادہ بتایا۔

انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں آپ کا ہسپتال دیکھنا چاہتی ہوں کیا آپ دکھانا چاہیں گے؟"

"شیور وائے ناٹ۔۔۔ آپ جب مرضی آجائیے گا۔" وہ نرمی سے بولے۔

"تھینک یو عائش بھائی! میں ایک دو دن میں چکر لگاؤں گی اور ساتھ اپنے ڈاکومنٹس بھی لیتی آؤں گی۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا اور اس عرصے میں یہ پہلی مسکراہٹ تھی۔ جسے آئمہ اسد نے بہت توجہ سے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اریزا! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی" اتنا اچھا چانس مس کر رہی ہو۔ جانتی ہو ایسا گولڈن چانس سب

کو نہیں ملتا۔"

"مگر میں بھی کیا کروں آزلہ! مجھے پرمیشن ہی نہیں مل رہی۔ پہلے مما پاپا خلاف تھے اور اب تو عائش نے بھی اجازت نہیں دی۔" وہ آزردگی سے بولی۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی، تم جیسی لڑکیاں اسی قابل ہوتی ہیں کہ چار دیواری میں گھٹ گھٹ کر جئیں۔ میں نے بے وجہ ہی اپنے انکل کے سامنے تمہاری فیور کی۔ اب جبکہ وہ تمہیں اپنی فلم میں اے ہیروئن کاسٹ کرنے پر ایگری ہیں تو تم بے وقوفی کر رہی ہو۔ تم نے تو میری بات کا بھی بھرم نہیں رکھا۔" وہ برہم سی اٹھ کھڑی ہوئی، جب اس نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"پلیز آزلہ! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم سمجھنے کی کوشش کرو بے وقوف لڑکی! ایسا چانس سب کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ یہ سنہری موقع تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دے گا۔ لاکھوں فین ہوں گے تمہارے۔ تم سے بات کرنے کے لیے لوگ ترسیں گے مگر تم۔۔۔ تمہیں میری بات کہاں سمجھ میں آئے گی۔ تم اپنے مایوں کی تیاری کرو۔"

پھر وہ دروازہ کھول کر باہر کی طرف بڑھ گئی۔

کب کے رکے آنسو راستہ پاتے ہی اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ ایک طرف اس کا کیریئر تھا اور دوسری طرف اس کی محبت دونوں کا ہی اس کی زندگی میں ہونا بہت ضروری تھا۔ پھر آخر وہ کرتی تو کیا کرتی۔

☼ ☼ ☼

"واؤ زبردست، بہت شاندار ہسپتال ہے۔ ریکلی آئی ایم سو پیچ امپریسڈ۔ غریبوں کے لیے بہت بڑی نیکی ہے۔" پورے ہسپتال کا راؤنڈ لگانے کے بعد وہ کیبن میں آتے ہی پرجوش انداز میں بولی۔

عائش دھیرے سے مسکرا دیے۔ بہت سے لوگوں نے انہیں سراہا تھا، ان کی حوصلہ افزائی کی تھی مگر نجانے کیوں آئمہ اسد کے منہ سے اپنے لیے تعریفی کلمات سن کر ان کے اندر نئی توانائی بھر گئی۔

"مجھے اس ہسپتال میں آپ جیسے جینئس بندے کے ساتھ کام کر کے خوشی ہوگی یہ میرے ڈاکومنٹس۔" ساتھ ہی اس نے اپنے ڈاکومنٹس کی فائل ان کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی۔

ڈاکٹر عائش ملک نے فائل اٹھا کر دیکھی۔ ان کے اندر حسرت کے سائے میں بیٹھا زخمی پرندہ ایک دفعہ پھر سے پھڑپھڑانے لگا۔ اتنا شاندار تعلیمی ریکارڈ، یہ چھوٹی سی لڑکی انہیں قدم قدم پر حیران کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

انہوں نے آہستہ سے نظریں ہٹاتے ایک نظر اس کے دھان پان سے وجود کو دیکھا اور پھر اپنے اندر جھانکنے لگے۔ انہیں عجیب سا فخر ہوا کہ انہیں کسی عام سی لڑکی سے محبت نہیں ہوئی تھی۔ آئمہ اسد بہت خاص تھی اور اس لمحے ان پر یہ اچھی طرح آشکار ہو چکا تھا۔ وہ یک لخت خاموش سے ہو گئے۔

ڈاکومنٹس کی فائل کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ اپنی قسمت سے جیسے شاکی ہوئے۔

"کیا ہوا کیا مجھے جاب نہیں ملے گی؟" ان کی خاموشی پر وہ متعجب سی بولی۔ وہ بمشکل مسکرائے۔

"مجھے بھی آپ جیسے ٹیلنٹڈ لوگوں کی بہت ضرورت ہے۔" وہ کافی دیر بعد بولے۔

"اوہ۔۔۔!" وہ کھل کر ہنسی۔ "میں تو ڈر ہی گئی تھی!" وہ جیسے ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی۔

ڈاکٹر عائش ملک اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گئے۔ جس سے ہم محبت کرتے ہیں اسے ہم بہت خاص دیکھنا چاہتے ہیں اور جب وہ خاص ہو تو پھر آپ کو اپنی محبت پر فخر ہونے لگتا ہے مگر جس لمحے آپ پر یہ ادراک ہو کہ یہ خاص بندہ آپ کی قسمت میں نہیں تو اس وقت ویسی ہی اداسیاں اندر ڈیرا ڈالنے لگتی ہیں جیسی اس وقت ڈاکٹر عائش ملک کے اندر ڈیرا جما چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

لڑکے والے مہندی لے کر آ چکے تھے۔ مہندی کا فنکشن کمبائن ارینج کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر عائش ملک وائٹ شلوار پر بلیو کلر کی جدید طرز کی قمیص پہنے کچھ افسردہ سے سب کی نظروں کا مرکز تھے۔ اسد صاحب نے گھر کے وسیع لان میں فنکشن ارینج کیا تھا۔ ڈیکوریشن اتنی شاندار تھی کہ اکثر آنکھیں پلکیں جھپکنا بھول گئیں۔

وہ بہت تیزی سے لان کی طرف بڑھ رہی تھی جب اسٹور روم کے قریب سے گزرتے کسی نے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے اندر کھینچ لیا۔

نیلی آنکھوں نے جب شدید خوف کے عالم میں سامنے دیکھا تو اندر تک مطمئن ہوتے ہوئے اس نے ہونٹوں پر دھرا ہاتھ ہٹایا اور اپنی سانسوں کو ہموار کرنے لگی جو چند لمحوں میں ہی بے ربط ہو گئی تھیں۔

"آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

اب وہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔ جبکہ مقابل مبہوت سا یک ٹک اس کے اک اک نقش کو آنکھوں کے رستے دل میں اتار رہا تھا۔

"بارز! میں نروس ہو رہی ہوں۔" اسے عجیب سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ دیوار کے ساتھ جڑی کھڑی تھی اور بارز عباد اس کے دائیں بائیں ہاتھ جمائے یقیناً اس کا نرم و نازک سا وجود خود میں جذب کر لینے کا متمنی تھا۔

"کیا ہوا ہے آپ کو۔۔۔ آخر ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟" اس کی نظروں کا انوکھا اور نکھارا سے خوامخواہ پزل کر رہا تھا۔

"یہ اپنے ہوش اڑانے والے روپ سے پوچھو۔ کیا ضرورت تھی اتنا سجنے سنورنے کی۔ پہلے کیا کم کمال کرتی تھیں اب اتنے ہتھیاروں سے لیس کیا میری جان لینے کا ارادہ ہے۔ کیا تم نے آئینہ دیکھا ہے اور اگر دیکھا ہے تو پھر مجھ سے یہ سوال کیوں؟"

میٹھی میٹھی بے خود سرگوشیاں تھیں جو وہ اس کے دیوانہ کر دینے والے حسن پر نچھاور کر رہا تھا۔

"میں تایا ابو سے بات کر چکا ہوں مجھے نہیں لگتا کہ اب میں مزید تم سے دور رہ سکتا ہوں۔" بہت والہانہ سرگوشی تھی جو اس کی سماعتوں میں انڈیلی گئی۔ پل کی پل اس نے نظریں اٹھائیں تھیں مگر اسے لگا کہ ان آنکھوں کی تاب لانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

"پلیز بارز۔۔۔" نیلی آنکھوں نے پلکوں کی جھلمل اٹھاتے جیسے التجا کی اور پھر بارز عباد نے اپنی معصوم شرارت کو ان پاگل کر دینے والی آنکھوں پر قربان کر دیا۔ لمبا سانس ہوا میں چھوڑتے ہوئے اس نے ہاتھ ہٹا لیے۔

"ٹھہرو آئمہ!" بہت تیزی سے وہ مڑی تھی جب اس نے اس کی کلائی تھامی۔ "یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔"

جیب سے گجرے نکال کر اس نے ہتھیلی پر رکھے۔ آئمہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"اوں۔۔۔ ہوں۔ میں خود پہناؤں گا۔" اس نے جیسے ہی گجرے تھامنے چاہے تو اس نے روک دیا اور پھر اس کی دونوں کلائیوں میں گجرے پہناتے جیسے وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر عائش ملک کتنی دیر سے آنکھیں موندے اپنے کیبن سے ملحق پرسنل روم میں صوفے پر لیٹے ہوئے تھے آج ان کی شادی تھی۔ مما کے کئی فون آ چکے تھے۔

"میں مصروف ہوں۔" ہر بار وہ یہ بہانہ بنا کر جان چھڑا لیتے۔ لیکن آخر کب تک۔

"میں یہ شادی کر بھی لوں تو ساری زندگی خوش نہیں رہ سکتا۔" نظروں میں بار بار آئمہ اسد کا سجا سنورا روپ آ کر انہیں بے چین کر رہا تھا۔ وہ بہت نیئر انسان تھے اور کسی کو دھوکا دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"آخر کیوں ہوا میرے ساتھ ایسا۔ کتنی پرسکون زندگی جی رہا تھا میں اور کیا یہ اریزہ کے ساتھ ناانصافی نہیں۔ کیسے میں اسے دھوکے میں رکھ کر نئی زندگی کی شروعات کر پاؤں گا۔" کنپٹیوں کو دباتے ہوئے وہ اذیت سے بڑبڑائے۔

کل رات جب آئمہ اسد ان کے قریب آکر بیٹھی تو انہیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ وہ اسے کھو کر بھی نہیں پائیں گے۔

"کیوں۔۔۔ کیوں ہوا میرے ساتھ ایسا میں محبت سے بے خبر تھا۔ میری زندگی کا مقصد کچھ اور تھا اور جو بہت نیک تھا۔ پھر یہ اذیت مسلسل میرا نصیب کیوں بن گئی۔ میں زندگی میں انسانوں کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں مگر اس روگ کو وجود میں چھپا کر ایک ٹوٹا بکھرا انسان آخر کیا کر سکتا ہے۔ اے اللہ یا میری محبت مجھے حاصل ہو جائے یا اس کا خیال میرے دل سے نکل دے۔" انہوں نے یک لخت سرخ انگارہ آنکھیں کھولیں اور پھر پر درد سی ہنسی ہنس دیے۔ جب ایک دفعہ پھر سے ان کا سیل فون بجا "مما کالنگ" تنی دیر وہ موبائل کی اسکرین کو دیکھتے رہے بیل مسلسل بجتی رہی۔ بالآخر آن کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مما! میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

وہ سوگواری میں بھی دولہا بنے غضب ڈھا رہے تھے۔ بہت سی ستائشی نظریں کئی دفعہ ان کی ڈھنگ پر ستائش کو سراہ چکی تھیں۔ گھر سے نکلتے وقت انہوں نے شدت سے دعا کی تھی کہ آج کم از کم ان کا سامنا کسی صورت آئمہ اسد سے نہ ہو۔

☼ ☼ ☼

"اوہو آپی! آپ ابھی تک پارلر نہیں گئیں۔" دونوں کلائیوں میں چوڑیاں بھرتے ہوئے وہ متفکر سی گویا ہوئی۔ پارلر والی کو گھر بلانے سے اریزا نے منع کر دیا تھا۔ جو مما کے ساتھ ساتھ اس کے لیے بھی حیرت کا باعث تھا۔

"چلی جاتی ہوں۔" سرسری سی نظر اس کے دمکتے روپ پر ڈال کر وہ واش روم میں گھس گئی۔ اسی وقت مما کمرے میں داخل ہوئیں۔

"آئمہ! تم ایسا کرو بارز سے کہو گاڑی نکالے اور اریزا کو پارلر لے جائے اور تم ہوٹل پہنچنے کی تیاری کرو۔ بارات ہوٹل پہنچنے ہی والی ہے۔" وہ مصروف سے انداز میں کہتی پلٹ گئیں۔

اریزا کو پارلر چھوڑ کر وہ ابھی گاڑی میں آکر بیٹھا ہی تھا جب اس کے موبائل پر اس کے دوست ماجد کی کال آئی۔

"ہاں کہو ماجد، کیسے ہو؟ کیا۔۔۔ کب۔۔۔ کیسے؟"

ماجد کی بات سن کر وہ اچھا خاصا پریشان ہو گیا تھا۔

"بس یار! تم فکر نہ کرو میں دس منٹ میں پہنچتا ہوں۔" فون بند کرتے اس نے آئمہ اسد کا نمبر ڈائل کیا۔

"آئمہ! ڈرائیور سے کہنا کہ وہ اریزا کو پارلر سے لے جائے۔ مجھے ایمرجنسی میں کہیں جانا پڑ رہا ہے۔ وہ سب میں تمہیں لوٹ کر بتاؤں گا۔ پلیز اگر مجھے لوٹنے میں دیر ہو جائے تو سب سنبھال لینا۔"

فون آف کر کے اس نے ڈیش بورڈ پر پھینکا اور گاڑی کو فل اسپیڈ میں سڑک پر چھوڑ دیا۔

☼ ☼ ☼

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" اسے ڈرائیور کی بات پر کسی صورت یقین نہ آیا۔

"جی چھوٹی بی بی! میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ میں جب وہاں پہنچا تو اریزا بی بی بہت پہلے ہی وہاں سے نکل چکی تھیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ تیزی سے مما کی طرف دوڑی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو آئمہ تم۔"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں مما اریزا آپی پارلر میں نہیں ہیں۔"

"پھر پھر کہاں گئی؟" بڑبڑاتے ہوئے وہ پارلر کا نمبر ڈائل کرنے لگیں مگر پھر جو کچھ انہیں سننے کو ملا وہ ان کے قدموں تلے سے زمین کھینچنے کے لیے کافی تھا۔

"آئمہ! اپنے پاپا کو بلاؤ۔" موبائل آف کرتے وہ پریشانی سے بولیں۔

"مما سب ٹھیک تو ہے نا!" مما کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں اسے کسی انہونی کی طرف اشارہ کرتی محسوس ہوئیں۔

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے آئمہ! تم اپنے پاپا کو بلا کر لاؤ۔" وہ جیسے صوفے پر ڈھے سی گئیں۔

آئمہ تیزی سے باہر کی طرف دوڑی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو منتشل!"

"میں سچ کہہ رہی ہوں اسد! جب بارز نے اریزا کو پارلر چھوڑا تھا تو وہ دس منٹ بعد ہی کہیں چلی گئی تھی بغیر تیار ہوئے۔" اسد صاحب کے قدم یکلخت لڑکھڑا گئے تھے۔ آئمہ وہ بروقت دیوار نہ تھام لیتے تو یقیناً گر جاتے۔

"بارز، بارز کہاں ہے؟" انہوں نے آئمہ کی طرف دیکھا۔ جس کی حالت بھی بالکل ان کے جیسی تھی۔

"پاپا! انہیں ایمرجنسی میں کہیں جانا پڑ گیا تھا اور انہوں نے ہی کہا تھا ڈرائیور کو بھیج کر آپی کو لانے کے لیے۔"

"یہ یہ نہیں ہو سکتا۔ اریزا ہمارے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہے۔" وہ بے اختیار سینہ مسلنے لگے۔

"پاپا! آپ ٹھیک تو ہیں؟" آئمہ نے انہیں تھامتے ہوئے صوفے پر بٹھایا۔

"پانی۔۔۔!" سینہ مسلتے وہ بمشکل بولے۔ آئمہ تیزی سے گلاس بھر کے لے آئی۔

"دعا کرو منتشل! جیسا ہم سوچ رہے ہیں ویسا کچھ بھی نہ ہو۔ ورنہ میں سر اٹھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ میرے اتنے سالوں کی بنی عزت۔" وہ صوفے کی ٹیک سے سر ٹکاتے ہوئے کرب سے بڑبڑائے۔

"آئمہ! تم جلدی سے بارز کو فون کرو۔" پانی پلاتے ہوئے مما نے کہا تو وہ تیزی سے بارز کا نمبر ملانے لگی جو مسلسل آف آ رہا تھا۔

"مما! فون آف ہے۔"

"کیا۔۔۔؟ تم جانتی ہو کہ وہ کہاں گیا ہے؟" وہ چیختے ہوئے بولیں۔ ایک طرف یہ ناگہانی افتاد دوسری طرف اسد صاحب کی بگڑتی حالت ان کے اعصاب جواب دینے لگے۔

"نہیں۔۔۔" بہتے آنسوؤں کے دوران اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"یہ لڑکا بھی نا۔۔۔ گھر پر اتنی مصیبت ٹوٹ پڑی اور اس کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ نجانے کہاں ہے۔ آپ فکر نہیں کریں اسد! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اسد صاحب کی بگڑتی حالت کے پیش نظر وہ موہوم سی امید کے تحت بولیں۔

اور پھر بہت سا وقت بیت گیا مگر اریزا کو نہ آنا تھا اور نہ وہ آئی۔ اب تو مہمان بھی ایک دوسرے کے کانوں میں چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔

"اس لڑکی نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ میں کس منہ سے باہر جاؤں۔۔۔ کیا کہوں جا کر کہ میری بیٹی بھاگ۔۔۔" یک لخت ان کے درد میں اضافہ ہوا زبان لڑکھڑا کر رہ گئی۔

"پاپا پلیز، خود کو سنبھالیے۔" ان کے لٹھے کی مانند سفید پڑتے چہرے کو دیکھتے ہوئے آئمہ زارو قطار رونے لگی۔

"ہمارے گھر کی پہلی شادی تھی۔ میں نے تو کسی کو بھی نہیں چھوڑا سب جاننے والوں کو مدعو کر لیا۔ کیا خبر تھی کہ اس طرح ہوگا۔" ان آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ آئمہ کے لیے یہ لمحہ بے انتہا تکلیف دہ تھا۔

"یہ کیا کر دیا آپ نے اریزا آپی! میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔" وہ ایک دفعہ پھر سے بارز کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی۔

"یہ دن دیکھنے سے پہلے مجھے موت کیوں نہ آگئی۔" وہ سر پٹخنے لگے۔

"پلیز پاپا۔۔۔!" روتے ہوئے آئمہ نے ان کے دونوں ہاتھ تھامے۔

انہوں نے پرنم آنکھیں کھول کر اپنی فرماں بردار بیٹی کو دیکھا اور پھر ایک خیال بجلی کی طرح ان کے دماغ میں کوندا۔ انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"مجھ میں اتنی ہمت نہیں آئمہ! کہ میں اتنی ذلت برداشت کر سکوں۔ اگر اپنے پاپا کو ذلت کی موت سے بچانا چاہتی ہو تو میری پیاری بیٹی اپنے پاپا کی عزت کی لاج رکھ لو۔ اگر بارات واپس گئی تو پھر میں کسی کا نہیں

رہوں گا۔ تمہارے کمزور پاپا کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔" انہوں نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

ان کی بات کا مطلب سمجھتے ہی وہ ساکت ہو گئی۔

"کبھی اس کے ساتھ اس طرح بھی ہو گا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اور پھر اس گزرے لمحے میں اس نے جتنے فون بارز عباد کو کیے پہلے کبھی کسی کو نہ کیے تھے۔ یقیناً" وہ ایک فرماں بردار بیٹی بھی مگر وہ اپنی محبت کو بھی آخری موقع دینا چاہتی تھی۔ وہ ہر رستے کے ساتھ کھڑی تھی آ گئی تھی۔ قسمت نے اسے مشکل ترین دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس نے اپنی محبت کو باپ کی عزت پر قربان کر دیا تھا مگر اس کے باوجود وہ چاہتی تھی کہ بارز یہاں آ جائے۔ شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔

مما، پاپا ڈاکٹر عائش ملک اور ان کی مما سے بات کرنے لگے تھے۔ ان کے جاتے ہی وہ تڑپ تڑپ کر رو دی تھی۔

"میں، میں کیسے جی پاؤں گی تمہارے بغیر بارز۔۔۔ لوٹ آؤ پلیز۔۔۔ میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ میں مر رہی ہوں۔ آخر تم کہاں چلے گئے۔ کون سے ضروری کام آن پڑے کہ تمہیں اپنی محبت کے لٹنے کی بھی خبر نہیں۔"

نکاح نامے پر سائن کرنے سے پہلے بھی اس نے اک موہوم سی امید کے تحت ایک دفعہ پھر سے اس کا نمبر ملایا تھا۔

"مجھے معاف کر دینا بارز! پلیز مجھے معاف کر دینا۔" بہتی آنکھوں سے نکاح نامے پر جھکتے ہوئے جیسے وہ اندر سے مر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر عائش ملک کو اپنی خوش بختی پر کسی صورت یقین نہیں آ رہا تھا۔ گھر میں داخل ہونے تک وہ اک خواب کی سی کیفیت میں ہی رہے۔

جب اسد صاحب نے ان سے بات کی تو وہ کتنی دیر متحیر سے ان کا چہرہ تکتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا ردِعمل ظاہر کرتے جب اسد صاحب نے ان کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر التجا کی تو وہ جیسے ہوش میں آ گئے۔

"انکل، انکل! یہ آپ کیا کر رہے ہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" یہ جملہ خود بخود ان کے ہونٹوں سے نکلا تھا۔

اور پھر سارے عمل کے دوران وہ بے یقین ہی رہے۔ اس وقت تو قسمت کی اس سخاوت پر وہ خوش بھی نہ ہو پائے کہ ایک باپ کی عزت کا سوال تھا مگر اس سب کے باوجود انہیں اریزا کی اس حرکت پر غصہ آنے کے بجائے صرف افسوس ہوا تھا اور اسد صاحب کی جھکی گردن انہیں تاسف میں مبتلا کر رہی تھی۔

"میری دعا میں اتنا اثر تھا کہ اللہ نے ناممکن کو ممکن کر دیا یا پھر میری محبت میں اتنا اثر تھا۔" انہوں نے بے یقینی سے تاروں بھرے آسمان کو دیکھا۔ آئمہ اس وقت ان کے بیڈ روم میں تھی اور اسی بات پر وہ اپنے دل کو آدھے گھنٹے سے یقین دلا رہے تھے مگر دل کیسے مانتا ابھی تو وہ خود بے یقین سے تھے۔ پہلے خود یقین کر لینا چاہتے تھے کہ آیا جو کچھ ہوا وہ سچ ہے یا پھر ایک خوب صورت خواب اسی وقت انہوں نے مما کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔

"مما آپ ابھی تک سوئی نہیں؟"

"تم بھی تو نہیں سوئے۔"

"میں بس جانے ہی والا تھا۔" یک لخت وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"عائش! کیا تم خوش ہو؟" اک خدشے کے تحت انہوں نے پوچھا تو وہ دلکشی سے مسکرا دیے۔

"میرے دل کی مراد بر آئی ہے مما! اور یقین کیجیے میں بہت خوش ہوں۔" اک کھنک سی تھی ان کے لہجے میں۔ وہ بے ساختہ چونکیں اور پھر انہوں نے کچھ بھی چھپانا ضروری نہ سمجھا۔ جبکہ مما حیران حیران سی سنتی رہیں پھر آخر میں ان کی پیشانی چومتی آسودگی سے بولیں۔

"تم نے مجھے مطمئن کر دیا ہے عائش! ورنہ میں تمہاری وجہ سے بہت اپ سیٹ تھی۔"

"جانتے ہو آئمہ کو پہلی بار دیکھنے کے بعد میرے دل میں بھی پہلا خیال یہی آیا تھا۔ لگتا ہے ہم دونوں کی خواہش اس سوہنے رب کو پسند آ گئی جو اس نے ہماری جھولی بھر دی۔ اب جاؤ کمرے میں اور موقع کی نزاکت کو سمجھنا۔ آئمہ ابھی گہرے صدمے کے زیر اثر ہے۔ دھیان رکھنا اور اس کی دلجوئی کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا۔"

"جی مما میں سمجھ سکتا ہوں۔"

انہوں نے تحمل سے انداز میں سر جھکایا۔ وہ مما کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے دونوں ہی نظروں میں بیٹے کی نظر اتاری۔

وہ بہت خوشگوار موڈ لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے جب ان کے موبائل پر ہسپتال سے کال آ گئی۔ ایمرجنسی میں انہیں بلایا گیا تھا۔ ہوا میں آسودہ سانس خارج کرتے وہ مما کو بتا کر مطمئن سے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا۔ آئمہ کو سنبھلنے کا موقع مل جاتا ورنہ انہیں اپنے جذبوں پر پہرے بٹھانا کافی مشکل لگ رہا تھا اور وہ آئمہ کو واقعی کچھ وقت دینا چاہتے تھے۔

☼ ☼ ☼

صبح کافی تھکے تھکے انداز میں انہوں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا تھا اور پھر آئمہ کو بیڈ کے ایک کونے میں سکڑے سمٹے لیٹے دیکھ کر ان کی ساری تھکن از خود ہونے میں لمحہ لگا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیے۔ اس کی نیند ٹوٹنے کے خیال سے انہوں نے گاڑی کی چابی اور والٹ آہستہ سے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا۔ کوٹ صوفے پر رکھتے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے بیڈ پر ٹک گئے۔ کتنی دیر وہ نرم سا تاثر لیے اسے تکتے رہے۔ نجانے کتنا وقت بیت گیا مگر ان کی نظریں اس کے دلفریب سراپے سے ہٹنے کو تیار ہی نہ ہوئیں۔ کبھی وہ اپنی آنکھوں کو بے قابو ہونے سے روک لیا کرتے تھے۔ جذبوں کے عیاں ہونے سے خائف تھے مگر آج۔۔۔ وہ اس پر ہر طرح کا حق رکھتے تھے۔

"میری زندگی کی سب سے خوب صورت صبح۔۔۔"

بڑبڑاتے ہوئے وہ ذرا سے جھکے اور اس کے گال سے شرارت کرتی آوارہ لٹ کو ہٹانے لگے۔ اسی دوران وہ کسمسائی اور پھر آنکھیں کھول دیں۔ ڈاکٹر عائش ملک کو اپنے اتنے قریب جھکے ہوئے دیکھ کر وہ بوکھلاتے ہوئے تیزی سے اٹھی۔

"گڈ مارننگ سویٹ گرل!" وہ اس کی نیند کے خمار سے سرخ قاتل آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے مسکرائے۔ آئمہ اسد نے چونک کر ان کے مطمئن انداز کو دیکھا۔

ایک طرف کروٹ کے بل لیٹنے سے جھمکے نے اس کے نرم و ملائم گال پر نشان چھوڑ دیا تھا۔ ان کی نگاہیں اسی پر پھسل رہی تھیں۔ ان کے انداز و اطوار دیکھتے اس کی تمام تر حسیات بیدار ہونا شروع ہو گئیں۔ بے خودی میں کھوتے جیسے ہی انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس نشان کو چھونا چاہا وہ کسمساتے ہوئے پیچھے کو سرکی۔ آنکھوں میں اک خوف سمٹ گیا۔ انہیں سنبھلنا پڑا۔ ان کے تیور اسے کافی الجھا گئے۔ اس کے اندازے کے مطابق تو ان کا رویہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات اس کی سوچ کے بالکل برعکس تھے۔ رات جب وہ روم میں نہیں آئے تو اس نے یہی سمجھا کہ وہ بھی اس کی طرح اس دھچکے کی گرفت میں ہیں۔ لیکن اب ان کا نارمل ردِعمل۔۔۔ وہ اچھی خاصی الجھ گئی۔

"رات ایمرجنسی کی وجہ سے مجھے ہسپتال جانا پڑا۔ شاید اسی وجہ سے تم کچھ خفا سی نظر آ رہی ہو لیکن یار! اس طرح کے کمپرومائز کی عادت ڈال لو کیونکہ یہ ہم ڈاکٹرز کی زندگی کا ہی ایک حصہ ہیں۔" وہ بہت خوشگوار موڈ میں کہہ رہے تھے۔ اس کی الجھن میں مزید اضافہ ہونے لگا۔ اندر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

"تم نے میرا کافی انتظار کیا ہوگا۔ آئی ایم سوری فارس۔" انھوں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما۔ اسے لگا جیسے اس کے ہاتھ کو کرنٹ چھو گیا ہو۔ بڑی تیزی سے اس نے ان کی گرم گرفت سے اپنا ہاتھ کھینچا تھا اور اس دوران وہ پہلی بار چونکے۔

"مگر... مجھے..." اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ان سے کیا کہے۔ "مجھے کچھ وقت چاہیے۔"

بھرائی ہوئی آواز میں وہ بمشکل بولی۔ اپنے اندر روتی کرلاتی محبت کو دم توڑتے دیکھنا اب اس کی برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ رات بھی روتے روتے نجانے اس کی کب آنکھ لگی تھی۔ وہ اس وقت چھوٹے چھوٹے جھٹکوں کی زد میں تھی۔ اعصاب ساتھ چھوڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اور پھر ڈاکٹر عائشہ ملک کو سب یاد آ گیا جسے اس کے دلکش روپ میں کھوتے ہوئے وہ مکمل طور پر فراموش کر چکے تھے۔

"پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔" اس نے آنسوؤں بھری آنکھیں اٹھائیں تو ان کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں آئمہ... ڈونٹ وری۔" اس کے ہوش ربا حسن سے نظریں چراتے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر جیسے ہی وہ واش روم میں گئے اس نے بے ساختہ سکون کا سانس لیا۔ ورنہ ان کے تیور اسے حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھے۔

مجھے اسے وقت دینا چاہیے تاکہ وہ اس رشتے کی سچائی کو دل سے قبول کر سکے۔

اپنے دل میں مچلتی تڑپتی خواہشوں کو تھپک تھپک کر سلاتے وہ منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگے۔

☼ ☼ ☼

وہ جیسے ہی نڈھال سے قدموں سے گھر میں داخل ہوا اک قیامت کو اپنا منتظر پایا۔ کتنی دیر تو وہ ساکت سا تایا ابو کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔ اس کا وجود ایسے تھا جیسے کسی نے انگاروں کی بھٹی میں دھکیل دیا ہو۔

"یہ... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تایا ابو؟" اسے اپنے وجود سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

"تم کہاں تھے یار! ہم پر اتنی بڑی قیامت ٹوٹ پڑی اور تمہیں خبر نہ ہو سکی۔ کتنے فون کیے ہم نے تمہیں۔"

اسد صاحب نے پرنم نظروں سے اس کے بت بنے ششدر وجود کو دیکھا۔ اسے لگا جیسے وہ ہوا میں معلق ہو اس کے قدموں تلے زمین نہ ہو۔ اس کے قدم لڑکھڑائے، جھٹکا بہت زور آور تھا۔ اسے خود کو سنبھالنا مشکل ہی نہیں ناممکن لگا۔ قریب پڑے صوفے پر جیسے وہ ڈھے سا گیا۔

"یہ کیا کر دیا تایا ابو آپ نے۔ بارات واپس جاتی تھی تو جانے دیتے مگر آئمہ کو تو نے..."

کافی دیر بعد وہ اک اذیت میں بڑبڑایا۔ اس کی پردرد پکار پر وہ بے ساختہ چونکے۔ وہ لٹا لٹا سا ان پر بہت کچھ عیاں کر گیا۔ انہیں لگا اپنی عزت کی خاطر وہ کچھ غلط نہیں بلکہ بہت غلط کر چکے ہیں۔

"آپ نے تو مجھ سے میری زندگی ہی چھین لی۔" صوفے کی بیک سے سر ٹکاتے اس نے بھیگی پلکیں موند لیں۔

اسد صاحب دم بخود بیٹھے اس کے چہرے پر بکھری اذیت دیکھتے رہے۔ ادراک و آگہی کے لمحے اتنے دردناک تھے کہ ان کے پورے وجود سے جان کھینچنے لگی۔

"تم نے ہمیں بتایا کیوں نہیں یار کہ تم آئمہ سے..." کافی دیر بعد سنبل بیگم ہی کچھ بولنے کے قابل ہوئیں۔ ساڑھی کے پلو سے بہتی آنکھیں رگڑتے ہوئے جیسے انہوں نے مزید ہونے والے نقصان کا پتہ لگانے کی کوشش کی۔

ایک لفظ بولے بغیر وہ اٹھا اور پھر اپنے مردہ قدموں کو گھسیٹتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اس کے پیچھے جاؤ سنبل! مجھے اس کی حالت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔" وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح گویا ہوئے۔

"مجھ میں ہمت نہیں اسد! کہ میں اسے اتنا ٹوٹا بکھرا دیکھ سکوں۔ ہم سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ آئمہ نے [illegible] ذکر نہ کیا۔ اریز! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" اسد صاحب کی بگڑتی حالت دیکھ کر وہ [illegible]سے ڈاکٹر زاکر کا نمبر ملانے لگیں۔

یقین و بے یقینی کی کیفیت میں معلق وہ کتنی دیر کمرے کے وسط میں کھڑا رہا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو کچھ اس کی سماعتوں نے سنا تھا اسے لگا جیسے وہ ایک خواب ہو۔ بھیانک خواب۔ آنکھیں کھولے گا تو سب کچھ پہلے جیسا ہوگا۔ اس کے دل نے شدت سے دعا کی کہ یہ سب واقعی ایک خواب ہی ہو۔ اس کے اعصاب ساتھ چھوڑنے لگے۔

"ہم نے تمہیں بہت فون کیے تھے۔" اس کے کانوں میں جملہ گونجا تو پوری قوت سے اس نے موبائل سامنے دیوار پر دے مارا۔ "نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میری آئمہ کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" وہ کمرے کی تمام چیزوں کو بے دردی سے پٹخنے لگا۔ قسمت اسے اتنی بڑی مات سے بھی دوچار کر سکتی ہے اس کے گمان تک میں نہ تھا۔

"اریز! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔" ہانپتے ہوئے وہ زمین پر ہی بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سلگنے لگیں اور پھر وہ اونچا لمبا شخص گھٹنوں میں سر دے کر بچوں کی طرح تڑپ تڑپ کر رو دیا۔

اریز کو پارلر چھوڑ کر وہ ابھی گاڑی میں آ کر بیٹھا ہی تھا جب ماجد کا فون آیا کہ اس کے دوست سہیل کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ آئمہ اسے کہنے کے بعد کہ وہ ڈرائیور کو بھیج دے گا وہ سیدھا ہاسپٹل پہنچ گیا۔ سہیل کی حالت شدید خراب تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح کاریڈور میں چکر لگانے لگا۔ ایک ہی تو اس کا قریبی دوست تھا۔ شدید پریشانی کی وجہ سے وہ موبائل کی ڈاؤن بیٹری پر بھی توجہ نہ دے سکا۔ صبح جا کر جب ڈاکٹرز نے اس کی حالت سنبھلنے کی اطلاع دی تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس کے گھر والوں کو تسلی دے کر وہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا جانتا تھا کہ اریز کی رخصتی پر اسے نہ پا کر تایا ابو اور تائی امی ضرور ناراض ہوں گے مگر گھر آ کر تو اس نے ایک طوفان کو اپنا منتظر پایا۔

گھٹنوں میں سر دیے سسکتے اسے نجانے کتنا وقت بیت گیا مگر وہ لٹا پٹا شخص ایک ہی زاویے میں بیٹھا جیسے پوری دنیا کو آگ لگا دینا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

ولیمہ کے ریسپشن میں ان کے گھر سے کوئی نہیں آیا تھا۔ فون پر مما نے پاپا کی طبیعت خرابی کا بتا کر معذرت کر لی۔ فنکشن ختم ہوتے ہی وہ ڈاکٹر عائشہ ملک کے ہمراہ بہت پریشان سی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ نڈھال سی مما اسے لاؤنج میں ہی مل گئیں۔

"مما...!" تیزی سے وہ ان کی طرف لپکی تھی اور پھر ان کے ساتھ لپٹتے ہی رونے لگی۔

"مما... مما اب پاپا کی طبیعت کیسی ہے؟" برستی آنکھوں سے اس نے پوچھا۔

"اب ٹھیک ہیں۔ ابھی میڈیسن لے کر لیٹے ہیں۔ تھوڑی دیر میں اٹھتے ہیں تو مل لینا۔"

وہ اسے خود سے علیحدہ کرتے اس کے آنسو صاف کرنے لگیں اور پھر جیسے ہی ان کی نظر پریشان کھڑے ڈاکٹر عائشہ ملک کی طرف اٹھی تو وہ ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"کیسے ہو بیٹا آپ...؟"

"آپ نے ہمیں انفارم کیوں نہیں کیا مما۔" ان کا مما کہنا انہیں بہت اچھا لگا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیں۔

"اب آ گئے ہو نا تو اچھی طرح چیک اپ کر کے جانا۔" ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے وہ بھیگی آواز میں گویا ہوئیں۔

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔" بہت اپنائیت سے وہ گویا ہوئے حالانکہ انہیں ہسپتال ارجنٹ پہنچنا تھا مگر وہ پاپا کے اٹھنے کا

انتظار کرتے رہے اور پھر جب وہ اٹھے تو ان کا مکمل چیک اپ کرنے کے بعد مما کو مطمئن کرتے ہسپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔

"میں شام کو تمہیں لینے آؤں گا۔" جانے سے پہلے وہ کچھ دیر اس کے پاس ٹھہرے تھے۔ وہ کچھ دن رکنا چاہتی تھی مگر دل کی بات زبان پر نہ لا سکی۔

"اریزہ آپی کا کچھ پتہ چلا؟" مما ابھی اس کے پاس آ کر بیٹھی تھیں جب اس نے پوچھا۔

"اس لڑکی نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ ہمارے اتنے سالوں کی عزت کو ایک جھٹکے میں تباہ کر دیا۔ اب بھی فون کر کے بتا دے کہ زندہ بھی ہے یا مر گئی۔" بیٹی کا سہارا پاتے ہی وہ سسک پڑیں۔

"پلیز مما چپ ہو جائیں۔ ہمت کریں اگر آپ ہی یوں ٹوٹ جائیں گی تو پاپا کو کون سنبھالے گا۔"

مما کی ایسی حالت اسے شدید تکلیف میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ نرمی سے ان کے آنسو صاف کرنے لگی جب ان کے دماغ میں جھماکا ہوا اور وہ پرنم آنکھوں سے کتنی دیر اس کی طرف دیکھتی رہیں۔

"کیا ہوا مما! ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟" ان کی متغیر حالت اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

"آئمہ! جانے تم ہماری کس نیکی کا ثمر ہو۔ اتنی بڑی قربانی... پاگل لڑکی ایک دفعہ کہا تو ہوتا۔ جب سے تمہارے پاپا کو سچائی کی خبر ہوئی ہے وہ بیڈ سے اٹھ ہی نہیں پائے۔ آخر تم نے ہمیں کیوں نہیں بتایا۔" وہ اس کے دونوں ہاتھ تھامتی تڑپ اٹھیں۔

"کیا نہیں بتایا مما...؟" اپنے اندر ہونے والی توڑ پھوڑ سے نظریں چراتے جیسے وہ سب راز چھپا جانا چاہتی تھی۔

"جانتی ہو بارز کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ جب سے آیا ہے اپنے کمرے میں بند ہے اور مجھ میں یا تمہارے پاپا میں اتنی ہمت نہیں کہ اس کا سامنا کر سکیں۔ اگر تم ہمیں بروقت بتا دیتیں تو بیٹا ہم تمہاری خوشی کو مقدم ٹھہراتے۔ ذلت و رسوائی تو ہماری جھولی میں آ ہی چکی تھی۔ کیا کم اور کیا زیادہ۔ لیکن ہم بھی تم دونوں کی خوشی نہ چھینتے۔"

وہ چہرہ جھکاتے ہوئے رو پڑی۔ نارسائی کا دکھ اسے اندر ہی اندر کند چھری سے کاٹ رہا تھا اور وہ جو کل سے ضبط و برداشت کے مراحل سے گزرتی ادھ موئی ہوئی جا رہی تھی، مما کے گلے لگتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"تم نے بہت غلط کیا آئمہ! تم نے اپنے اور بارز دونوں کے ساتھ ظلم کیا۔ ہم تو بے خبر تھے مگر تم تو جانتی تھیں پھر کیوں نہ ہم سے کہا۔" ان کے آنسو اس کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔ "ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ اس کا سامنا کر سکیں۔ پلیز آئمہ! تم جاؤ اس کے کمرے میں دیکھو وہ ٹھیک تو ہے۔"

مما نے آہستہ سے اسے خود سے علیحدہ کیا تو وہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں کس دل سے اس شخص کا سامنا کروں جس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہی میں نے چھین لی۔ جسے زندہ درگور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کیسے میں ان آنکھوں کے شکوے سہہ پاؤں گی۔"

دروازے کے قریب آتے ہی جیسے زمین نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ وہ اپنے میں ہمت نہیں پا رہی تھی مگر اسے اندر جانا تھا۔ وہ اسے اس کڑے وقت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی کیونکہ وہ اس سے اب بھی محبت کرتی تھی، بہت محبت کرتی تھی۔ کمرے کے اندر بڑھنے والے قدم من من بھر کے ہوتے جا رہے تھے۔

"بارز...!" وہ جو ساکت آنکھوں سے چھت کو گھور رہا تھا، مانوس سی پر درد پکار پر بری طرح چونکا۔

"آئمہ!" زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ تیزی سے بیڈ سے اترتے اس کی طرف بڑھا۔ کتنی دیر وہ دونوں روبرو کھڑے ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ تقدیر نے ان کے ساتھ بہت بھیانک مذاق کیا تھا۔ وہ قصوروار قرار دیتے بھی تو کس کو۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے؟" بہت دیر بعد آئمہ نے ہی لب کشائی کی تھی۔ آنکھیں رو رو کر جیسے تھک چکی تھیں مگر اس وقت اپنے من کے دیوتا کو سامنے پاتے

ایک دفعہ پھر سے خود پر بیتنے والی قیامت پر اشک بار ہو گئیں۔

"میں نے آپ کو کتنی دفعہ فون کیا مگر..."

وہ بے بسی سے ہونٹ چباتے ارد گرد دیکھنے لگی۔ کمرے کی حالت بالکل بارز عباد کے وجود کی طرح ابتر تھی۔ بارز عباد کی نظریں ابھی تک اس کے چہرے پر بھٹک رہی تھیں۔ اس کا دل کیا کہ وہ اسے چھپا کر کہیں دور لے جائے۔ جہاں کوئی نہ ہو۔

اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھامے اور پھر دونوں ہی گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ کر رو... چلا گیا۔ وقت سرکتا گیا، اس کا درد بڑھتا گیا۔

"میں تمہارے بغیر کیسے جیوں... اگر تمہارے پاس اس سوال کا جواب ہے تو یہاں سے جانا ورنہ..." اس نے سرخ انگارہ آنکھیں اٹھائیں۔

آئمہ اسد کے وجود کا رواں رواں سسکنے لگا۔

"آپ کو لگتا ہے کہ ابھی تک ہم دونوں زندہ ہیں۔ جب میں یہاں سے رخصت ہوئی تھی تو خالی وجود ہی تھا میرے ساتھ، دل اور روح تو یہیں کہیں کھو گئے تھے۔" بارز عباد کو اپنے سوالوں کا جواب مل گیا تھا۔ وہ اس من موہنی لڑکی کو کتنی دیر تشنہ لبی سے دیکھتا رہا۔ پیاس تھی کہ بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اور پھر جیسے ہی اس نے اٹھنا چاہا تو اس کے ہاتھوں پر گرفت مضبوط کرتے بولا۔

"تھوڑی دیر بیٹھو پلیز... کیا مجھے عمر بھر کا زاد راہ نہیں دو گی۔"

"بارز...!" وہ اس کے ہاتھوں پر پیشانی ٹکاتے تڑپ تڑپ کر رو دی۔

"مجھے معاف کر دینا بارز! میں مجبور ہو گئی تھی۔ پلیز اپنی محبت کے ساتھ اتنی بڑی ناانصافی پر مجھے معاف کر دیں۔ میں بیٹی بن گئی۔ آپ کی محبت پر باپ کی عزت کو ترجیح دے بیٹھی۔"

"مجھے تم پر فخر ہے آئمہ... اگر تم محبت کو ترجیح دیتی تو ساری عمر گلہ رہتا۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"آپ اتنے اچھے کیوں ہیں بارز۔" اسے یک لخت احساس ہوا کہ وہ کیا کھو چکی ہے۔

"کیونکہ تم خود بہت اچھی ہو۔" نرمی سے کہتے جیسے اس کے اندر سالوں پر محیط تھکن اترنے لگی۔

"میں آپ کو کبھی بھلا نہیں پاؤں گی۔ آپ ہمیشہ میرے دل کے کسی کونے میں خوب صورت یاد کی طرح رہیں گے۔"

"یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ تم مجھے یاد رکھو گی۔ اور تم بھی ہمیشہ ایک خوب صورت و مقدس یاد کی طرح میرے دل کے سب سے خاموش کونے میں براجمان رہو گی۔"

وہ دھیرے دھیرے بولتا جیسے اس کے اندر نئی توانائیاں بھر رہا تھا۔ وہ پلکیں جھپکے بغیر یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ دونوں کے وجود اک نئی روشنی کے احساس سے منور ہو چکے تھے۔ اس نے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ نرمی سے کھینچے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آج کے بعد تم جب بھی میری نظروں کے سامنے آؤ گی ان میں صرف اور صرف احترام ہو گا۔" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"آج کے بعد میں جب بھی آپ کو دیکھوں گی میری نظروں میں فخر ہو گا۔" محبت کو معتبر کرنے والا شخص احترام کے ساتھ ساتھ میرے لیے باعث فخر بھی ہے۔ بارز اس دوران پہلی بار مسکرایا تھا۔

بہت نامانوس سی مسکراہٹ تھی۔ دھیمی، پر درد خود میں اک داستان سمیٹے روتی بلکتی مسکراہٹ۔

☆ ☆ ☆

"آئمہ! مجھے لگتا ہے کہ اب تمہیں ہسپتال جوائن کر لینا چاہیے۔" شادی کے ہفتے بعد وہ کھانے کی میز پر کہہ رہے تھے۔

"جی میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔"

"تو ٹھیک ہے پھر ساتھ ہی نکلتے ہیں۔" وہ ناشتہ کر چکے تھے۔ استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"آپ کا کیا خیال ہے مما؟" انہیں جواب دینے

سے پہلے اس نے ماما پاپا کی بھی رائے لینا چاہی۔

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بیٹا! جاؤ ضرور جاؤ۔" وہ خوش دلی سے بولیں تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی جب انہوں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما۔

"میں بہت عرصہ تمہاری ہوں آئمہ! اب تو میری اللہ سے یہ ہی ایک دعا ہے کہ وہ جلد تمہاری گود بھر دے، کہ میری تنہائی دور ہو سکے۔"

وہ اچھی خاصی بوکھلا کر رہ گئی۔ نظریں بے اختیار ڈاکٹر عائش ملک کی طرف اٹھیں جو لب بھینچے مسکراہٹ چھپا رہے تھے۔

"میں چینج کر کے آتی ہوں۔" اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بہت تیزی سے وہ وہاں سے کھسکی تھی۔ جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دیے۔

☼ ☼ ☼

"ماما کی خواہش پوری کرنے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے آئمہ؟" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بالوں میں برش کر رہی تھی جب وہ نائٹ ڈریس تبدیل کرتے اس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔

اس کے ہاتھ سے برش گرتے گرتے بچا۔ آج وہ سارا دن اپنے وجود پر ان کی نظریں محسوس کرتی رہی تھی اور اب رات ہوتے ہی وہ اس کی رائے جاننے کی منتظر اس کے روبرو تھے۔ بڑبڑاتے ہوئے اس نے بالوں کو کیچر میں جکڑنا چاہا۔

"کھلا رہنے دو یار! اچھے لگ رہے ہیں۔" فرصت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما۔ تمام بال چاند چہرے کے اردگرد بکھر گئے۔

ان کی اس جسارت پر اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ وہ دو قدموں کا فاصلہ سمیٹتے اس کے بے حد نزدیک آ کھڑے ہوئے۔ ان کے کلون کی دھیمی خوشبو اسے حواس باختہ کرنے لگی۔

"مم..... مجھے نیند آ رہی ہے۔" بوکھلاتے ہوئے جیسے وہ راہ فرار تلاشنے لگی۔

"تو سو جاؤ۔ میں نے کب روکا ہے مگر ماما کی خواہش کے بارے میں ضرور سوچنا۔" اسے صوفے کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ پھر شرارت سے باز نہ آئے۔ ان کی نفیس سلجھی ہوئی طبیعت کو کسی صورت یہ گوارا نہ تھا کہ وہ اس معاملے میں اس سے ذرا بھی زبردستی سے کام لیتے۔ وہ اس وقت کا شدت سے انتظار کر رہے تھے جب وہ از خود ان کی قربت کی تمنائی ہوتی ان کے قریب آتی۔ اس کے لیے چاہے انہیں کتنا بھی انتظار کیوں نہ کرنا پڑتا وہ اس کے لیے تیار تھے۔

☼ ☼ ☼

"آؤچ..." وہ راؤنڈ لے کر پیشنٹ نمبر فائیو کی کنڈیشن کے بارے میں ڈسکس کرتی آ رہی تھی، ڈاکٹر عائش ملک بہت دھیان سے اس کی بات سن رہے تھے جب پاؤں مڑنے کی وجہ سے بائیں ٹانگ پر ہاتھ رکھتی نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

"کیا ہوا؟" یک لخت وہ مڑے۔

"پاؤں مڑ گیا ہے... اف اللہ!" بتانے کے ساتھ ہی وہ اٹھنے کی کوشش میں ناکام ہوتی کراہتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئی تو ڈاکٹر عائش ملک پریشانی سے جھکے۔

"وزن نہیں پڑ رہا پاؤں پر۔" ان کے متفکرانہ دیکھنے پر اس نے بتایا۔ انہوں نے ایک پل کے لیے کچھ سوچا اور پھر نرمی سے اس کے وجود کو بانہوں میں اٹھا لیا۔ بہت سی معنی خیز نظریں ان کی طرف اٹھی تھیں مگر وہ نظر انداز کیے اپنے پرسنل روم کی طرف بڑھ گئے۔ جبکہ وہ سب کو اپنی طرف متوجہ پا کر اچھی خاصی خجل ہو گئی۔

بہت آہستہ سے انہوں نے اسے بیڈ پر بٹھایا تھا۔ اس نے کافی حیرانی سے کمرے کو دیکھا۔ جو نفاست اور اعلا ذوق کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

"کمرا تو بہت خوب صورت ہے۔" ستائش سے دیکھتے اس کے ہونٹ خود بخود تعریفی انداز میں ہلے وہ دھیمے سے مسکرا دیے۔

"جب میں بہت تھک جاتا ہوں اور گھر جانے کی سکت خود میں نہیں پاتا تو کچھ دیر یہاں آرام کرنے کے بعد گھر لوٹتا ہوں۔" اس کے پاؤں پر جھکتے ہوئے وہ تفصیلاً بولے۔

"مجھے لگتا ہے کہ موچ آ گئی ہے۔" معائنہ کرنے کے بعد وہ زیر لب بڑبڑائے تو وہ جو ابھی تک کمرے کو سراہتی نظروں سے دیکھ رہی تھی ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ ان کا ہاتھ بہت نرمی سے اسے لمس مسیحائی عطا کر رہا تھا۔ اسے اس پل جیسے اپنے اور ان کے مابین رشتے کا شدت سے احساس ہوا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے پاؤں سمیٹا تھا اور پھر تیزی سے پاؤں کھینچنے کا مزہ بھی چکھ لیا۔

درد کی لہر اندر تک دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"کیا ہوا...؟" انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر اذیت بھرے تاثرات دیکھتے ہوئے وہ سرعت سے اس کی طرف لپکے۔

"تم ٹھیک تو ہو کیا زیادہ درد ہو رہا ہے۔ تم فکر نہیں کرو میں ابھی پین کلر دے رہا ہوں درد یوں غائب ہو جائے گا۔" چٹکی بجاتے ہوئے انہوں نے بچوں کی طرح اسے پچکارا تو نجانے کس احساس کے زیر اثر اس کی آنکھیں پانیوں سے بھرتی گئیں۔

"پلیز آئمہ! کچھ بتاؤ تو آخر کیا ہوا ہے؟ اگر زیادہ درد ہے تو تم فکر نہ کرو ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔" اس کے آنسو جیسے انہیں اندر تک تڑپا گئے۔ آئمہ نے بھیگی پلکیں اٹھائیں اور اسی لمحے ڈاکٹر عائش ملک کو احساس ہوا کہ وہ ان آنکھوں میں آنسو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ وہ تیزی سے اٹھے اور فرسٹ ایڈ بکس میں پین کلر تلاشنے لگے۔

"یہ لو..... انشاء اللہ درد ختم ہو جائے گا۔" ایک ہاتھ میں گولی اور دوسرے میں پانی کا گلاس لیے وہ پریشانی سے گویا ہوئے۔ اس نے خاموشی سے گولی نگلتے پانی پی لیا۔

"تمہاری آنکھوں میں آنسو مجھے بہت تکلیف دے رہے ہیں آئمہ! آئندہ میں کبھی ان آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں۔"

وہ نرمی سے اس کے آنسو صاف کرنے لگے پھر یکبارگی چونکے اور دھیرے سے مسکرا دیے۔ اس نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔

"جانتی ہو جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو میرے دل میں یہ خواہش بڑی شدت سے ابھری تھی کہ میں تمہیں چھو کر دیکھوں تم پر مجھے کسی باربی ڈول کا گمان گزرا تھا۔"

وہ انجانے میں ہی اس کے بھرتے زخموں کو ادھیڑ گئے تھے۔ پل میں اس کا وجود ساکت ہوا تھا۔ کتنی دیر تو وہ کچھ بول ہی نہ پائی۔ ڈاکٹر عائش ملک کا ہاتھ اس کے گالوں سے پھسلتے ہوئے اس کی صراحی دار گردن تک آ پہنچا تھا۔

"کبھی کبھی مجھے اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آتا۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں ابھی تک کسی خوب صورت خواب کے زیر اثر ہوں۔ آنکھیں کھولوں گا تو کچھ نہیں رہے گا سوائے دھند کے۔ ان پر بے خودی چھانے لگی۔ تم میرے لیے کیا ہو شاید تم کبھی نہ سمجھ سکو۔"

وہ اس کے چہرے پر جھکے مدہوشی سے کہہ رہے تھے۔ جذبوں نے ان کی آواز کو کافی حد تک بوجھل کر دیا۔ ان کی سانسوں کی پر حدت جھلسا دینے والی گرمی گالوں پر محسوس کرتے وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔

میلوں کا سفر تھا جو وہ لمحوں میں طے کر گئی تھی۔

"پلیز۔" اپنے دونوں ہاتھ ان کے سینے پر رکھتے ہوئے وہ دبے دبے انداز میں چیخی تو وہ جو اس کی قربت میں مدہوش ہو رہے تھے بری طرح ٹھٹکے۔

"کیا ہوا؟" وہ حیران سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔ جہاں انہیں وحشت اور ویرانیوں کے علاوہ کچھ نہ ملا۔

"میں، میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔ وہ یہاں سے غائب ہو جانا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر عائش ملک کی گہری نظریں اسے اپنے وجود کے آر پار محسوس ہو رہی تھیں اور اس وقت وہ جس کیفیت کی زد میں تھی ان کے ساتھ کسی بھی قسم کا

مس بی ہو کر جاتی تو وہ نہیں چاہتی تھی۔

"ٹھیک ہے تم آرام کرو۔" یک لخت وہ اٹھ کھڑے ہوئے ان کا انداز کچھ سنجیدہ سا تھا مگر اس وقت ان کے بارے میں سوچنے کے لیے اس کا دماغ بالکل حاضر نہ تھا۔ ان کے جاتے ہی وہ گھٹنوں میں سر دے کر تڑپ تڑپ کر رو دی۔ پاؤں کی تکلیف تو اس تکلیف کے آگے کچھ بھی نہ تھی جسے وہ اس وقت اپنے پورے وجود میں محسوس کر رہی تھی۔ محبت سے دستبردار ہونا اتنا جان لیوا نہیں ہوتا جتنا جان لیوا محبت کا حق دوسری جھولی میں ڈالنا ہوتا ہے۔ چاہے وہ مکمل استحقاق ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔

"میں اتنی بہادر نہیں ہوں بارڈ.... مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔" کتنے جتن کر کے اس نے اپنے ریزہ ریزہ وجود کو سمیٹا تھا مگر بکھرنے میں صرف لمحہ لگا۔

☼ ☼ ☼

"آسائش! یہ کیا پاگل پن ہے۔ آخر تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔" سارہ جھنجلاتے ہوئے بولی۔

"کیا.... کیا سمجھوں میں سارہ.... اور کیسے سمجھوں یہ دل نہیں مانتا.... کچھ بھی نہیں مانتا۔" اس نے بے بسی و لاچاری کی انتہاؤں کو چھوتے نظریں اٹھائیں تو ان آنکھوں کی ویرانی سارہ کے اندر تک اتر گئی۔

"یہ بے وقوفی ہے آسائش!" اس نے ایک اور کوشش کی۔

"مجھے یہ بے وقوفی بھی بہت عزیز ہے سارہ!" اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"جب وہ تمہارے سامنے تھا تو کیوں چپ رہیں، کیوں نہ بتایا کہ کتنا چاہتی ہو تم اسے تمہارے پاس وقت تھا، موقع تھا مگر تم نے اپنی بزدلی کی وجہ سے گنوا دیا اور اب جب تمہارے دامن میں کچھ نہیں بچا تو کیوں زندگی تیاگ رہی ہو۔ اپنے ممی پاپا کا ہی کچھ خیال کر لو۔"

سارہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنی دوست کے بکھرے وجود کو سمیٹے۔

"میں بے بس ہوں سارہ پلیز مجھے مجبور نہ کرو۔ اگر کچھ کرنا ہی چاہتی ہو تو میرے لیے دعا کرو۔ دعا کرو کہ وہ مجھے صرف ایک دفعہ مل جائے پھر میں اسے دوبارہ کبھی نہیں کھونے دوں گی۔" وہ دور خلاؤں میں دیکھتے افسردگی سے بولی۔

"تمہیں محبت نے سودائی کر چھوڑا ہے آسائش۔" اس کی آنکھوں سے تاسف جھلکنے لگا۔

"ہاں مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے۔" وہ ہنسی، کتنی پھیکی اور دل کو تڑپانے والی ہنسی تھی۔ سارہ کو اس کی حالت پر شدید دکھ ہوا۔ وہ اپنی کزن اور عزیز از جان دوست کو ایک نظر دیکھ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اس واقعہ کے بعد ان کے مابین خود بخود ایک فاصلہ سا پیدا ہو گیا۔ وہ عائش کے مہذبانہ انداز و اطوار سے بخوبی آگاہ تھی۔ اور ان کی شخصیت کا ٹھہراؤ اسے ہر ہر قدم پر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

اس گزرے ہفتے میں چند جملے ہوں گے جو انہوں نے بمشکل ادا کیے۔ وہ اس کے رویے سے ہرٹ ہوئے تھے اور اس کا اندازہ اسے بخوبی ہو چکا تھا۔ کئی دفعہ اس نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی مگر پھر ان کے چہرے پر چھائی سنجیدگی نے اسے کچھ بولنے نہ دیا۔ ان کی بارعب شخصیت کا تاثر تھا ہی ایسا کہ مقابل بات کرنے سے پہلے دس بار سوچتا۔

وہ ٹائی کی ناٹ بنا رہے تھے جب وہ ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ افسردہ سی پشیمان سی۔

"آئی ایم سوری۔" دونوں کانوں کی لوؤں کو نرمی سے چھوتی وہ شرمندہ سی گویا ہوئی۔ "پلیز معاف کر دیں۔ اگر آپ میرے اس دن کے رویے سے ہرٹ ہوئے ہیں تو ایکسٹریملی ویری سوری۔"

انہوں نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی اور پھر وہاں سے ہٹ گئے۔ ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے وہ ایک دفعہ پھر سے ان کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔

"ایکچوئلی اس دن میرے پاؤں میں بہت درد ہو رہا تھا۔ سو مس بی ہیو کر گئی۔ اب سوری بول رہی ہوں نا۔" وہ دھیمی آواز میں ندامت سے بولی۔ ان کی نظریں جیسے اس کے معصوم چہرے پر ٹھہری گئیں۔

"اس دن میں واقعی تمہارے رویے سے ہرٹ ہوا تھا۔ جانتی ہو اس دن تمہاری آنکھیں مجھے۔"

"پلیز فارگیٹ اٹ۔" وہ نجانے کیا کہنے جا رہے تھے جب وہ انہیں درمیان میں ہی ٹوک گئی۔

"میں سوری بول رہی ہوں نا۔" اس کے ہاتھ خود بخود ان کی ٹائی کی ناٹ درست کرنے لگے۔

ڈاکٹر عائش ملک کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ شادی کے گزرے ان تین ماہ میں یہ پہلی پیش قدمی تھی جو اس کی طرف سے ہوئی تھی۔ ان کے ہونٹوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ بکھری تھی۔ یہ منظر انہیں اتنا دلکش و دلفریب لگا کہ وہ بے ساختہ اس کی کمر کے گرد حصار قائم کر گئے۔ بوکھلاتے ہوئے اس نے ہاتھ کھینچے تھے۔

"وہ.... وہ آپ کو ہسپتال سے دیر ہو رہی ہے۔" اپنے اندر ابھرتی مزاحمت کی شدید خواہش کو اندر ہی اندر دباتے وہ بمشکل منمنائی جب وہ دلکشی سے مسکرا دیے۔

"آج پہلی بار ایسا ہو گا کہ میں ہسپتال دیر سے پہنچوں گا۔" ان کا موڈ بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔

"مما.... مما نیچے ویٹ کر رہی ہوں گی۔" کوئی راہ فرار نہ پاتے جیسے اسے ایک دم مما کا خیال آیا۔

"کرنے دو۔" انہیں تو جیسے کسی کی پروا نہ تھی۔ وہ اس کی گھبراہٹ و بوکھلاہٹ کا بھرپور مزہ لے رہے تھے۔

اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ انہیں منا کر کتنی بڑی غلطی کر چکی ہے۔ اس سے تو وہ خفا ہی بھلے تھے۔

"کیا ہوا.... کیوں اتنا گھبرا رہی ہو میری باربی ڈول؟" اس کے چہرے پر جھکتے ہوئے انہوں نے لطیف سی شرارت کر ڈالی۔ اس کا پورا جسم کپکپانے لگا۔ دل پسلیوں میں پھڑپھڑانے لگا۔

اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہ پلکیں ہی اٹھا سکتی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی شرارت کرتے اسی وقت ان کا سیل بجا اس نے بے ساختہ پرسکون سانس ہوا میں خارج کیا۔ جیب سے موبائل نکال کر پہلے انہوں نے نمبر چیک کیا اور پھر آن کرتے کان سے لگا لیا۔ دوسرا ہاتھ ابھی تک اس کی کمر کے گرد حمائل تھا۔

اس نے فون کرنے والے کو دل ہی دل میں ڈھیروں دعاؤں سے نوازا اور ان کا ہاتھ ہٹاتے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں رکنے کے لیے کہہ رہے تھے مگر جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق وہ نظر انداز کرتی باہر کی طرف لپکی اور پھر ان کے ہسپتال روانہ ہونے تک وہ کچن میں مختلف کاموں میں مصروف رہی۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد اس نے کال کر کے انہیں انفارم کر دیا کہ مما نے اسے ایمرجنسی میں آنے کو کہا ہے اور وہ مما کی طرف جا رہی ہے۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے کھسکنا چاہتی تھی۔

ان دنوں وہ دو متضاد کیفیتوں کا شکار تھی۔ انہیں خفا بھی نہیں دیکھ سکتی تھی اور ان کی قربت بھی برداشت سے باہر تھی۔ اسے لگا اسے خود کو وقت دینا چاہیے۔ اسی لیے اسے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ مما اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ پاپا سے ملنے کے بعد وہ اپنے روم میں چلی آئی۔ پاؤں پر چوٹ کی وجہ سے وہ ان دنوں چھٹیوں پر تھی۔

بارڈ سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی بقول مما کے اس کا زیادہ وقت آفس میں ہی گزرتا تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹی مسلسل ڈاکٹر عائش ملک کے بارے میں ہی سوچے جا رہی تھی۔

"آخر یہ فرار کب تک، مجھے سنجیدگی سے اس رشتے کے متعلق سوچنا ہو گا۔ اگر پاپا کی عزت کی خاطر میں نے اس رشتے کو قبول کیا ہے تو پھر مجھے اپنے دل میں بھی وسعت پیدا کرنی ہو گی۔ اس سے پہلے کہ ان کے دل میں میرے متعلق کسی قسم کی بدگمانی پیدا ہو۔"

وہ آہستگی سے چلتی آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اپنے خدوخال کو بغور دیکھتے ہوئے اس کی نظر اپنے

بائیں گال پر ٹھہر سی گئی۔ صبح ڈاکٹر عائش ملک کی بے استحقاق جسارت کا سوچتے اسے گال پر بے انتہا تپش کا احساس ہوا۔ اس نے آہستہ سے اپنے گال پر ہاتھ پھیرا۔ اسی وقت مما روم میں داخل ہوئیں۔

"آئمہ بیٹا! عائش تمہیں لینے آیا ہے۔" وہ بری طرح چونکتے ہوئے مما کی طرف پلٹی تھی۔

"مجھے ابھی ان کے ساتھ نہیں جانا۔" وہ اس وقت اتنی الجھی ہوئی تھی کہ کسی صورت ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"کیا مطلب؟" مما بے ساختہ ٹھٹکیں۔

"پلیز مما۔۔۔ میں کچھ دن آپ کے اور پاپا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے مگر عائش سے بات تو کر لو۔" اس کا گریز وہ سمجھ نہیں پائیں۔

"نہیں۔۔۔ مجھے ان سے کسی قسم کی کوئی بات نہیں کرنی۔ آپ ان سے جا کر کہہ دیں کہ آپ مجھے روکنا چاہتی ہیں۔"

"سب ٹھیک تو ہے نا آئمہ!" وہ ایک دم پریشان ہو گئیں۔

"جی مما! سب کچھ ٹھیک ہے مگر میں تھوڑا وقت چاہتی ہوں۔"

"[illegible] مطلب ہے تمہارا آئمہ! صاف صاف بات کرو۔" مما کی پریشانی پر انہونے سے اندیشے غالب آنے لگے۔

"[illegible] مطلب [illegible] ہیں۔" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مما سے کس طرح بات کرے۔ پھر ہوا میں لمبا سانس چھوڑتے اس نے مما کے دونوں ہاتھ تھامے اور انہیں بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولی۔

"مما! میں خود کو کچھ وقت دینا چاہتی ہوں۔ پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔"

"میں کچھ دن۔۔۔" اس کی آواز بھرا سی گئی۔

"عائش کا رویہ تو تمہارے ساتھ ٹھیک ہے؟" اب کی بار ان کا لہجہ کچھ ٹٹولتا ہوا تھا۔

"مما! ان کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا ہے۔ یہ تین ماہ جو میں نے ان کے ساتھ گزارے ہیں۔ ان میں ان کی شخصیت کے انوکھے باب ہی مجھ پر کھلے ہیں۔ مما! وہ اتنے اچھے ہیں کہ ان کی اچھائی نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اب جب میں ان کی طرف بڑھوں تو میرے دل میں ان کا سب سے اونچا، مقدم اور الگ مقام ہو۔ وہ بہت قیمتی انسان ہیں! مما اور میں ہر طرح سے تیار ہو کر ان کے روبرو جانا چاہتی ہوں۔ میں نے دیکھا ہے انہیں خود سے زیادہ دوسروں کی پروا کرتے تو کیا میں انہیں خوشیوں کے خالص چند پل نہیں دے سکتی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے ہوئے اس کے گال بھگونے لگے۔ بہت سلجھے ہوئے انداز میں لفظوں کا چناؤ کرتے وہ مما کو بہت کچھ باور کروا چکی تھی۔

مما کو اس پر بے اختیار پیار آیا۔ کتنی سمجھ دار ہو گئی تھی وہ۔ کتنی مختلف تھی وہ آریزہ سے جو ان کی ذلت کا باعث بنتے نجانے اس وقت کہاں تھی اور ایک وہ تھی اپنے مما پاپا کی خوشی کی خاطر خود کو ایڈجسٹ کرنے کے لیے ہر طرح سے تیار کر رہی تھی۔

"مجھے تم پر فخر ہے آئمہ!" بھیگی پلکوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے اس کی پیشانی چومی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"سنو! اسے زیادہ انتظار مت کروانا۔ دوریاں بے تابیاں تو بڑھاتی ہی ہیں مگر کبھی کبھی یہ بدگمانیاں پیدا کرنے کا سبب بھی بن جاتی ہیں۔"

جانے سے پہلے وہ پلٹتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں گویا ہوئیں تو اس نے ہلکا سا مسکراتے سر اثبات میں ہلا دیا۔

✲ ✲ ✲

سارہ کا برتھ ڈے تھا اور اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے لیے کیا گفٹ خریدے۔ گفٹ شاپ پر کھڑی وہ کتنی دیر سے مختلف چیزوں کو ریجیکٹ کر رہی تھی جب اپنے قریب ابھری آواز کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میں کافی دیر سے آپ کو واچ کر رہی ہوں۔ آپ کی نظر میں کوئی چیز جچ ہی نہیں رہی۔" وہ ہلکا سا مسکرا دی۔ آئمہ بے ساختہ چونکی۔ دھیمے مسکراتے ہونٹ جبکہ آنکھوں میں ہلکورے لیتا کوئی نامعلوم درد جو اتنا گہرا تو ضرور تھا کہ ان کو ویرانیاں سونپ گیا۔

"کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟" اسے نجانے کیا ہوا تھا کہ بے اختیار ہی کہہ گئی۔

آسائش نے اس دوران پہلی بار اسے بغور دیکھا تھا۔ یہ لڑکی اسے اپنی اپنی سی محسوس ہوئی۔

"ہاں کیوں نہیں۔" وہ شائستگی سے بولی۔

"کیا میں آپ کا گڈ نیم جان سکتی ہوں؟"

"آئمہ اسد۔۔۔" یکلخت وہ رکی پھر دھیمے سے مسکراتے دوبارہ بولی۔

"ڈاکٹر آئمہ عائش ملک۔۔۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

"آسائش۔۔۔ آسائش میر۔" اس نے اس کے پھیلے ہاتھ میں آہستہ سے اپنا ہاتھ دے دیا۔

"نائس ٹو میٹ یو۔۔۔"

"سیم ٹو ہیئر۔۔۔" اور پھر دس منٹ کی بات چیت کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے اپنے موبائل نمبر دے چکی تھیں۔

"آپ بہت خوب صورت ہیں آئمہ!" باہر نکلتے ہوئے اس کے کمنٹس اسے ایک بار پھر سے مسکرانے پر مجبور کر گئے۔

"تھینکس۔۔۔ اور آپ بہت دلکش ہیں۔"

"مجھے ایسے کمپلیمنٹس پہلے کبھی کسی نے نہیں دیے۔" وہ حیران ہوئی۔

"ہوں۔۔۔ اسی لیے میں نے ایسا کہا ورنہ کمپلیمنٹس آپ نے مجھے دیے ہیں وہ آپ سے پہلے ہزاروں لوگ دے چکے ہیں۔"

وہ بہت ہلکے پھلکے انداز میں بولی جب آسائش نے اس انوکھی لڑکی کے خوب صورت خدوخال سے سجے چہرے کو دھیرے سے دیکھا اور پھر دھیمے سے مسکرا دی۔ اپنی اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے نجانے کس کیفیت کے زیر اثر دونوں نے ہی پیچھے مڑ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

✲ ✲ ✲

"آسائش! تمہیں نہیں لگتا کہ تم ایک سراب کے پیچھے اپنی زندگی برباد کر رہی ہو۔ توڑ دو اس جمود کو، باہر نکل آؤ۔ سوائے اذیت کے تمہیں کچھ نہیں ملنے والا۔"

وہ جو سر جھکائے بیٹھی تھی۔ آہستہ سے سر اٹھا کر سامنے دیکھنے لگی۔ سامنے کچھ فاصلے پر کھڑے محو گفتگو شخص پر اسے کسی کا گمان گزرا۔ کتنی دیر وہ ساکت انداز میں سامنے دیکھتی رہی جب وہ شخص بیرونی گیٹ کی طرف بڑھا تو اس نے تیزی سے اٹھتے ہوئے اس کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ جبکہ سارہ ہکا بکا اسے دیوانہ وار مین گیٹ کی طرف بھاگتے دیکھ کر خود بھی اس کے پیچھے لپکی۔

"کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔ کیوں پاگلوں کی طرح بھاگ رہی ہو۔" اسے راستے میں ہی وہ دونوں کندھوں سے جھنجوڑتے بولی۔

"سارہ، سارہ میں نے اسے دیکھا۔۔۔ سارہ آج میں نے اسے پانچ سالوں بعد دیکھا۔ وہ ہی تھا سارہ، وہ بالکل نہیں بدلا، وہ ویسا ہی ہے۔"

اس کی بانہوں میں مچلتے ہوئے وہ ایک ہی سانس میں بولی تو سارہ نے بے اختیار ارد گرد نظر دوڑائی دور دور تک اسے کسی شخص پر بھی اس کا گمان نہ گزرا۔

"آسائش! تم پاگل تو نہیں ہو گئی کہاں ہے وہ؟" اسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔

"سارہ! میرا یقین کرو میں نے اسے ہی دیکھا تھا۔ میں اس کی طرف بھاگی بھی تھی مگر میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ مین گیٹ سے ہوتا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس۔۔۔ اس کا مطلب ہے سارہ کہ وہ اسی شہر میں ہے۔ اب میں اسے ضرور ڈھونڈ لوں گی۔"

سارہ نے اس کے لرزتے وجود کو آہستہ سے تھاما۔

"اگر واقعی تم نے اسے دیکھا ہے تو ہم اسے ضرور

ڈھونڈ نکالیں گے۔ اپنی دوست کی حالت پر اس کی آنکھیں بھی اشک بار ہو گئیں۔ پھر اس نے مین گیٹ کی طرف بڑھتے پارک میں موجود لوگوں پر سرسری سی نظر ڈالی' کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہ تھا۔

اور پھر اک موہوم سی امید کے تحت وہ روز پارک آنے لگی۔ کبھی سارہ اس کے ساتھ ہوتی اور کبھی وہ تنہا ہی نکل پڑتی۔

"اللہ جی مجھے صرف ایک دفعہ اس سے ملوا دے۔ میں تیرا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔" آسمان کی وسعتوں میں نظریں دوڑاتے وہ دل کی تمام شدتوں کو زبان پر لے آتی مگر پھر ہر بار مایوس لوٹتے ہوئے بھی اس کے دل کی امید نہیں ٹوٹتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"انسانوں کو اپنی خواہشوں کے پیچھے پاگل نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس کے ہاتھ سوائے پچھتاووں کے کچھ نہیں آتا اور پچھتاوے بھی ایسے جو کسی زہریلے ناگ کی طرح اس کی پوری زندگی کی آسودگی کو نگل جاتے ہیں۔ خواہش ضرور کرو مگر اس کے پیچھے دیوانہ وار بھاگنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لو کہ آپ کی خواہش کہیں آپ کی پوری زندگی کو تو تباہ نہیں کر رہی۔ محبتوں کا احساس بھی اس وقت ہوتا ہے جب وہ آپ سے چھن جاتی ہیں۔ اپنوں کی چاہت اس وقت رلاتی ہے جب اپنوں کا ساتھ نہیں ملتا۔"

اس کی آنکھیں آنسو چھلکانے لگیں تو اس نے اپنا چہرہ بلیک بورڈ کی طرف موڑ لیا۔ سب بچیاں خاموشی سے اپنی ٹیچر کی کمر پر جھولتی چوٹی کو دیکھتی رہیں۔ انہیں اپنی یہ ٹیچر بہت پسند تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر بولنے والی۔ اچھے برے میں تمیز بتانے والی۔

"مس! آپ کو میڈم بلا رہی ہیں۔" چپراسی کی آمد پر وہ سر اثبات میں ہلاتے آفس کی طرف بڑھ گئی۔

"مے آئی کم ان میم۔"

"ہاں آؤ آؤ۔" وہ جو کچھ لکھنے میں مصروف تھیں سر اٹھاتے ہوئے بولیں۔

"آپ نے مجھے بلایا......"

"ہاں بیٹھو۔"

"اس ٹرم میں آپ کی کلاس کا رزلٹ بہت شاندار رہا ہے۔ اگر آپ اسی طرح محنت کرتی رہیں تو اس سال بیسٹ ٹیچر کا ایوارڈ ضرور ون کرلیں گی۔" وہ خوش دلی سے بولیں تو وہ دھیمے سے مسکرا دی۔

"تھینک یو میم۔"

"آپ ایک بہت اچھا اضافہ ہو ہمارے اسکول میں۔ یقیناً" بہت جلد آپ اپنا الگ مقام بنا لیں گی۔" میڈم کے ہونٹوں سے نکلنے والا ہر تعریفی لفظ اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

آفس سے باہر آنے تک اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ اسی دھند میں وہ ٹھیک سے دیکھ نہ سکی اور کسی سے بری طرح ٹکرائی۔

"او آئی ایم سوری سر! میں آپ کو دیکھ نہ سکی۔" مقابل نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس کی آنکھیں اس کے سوگوار حسن پر جم کر رہ گئی تھیں جبکہ وہ اس سب سے بے خبر دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑتی اس کے قریب سے گزرتی ہوئی اپنی کلاس کی طرف بڑھ گئی۔

"لڑکی میں کچھ بات تو ضرور ہے۔" ہلکا سا بڑبڑاتے ہوئے وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

"مما! یہ جو تھوڑی دیر پہلے آپ کے روم سے لڑکی نکلی وہ کون ہے؟" اندر آتے ہی اس نے پوچھا تو میڈم نے آنکھوں سے چشمہ ہٹاتے ہوئے اسے زبردست گھوری سے نوازا۔ وہ اچھا خاصا بوکھلا کر رہ گیا۔

"وہ... وہ میرا مطلب ہے کہ پہلے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔" کان کھجاتے اس نے ترچھی آنکھوں سے ان کے تاثرات نوٹ کرنے چاہے جو پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو چکی تھیں۔ اپنے بیٹے کی حسن پرست طبیعت سے وہ اچھی طرح واقف تھیں۔

"کس لیے آئے ہو؟" کام ختم کرتے ہوئے وہ سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"آپ تو جانتی ہی ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے

ان کی طرف دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

بہت دنوں بعد آج اس کا سامنا بارز عباد سے ہوا تھا۔ ایک پل کے لیے دونوں کی نظریں ٹکرائی تھیں مگر پھر لمحے کے ہزارویں حصے سے بھی پہلے دونوں نے اپنی اپنی نظروں کا زاویہ بدلا۔

"کھانا لگاؤں؟" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا جب اس نے پوچھا۔

"نہیں... مجھے بھوک نہیں ہے۔" آہستہ سے کہتے ایک دفعہ پھر سے اس کے قدم اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے بارز!" پیچھے سے آتی اس کی مدھم آواز پر اس کے قدم یکلخت رکے۔ کچھ دیر وہ اس کی طرف پشت کیے ہی کھڑا رہا پھر آہستہ سے چلتے سامنے موجود صوفے پر جا بیٹھا۔

"بارز! یہ کیا حرکت ہے۔ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" اس نے نظریں اٹھائیں۔ استفہامیہ نظروں میں صاف درج تھا کہ وہ اس کی بات نہیں سمجھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو بغور دیکھنے لگی۔

"اگر میں آپ کو اتنا ٹوٹا بکھرا اور شکست خوردہ دیکھوں گی تو پھر اپنی ازدواجی زندگی میں سکون سے نہیں رہ پاؤں گی۔ کتنے بڑے بڑے دعوے کیے تھے آپ نے یاد کیجیے اپنے وہ الفاظ جب آپ نے کہا تھا کہ میں زندگی گزاروں گا اور جیوں گا بھی۔ کیا ایسے زندگی جی جاتی ہے؟ آپ نے تو میرے اور حالات سے سمجھوتا کرنے کے لیے بڑی توانائیاں بھری تھیں اور آج آپ کو اتنا منتشر دیکھ کر میرے دل پر کیا گزر رہی ہے کاش آپ اس کا اندازہ لگا سکتے۔"

اس کی آواز میں نمی سی گھلتی گئی۔ بارز نے چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ نے تو کہا تھا کہ جب بھی میں آپ کے سامنے آؤں گی آپ کی آنکھوں میں احترام ہوگا مگر اس سے بھی بہتر تھا کہ آپ مجھے کہتے کہ میں ساری زندگی کبھی آپ کے سامنے نہ آؤں۔ مجھ میں حوصلہ نہیں ہے آپ کی آنکھوں کی ویرانیاں سہنے کا۔ کیوں اس طرح کے بی ہیویئر سے مجھے تکلیف دے رہے ہیں کیوں میرے لیے زندگی مزید تنگ کر رہے ہیں۔ جانتے ہیں مما پاپا کو آپ کی کتنی ضرورت ہے۔ وہ منہ سے نہیں کہتے کیونکہ وہ آپ کی اندرونی توڑ پھوڑ سے آگاہ ہیں مگر ان کی نظریں جب بھی آپ کی طرف اٹھتی ہیں ان میں ایک حسرت ہوتی ہے' آپ کو خوش دیکھنے کی حسرت۔ میں نے کہا تھا کہ ہم محبت کو خود پر ہنسنے کا موقع نہیں دیں گے۔ بہادر بن کر دکھائیں گے۔ کیا ایسی ہوتی ہے بہادری۔ جو درد آپ کو ملا ہے' میں بھی تو اسی درد سے گزری ہوں۔"

اس کی آنکھیں آنسو برسانے لگیں۔ بارز ساکت بیٹھا یک ٹک اس کے منقش چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ دوپٹے کے پلو سے بے دردی سے آنکھیں رگڑنے لگی۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ آج بھی ان آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔

"آئی ایم سوری آنیہ! فار ایوری تھنگ اور تھینکس میری غلطی کا احساس دلانے کے لیے۔" کافی دیر بعد وہ بولا تھا۔

"آئندہ تایا ابو' تائی امی اور تمہیں مجھ سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں بھول گیا تھا کہ جس درد سے میں گزر رہا ہوں وہی درد تم نے بھی سہا ہے۔ میں خود کو بدلنے کی پوری کوشش کروں گا۔ تم دیکھنا آئندہ میں تمہاری آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھوں گا۔" یک لخت وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تھینکس بارز!" دھیما سا مسکراتے ہوئے وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ بھی ہلکا سا مسکرایا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

صبح وہ بالکل الگ روپ میں ان کے سامنے آیا تھا۔ مما پاپا کے ساتھ باتیں کرتے دھیرے دھیرے مسکراتے بارز عباد کو اس نے کافی مطمئن نظروں سے دیکھا تھا۔

میرے اللہ سے سچے دل سے یہ دعا ہے بارز! اللہ وہ ایسی لڑکی کو آپ کی زندگی میں بھیجے جو آپ کے اندر کی ساری تلخی سمیٹ لے اور آپ کی آنکھوں میں محبت کا اک نیا جہان آباد کردے۔" آسمان کی وسعتوں میں دیکھتے ہوئے اس نے دل کی تمام تر گہرائیوں سے دعا کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ایکسکیوزمی مس! میری بات تو سنیں۔" وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اگر وہ بروقت نہ رکتی تو یقیناً" اس سے ٹکرا جاتی۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

"مسئلہ کیا ہے آپ کے ساتھ کیوں مجھے پریشان کر رہے ہیں؟"

"آپ میرا مسئلہ اچھی طرح جانتی ہیں۔" وہ ڈھٹائی کی ساری حدوں کو پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح اس سے اپنا پیچھا چھڑائے۔

"دیکھیے مسٹر۔۔۔ آپ جس طرح کی لڑکی مجھے سمجھ رہے ہیں' میں ویسی نہیں ہوں۔ پلیز بار بار میرے راستے میں آنا اور مجھے پریشان کرنا چھوڑ دیں۔ آپ میڈم کے بیٹے ہیں اسی وجہ سے میں اب تک آپ کی بدتمیزی برداشت کرتی آرہی ہوں' ورنہ آپ کا منہ توڑنا بھی میں بخوبی جانتی ہوں۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

"اچھا تو تم میرا منہ توڑو گی۔ ہو کیا چیز تم' میں تمہیں اپنی برداشت سے بہت زیادہ ٹائم دے چکا ہوں۔ سیدھی طرح سے میری بات مان لو ورنہ مجھے زبردستی بھی کرنی آتی ہے۔"

ایک دم ہی اس نے شرافت کا چولا اتار پھینکا تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر وہ اچھی خاصی گھبرا گئی۔ ایک سہمی ہوئی نظر اس کے سنجیدہ چہرے پر ڈال کر وہ تقریباً" دوڑنے والے انداز میں بس کی طرف بڑھی تھی۔ اس معاشرے میں عزت سے جینا کتنا مشکل تھا اسے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا۔ اسے ایک دفعہ پھر سے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔

☼ ☼ ☼

دروازہ کب سے بج رہا تھا مگر وہ سستی سے لیٹی رہی۔ صبح سے ہی اس کی طبیعت کافی خراب تھی۔ سر بری طرح سے چکرا رہا تھا وہ خود میں ذرا بھی ہمت نہیں پا رہی تھی کہ اٹھ کر دروازہ ہی کھول دیتی مگر دروازہ پیٹنے والا بھی کوئی ڈھیٹ ہی واقع ہوا تھا۔ بیزاری سے اٹھتے ہوئے اس نے بغیر دیکھے ہی دروازہ کھول دیا مگر پھر جو شخص اسے نظر آیا اسے دیکھتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ خوف سے پورے جسم میں اک پھریری سی دوڑ کر رہ گئی۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کرنا چاہا جب وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

دروازہ بند کرتے وہ اسے گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا اور پھر کسی بے جان گڑیا کی طرح اسے بیڈ پر لا پٹخا۔ وہ اس حد تک خوف زدہ ہو گئی کہ چند لمحوں کے لیے تو بول ہی نہ سکی۔

"تم پر میں ضرورت سے زیادہ وقت برباد کر چکا ہوں مگر تمہاری بے جا ضد نے مجھے یہ سب کرنے پر مجبور کیا ہے۔ کیا سمجھتی ہو تم کہ مجھ سے بچ سکتی ہو۔ ارے شہریار عارف کی نظر جس کبوتری پر پڑ جائے وہ اتنی آسانی سے اسے نہیں چھوڑتا۔"

اس کے دوپٹے کے بغیر وجود کو حریص نظروں سے دیکھتے وہ خباثت ۔۔۔ مسکرایا۔ اس نے بے ساختہ خشک ہونٹوں پر زبان ۔۔۔ی۔ تنہا عورت کا اس دنیا میں عزت سے جینا کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ اسے بخوبی ہو چکا تھا۔ ا۔۔۔ بیڈروم میں خود سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا دیکھ ۔۔۔ اس کی ساری اکڑ کہیں دور جا سوئی تھی۔ یہ وقت ۔۔۔ سے نہیں بلکہ عقل سے کام لینے کا تھا۔ ہوش گنوا کر ۔۔۔ اپنی عزت سے ہاتھ دھو سکتی تھی۔

"دیکھو شہر۔۔۔م جیسی لڑکی مجھے سمجھ رہے ہو میں ویسی نہیں ہوں۔ وقت کی ستائی ہوئی ہوں' عزت سے جینا چاہتی ہوں۔ پلیز میری زندگی میرے لیے مزید تنگ مت کرو۔ میرے پاس جینے کے لیے کچھ تو رہنے دو۔"

آنسو بہاتے ہوئے اس نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"کیوں پریشان ہوتی ہو جانم میں ہوں نا' تمہارے سب دکھ دور کردوں گا۔"

وہ ہوس ناک نظریں اس کے کپکپاتے وجود پر جمائے بیڈ کی طرف بڑھا۔ خود کو مکمل طور پر بے بس محسوس کرتے اس نے چیخنا چاہا جب اس کا ہاتھ تیزی سے اس کے ہونٹوں کو دبا گیا۔ اس نے زور سے اس کے ہاتھ پہ دانت گاڑ دیے ہاتھ ہٹنے میں لمحہ لگا۔ وحشت و خوف سے پھیلی آنکھیں اسے مزید دیوانہ کر گئیں۔

"پلیز پلیز مجھے چھوڑ دو۔۔۔ تمہیں اللہ کا واسطہ ہے۔" گھٹی گھٹی آواز میں وہ گڑگڑائی مگر پھر بھی اس کی آنکھوں میں اسے ذرہ برابر رعایت نظر نہ آئی۔

"تم جیسے شیطان کو اللہ بھسم کیوں نہیں کردیتا۔ ڈرو رب کے قہر سے اور اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ۔" کوئی راہ فرار نہ پا کر وہ زہر خند انداز میں پھنکاری تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"میں کب سے حیران تھا کہ آخر کہاں گئی تمہاری اکڑ' تمہارا غصہ۔۔۔ یہی تمہارا غصہ تو مجھے پاگل کردیتا ہے کہ میں حواس کھونے لگتا ہوں۔ دیوانہ کردیتا ہے تمہارا یہ روپ۔" کلائی سے دبوچتے ہوئے اس نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ وہ اس کی بانہوں کے گھیرے میں بن پانی کے مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔

"اے اللہ میری مدد کر۔ اس شیطان سے مجھے بچالے۔" آخری لمحوں میں ہچکیوں سے روتے ہوئے اس نے دل کی تمام تر شدتوں سے اللہ کو آواز دی تھی۔ اور اللہ نے بھی اپنے بے بس انسان کو تنہا نہ چھوڑا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑے گلدان سے جیسے ہی اس کا ہاتھ ٹکرایا اس نے اٹھاتے ہوئے پوری طاقت سے اس کے سر پر دے مارا۔ کراہتے ہوئے جیسے ہی اس کی گرفت ڈھیلی پڑی وہ پھرتی سے دروازہ کھولتے ہی باہر کی طرف دوڑی۔ رات کی تیرگی چہار سو چھا چکی تھی۔ سڑک پر آتے ہی اس نے اندھا دھند بھاگنا

شروع کردیا جب کسی گاڑی سے بری طرح ٹکرائی اور پھر کٹی پتنگ کی طرح سڑک پر گرتے ہی وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

اسے جب ہوش آیا تو اس نے خود کو بیڈ پر لیٹے ہوئے پایا۔ کتنی دیر وہ سیدھی لیٹی چھت کو گھورتی رہی پھر جیسے ہی گردن موڑ کر دائیں طرف دیکھا اس کی آنکھیں ساکت رہ گئیں۔

"م۔ مما!" کتنی دیر کے بعد اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور آنکھیں پانیوں سے بھرتی چلی گئیں جبکہ سنبل بیگم لب بھینچے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ وہ سرعت سے اٹھی اور ان کے قدموں میں سر رکھ کر زاروقطار رونے لگی۔

"مجھے معاف کردیں مما! پلیز مجھے معاف کردیں۔ میں بہت بری ہوں۔"

اس کی حالت کے پیش نظر انہوں نے آہستہ سے اسے اٹھاتے ہوئے بیڈ پر بٹھا دیا۔ اس کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی جس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"تم لیٹ جاؤ' تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" سنجیدگی سے کہتے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے اک تاسف بھری نظر اس کے سسکتے وجود پر ڈالی ان کی ممتا اسے خود میں سمونے کے لیے مچلنے لگی مگر وہ سختی سے اپنے خواہش کو اندر ہی دباتے باہر کی طرف بڑھ گئیں جبکہ اریزہ گھٹنوں میں سر دیے سسک پڑی۔

☼ ☼ ☼

اسے گھر لوٹے ہفتہ ہو گیا تھا۔ اس نے سب سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی مگر ابھی تک سب کا رویہ اس کے ساتھ کافی سرد تھا۔ بارز عباد نے تو اس کی طرف دیکھنا بھی گناہ تصور کرلیا تھا۔ آئمہ کی ڈاکٹر عائش ملک کے ساتھ شادی کا سن کر اسے ازحد دکھ ہوا تھا۔ اس کی غلطی کی وجہ سے آئمہ کو اپنی محبت کی قربانی دینی پڑی تھی۔ ان دونوں کی محبت کی تو وہ خود گواہ تھی اور بارز عباد۔۔۔ وہ کتنا بدل گیا تھا۔ پہلے سی شوخی شرارت تو جیسے

اس میں مقفود ہو کر رہ گئی تھی۔
"میری وجہ سے ہی دونوں الگ ہوئے ہیں نا! اب میں ہی دونوں کو ملواؤں گی۔" آنکھیں موندے ہوئے اس نے ڈاکٹر عائش ملک سے بات کرنے کے بارے میں سوچا۔
صبح فجر کی نماز پڑھ کر وہ جیسے ہی لاؤنج میں آئی آئمہ کو پہلے ہی کرسی پر براجمان پایا۔
وہ آنکھیں بند کیے کرسی کی بیک پر سر ٹکائے ہوئے تھی۔ کتنی کمزور اور زرد سی لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے بھی نمایاں ہونے لگے تھے۔
اس کے دل کو بے ساختہ کچھ ہوا۔ اپنی چھوٹی بہن کی اندرونی حالت کا اندازہ اسے کسی حد تک ہو چکا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی موجودگی محسوس کرتے آئمہ نے آنکھیں کھول دی تھیں۔
"مجھے معاف کر دو آئمہ! میں نے تمہارے اور بازو کے ساتھ بہت برا کیا مگر میرا یقین کرو ایسا میں نے کبھی نہیں چاہا تھا۔ میری ایک خواہش نے بہت سی زندگیوں کو برباد کر دیا۔" اس کی آواز نم ہونے لگی۔
"جو قسمت میں لکھا تھا وہ تو ہو کر رہنا تھا۔" وہ بہت آہستہ سے بولی تھی۔
"میں خالی ہاتھ رہ گئی ہوں آئمہ! میرے دامن میں کچھ نہیں بچا۔"
"محبت سے بچھڑنے کا درد کتنا پراذیت ہوتا ہے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اپنی قسمت میں تو یہ درد میں نے خود لکھوایا ہے مگر میں تمہیں یہ درد نہیں سہنے دوں گی۔" آئمہ بری طرح چونکی۔
"کیا مطلب؟" اس کے اردگرد عجیب سے خدشے رقص کرنے لگے۔
"تم اور بازو... میں ملواؤں گی تمہیں۔"
"یہ... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" وہ اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کہہ دے گی اسے یقین نہ آیا۔
"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں آئمہ! میں جس تکلیف سے گزر رہی ہوں۔ نہیں چاہتی کہ تم دونوں بھی وہی تکلیف وہی درد برداشت کرو۔"

"آپ... آپ محبت کرتی ہیں عائش سے؟" کافی دیر بعد وہ بولی۔ اسے اپنی آواز دور کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔
"ہاں... بہت زیادہ محبت کرتی ہوں۔ میری ایک غلطی نے مجھ سے میری محبت چھین لی۔ میرے اپنے پیاروں کو مجھ سے دور کر دیا۔"
وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ کتنی دیر خالی خالی نظروں سے اس کے سسکتے وجود کو دیکھتی رہی اور پھر خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
اب کہنے سننے کو کچھ نہ بچا تھا۔ اسے اپنا وجود ٹکڑوں میں کٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ ساری رات ایک لمحے کے لیے بھی اس کی آنکھ نہ لگی۔ صبح ہوتے ہی اس نے سب سے پہلا کام ڈاکٹر عائش ملک کو فون کرنے کا کیا۔

✼ ✼ ✼

وہ کب سے اس کا انتظار کر رہے تھے جب اسے گلاس ڈور دھکیل کر اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے قریب پہنچ کر بہت آہستگی سے اس نے سلام کیا تھا۔ وہ خاموشی سے یک ٹک اس کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ اس چہرے کو پندرہ دنوں کے بعد دیکھ رہے تھے اور یہ پندرہ دن انہوں نے کیسے گزارے تھے یہ صرف وہ ہی جانتے تھے۔ آنکھیں تھیں کہ اس کے چہرے پر سے ہٹنے کو تیار ہی نہ ہو رہی تھیں۔ دل کیا وہ اس کا ہاتھ تھامیں اور ان مسکراتے چہروں سے کہیں دور خوابوں کے نگر لے جائیں۔ جہاں کوئی ذی روح نہ ہو۔ وہ ہوں اور چاہت کی خوشبو میں مہکتا اس کا وجود ہو۔ کیسی وارفتگی و بے خودی تھی کہ چند پلوں کے لیے وہ خود سے بھی غافل ہو گئے۔
ان کی محویت پر وہ بے وجہ ہی انگلیاں موڑتے اردگرد دیکھنے لگی۔

"مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے جیسے ان کے تسلسل کو توڑنا چاہا۔ وہ بری طرح چونکے اور پھر اثبات میں سر ہلاتے اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گئے۔
"ہاں کہو... کیا کہنا چاہتی ہو؟" وہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکے تھے۔ انداز نرم مگر سنجیدگی سے پر تھا۔ نظریں جھکاتے ہوئے وہ اپنے اضطراب پر قابو پانے لگی۔
انہوں نے بہت گہری نظر اس کے متذبذب چہرے اور جھکے سر کی سیدھی مانگ پر ڈالی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ عماد نے انہیں کیا کہا تھا مگر ان کے سنجیدہ خدوخال ان کی ناراضی کا بہت آسانی سے پتہ دے رہے تھے۔
"آپ مجھ سے ناراض ہیں؟"
کہنا کچھ چاہتی تھی مگر کہہ کچھ گئی۔
"تمہیں میری ناراضی کی پروا ہے؟" لہجہ سادہ تھا مگر اس کے باوجود وہ اندر تک شرمندہ ہو گئی۔
"میں تمہاری ابی ہیویئر سمجھ نہیں پا رہا آئمہ! جو تمہارے دل میں ہے وہ مجھے صاف صاف بتا دو مگر پلیز یہ آنکھ مچولی کا کھیل بند کر دو۔" اس کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے وہ بہت سنجیدگی سے بولے تھے۔ اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔
"اریزہ آپی واپس آ چکی ہیں۔" اپنی طرف سے اس نے ایک ہی جملے میں کافی کچھ باور کروا دیا۔ وہ چونکے مگر پھر اگلے ہی پل پرسکون انداز میں گویا ہوئے۔
"تو...؟" لہجہ اتنا ہموار تھا کہ اس دوران پہلی بار اس نے ان کی آنکھوں میں براہ راست دیکھا جہاں اس کے ساتھ کی طلب واضح بھی ہوا سے نظریں چرانے پر مجبور کر گئی۔ اس کے اندر عجیب سی توڑ پھوڑ ہونے لگی۔ بہت مشکل سے اس نے اس توڑ پھوڑ کو باہر آنے سے روکا۔
"انہیں اپنی غلطی کا احساس ہے۔ بہت پچھتا رہی ہے۔ بالکل ٹوٹ چکی ہے۔ مگر کوئی بھی پہلے والی جگہ دینے کو تیار نہیں۔"

"مجھے کسی وضاحت کی، کسی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ یہ سب آخر تم مجھے کیوں بتا رہی ہو۔ اگر تم صرف اور صرف اپنے بارے میں بات کرو گی تو زیادہ بہتر ہو گا۔" بولنے کے دوران ہی انہوں نے اسے ناگواری سے ٹوک دیا۔
اس کی آنکھوں کی سطح گیلی ہونے لگی۔ پلکیں جھپک جھپک کر اس نے سارے آنسو اندر ہی کہیں اتار لیے۔
"وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہیں اور آپ کی زندگی میں لوٹنا چاہتی ہیں۔"
"وات...!" ان کے ماتھے پر شکنوں کا جال بننے لگا۔ وہ اپنی زندگی میں بہت کم غصے میں آتے تھے مگر اس وقت انہیں شدید غصہ آیا۔ اریزہ پر نہیں بلکہ آئمہ پر جو اس کی وکالت کرنے ان کے روبرو آ بیٹھی تھی۔
"محبت... کیا جانتی ہو تم محبت کے بارے میں؟" بھرپور طنزیہ نظروں سے انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ یہ ان کی شخصیت کا خاصا تو نہ تھا مگر اس وقت وہ جس کیفیت کے زیر اثر تھے ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس چھوٹی سی لڑکی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے جو ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے نمک پاشی کر رہی تھی۔
"وہ آپ سے شدید محبت کرتی ہیں عائش! مکمل طور پر ٹوٹ چکی ہیں۔ آپ کے سہارے کی ضرورت ہے انہیں۔" نہ چاہنے کے باوجود اس کی آواز بھیگ گئی۔
"بہت فکر ہے تمہیں دوسروں کی۔ کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ تم خود کیا چاہتی ہو اور کبھی یہ جاننے کی کوشش کی تم نے کہ میں کیا چاہتا ہوں؟"
بہت کٹیلا لہجہ تھا جو برچھی کی طرح اس کے اندر تک اتر گیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ انہوں نے لحہ میں اپنے لہجے پر قابو پایا۔ یہ سچ تھا کہ اس کے آنسو انہیں اب بھی بہت تکلیف دے گئے تھے۔ چند لمحوں میں ہی انہوں نے خود کو کمپوز کیا اور پھر نرمی سے اس کے ٹیبل پر پڑے ہاتھ پر اپنا ہاتھ

رکھ دیا۔

"تم نے کبھی اپنے بارے میں سوچا ہے کہ اس کے بعد تمہارا کیا ہوگا؟"

"میں رہ لوں گی آپ کے بغیر۔" سوال سوں کرتے وہ تیزی سے بولی۔

اسی دوران وہ پہلی بار مسکرائے۔

"مگر میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" بالآخر انہوں نے اسے سچائی بتانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ وہ بری طرح چونکی تھی۔

"محبت کرتا ہوں میں تم سے۔ شدید محبت۔ اب سے نہیں بہت پہلے سے۔ جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تب سے یہاں دھڑکتی ہو تم۔" انہوں نے دل پہ ہاتھ رکھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ کیسا اقرار تھا کیسا ادراک تھا۔ کیسی آگہی اس کی سن ہوتی سماعتوں میں انڈیلی گئی تھی کہ وہ سر سے پیر تک بھونچکا کر رہ گئی۔ یقین و بے یقینی کے درمیان معلق اس نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا۔ اس کا اندر مکمل پرسکون تھا۔ جیسے وہ کچھ ایسا ہی ان کے ہونٹوں سے سننا چاہتی ہو۔ وہ اور نجانے کیا کیا کہہ رہے تھے۔

"کیسے، کیسے میں تمہاری جگہ کسی اور کو دے سکتا ہوں۔ جبکہ میرے وجود کی تکمیل ہی تمہارے احساس سے ہوتی ہے۔ زندگی میں پہلی بار میں نے شدت سے اللہ کو پکارا تھا۔ صرف اور صرف تمہیں مانگنے کے لیے اور دیکھو اس نے مجھے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔ جس کی لگن سچی ہوتی ہے وہ پا جاتا ہے۔ اللہ اسے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔"

وہ خود میں مگن کہہ رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی۔

"تو کیا میری اور بارز کی لگن میں کہیں کوئی کمی رہ گئی تھی۔"

"تم میری اولین آرزو ہو آئمہ! تمہارے بغیر میں جینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ چلو گھر چلتے ہیں۔ بہت امتحان لے لیا تم نے میری برداشت کا۔ بہت آزمالی میری محبت، بہت فاصلے پیدا کر لیے اب اور نہیں ــ چلو آؤ گھر چلتے ہیں۔"

وہ نرمی سے بولے جب وہ آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دلکشی سے مسکرا دیے۔ اس نے خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے مگر پھر جب وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھی تو وہ حیران سے اس کے قریب آئے۔

"کیا ہوا گھر نہیں چلنا کیا؟"

"آئی ایم سوری عائش! مگر میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکتی۔"

کھوئی کھوئی کیفیت میں کہتے اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ جبکہ وہ بت بنے کتنی دیر اس رستے پر نظریں جمائے کھڑے رہے جہاں سے اس کی گاڑی گزر گئی تھی۔ انہیں ایسے لگا جیسے وہ ان کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل کر چلی گئی ہو۔ ان کے اندر درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ محبت ہر بڑے سے بڑے انسان کو اسی طرح حقیر بنا دیا کرتی ہے۔ وہ اپنے نڈھال قدموں کو گھسیٹتے گاڑی کی طرف بڑھے تھے۔

☼ ☼ ☼

"اریزا! آپی آپ عائش کی زندگی میں واپس جانا چاہتی ہیں؟" شام کو وہ ان کے کمرے میں بیٹھی پوچھ رہی تھی۔

"میں تمہیں اور بارز کو ملوانا چاہتی ہوں۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"یہ ہی تمہارے سوال کا جواب ہے۔" اس نے جواب پر بھرپور زور دیتے کہا تو وہ الجھے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی پھر آہستہ سے بولی۔

"میرے اور بارز کے درمیان اب کچھ نہیں رہا۔ میں کبھی بھی بارز کی زندگی میں لوٹنا نہیں چاہوں گی۔ چاہے عائش میری زندگی میں رہیں یا نہ رہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔ اریزا نے بری طرح چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کے مضمحل و پژمردہ وجود پر اس کی نظریں گڑی گئیں۔ چند لمحوں کا ارتکاز اس پر بہت کچھ منکشف کر گیا۔

"جاننے لگی ہو تم عائش کو، ہے نا! یہ ہی بات ہے نا اور پلیز مجھ سے جھوٹ مت بولنا مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا ہی ہے۔" وہ مضبوطی سے بولی۔

اس کا ٹوٹا بکھرا نڈھال وجود بہت کچھ عیاں کر رہا تھا۔ اس نے پرنم آنکھیں اٹھائیں اور اس کی آنکھوں میں ڈاکٹر عائش ملک کا ڈولتا عکس اتنا صاف شفاف ضرور تھا کہ اریزا دھیرے سے مسکرا دی۔

"پاگل لڑکی! ایک دفعہ پھر میری وجہ سے قربانی دینے چلی تھیں۔ یہ سچ ہے کہ میں عائش سے محبت کرتی ہوں مگر ان کی زندگی میں لوٹنے کے بارے میں، میں نے کبھی نہیں سوچا۔ میں ان کے قابل نہیں ہوں۔ ان جیسا نائس بندہ مجھ جیسی لڑکی ڈیزرو نہیں کرتا۔"

آئمہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"پاگل..... ایک دم پاگل ہو تم بھی۔" اس نے اسے گلے سے لگا لیا۔ "جو اندھا دھند اپنی خواہشوں کے پیچھے بھاگتے ہیں یہ سب تو پھر ان کے ساتھ ہونا ہی ہوتا ہے۔ میں تو اللہ کی شکر گزار ہوں کہ اس نے میری عزت کی حفاظت کی۔ عائش بہت نائس انسان ہیں اور تم جیسی لڑکی ایسے ہی نائس بندے کو ڈیزرو کرتی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے پرفیکٹ ہو۔ دیکھنا اللہ تعالیٰ نے بارز کے لیے بھی کوئی نہ کوئی بنایا ہوگا۔ جو اس کے سب دکھ سمیٹ لے گی جو اسے اتنی محبت دے گی کہ بارز اسے چاہنے پر مجبور ہو جائے گا اور میری تم فکر نہ کرو آئمہ! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس مجھے ہر صورت اپنا مقام واپس لینا ہے۔ مما پاپا کے دلوں میں اپنی وہی جگہ تلاشنی ہے اور جب میں وہ جگہ تلاشنے میں کامیاب ہو گئی تو پھر ان کی پسند سے کہیں شادی بھی کر لوں گی۔"

"یہ تھوڑا مشکل تو ضرور ہے مگر ناممکن نہیں مگر جو تم کرنے چلی تھیں وہ کسی صورت ٹھیک نہیں۔ تمہارا دل ہر کسی کے لیے صاف ہے۔ میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تمہیں اتنی خوشیاں دے کہ تمہارا دامن کم پڑ جائے۔"

اس نے صدق دل سے اپنی چھوٹی بہن کو دعا دی۔

آئمہ اس کے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☼ ☼ ☼

صبح سے ہی اس کا دل کافی بوجھل تھا۔ کہیں دل نہیں لگ رہا تھا۔ رہ رہ کر ڈاکٹر عائش ملک کا افسردہ چہرہ نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ کئی دفعہ انہیں فون کرنے کے بارے میں سوچا مگر پھر خود میں ہمت ہی نہ پائی۔ دل کا بوجھل پن جب بڑھنے لگا تو وہ قریبی پارک میں چلی آئی اور یہاں اس کی ملاقات ایک دفعہ پھر سے آسائش میر سے ہو گئی۔

"آپ ــ؟ کیسی ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا تو وہ افسردگی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"آپ سنائیں آپ کیسی ہیں؟" وہ خاموشی سے نظریں جھکا گئی۔ شاید اس سوال کا جواب دونوں کے پاس ہی نہ تھا۔

"آسائش! اگر تم بھروسہ کرو تو اپنا درد مجھ سے کہہ سکتی ہو۔" فاصلوں کی دیوار گراتے وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ اس کے اپنائیت بھرے انداز کو اس نے دل سے محسوس کیا تھا نجانے کیوں مگر یہ احساس اسے بہت اچھا لگا تھا۔

"اگر میں بھی تم سے یہ ہی کہوں تو؟"

اس نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر سب کہتی چلی گئی۔ بارز عباد کا ذکر وہ جان بوجھ کر گول کر گئی۔ جس کہانی کو وہ اپنے تئیں ختم کر چکی تھی۔ اسے بھی دوبارہ کریدنا نہیں چاہتی تھی۔

"تمہیں اپنے شوہر کے پاس لوٹ جانا چاہیے آئمہ! اب جبکہ تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔" پوری بات سننے کے بعد اس نے مخلصانہ مشورہ دیا۔

"میں بھی واپس جانا چاہتی ہوں آسائش! مگر خود میں ہمت ہی نہیں پا رہی۔ میں نے ان کے ساتھ بہت برا کیا۔ آخری ملاقات میں انہوں نے جن نظروں سے مجھے دیکھا تھا وہ نظریں میں ہر وقت اپنے اردگرد محسوس کرتی ہوں۔ وہ درد بھرا تاثر ــ میں اب تک فراموش

نہیں کر سکی۔ وہ اس کی لپیٹ میں چمکتا یقین جسے میں جان بوجھ کر اپنے قدموں میں روند آئی۔ کیسے کیسے ہمت کروں ان کا سامنا کرنے کی۔"

وہ نظریں جھکائے صاف گوئی سے بولی۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولا سا پھنس گیا۔

"محبت کرنے والے دوسرے کو کبھی اتنا نہیں آزماتے آئمہ! تم صرف ایک بار انہیں پکارو تو سہی۔ دیکھنا وہ دوڑے چلے آئیں گے۔"

"اسی پکار سے تو ڈر لگتا ہے۔ اگر وہ نہ آئے تو!" اس نے اپنے اندر کا خوف بتایا۔

"ابھی بھی اگر تمہیں لگتا ہے کہ وہ تمہاری پکار پر نہیں آئیں گے تو یہ تمہاری بے وقوفی ہے اور اپنی زندگی کے اتنے خوب صورت دنوں کو خود ساختہ حماقت کی نذر کرنا اس سے بھی بڑی بے وقوفی ہے۔" وہ دولے سے مسکرائی۔ اس نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"ہاں میں ایک کوشش ضرور کروں گی۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" وہ ایک دم پر جوش سے مسکرائی۔ اس کی آنکھیں اس کی مسکراہٹ کا ساتھ ہرگز نہیں دے رہی تھیں۔ اس نے بغور ان آنکھوں کی ویرانیوں کو دیکھا اور بولی۔

"کون تھا وہ آسائش! جس کی وجہ سے تم نے اپنی حالت ایسی بنالی۔ تم چاہے جتنا مرضی مسکرا لو مگر اس کے باوجود آنکھوں کی اداسیاں چھپا نہیں پاتیں۔"

اس سے بات کرتے اسے کتنا سکون محسوس ہوا تھا۔ سوچ کو نئی راہ ملی تھی۔ وہ دل سے اس اچھی لڑکی کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی۔

اور پھر اس نے بھی اس سے کچھ نہ چھپایا۔ جو اسے بہت اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔

"یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ اسی دوران مجھے ادراک ہوا کہ میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں مگر کبھی کہہ نہ سکی اور شاید میری محبت میں بھی اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ کھنچا چلا آتا۔"

پل میں اس کا چہرہ اک کرب کی لپیٹ میں آیا تھا۔ وہ اس کے درد کی گہرائی کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔

"اب کہاں ہے وہ۔ کیا شادی کرلی؟"

"نہیں جانتی؟"

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوئی۔

"میں اس کے نام کے سوا کچھ نہیں جانتی اور دل کی خوش فہمی تو دیکھو اسے پورا یقین ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن مجھے ضرور ملے گا۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

اور پھر جو نام اس نے لیا وہ اسے دم بخود کر گیا۔ کتنی دیر وہ متحیر سی یک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"ہوں۔۔۔ تو جناب اپنی محبت کو پا کر کیسا محسوس کر رہی ہو؟" اس کے سر پر دوپٹہ سیٹ کرتے سارہ نے شرارت سے اس کے چمکتے روپ کو دیکھا۔

"اگر سچ پوچھو تو سارہ! مجھے ابھی تک اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آ رہا۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے میں کسی خوب صورت خواب کے زیر اثر ہوں۔ پلک جھپکوں گی تو یہ خواب ٹوٹ جائے گا۔"

"تم بھی نا آسائش! ایک دم پاگل ہو۔ یہ کوئی خواب نہیں ہے۔ یہ تمہاری محبت کی سچائی ہے۔ کامیابی ہے اور یہ سب کچھ آئمہ کی وجہ سے ہوا ہے۔ بے شک وہ تمہارے لیے ایک فرشتہ ثابت ہوئی ہے۔"

"ہاں سارہ! میں اس کا یہ احسان ساری زندگی نہ بھلا پاؤں گی۔" اس نے دل سے کہا۔

"سارہ! اگر آسائش تیار ہو گئی ہے تو اسے باہر لے آؤ۔ سب لوگ ویٹ کر رہے ہیں۔" اسی وقت آئمہ نے اندر قدم رکھا۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔" اس کے چمکتے وجود کو دیکھتے اس نے بے ساختہ سراہا۔ وہ جھینپتے ہوئے سر جھکا گئی۔ آنکھوں کی سطح بھرپور خوشی کے احساس سے بھیگنے سی لگی تھی۔

"آئمہ! میں تمہارا یہ احسان۔۔۔"

"پلیز آسائش۔۔۔ دوست بھی دوسرے دوست پر احسان نہیں کرتا۔"

اس نے دھیرے سے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اور پلیز اب اپنی خوب صورت آنکھوں کو آنسو بہا کر بیڑا غرق مت کرنا۔" اس نے نرمی سے اس کی آنکھوں کے کونے ٹشو سے صاف کیے تو وہ مسکرا دی۔ "چلو اب سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے اس کا ہاتھ تھاما جو ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ نظریں جھکاتے بولی۔

"ڈر۔۔۔؟" سارہ اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔ اس نے شاکی نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا تو انہیں سنبھلنا پڑا۔

"یار اب اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے بلکہ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ کیونکہ تم اپنی محبت کو پانے جا رہی ہو اور محبت کو پانا ایک اعزاز ہے جو سب کے نصیب میں نہیں ہوتا۔"

وہ اس کے خوب صورت روپ کو نظروں میں سموتے ہوئے بولی تو اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ تینوں مسکراتے ہوئے بہت اعتماد سے باہر کی طرف بڑھی تھیں۔

وہ کب سے عائش کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی مگر وہ ریسیو ہی نہیں کر رہے تھے۔ اس کی جھنجلاہٹ اب تشویش میں بدلنے لگی۔

"آئمہ! رسم شروع ہونے والی ہے اور عائش بیٹا ابھی تک نہیں آیا۔ تم نے فون تو کیا تھا نا؟" اسی وقت مما مصروف سے انداز میں اس کے قریب آئیں۔

"جی مما! اب سے ٹرائی کر رہی ہوں شاید ہسپتال میں مصروف ہیں۔" اپنے سیل کو دیکھتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔

"او کے۔ ایسا کرو تم ٹرائی کرتی رہو۔ جیسے ہی نمبر ملے اسے پہنچنے کے لیے فوراً کہو۔"

وہ اسے ہدایت دیتے اسٹیج کی طرف بڑھ گئیں۔ بے دلی سے اسٹیج کی طرف بڑھتے ہوئے اس کی نظر جیسے ہی آسائش کی طرف جھک کر بات کرتے بازغہ پر پڑی تو اس کے چہرے کے تاثرات پل میں بدلے تھے۔

"میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے بازغہ! کہ وہ آپ کو اتنی خوشیوں سے نوازے کہ آپ کا دامن کم پڑ جائے۔ آپ ماضی کی تمام تشنگیاں بھول جاؤ۔ اللہ آپ دونوں کو تمام عمر خوش رکھے۔ آمین۔" بہت مطمئن اور آسودہ انداز میں اس نے تہ دل سے دونوں کو دعا دی۔

اور پھر انگیجمنٹ سے تھوڑی دیر پہلے ہی ڈاکٹر عائش ملک کی آمد نے اسے ہر طرح سے ہلکا پھلکا کر دیا۔ بے اختیار ہی اس نے پرسکون سانس ہوا میں خارج کیا۔

سب کی تالیوں کی گونج میں بازغہ عباد نے آسائش میر کو اپنے نام کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ دونوں کے چہروں پر دھیمی سی مسکراہٹ بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

ہر طرف خوشیاں تھیں، قہقہے تھے۔ وہیں ایک وجود ایسا بھی تھا جو ایک کونے کھڑا ماضی کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا۔

آزر اور اس کے انکل نے اسے دھوکا دیا تھا۔ کون سی فلم اور کیسی فلم۔ لیکن جب تک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا بہت دیر ہو چکی تھی۔ کس طرح عزت بچا کر وہ ان کے شکنجے سے نکلی تھی یہ صرف وہی جانتی تھی۔ دوستی پر سے اس کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔ وہ گھر لوٹنا چاہتی تھی مگر وہ خود میں ہمت نہیں پا رہی تھی آخر کس منہ سے گھر لوٹتی۔ زندگی تو اس نے کسی طرح جینا ہی تھی سو ایک دوست کی مدد سے قریبی اسکول میں جاب کر لی پھر دوست کے بے حد اصرار پر ہی وہ ہاسٹل شفٹ ہو گئی تھی۔ مگر پھر میڈم کا بیٹا اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اس کی مدد کی اور وہ پھر سے اپنوں میں لوٹ آئی۔

"میری ایک غلطی نے آپ کو بہت دکھ دیا ہے مگر آپ کو دکھی کر کے خوش میں بھی نہیں رہی۔ لوگوں کے بہت سے بھیانک رویوں کو بھگت چکی ہوں۔ میں

آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ میری طرف سے آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔" آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو صاف کرتے اریزانے کچھ دور بیٹھے مما پاپا کی طرف دیکھ کر بے ساختہ سوچا اور پھر ان کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"سنیں!" وہ تیزی سے پورچ کی طرف بڑھ رہے تھے جب اپنے پیچھے ابھرتی پکار پر بے ساختہ پلٹے اور پھر اس کے ہاتھ میں بیگ دیکھ کر چند لمحوں کے لیے حیرت زدہ رہ گئے۔

"کیا مجھے یہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے؟" وہ ان کے قریب آتی بولی۔

وہ چونکے کچھ لمحوں کے لیے نظریں اس کے چہرے پر ہی جمی رہیں پھر آہستہ سے جھکے اور خاموشی سے اس کا بیگ تھام کر گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ ان کے پیچھے آتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرا دی۔

اس کی نظریں بار بار ان کے سنجیدہ چہرے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی رسپانس نہ دیکھتے ہوئے کبھی تو وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی اور کبھی بے وجہ ہی انگلیاں چٹخانے لگتی۔

پورے سفر کے دوران انہوں نے ایک دفعہ بھی اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔

"یہ تو بہت ہی ناراض لگ رہے ہیں۔" گاڑی جیسے ہی اندر داخل ہوئی وہ خاموشی سے اتر کر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ کتنی دیر وہ وہیں بیٹھی کمرے میں جانے کے لیے ہمتیں مجتمع کرتی رہی۔

"مگر اسی طرح منہ پھلانا تھا تو گھر سے لے کر کیوں آئے تھے۔" آہستہ سے بڑبڑاتے ہوئے وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

مما کے کمرے میں جھانک کر دیکھا وہ سو رہی تھیں۔ کچھ دنوں سے انہیں بخار تھا اسی وجہ سے وہ فنکشن میں بھی نہ آسکیں۔ اس نے آہستہ سے ان کے ماتھے کو چھوا جو ٹھنڈا تھا۔ مطمئن ہوتے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ کمرے میں نہیں تھے۔ اس کی مضطرب نظروں نے پل میں پورے کمرے کا جائزہ لے ڈالا۔ اسی وقت وہ اسے سلیپنگ گاؤن میں ملبوس ڈریسنگ روم سے نکلتے ہوئے نظر آئے۔ اس کی طرف تو سرسری انداز میں بھی نہ دیکھا اور خاموشی سے بیڈ کی طرف بڑھ گئے۔ وہ وہیں کھڑی ہونٹ چباتی رہی۔ آنسو پلکوں کی باڑ پھلانگ کر باہر آنے کو مچلنے لگے۔ ان کی بے نیازی اسے اندر تک تڑپا گئی تھی۔

پلکیں جھپک جھپک کر آنسو پینے کی کوشش میں جیسے وہ نڈھال سی ہو گئی۔ اسی وقت ان کی نظر اس کی طرف اٹھی تھی۔ کمرے کے وسط میں کھڑے اس کے افسردہ وجود کو وہ زیادہ دیر نظر انداز نہ کر سکے۔ بیڈ سے اتر کر اس کے روبرو آکھڑے ہوئے اور پھر دونوں بازو سینے پر باندھ کر خاموشی سے اس کے سرخ چہرے کو دیکھنے لگے جو ان کی گہری نظروں کے ارتکاز پر سر جھکاتی جوتی کی نوک سے قالین کھرچنے لگی۔

"جو کہنا چاہتی ہو صاف کہہ دو۔ میں تمہارا فیصلہ تمہارے منہ سے ادا ہونے والے لفظوں میں ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔" وہ بہت نرمی سے بولے تھے جب اس نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔

"آئی ایم سوری۔" بہت مشکل سے وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"فار واٹ؟" انہوں نے اسی سکون سے پوچھا جب اس نے شاکی نظریں اٹھائیں۔

"میں نے آپ کو ہرٹ کیا۔" بالآخر اسے اپنے منہ سے کہنا پڑا۔

"ہوں تو تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ تم نے مجھے ہرٹ کیا۔" وہ مبہم سے انداز میں گویا ہوئے۔ ان کا یہ اجنبی انداز سہنا اس کے لیے مشکل ترین ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے ادھ کھلے لب فقط پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

"بہت بار خوش فہمیوں کو پالتے ہوئے میں تمہاری طرف بڑھ چکا ہوں اور ہر دفعہ میرے وجود کو بوجھ سمجھتے ہوئے تم میرا ہاتھ جھٹک چکی ہو مگر اب۔"

"یہ غلط ہے سراسر الزام۔" وہ احتجاجاً تیزی سے بولی۔ ان کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔

"کیا غلط ہے؟" وہ اسے بغور دیکھنے لگے۔

"آپ کا وجود میرے لیے کبھی بوجھ نہیں رہا۔ یہ آپ کی خود ساختہ سوچ ہے اور کبھی بھی میں نے آپ کا ہاتھ نہیں جھٹکا۔" اس نے اپنا دفاع کرنے کی موہوم سی کوشش کی۔

"اچھا تو پھر ہر دفعہ میرے قریب آنے پر تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑنے لگتی تھیں۔ مجھ سے فرار کیوں چاہنے لگتی تھیں؟" وہ ڈپٹتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

جب وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک پڑی۔ وہ لب بھینچتے ہوئے کچھ دیر اس کے سسکتے وجود کو دیکھتے رہے پھر آہستہ سے اس کے دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولے۔

"میں تمہارے ساتھ کبھی بھی زبردستی نہیں کرنا چاہتا۔ آج بھی میرے لیے تمہارا فیصلہ مقدم ہے۔ مجھے اس الجھن سے نکالو اور پلیز صاف صاف بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو۔ اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں اریزا سے شادی کر لوں تو یہ ناممکن ہے۔ میں اسے کسی صورت بھی اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتا اور اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں تو جب تک زندہ ہوں ایسا نہیں ہوگا ہاں میری موت کے بعد۔"

بہت تیزی سے اس نے ان کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور پھر بھیگی آواز میں بولی۔

"اگر میں ایسا کچھ چاہتی تو آپ کے ساتھ کبھی نہ آتی۔ بہت ذہین بنے پھرتے ہیں مگر اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ اگر میں لوٹی ہوں تو کیوں۔"

اس نے خفگی سے ان کی طرف دیکھا۔ آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گالوں پر پھسل رہے تھے۔ وہ بھرپور انداز میں چونکے اور پھر اس کی پرنم آنکھوں میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے پہلے حیران ہوئے اور پھر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے جھینپے سے مسکرا دیے۔ اس کی آنکھوں کا بھیگا تاثر ان کے اندر تک خوشی و سرمستی کی لہر دوڑا گیا۔ ان پر بہت کچھ منکشف ہو چکا تھا۔ جس لمحے کا انتظار انہوں نے دل کی تمام تر شدتوں سے کیا تھا وہ لمحہ ان کی زندگی میں آچکا تھا۔ ان کا دل ان کے سینے کے اندر زور زور سے پھڑپھڑانے لگا۔

انہوں نے اپنے دونوں بازو وا کر دیے اور اس نے خود کو ان کی بانہوں میں سونپنے میں لمحہ لگایا تھا اور پھر تحفظ بھرا حصار قائم ہوتے ہی وہ ان کے سینے پر سر رکھتے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"آئی ایم سوری یار۔ میں سمجھ نہیں سکا۔" اس کے بالوں پر ہونٹ رکھتے ہوئے وہ شرارت سے بولے تھے جب اس نے آہستہ سے گردن اٹھائی۔

"میں اپنی ساری زندگی آپ کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں عائش!"

اتنا دلفریب اظہار۔ وہ اندر تک سرشار ہو گئے۔ وہ مسکرائے تھے اور پھر مسکراتے چلے گئے۔ کتنی انوکھی اور خوب صورت ہنسی تھی ان کی اس کی پلکوں پر آنسو ٹھہر گئے۔ وہ موتیوں کی طرح چمکتے ان کے دانتوں کو یک ٹک دیکھنے لگی۔ وہ آہستہ سے جھکے اور پھر اس کی پیشانی پر مہر محبت ثبت کر دی۔ اس کی محویت کیا ٹوٹی نظریں جھجکتی چلی گئیں اور پھر پلکوں کی باڑ پر لڑکھڑاتا آنسو گالوں پر پھسل آیا۔ انہوں نے بہت نرمی سے اس آنسو کو اس کے نازک گال سے ہٹایا تھا۔

"میں تمہاری آنکھوں میں آئندہ کبھی آنسو نہ دیکھوں۔ تمہارے یہ آنسو مجھے بہت تکلیف دیتے ہیں۔ مجھ سے وعدہ کرو آئندہ تم کبھی نہیں روؤ گی۔" انہوں نے مضبوط ہتھیلی پھیلائی تو اس نے شرماتے، گھبراتے اپنا ہاتھ ان کی چوڑی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

سائرہ عارف

میری صبح کا ستارہ

غریب گھرانے میں پیدا ہونے والی سارا کو اپنی خوب صورتی پر بہت غرور ہے۔ بچپن کا منگیتر یاور خوب صورت ہونے کے محض غریب ہونے کی بنا پر ٹھکرا دیا۔ اگرچہ نواز اکرم کا پورا خاندان اور وہ خود معمولی شکل کے تھے۔ لیکن سارا نے پورے خاندان سے لڑ کر ان سے شادی کر لی۔ لیکن کبھی نواز اکرم کو وہ مقام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ انہیں اپنی بیٹی ماہین سے صرف اس لیے نفرت ہے کہ وہ شکل و صورت میں ددھیال پر پڑی ہے۔ جبکہ چھوٹی بیٹی میرب بالکل ان پر گئی ہے۔ سارا علوی اور میرب ہر وقت ماہین کو اس کی کم صورتی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ جس سے ماہین اپنے رنگ کے معاملے میں حساس ہو گئی ہے۔ دونوں بہنوں میں بالکل نہیں بنتی۔ اس کی واحد دوست رفعت اسے نت نئی رنگ گورا کرنے والی کریمیں لا کر دیتی ہے اور یہ بھی تو کرتی ہے۔ مگر وہ نواز اکرم کے قریب ہے۔ لیکن ہر وقت کی تنقید اور رشتوں سے انکار نے اسے نفسیاتی طور پر تنہا کر ڈالا ہے۔ نواز اکرم کی بہن ثروت بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن سارا علوی کے ناروا سلوک کے باعث بھائی سے ملنے سے کتراتی ہے۔

میرب کے لیے نواز اکرم کے دوست رضا اپنے بیٹے کا رشتہ دیتے ہیں تو میرب سے ٹھکرا دیتی ہے۔ سارا۔ کا ایک ذہنی معذور بھائی شہزاد ہے۔ جس کی اکلوتی ماں نے مرتے وقت سارا کے سپرد کی تھی۔ اسے آوارہ گردی کا اور شعر و ادب کا شوق ہے۔ ماموں شہزاد کو ماہین سے خاص انسیت ہے وہ دیگر لوگوں کی طرح انہیں ڈانٹنے کے بجائے ان کا خیال رکھتی ہے۔

ناولٹ

فاخرہ کی اپنے شوہر ریاض کے انتقال کے بعد دنیا اندھیر ہو گئی۔ اسے چند ماہ تک اپنے بیٹے کاشف کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ میکے والے اس موقع پر اسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔ جبر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاض کے بچپن کا دوست اقبال کاشف کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے متاثر کر لیتا ہے۔ حالات کی سنگینی کا احساس فاخرہ کو اس وقت ہوتا ہے۔ جب کاشف ماں کو اقبال سے شادی کا مشورہ دیتا ہے۔ فاخرہ اسے احساس دلاتی ہے کہ وہ اقبال سے دور رہے، لیکن کاشف، اقبال انکل کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں۔ بیٹے کو مجبور کرنے پر وہ اقبال سے عقد ثانی کر لیتی ہے۔

شادی کے فوراً بعد اقبال اچھائی کا لبادہ اتار پھینکتا ہے اور ماں بیٹے کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ گھر کا پہیہ فاخرہ کی اسکول کی نوکری پر ہی چلتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ کاشف کو اپنا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ وہ نواز اکرم کے یہاں بطور اکاؤنٹ کلرک کام کرتا ہے اور کبھی کبھار ہی ماں سے ملتا ہے اور ہر وقت فاخرہ کو علیحدگی کا مشورہ دیتا ہے۔ اس عمر میں بدنامی کا خوف انہیں ایسے فیصلے سے روکے ہوئے ہے۔ فاخرہ کے لیے اقبال کی غیر اخلاقی سرگرمیاں ناقابل برداشت ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

ساتویں قسط

وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ بمشکل اپنی سیٹ تک پہنچی تھی اور پورے قد کے ساتھ وہ اپنی سیٹ پر گرنے والے انداز میں بیٹھی تھی۔ ساکت نظروں سے سامنے دیکھا۔ جہاں اسٹیج پر وہ ماہین کو دلہن بنا بیٹھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ رفعت تھی اور شہناز جبکہ سارا اور نواز دونوں اسٹیج کے ایک کونے میں بے حد پریشان حال کھڑے تھے۔ نواز اکرم کے چہرے پر اتنی دور سے بھی اسے ایک خوف زدہ کر دینے والی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ ان کے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ وہ بار بار اپنی زبان ہونٹوں پر پھیر رہے تھے۔ شاید سارا کے تند و تیز جملوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ فکرمندی تو ضرور تھی مگر دکھ نہیں تھا۔ وہ دکھ جو نواز اکرم کے سانولے چہرے کو زرد کر گیا تھا اور جس نے خود اسے اندر سے جیسے نچوڑ ڈالا تھا۔ آنے والے لمحوں کا خوف تھا اور ماہین کی بربادی کا احساس۔ مگر سارہ کے چہرے پر صرف اور صرف برہمی تھی۔ اسے کاشف پر غصہ آ رہا تھا اور وہ اسی لیے نواز اکرم کو بھی ڈانٹ رہی تھی۔ یکدم اس کے اندر جیسے آندھی سی اٹھی تھی۔ برسوں پہلے بھی تو ایسی ہی آندھی اس کے اندر اٹھی تھی اور اس کی ساری ہستی کو ملیامیٹ کر گئی تھی۔

"میڈم! آپ یہاں بیٹھی ہیں اور وہاں آنٹی! کیا ہوا؟" احمد اپنی ہی دھن میں کہیں سے گھومتا ہوا آیا تھا اور اس کے قریب بیٹھ کر کچھ کہنے والا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی چونک گیا تھا۔

"ثروت آنٹی۔۔۔" اس کی آواز کے جواب میں بھی وہ ساکت سامنے دیکھے جا رہی تھی۔ بالکل گم صم جیسے وہاں اس پل موجود ہی نہ ہو۔ احمد کو وہ بہت عجیب لگی تھی۔ کھوئی کھوئی سی۔ اس نے چند لمحے انتظار کیا تھا۔ پھر بازو ہلا کر اسے دوبارہ مخاطب کیا تو وہ چونکی تھی۔

"کیا؟ کیا ہوا! مجھ سے کچھ کہا!"

"جی۔۔۔ میں پوچھ رہا تھا کہ آپ پریشان کیوں ہو گئی ہیں۔ کوئی بات ہوئی ہے؟ آپ کے بھائی اور بھابھی بھی فکرمند پریشان سے لگ رہے ہیں۔" احمد کے تجزیے پر وہ بے ساختہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

"ہاں۔۔۔ وہ، وہ ماہین کی بارات۔" اس کی زبان بے ساختہ لڑکھڑائی تھی۔

"بارات لیٹ ہے یا۔۔۔ آپ کھل کر بولیں آنٹی! کیا ہوا ہے؟" وہ ثروت کے چہرے پر پھیلی عجیب سی سراسیمگی کو بھانپ گیا تھا۔ اس کا لہجہ بھی کسی انہونی کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا۔ احمد کا دل ہول گیا۔

"احمد ماہی کی بارات نہیں آئے گی۔ اسے بھی میری طرح زمانے نے اس جرم کی سزا دی ہے جو اس نے کبھی نہیں کیا۔ بدصورتی بھی تو خوب صورتی کی طرح اللہ کی عطا کردہ ہے نا۔ جب خوب صورت لوگوں کو ہمارا معاشرہ سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے تو بدصورت لوگوں کو تنفس، زندہ رہنے کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔"

ثروت کی آنکھوں میں اذیت و کرب تھا۔ احمد کا دل چاہا وہ ہاتھ بڑھا کر ان سیاہ آنکھوں کی گیلی پلکیں صاف کر دے۔

"اسے محبت کے نام پر دھوکا دیا گیا ہے۔ اس نے کاشف سے پیار کیا تھا۔ اپنی محبت میں اپنا سب کچھ اسے سونپ دیا۔ مگر وہ کم ظرف، بدنصیب نکلا۔ ایسی ہیرا لڑکی کو ٹھکرا دیا۔ میں نے کبھی نہیں چاہا تھا۔ اس کا نصیب میرے جیسا ہو۔ وہ ہو بہو مجھ جیسی ہے۔ یہ بدنصیبی ہم جیسے لوگوں کے حصے میں ہی کیوں آتی ہے۔" ثوٹے کانچ سا لہجہ احمد کے دل میں کھب گیا تھا۔

"ایسے مت کہیں آنٹی۔ کیوں خ[illegible] کا شکار ہو رہی ہیں۔ آپ جیسی ہستی کو جو اتنی ونگ کیئرنگ اور سوفٹ ہوں۔ کون ٹھکرا سکتا ہے۔" احمد کے سوال پر اس نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔

"کون ٹھکرا سکتا ہے۔ ہر شخص مجھ جیسی شکل و صورت والی عورت کو ٹھکرا سکتا ہے۔ یہ جو خوبیاں تم مجھے بتا رہے ہو نا، ہمارے معاشرے میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اگر ہے تو بہت بعد میں۔ ماہین مجھ جیسی ہی ہے۔ شاید یہ بھی اس کی شکل کی وجہ ہے۔"

یکدم ثروت کا گلا رندھ گیا تھا اور وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پائی تھی۔ پلکیں جھپک جھپک کر اس نے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس میں بھی کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

"آنٹی۔۔۔" احمد نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھاما۔

"آنٹی، ہو سکتا ہے دنیا میں یہ سب ہوتا ہو۔ مگر ابھی بھی سیرت کو صورت پر ترجیح دینے والے بہت ہیں اور۔"

"ثروت، ثروت۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا۔ نواز نے اسے آواز دی تھی۔ وہ چونک کر اٹھی۔

نواز اکرم اس وقت بے انتہا پریشان لگ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ فکر مندی سے اسے آوازیں دیتے ہوئے اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ثروت جلدی سے اس کے قریب پہنچی۔

"خیریت۔ کیا ہوا؟ کچھ پتا چلا کاشف کا۔"

"ہاں 'وہ 'وہ فرار ہو گیا ہے۔ سب کچھ بیچ کر سمیٹ کر۔" نواز رو دینے کو تھے۔ اس کا لہجہ بے حد دھیما تھا۔ مگر ثروت ان کے چہرے سے ہی ان کی کیفیت کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ اسے خود بھی لگا۔ جیسے وہ اب مزید اپنے پاؤں پہ کھڑی نہیں رہ سکے گی۔

"پھر اب ...!" وہ بہت دھیمے سے بڑبڑائی تھی۔ نواز تک تو اس کی آواز شاید پہنچی بھی نہیں تھی۔

"اب! اب کیا ہو گا ثروت؟ اب کیا کروں میں؟" نواز بکھرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھ رہے تھے۔

"اب میں کیا بتاؤں نواز۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ سب لوگ 'ساری دنیا۔ ہال بھرا ہوا ہے۔ ان سب کو کیا بتائیں کہ ... اور ماہین ... وہ ... وہ تو مر جائے گی۔" ثروت کی تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس وقت اس کے پاس کیا تھا۔ خود تہی دامن تھی۔ وہ نواز کو کیا تسلی دیتی۔

"ثروت! میری عزت 'میری عزت ختم ہو جائے گی۔ لوگ کہیں گے 'نواز اکرم اتنا بے وقوف تھا کہ اس نے ایک غلط 'فراڈیے کو پہچانا نہیں اور اس کی باتوں میں آ کر ... اپنی بیٹی بھی اسے دے رہا تھا۔ اور وہ سب لوٹ کر بھاگ گیا۔ کیونکہ اسے ماہین سے شادی نہیں کرنا تھی۔ یہ ذلت اور بدنامی میں کیسے سہ سکوں گا اور ماہی وہ تو ... میں کیا کروں ثروت میری دولت 'سارا روپیہ پیسہ 'کچھ بھی تو اس پل میری عزت نہیں بچا سکتا۔ او خدایا۔"

نواز اکرم نے کرسی کی پشت تھام رکھی تھی۔ ورنہ وہ کسی سہارے کے بغیر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے اور ابھی بھی انہیں لگا تھا کہ وہ کسی بھی پل گر جائیں گے۔

"ثروت آنٹی۔" احمد نے پیچھے سے آ کر اسے پکارا تو وہ بے ساختہ چونک کر پلٹی تھی۔

"ہاں 'ہاں۔ میں ابھی آ رہی ہوں احمد 'تم ... تم چلو۔"

"کیا ہوا؟ کچھ پتا چلا کہ کیا معاملہ ہے۔" احمد کے سوال پر نواز نے چونک کر اسے دیکھا تھا اور پھر ثروت کو۔

"یہ احمد ہے۔ میرا اسٹوڈنٹ 'احمد! تم بیٹھو میں۔"

"مجھے غیریت سمجھیں آنٹی! مجھے بتائیں کیا ہوا ہے؟" احمد نے دوبارہ اس کی ٹالنے کی کوشش ناکام بنا دی تھی۔ اس نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"کاشف فرار ہو گیا ہے اور اب وہ نہیں آئے گا۔" ایک جملہ بولتے ہوئے اسے کتنی تکلیف ہوئی تھی۔ کیسی اذیت رگ و پے میں دوڑی تھی وہ بتا نہیں سکتی تھی۔

"او ... ویری سیڈ۔" وہ یکدم ٹھٹکا تھا۔

"ثروت! میں کیا کروں۔ سارا ابھی مجھے ہی الزام دے رہی ہے۔ کہ میں نے کیا غلط کیا۔ وہ اتنا گھٹیا 'بیچ 'بدذات انسان ہو گا۔ خود ماہین بھی تو اس سے۔" کہتے کہتے یکدم ٹھٹکے تھے۔ احمد کے سامنے اپنی بیٹی کی بات کرتے ہوئے بے ساختہ ان کی زبان لڑکھڑائی تھی۔

"حوصلہ کرو نواز ہمت سے کام لو۔ اس طرح پریشان ہو کر بوکھلا کر مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ اب اس انہونی پر کیا کہیں۔ ہمارے بس میں کچھ نہیں ہے۔ مگر اب 'اب ہمیں بہت حوصلے سے کام لینا ہو گا نواز۔" اس نے بڑے حوصلے سے خود کو سمیٹا تھا۔

"کہاں سے لاؤں حوصلہ ثروت 'کہاں سے لاؤں۔ پہلے تم اور اب میری بیٹی۔ کب تک یہ زخم مجھے ملتے رہیں گے۔ میں ہار گیا ہوں ثروت۔" نواز اکرم بری طرح لڑکھڑائے تھے۔ ثروت نے تڑپ کر ان کا بازو تھام لیا۔

"نواز ..." لگا اس کا بھائی مزید اپنے قدموں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ ڈھے جائے گا۔

"نواز! بھول جاؤ پرانی باتیں 'پرانے قصے 'تم اس صورت حال کے بارے میں سوچو۔ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں ماہین کے ساتھ یہ سب ہوتے نہیں دیکھ سکتی ہوں۔ جیسی زندگی میں نے گزاری ہے۔ وہ ماہی کو نہیں گزارنے دوں گی۔ نواز! تم جاؤ۔ جا کر اسے ڈھونڈ کر لاؤ۔ جاؤ نواز۔" وہ اسے جھنجوڑتے ہوئے رو پڑی تھی۔

"کہاں جاؤں ثروت! کہاں جاؤں۔ وہ نہیں ملے گا اب 'اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ اب ماہین بھی تمہاری طرح۔" نواز اکرم یکدم ثروت کے ہاتھوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔ خود ثروت کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ احمد نے ایک پل دونوں کو دیکھا 'کل کا ماضی اور آج حال ... بے ساختہ اس کی نظریں اصلی پھولوں سے سجے اسٹیج کی طرف گئیں۔ جس کی خوب صورتی کی تعریف یہاں موجود ہر شخص نے کی تھی۔ وہ اب سنسان تھا۔ بارات کی دیر نے لوگوں میں بے چینی اور اضطراب پھیلا دیا تھا اور سرگوشیوں سے بات بڑھ کر چہ مگوئیاں تک آ گئی تھی۔

اس نے گہرا سانس لے کر سوچا 'باپ کو راتوں میں اٹھ کر بے چینی سے اضطراب کی حالت میں ٹہلتے بارہا دیکھا تھا 'وہ غیر مطمئن اور ناآسودہ زندگی گزار رہے تھے اس کی ماں کے ساتھ۔ اس کی ماں خاندان بھر میں سب سے خوب صورت عورت تھی۔ اتنی خوب صورت بیوی پا کر بھی وہ غیر مطمئن تھے۔ تو کیوں! اور آج اسے برسوں بعد اس سوال کا جواب مل گیا تھا۔

"آنٹی ... ماہین آپ کی طرح تنہا زندگی نہیں گزارے گی۔" احمد کے اس ایک جملے میں کیا تھا 'ثروت نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا مطلب احمد ...؟"

"میں ... اگر آپ اور نواز انکل مجھ پر اعتماد کریں تو میں خود کو ماہین کے لیے پیش کرتا ہوں۔" ایک لمحہ تھا فیصلے کا اور اپنے باپ کو برسوں پرانے اضطراب سے نکالنے کا 'جو انہیں رات کو سکون کی نیند سونے نہیں دیتا تھا۔

"تم ... احمد تم 'یہ کیا کہہ رہے ہو تم!" ثروت کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ نواز اکرم بھی چونک کر احمد کو دیکھنے لگے تھے۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں آنٹی ... میں ابھی 'اسی وقت ماہین سے نکاح کے لیے تیار ہوں۔" اس نے بے حد مضبوط لہجے اور پر یقین انداز میں کہا تھا۔

"مگر تمہارے والد صاحب 'وہ۔"

"وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ میں ابھی ان سے آپ کے سامنے اجازت لے لیتا ہوں۔"

"تم ... بیٹا تم 'تم میری ماہین سے شادی کرو گے۔" نواز اکرم کو تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ یکدم کانپتے ہاتھوں سے احمد کے ہاتھوں کو جکڑ کر کپکپاتے لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

"جی انکل۔ میں کروں گا ان سے شادی۔" اس نے ان کے ہاتھوں کو دبا کر یقین دلایا تھا۔

"مگر وہ ... وہ تو ... میرا مطلب تم نے اسے دیکھا نہیں ہے۔ وہ مجھ جیسی ہی ...."

"آپ جیسی ہے نا۔ مجھے منظور ہے۔" اس نے ثروت کی بات کو درمیان سے ہی کاٹ دیا تھا۔ اسے ثروت کا بار بار خود کو بدصورت کہنا بہت برا لگ رہا تھا۔

"تم اپنے بابا سے تو پوچھ لو ..." ثروت نہ جانے کیوں خوف زدہ تھی۔ احمد یکدم مسکرایا۔ چند پل کچھ سوچا 'پھر موبائل نکال کر نمبر دبانے لگا۔

"ہیلو 'السلام علیکم بابا۔" اس کے چہرے پر معصوم سی ہنسی بکھری تھی۔

"کیسے ہیں آپ بابا ... جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ جی وہ بابا پلیز میری بات غور سے سنیں۔ میں یہاں ثروت آنٹی کے ہاں آیا ہوا ہوں۔ ان کی بھتیجی کی شادی میں شرکت کے لیے۔ مگر یہاں ایک پرابلم ہو گیا ہے۔ وہ ..." احمد بات کرتے کرتے کچھ دور چلا گیا تھا۔ ثروت نے اسے دور جاتے دیکھا اور پھر مڑ کر نواز کو دیکھا۔

"نواز! تم حوصلہ کرو۔ اللہ بہتر کرے گا۔ جو دکھ دیتا ہے تو اسے سہنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے اور اس کا تدارک بھی کرتا ہے۔"

ثروت نے مسکراتے ہوئے نواز کو تسلی دی تھی۔ نواز اکرم کو جیسے کسی نے زندگی کی نوید دی تھی۔ ان کی آنکھوں کی بجھتی جوت دوبارہ جلنے لگی تھی۔ امید اور آس کے جگنو آنکھوں میں جگمگاہٹ سی بھر رہے تھے۔

"یا اللہ۔۔۔ میرے بھائی کی آنکھوں کی یہ جگمگاہٹ سدا قائم رہے یا اللہ میرے بھائی کو دوبارہ دکھی نہ ہونے دینا۔ یا اللہ۔"

ثروت کا رواں رواں دعاگو تھا اور اس کے دل کی دھڑکن اس لمحے دوگنی ہو گئی تھی۔ اسے لگا اگر ماہین کے حق میں فیصلہ نہ ہوا تو اس کا دل بند ہو جائے گا۔

اس کی نظریں ابھی گھڑی پر جمی تھیں۔

"آنٹی! یہ بابا سے بات کریں۔" احمد واپس پلٹا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل تھاما۔

"ہیلو جی۔ میں ثروت۔" برسوں بعد اس شناسا آواز کو سننا، سننے کی حسرت ہمیشہ سے دل میں تھی۔ جسم و جاں میں کیسا کرنٹ سا دوڑا تھا۔ ثروت نے بے ساختہ قریب دھری کرسی کی پشت تھام لی تھی۔

"جانتا ہوں ثروت! مجھے ابھی احمد نے سارا معاملہ بتایا ہے۔ میں نے اسے اجازت دے دی ہے۔ یہ ماہین سے شادی کرلے۔ وقت نہیں ہے ورنہ میں خود بھی شامل ہوتا۔ مگر خیر رخصتی کے لیے ہم باقاعدہ بارات لے کر آئیں گے امید ہے، تم میرے بیٹے کو مایوس نہیں لوٹاؤ گی۔"

"میں، میں آپ کی شکر گزار ہوں سر! آپ نے اس وقت احمد کو اجازت دے کر مجھے جو خوشی دی ہے آپ سمجھ لیں، برسوں پہلے کے ہر دکھ، ہر غم کا ازالہ ہو گیا ہے۔ بہت شکریہ۔" اس نے بچوں سے کہا تھا۔

"تم خوش ہونا؟" نہ جانے وہ کیا سننا چاہ رہے تھے۔

ان کی ہلکی سی سرگوشی نے ثروت کے دل کے دھڑکن کو بڑھا دیا تھا۔

"بہت، بہت خوش ہوں۔" وہ بڑے بھرپور انداز میں مسکرائی تھی۔

"شکریہ۔ اللہ حافظ میں نکاح کے بعد فون کروں گا۔" اس نے موبائل احمد کی جانب بڑھا دیا۔

"ارے بھئی نواز! یہ کیا ہو رہا ہے۔ بارات ہے نہ باراتی۔ دولہا غائب ساتھ دلہن غائب۔ اوپر سے رات آدھی گزر گئی ہے۔ کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔" رضا صاحب بے چین ہو کر فکر مندی سے چلے آئے تھے۔

"کچھ نہیں رضا بھائی! بس، دو ابھی، ابھی نکاح شروع کرواتے ہیں۔" نواز نے پل بھر میں خود کو سنبھالا تھا۔

"نکاح۔۔۔ بارات آگئی کیا؟" نواز کی بات پر رضا بری طرح چونکے تھے، متلاشی نظریں دروازے کی سمت اٹھی تھیں۔

"ہاں بس آگئی ہے۔ آپ بیٹھیں۔ آؤ ثروت! ماہین کے پاس چلیں۔" نواز اکرم اب پوری طرح خود کو سنبھال چکے تھے۔ اسی لیے وہ بہت پر اعتماد ہو کر ثروت سے مخاطب ہوئے تھے، ثروت نے مسکرا کر ایک نظر احمد کو دیکھا۔ پھر اس کا بازو تھام کر اسے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

"ہم ابھی ڈریسنگ روم سے آتے ہیں نواز! تم مہمانوں کو تسلی دو۔ اب کوئی پرابلم نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ شکر اللہ کا۔ بس تم جا کر مہمانوں کو سنبھالو میں ابھی آتی ہوں۔" ثروت نے نواز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں سب اچھا ہے کا سگنل دیا تھا اور خود تیز تیز قدموں سے اسٹیج کے ساتھ ہی بنے برائیڈل روم کی جانب بڑھ گئی۔

"ماہین پلیز۔ خود کو سنبھالو۔ مجھے نہیں پتا، اصل معاملہ کیا ہے۔ بارات کیوں نہیں آرہی۔ مجھے تو انکل نے کہا تھا کہ ماہین کو ابھی اسٹیج پر مت لانا۔ جب تک وہ بارات نہیں آجاتی ہے۔" رفعت اسے حوصلہ دے رہی تھی۔

"مگر کیوں؟ بارات کیوں لیٹ ہوئی ہے؟ کاشی تو کہتا تھا میں۔ اس کا موبائل بھی آف ہے۔ میں بار بار فون کر رہی ہوں۔ مگر۔۔۔ وہ" شدید پریشان اور خوف زدہ ماہین نے یکدم اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"رفعت! وہ۔ وہ آئے گا نا۔۔۔ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا، میں۔۔۔"

"تم پریشان کیوں ہوتی ہو ماہی! ڈونٹ وری۔ وہ آئے گا انکل اور آنٹی دونوں اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر ابھی اس کا موبائل آف ہے نا۔ تو تم پریشان۔۔۔" رفعت نے کھوکھلے لہجے میں اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"تم مجھے پاگل بنا رہی ہو۔ بے وقوف، الو سمجھتی ہو مجھے، جھوٹی تسلیاں دے کر بہلا رہی ہو۔ سچ سچ بتاؤ رفعت! کاشف کے ساتھ کیا ہوا ہے، وہ۔۔۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ وہ مجھے بہت چاہتا ہے۔ وہ میرے ساتھ دھوکہ نہیں کر سکتا۔"

وہ رفعت کے کندھوں کو جھنجوڑتے ہوئے زور زور سے چلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس کا بھاری کامدار خوب صورت دوپٹہ اس کے کندھے سے تکلی پن سمیت ڈھلک کر بازو پر آگرا تھا اور اسے اس نے ایک جھٹکے سے پیچھے پھینک دیا تھا۔ شہر کی سب سے مہنگی بیوٹیشن سے اس نے میک اپ کروایا تھا۔ اور وہ بلاشبہ اس وقت بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہونے والا حادثہ ایسا تھا کہ سب ہی کانپ گئے تھے۔

کاشف بھاگ گیا تھا۔ سب کچھ سمیٹ کر۔ اس کا گھر خالی تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ نواز اکرم کے بندوں نے محض آدھے گھنٹے میں پورا شہر چھان مارا تھا۔ ہر ممکن جگہ، جہاں اس کے پائے جانے کا امکان تھا، دیکھ ڈالی تھی۔ مگر وہ شاید اس شہر سے ہی نکل گیا تھا اور زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ رانی اس کی کزن بھی غائب تھی مگر یہ تمام باتیں ماہین کے علم میں نہ تھیں۔ اسے محض بہانے اور بہلاوے سے ٹالا جا رہا تھا۔

"تم بولتی کیوں نہیں ہو رفعت! خدا کے لیے رفعت! تم بتاؤ کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کاشف ابھی تک کیوں نہیں آیا۔ کہیں وہ کسی۔۔۔ حادثے کا شکار تو نہیں ہو گیا۔" یک دم اس نے خوف زدہ ہو کر سوال کیا تھا۔

"اللہ کرے وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر مر جائے۔" اسے اپنے پیچھے سارا علوی کی زہریلی اور نفرت بھری آواز آئی تھی۔

"کیا۔۔۔ مما وہ میرا، میرا ہونے والا شوہر ہے اور۔۔۔"

"ہونے والا تھا ماہین! مگر اب نہیں ہو گا۔ بھول جاؤ اسے۔"

سارا کا غصہ برسنے کو تیار تھا۔ اول دن سے اسے کاشی اچھا نہیں لگا تھا اور اس نے بارہا نواز سے کہا بھی تھا کہ یہ بہت چالاک لڑکا ہے۔ یہ ایک دن ساری دولت سمیٹ کر بھاگ جائے گا۔ مگر نواز کو نہ جانے اس میں کیا نظر آتا تھا کہ وہ اس کی باتوں اور خیالات کو ہمیشہ ٹھکراتا تھا۔

"مما۔۔۔ کاشف۔" ماہین نے کراہ کر جیسے ماں سے التجا کی تھی۔

"نام مت لینا دوبارہ اس کا۔ وہ کم ظرف کمینہ، گھٹیا انسان بھاگ گیا ہے۔ تمہیں چھوڑ کر۔ تمہارا سب کچھ لوٹ کر۔" سارا نے بے رحمی اور غصے سے اسے جتایا تھا اور ساتھ ہی اس کے قریب آگئی تھی۔

"آنٹی پلیز۔۔۔ ابھی اسے کچھ نہ۔" رفعت کو ماہی کا چہرہ خوف زدہ کر گیا تھا۔ وہ ساکت نظروں سے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو کر جیسے ایک جگہ جم گئی تھیں۔

"مزید چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کی واپسی اب ممکن نہیں ہے۔ ابھی اس کا نکاح احمد کے ساتھ ہو رہا ہے۔" سارا کے انکشاف پر رفعت نے حیرت سے اسے دیکھا۔ مگر ماہین تو پتھرائی ہوئی بالکل گم صم خاموش کھڑی تھی۔

"احمد!... کون احمد کون ہے؟"

"میں بتاتی ہوں رفعت۔" اسی پل ثروت اندر آئی تھی اور اس نے ایک نظر وہاں موجود ان تینوں کو دیکھا تھا۔ ماہین اسی انداز میں پتھرائی کھڑی تھی۔ اسے فوراً" اندازہ ہو گیا تھا کہ سارا اس سے کاشف والے معاملے پر بات کر چکی ہے۔ اسے دیر ہو گئی تھی۔ اسے سخت افسوس ہوا۔ احمد کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر وہ ابھی اسے اسٹیج پر بٹھا کر آئی تھی۔ اس کے پیچھے نکاح خواں تھا۔ نواز اکرم اور رضا کے ساتھ۔

"ماہی... ماہی میری جان! میرا بچہ تم کھڑی کیوں ہو۔ تم بیٹھو نا بیٹھو۔" اس نے اس کا بازو تھام کر بٹھایا تھا اور وہ خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔ ثروت نے بمشکل خود کو سنبھالا۔ اس وقت اس کی ذرا سی جذباتی کمزوری ماہین کے لیے بہت بڑا پرابلم بن سکتی تھی۔

"ماہی! تمہیں سارا نے کاشی کے بارے میں بتایا ہو گا۔ میں صرف اتنا کہوں گی کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور جسے ہم سے ملنا ہوتا ہے۔ وہ مل کر رہتا ہے۔ جھلے کسی بھی طریقے سے مجھ پر ٹرسٹ کرتی ہو نا۔"

ثروت نے اس کا ہاتھ تھام کر تھپکا۔ وہ جامد چپ کے ساتھ ایک ٹک ثروت کو دیکھ رہی تھی۔ یوں جیسے غائب دماغ ہو۔ یا پھر ثروت اس کے لیے اجنبی اور غیر ہو۔

"میری بات مانو گی نا ماہین! تمہارے بابا کی عزت کا سوال ہے۔" ثروت کے لیے بات کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ گلے میں آنسوؤں کا پھندا لگا تھا اور آنکھوں کے آگے دھند پھیل گئی تھی۔

"کیوں نہیں مانے گی۔ ضرور مانے گی۔ وہ کمینہ تو بھاگ گیا، جس کی آس میں یہ دلہن بنی بیٹھی ہے۔ اب کون آئے گا۔ اسے بیاہنے۔ شکر کرے۔"

"سارا! خدا کے لیے تم چپ ہو جاؤ۔ مجھے اس سے بات کرنے دو۔" ثروت تحمل سے بولتے بولتے یکدم چیخ اٹھی تھی اور اس کی بات کا سارا نے سخت مانا تھا۔ اس نے گھور کر دونوں پھوپھی، بھتیجی کو دیکھا۔

"ہوں۔ رسی جل گئی مگر۔" دانت پیستے ہوئے اس نے زیرِ لب اسے سنایا تھا اور پھر ٹک ٹک کرتی باہر نکل گئی تھی۔ ثروت نے تاسف سے اسے دیکھا پھر ماہین کی جانب متوجہ ہوئی۔

"ماہین... تم میری بات سمجھ رہی ہو نا۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ باہر ہال مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ ہماری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے ماہین۔ پلیز... خود کو سنبھالو۔" وہ اسے سمجھاتے سمجھاتے یک دم رو پڑی تھی۔

"ماہین! ہماری عزت رکھ لو۔ ورنہ تمہارا باپ اس بے عزتی کے بعد زندہ نہیں رہے گا۔ میں تمہیں گارنٹی دیتی ہوں۔ احمد بہت اچھا انسان ہے۔ وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔" ثروت نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"خوش..." بہت ہولے سے اس کے لب ہلے تھے۔ اس کی نظریں اب ثروت کے چہرے پر تھیں۔ ثروت کو لگا۔ وہ سانس نہیں لے سکے گی۔ کیا نہیں تھا اس کی خشک، ویران اور ایک دم ساکت نظروں میں۔

"ضروری نہیں ہمیں صرف ان ہی لوگوں سے خوشیاں ملیں جو ہمیں جانتے ہیں اور جنہیں ہم جانتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمیں وہ لوگ خوشیاں دیتے ہیں جو ہمارے لیے اجنبی ہوتے ہیں مگر اپنوں سے بڑھ کر ہو جاتے ہیں۔"

"ثروت، آ ثروت!" اسے نواز اکرم پکار رہے تھے۔ وہ چونکی۔ نواز اکرم کمرے میں نہیں آئے تھے اور شاید وہ آنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ ماہین کا سامنا کرنے کی ابھی ان میں ہمت ہی کہاں تھی۔ وہ تو خود کو اس کا مجرم سمجھ رہے تھے۔

"نواز! اندر آ جاؤ۔" ثروت نے ماہی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا اور نظریں دروازے پر جما دی تھیں۔

دروازے سے قاضی صاحب اور رضا بھائی دونوں اندر آئے تھے۔ ان کے پیچھے سارہ اور میرب تھیں۔

ثروت نے بے ساختہ گہرا سانس لیا۔ نواز اکرم اندر نہیں آئے تھے۔

"نکاح شروع کریں مولوی صاحب۔" سارہ کے جملے پر وہ چونکی۔ اس کے ہاتھ میں دبا ماہی کا ہاتھ اس قدر ٹھنڈا تھا کہ اسے لگا اس نے برف کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں دبا رکھا ہے اور اس کی ٹھنڈک نے خود ثروت کے وجود کو بھی برف بنا دیا تھا۔ اس کا رواں رواں کپکپا اٹھا تھا۔ جیسے وہ دسمبر کی یخ بستہ برفانی ہواؤں میں بغیر گرم کپڑوں کے کھڑی ہو اور پورا وجود منجمد ہوتا جا رہا ہو۔

"ماہین دختر نواز اکرم! آپ کو احمد ولد ابراہیم بعوض ... لاکھ حق مہر قبول ہے۔" مولوی صاحب نے شاید دوسری یا تیسری بار دہرایا تھا۔ وہ خاموش رہی تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ ہلایا۔ سب ہی کی نظریں ماہی پر جمی تھیں۔

"ماہین! تمہیں مجھ پر اعتبار ہے نا، میری بچی، میری خاطر پلیز..." ثروت نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا کر گویا اسے یقین دلایا تھا۔ ماہین نے ثروت کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی، بے بسی تھی اور خواہش تھی۔ ماہین نے سر ہلایا اور خاموشی سے سامنے کھلے رجسٹر کے دائیں کونے میں سائن کر دیے تھے۔ جہاں مولوی صاحب نے انگلی رکھی تھی۔

"مبارک ہو، مبارک ہو۔" رضا صاحب نے سارہ بھاوج کو مبارک باد دیتے ہوئے ماہین کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"مبارک ہو بھابھی..." ثروت نے مطمئن کھڑی سارہ کو مبارک دی۔

"خیر مبارک۔ ماہین کو باہر لے آؤ، تاکہ فوٹو سیشن ہو جائے، ارے ہاں ابھی رخصتی تو نہیں ہو گی نا، رخصت ہو کر ماہین کہاں جائے گی۔"

سارہ کو یک دم ہی خیال آیا تھا اور اس نے واپس مڑتے ہوئے ثروت سے پوچھا تھا۔

"ہاں... رخصتی بعد میں ہو گی یا شاید ابھی میں نے احمد سے پوچھا نہیں، ابھی پوچھتی ہوں۔" ثروت خود بھی الجھی ہوئی تھی۔ اسی لیے صحیح طرح جواب نہیں دے سکی تھی۔

"احمد... اچھا تو اس لڑکے کا نام احمد ہے۔" سارہ نے چونک کر کہا تھا۔ اس کی بات سن کر ماہین نے بھی چونک کر سر اٹھایا تھا۔ ثروت نے فوراً" بات پلٹی۔

"سارہ بھابھی! آپ... آپ نواز بھائی سے اجازت لے لیں، پھر میں ماہین کو باہر لاؤں گی۔"

"او یس... میں ابھی آئی۔" وہ سر ہلا کر باہر نکل گئی تھی۔ میرب بغور ماہین کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب طرح کے تاثرات تھے۔ ثروت کو اس لمحے اس کا چہرہ بہت عجیب لگا تھا۔ اس کے چہرے پر حسد اور رشک کی ملی جلی کیفیت تھی۔

"ماہین! تمہارے لیے کھانا لے کر آئی ہوں۔ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا، تھوڑا سا کھا لو۔" رفعت ٹرے میں کھانا لے آئی تھی۔ اس نے ماہین کے قریب بیٹھ کر کہا تو وہ چونکی۔ پھر آہستہ سے نفی میں ہلا دیا تھا۔

"تھوڑا سا کھا لو... تم نے..." اس نے دوبارہ پیار سے اصرار کیا۔

"بھوک نہیں ہے، لے جاؤ۔" ماہین نے بے حد سنجیدگی سے اسے جواب دیا تھا۔

"تھوڑا سا کھا لو، دیکھو تم بھوکی..."

"میں نے کہا نا مجھے نہیں کھانا، نہیں کھانا۔" یک دم وہ برہم ہو کر بولی تھی۔

"اچھا اچھا، چلو ٹھیک ہے، ٹھیک ہے نہ کھاؤ تم کھانا، ہم تمہیں مجبور نہیں کرتے۔ اوکے، پلیز خود کو سنبھالو۔" ثروت نے بے حد نرم لہجے میں اسے سمجھایا تھا۔ مگر وہ جیسے حواس کھو بیٹھی تھی۔

"میں جانتی ہوں، یہ بھی میری دولت لوٹ کر بھاگ جائے گا۔ میں جانتی ہوں۔"

"ہرگز نہیں، پلیز ماہی! خود کو سنبھالو، ہوش کرو، احمد ایسا انسان نہیں ہے، میرا یقین کرو، تم احمد کے ساتھ..."

"وہ جانتا ہے مجھے؟ اس نے دیکھا ہے مجھے؟ جو مجھے جانتا تھا، جس نے مجھے دیکھا تھا جس نے مجھ سے محبت کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ بھی چھوڑ گیا۔ یہ بھی اسی طرح اسی

ملیح کرے۔ کالج میں اب وہ منہ دکھانے کی ہمت نہیں ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ ثروت کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

"ثروت! اسے سنبھالو' خاموش کرواؤ' وہ لڑکا نواز کے ساتھ اندر آرہا ہے۔" کچھ ہی دیر بعد حواس باختہ سی سارہ اندر آئی تھی اور ماہین کو اس طرح روتے دیکھ کر گھبرا کر بولی تھی۔ ثروت ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا... مگر وہ کیوں یہاں آرہا ہے؟ اسے ابھی تو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"مجھے پتا نہیں' شاید اس نے خود ہی کہا ہے کہ وہ ماہین سے ملنا چاہتا ہے۔"

"نہیں' ابھی اس کا ماہین سے اس حالت میں ملنا درست نہیں ہے' بھابھی! تم اسے سنبھالو' میں اسے روکتی ہوں۔" ثروت نے گھبرا کر ماہی کو سارہ کے پاس کھڑا کیا اور خود تیزی سے باہر نکل گئی۔

"ہوش کرو ماہین! پاگل مت بنو' شکر کرو ہماری عزت بچ گئی اور تمہاری بھی' ورنہ جس لڑکی کا دولہا عین بارات والے دن بھاگ جائے گا اسے کوئی معاف نہیں کرتا اور نہ ہی اس سے کوئی شادی کرتا ہے۔ یہ تو بڑا اچھا ہے جو ثروت نے احمد کو منا لیا۔ اور وہ کاشی اسے بگاڑنے میں تمہارا باپ اور تم دونوں ہی پیش پیش تھے۔ اس کی حیثیت کیا تھی' فقط دو ٹکے کا کلرک اور اوقات سے زیادہ مل گیا تھا اسے۔ اسی لیے تو وہ اتنا بدنیت ہوا' بے غیرت' بے شرم اور تم پھر بھی اسی کا نام لے رہی ہو۔" ثروت کے جاتے ہی سارہ کو کھل کر ماہین کو لتاڑنے کا موقع مل گیا تھا۔ ماہین نے تڑپ کر ماں کو دیکھا۔

"آنٹی... آنٹی... پلیز... اسے کیوں ڈانٹ رہی ہیں۔ اس سارے معاملے میں اس کا کیا قصور ہے' اسے کیا علم تھا کہ وہ اس طرح بھاگ جائے گا۔ وہ فراڈیا نکلا تو ماہین کا کیا قصور' یہ بے چاری تو خود..." رفعت کو سارہ خالہ پہلے بھی اتنی بری نہیں لگی تھی۔ جتنی اس وقت اس لمحے لگی تھیں۔

"ہاں اب تو سب ہی بے قصور ہو جائیں گے۔ پاک صاف' دھلے دھلائے' ہم ہی رہ گئے ہیں زمانے کی باتیں سننے کو' اونہہ!" وہ اسے بھی ڈانٹ کر غصے سے بڑبڑاتی وہاں سے نکل گئی تھی۔

"یہ آنٹی بھی نا بس یوں ہی ہیں... تم پریشان نہ ہونا ماہین۔ تمہیں تو معلوم ہے نا۔"

"رفعت... گھر چلو' مجھے گھر لے چلو پلیز' میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔" ماہین نے اس کی تمام باتوں کے جواب میں آہستہ سے التجا کی تھی۔

"مگر... مگر اس طرح میں تمہیں تنہا کیسے لے جا سکتی ہوں۔ تم دلہن بنی ہوئی ہو اور تمہارے گھر والے۔" رفعت اس کی فرمائش پر حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ جلدی جلدی اپنا زیور اتار رہی تھی۔

"میں ابھی... ابھی اور اسی وقت یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔" اس نے نوچ کر اپنا دوپٹہ اتارا تھا۔ جو سیفٹی پن لگی ہونے کی وجہ سے چرر کی آواز کے ساتھ پھٹتا چلا گیا تھا۔

"ہائے ماہی..." رفعت نے بے ساختہ دل پر ہاتھ رکھ کر دہائی دی تھی۔

"اتنا مہنگا سوٹ اور یہ... تم نے اسے پھاڑ دیا۔" وہ دوپٹے کے پھٹے ہوئے دونوں حصے اٹھا کر اسے حسرت سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"تم لے لو۔" اس نے لاپروائی سے لہنگا اس کی جانب اچھالا۔ اب وہ دوبارہ اپنے پرانے حلیے میں تھی۔ سادہ سا پیلا سوٹ پہنے جو اس نے یہاں آتے ہوئے تبدیل کیا تھا۔ بالوں کو بے دردی سے کھول کر بینڈ میں جکڑ لیا تھا۔ خوب صورت ہیئر اسٹائل کا حلیہ بگاڑ دیا تھا اس نے۔

"میں ابھی آئی۔" وہ دوبارہ واش روم میں جا گھسی تھی۔ رفعت نے حیرانی سے کارپٹ پر گرے ہوئے ستر ہزار کے لہنگے کو دیکھا۔

"ماہین کہاں ہے؟" ثروت کچھ دیر بعد دوبارہ اندر آئی تو حیرانی سے خالی کمرے کو دیکھا۔

"وہ واش روم میں گئی ہے۔" رفعت نے کارپٹ سے اس کا لہنگا اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ تو ثروت بے ساختہ چونکی۔ اب اس کی نظر لہنگے پر پڑی تھی۔

"ماہی نے یہ... ڈریس چینج کر لیا ہے۔" پھولوں کے ہار بکھرے اور ماہین کا پرس پڑا تھا۔ ثروت نے گہرا سانس لے کر سب چیزیں بیگ میں ڈالنا شروع کر دی تھیں۔

"رفعت! تم یہ زیور سنبھالو' میں احمد کو..." اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے پریشانی سے واش روم کے بند دروازے کو دیکھا اور پھر بند دروازے کو۔

"احمد!" ثروت اپنے سامنے کھڑے احمد کو دیکھ کر چونک گئی۔ ایک پل کو ہچکچائی' پھر دوسرے ہی لمحے اس نے دروازے سے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ احمد جھجکتے ہوئے اندر آیا تھا۔ شرمیلی مسکراہٹ اس کے معصوم سے چہرے پر کتنی پیاری لگ رہی تھی' ثروت کو بے ساختہ اس پر پیار آ گیا۔ اس کے گلے میں اب بھی وہی پھولوں کا ہار لٹک رہا تھا۔ جو ثروت نے اسے پہنایا تھا۔ اور جسے پہناتے ہوئے اسے لگا تھا آج برسوں بعد ممتا کے جذبے کی تسکین ہو گئی ہے۔ احمد نے اس کے ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

"میری امی فوت ہو گئی ہیں' مگر آپ کی محبت اور پیار دیکھ کر مجھے لگتا ہے اب مجھے امی کی کمی نہیں محسوس ہو گی۔" اور ثروت کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"آنٹی وہ..." اس نے پل بھر میں خالی کمرے کا جائزہ لے لیا تھا۔

"آؤ... تم بیٹھو نا۔" اس نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ رفعت خود بھی حیرت زدہ سی کھڑی احمد کو دیکھ رہی تھی۔ اسے ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ احمد اتنی خوب صورت پرسنالٹی کا مالک ہو گا۔

"رفعت... سب کچھ سمیٹ لیا' یہ لو' یہ بھی سنبھالو۔" اسی پل واش روم کا دروازہ کھلا تھا۔ اور ماہین نے باہر نکل کر کچھ چیزیں اس کی جانب پھینکی تھیں ثروت کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ اپنا سارا میک اپ اتار آئی تھی۔ اور اب بالکل سادہ چہرے کے ساتھ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی اور اس کی نظریں چھوٹے سے کمرے کے واحد صوفے پر بیٹھے احمد کی جانب اٹھی تھیں۔ ثروت کے لیے یہ صورت حال خاصی پریشان کن بن گئی تھی۔

"ماہی... آؤ' تم یہاں بیٹھو' احمد' احمد تم سے ملنے آیا ہے بیٹا۔"

"السلام علیکم۔" احمد نے فوراً اٹھ کر اسے سلام کیا تھا۔

وہ سپاٹ چہرہ لیے کھڑی تھی' ماہین کو یوں گم صم دیکھ کر ثروت نے اس کے قریب آ کر اس کا بازو تھام کر ہلایا تھا۔

"ماہین۔" اس کی سرگوشی میں تنبیہہ تھی۔

"بہت مہربانی' بہت شکریہ' میرے باپ کی عزت بچانے کا اور میری پھوپھو کی لاج رکھنے کا۔ پتا نہیں کیا سوچ کر آپ نے مجھ جیسی لڑکی سے شادی کی ہے' یقیناً" پھوپھو نے آپ کو مجبور کیا ہو گا یا شاید کوئی لالچ..."

"ماہین..." ثروت نے گھبرا کر اس کا کندھا ہلایا۔

"آپ مجھے ان سے بات کرنے دیں گی پلیز۔" احمد اٹھ کر اس کے قریب آ گیا تھا۔ اس نے ایک خوف زدہ نظر ماہین پر ڈالی' اس کے عزائم ثروت کو بہت خطرناک لگ رہے تھے۔

"ہاں... ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلاتی رفعت کو ہاتھ سے اشارہ کرتی باہر نکل آئی تھی' رفعت نے فکرمندی سے ثروت کو دیکھا۔

"آنٹی وہ ماہی... وہ کوئی گڑبڑ نہ کر دے' اس کا موڈ..."

"فضول بکواس بند کرو' اچھا ہے' وہ احمد سے بات کرے گی تو اسے اندازہ ہو گا کہ وہ کتنا اچھا لڑکا ہے اور اس کا خوف دور ہو جائے گا۔" ثروت نے کہا تو وہ سر ہلا کر اس کے ساتھ ہال میں آ گئی۔ جہاں لوگ ندیدوں کی طرح

کھانے پر نوٹے ہوئے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹے کی تاخیر نے سب ہی کو بے صبر بنا دیا تھا۔ اس نے ہال میں نظر دوڑائی۔ نواز اکرم رضا کے ساتھ کھڑے تھے جبکہ سالہ اسے کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ میرب' آیان واسطی کے ساتھ کھڑی تھی اور مسلسل بول رہی تھی پتہ جانے وہ دولہا کی تبدیلی کی اسے کیا کیا وجوہات بتا رہی تھی۔

بہرحال ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ ثروت نے ایک گہرا اطمینان بھرا سانس لیا۔

"آنٹی! آپ بھی تو تھوڑا سا کھانا کھا لیں' صبح سے بھوکی گھوم رہی ہیں۔" رفعت پلیٹ اٹھائے قریب آگئی تو اس نے اس سے پلیٹ تھام لی۔

"فکر و پریشانی نے تو بھوک' پیاس سب ہی ختم کر دی تھی' ابھی کچھ ہوش بحال ہوئے ہیں تو۔۔۔"

اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔ احمد گھبرایا ہوا اس کی جانب آرہا تھا۔ اس کا دل کانپا۔

"احمد۔۔۔ کیا ہوا؟" اس کے چہرے پر شدید پریشانی تھی۔ ثروت نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

"آنٹی۔۔۔ وہ ماہین۔۔۔ وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ پتا نہیں اسے کیا ہوا ہے۔"

"بے ہوش۔۔۔ کہاں ہے وہ۔۔۔ آؤ میرے ساتھ۔" اس نے ہاتھ میں تھامی پلیٹ رفعت کی پلیٹ پر رکھ کر گھبراتے ہوئے اس سے پوچھا تھا اور بڑی تیزی سے اس کے ساتھ اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

دروازے پر زوردار دستک ہو رہی تھی۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے ساتھ کاشف بے سدھ سو رہا تھا۔

"یہ کون آگیا ہے۔ پتا نہیں کیا وقت ہو گیا ہے۔ اف میرا سر۔ ابھی تو سوئے تھے۔" دروازے پر دوبارہ دستک ہو رہی تھی۔

"اوہو۔۔۔" وہ جھنجلا کر غصے سے اپنے بال سمیٹتی اٹھی تھی۔

"کون؟" اس نے کنڈی کھولنے سے پہلے اندر سے ہی پوچھا تھا۔

"میں۔۔۔ شہباز ہوں بھابھی۔۔۔ کاشف اٹھ گیا ہے؟" اس نے مڑ کر بے سدھ سوئے کاشی کو دیکھا۔

"نہیں بھائی' وہ سو رہا ہے۔" اس نے کنڈی اتار کر دروازہ کھولا۔ شہباز باہر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"بھابھی! دن کا ایک بج رہا ہے اور یہ ابھی تک سو رہا ہے۔"

وہ کہتے کہتے اندر آگیا تھا۔ رانی نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ وہ ابھی بستر سے اٹھی تھی۔ شکن آلود بستر کی چادر اور بنیان میں سویا ہوا کاشف۔ شہباز کے چہرے پر بڑی معنی خیز سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا دوپٹہ پھیلایا۔

"کاشف۔۔۔ اوئے کاشف' یار! اٹھ جا اب۔" اس نے کاشف کا کندھا تھام کر اسے ہلایا۔ کاشف نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا' پھر یک دم اٹھ بیٹھا تھا۔

"تم۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا ٹائم ہو گیا ہے یار؟"

"ٹائم تو بہت ہو گیا ہے' دوپہر ہو گئی ہے' تم دونوں نہا دھو لو' پھر کھانا کھاتے ہیں۔ میں نے سری پائے اور نہاری نان منگوائے ہیں۔ ٹھنڈے ہو جائیں گے' اسی لیے تمہیں اٹھایا ہے۔"

رانی جلدی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ شہباز نے رات کو ہی گھر میں بنے باتھ روم کی نشان دہی کر دی تھی۔ چھوٹا سا باتھ روم' پلاسٹک کی نیلی بالٹی اور صابن دانی میں دھرا نیا نکور صابن' اس نے ایک نظر میں ہی باتھ روم کا جائزہ لے لیا تھا۔

"یار! تو پریشان کیوں ہوتا ہے۔ یہاں سیٹھ نواز تو کیا اس کی روح بھی نہیں پہنچ سکتی ہے۔ یہ میرا اپنا گھر ہے' جتنے دن تیرا دل چاہتا ہے رہ' بلکہ میرا خیال ہے جب تک حالات بہتر نہیں ہو جاتے تو آرام سے یہاں رہ۔" وہ واپس آئی تو شہباز' کاشف سے کہہ رہا تھا۔

"میں یہاں زیادہ دن نہیں رہوں گی۔ یہ جگہ بھی کوئی رہنے کے قابل ہے۔ گاؤں میں رہنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ ہم کسی بڑے شہر میں چلے جائیں گے اور۔۔۔"

اس نے رات کو ہی اس چھوٹے سے گاؤں کی ٹوٹی پھوٹی سڑکوں کو دیکھتے ہوئے سنا دیا تھا۔ اوپر سے شہباز کا گھر' چھوٹا سا کچا پکا۔ رات بھر مچھروں کی یلغار نے تنگ کیے رکھا تھا اور اب جب کچھ آنکھ لگی تھی تو خود شہباز نے اٹھا دیا تھا۔

"یہاں ہی رہنا ہے مجھے یار! اور کہاں جاؤں گا' تو میرا جگری یار اور ہمدرد ہے۔ اس وقت تو نے میری مدد کی ہے۔ میرا ساتھ دیا ہے۔ مجھے پناہ دی' اپنے گھر میں' میں تو تیرا یہ احسان زندگی بھر نہیں اتار سکتا۔" کاشف کے اس قدر عاجزانہ رویے پر رانی نے ناک چڑھائی۔

"اونہہ۔۔۔ احسان۔۔۔ پیسہ ہے ہمارے پاس بھوکے ننگے ہوتے تو دیکھتی' پناہ دیتا یا ٹھوکریں مار کر۔ تو زیادہ احسان مند نہ ہوا کر اس کا اور ہم نے اب زیادہ دن نہیں رہنا یہاں۔" شہباز کے جاتے ہی اس نے اپنی ناگواری کا برملا اظہار بھی کر دیا تھا۔ کاشف نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا مطلب! کیسی باتیں کر رہی ہے تو' یہ میرا جگری یار ہے' میرا سب سے بڑا ہمدرد۔ اور یہاں سے نکل کر کہاں جائیں گے۔ وہ نواز اکرم جو ہے نا۔ اس کے بندے کتوں کی طرح میرے پیچھے لگے ہوں گے۔ بلکہ وہ تو اب تک پولیس کو بھی میری گمشدگی کی اطلاع دے چکا ہو گا۔ اسی لیے کہتا ہوں' ابھی چند دن خاموشی سے یہاں ہی گزار لو' جب تک یہ معاملہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا۔ پھر ہم کسی شہر میں اچھا سا خوب صورت گھر لے کر موج اور عیش سے رہیں گے۔ سمجھا کرنا تو بڑی سیانی ہے۔"

کاشف نے اس کی بے زاری اور کوفت کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اپنی پسند ناپسند کا یوں ہی برملا اظہار کرتی تھی۔ اسی لیے اس نے بڑے آرام اور سبھاؤ سے اسے سمجھایا تھا۔

"مگر یہاں۔۔۔ اس کچے گھر میں؟" اس نے منہ بنا کر مٹی کا فرش دیکھا۔

"تجھے کون سا یہ گھر صاف کرنا ہے۔ سارا دن آرام سے بیڈ پر لیٹی رہنا۔ دیکھ رانی۔" کاشف نے اس کا ہاتھ تھاما۔ "جب سب کچھ ہمارا ہے' ہم خوب عیش موج میں زندگی گزاریں گے۔ تو صرف چند دن صبر کر لے میں نے تیرے لیے ہی تو یہ سب کیا ہے۔"

"ہم شادی کب کریں گے تیرا اور میرا ویاہ۔۔۔"

"شی۔۔۔ چپ۔۔۔ شہباز کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ ہم۔۔۔ وہ ہم دونوں کو میاں بیوی ہی سمجھتا ہے اور اسے کبھی یہ بتانا بھی مت' ورنہ۔۔۔ ابھی کچھ دن بعد جب ہم یہاں سے جائیں گے تو وہاں جا کر شادی کر لیں گے۔"

"ہوں۔" کاشف کے سمجھانے پر اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

"چل اب موڈ ٹھیک کر' میں نہا کے آتا ہوں' پھر سری پائے کا ناشتا کرتے ہیں۔ نہاری تو تجھے بھی بہت پسند ہے نا۔"

"ہاں۔۔۔" یک دم بھوک کا احساس جاگا تھا۔

"چل پھر میں ابھی آیا۔"

کاشف نے پیار سے اس کا گال دبایا اور چھلانگ لگا کر نیچے اتر گیا تھا۔ وہ بے ساختہ مسکرائی۔ بیڈ شیٹ کو صاف کر کے جھاڑ کر دوبارہ بچھایا۔ گدے درست کیے۔ تکیے جھاڑ کر سرہانے دھرے' میز کا کپڑا ٹھیک کر کے ارد گرد نظر دوڑائی۔ باقی تو سارا کمرہ درست ہی تھا۔ اس نے اپنے بیگ سے برش نکالا اور اپنے لمبے سیاہ بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"ویسے کمال بات ہے' دولہا انہوں نے ڈھونڈا کہاں سے' اتنا ارجنٹ دولہا۔ خاصی فلمی کہانی لگ رہی تھی۔" عالیہ نے ناشتے کی میز پر بیٹھے انور اور آیان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے مذاق کیا تھا۔

"بڑا چالاک نکلا وہ۔ سب لوٹ سمیٹ سماٹ نکل گیا اور اس کی وجہ سے میری بھی شادی لیٹ ہو گئی ہے۔"

"ارے ایسے رشتوں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ زور زبردستی سے اسے اپنا داماد بنانا چاہا' لالچ دیا۔ وہ لالچ میں آگیا۔ کھا گیا۔ ماہین۔ اس سارے قصے میں بے چاری ماہین

کا کیا قصور؟ اس کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ اس نے کاشف کو اپنا سب کچھ سونپ دیا۔ اپنا سارا روپیہ پیسہ زیور، جہیز تک تو وہ بیچ گیا ہے۔" عالیہ نے چائے کا سپ لیتے ہوئے افسوس سے کہا۔

"تو انہیں کس نے مشورہ دیا تھا کہ سب کچھ پہلے سے اسے سونپ دو۔ شادی سے قبل زیور، جہیز اور کیش دینے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اب تو یہ ہی فیشن ہے بیٹا! اب کچھ شادی سے قبل لڑکے والوں کے ہاں بھجوا دیا جاتا ہے۔ تاکہ گھر میں جہیز کا سامان سیٹ ہو جائے اور دلہن کا کمرا بھی سج جائے۔ تمہیں کیا معلوم، تمہاری کوئی بہن نہیں ہے نا۔"

"شکر ہے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ ہماری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ توبہ توبہ کتنے دکھ اور تکلیفیں ملتی ہیں ان بیٹیوں کی وجہ سے۔ میں نے نواز اکرم کو اتنا دل برداشتہ، ہارا ہوا۔ پریشان اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ بزنس مین ہے وہ، اتار چڑھاؤ زندگی میں آتے رہتے ہیں۔ مگر ایسا مالی نقصان، جس میں اپنی خوشیاں بھی داؤ پر لگ جائیں، انسان کو ختم کر دیتی ہیں۔ اف! انور واسطی نے کیا کر کہا تھا۔ عالیہ نے بے ساختہ چونک کر انہیں دیکھا۔

"بس بیٹیوں کے برے نصیبوں سے ڈر لگتا ہے۔ ورنہ بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں اور بڑی پیاری ہوتی ہیں۔ مگر جب ان کے ساتھ اس طرح کے دھوکے ہوتے ہیں تو۔ اللہ اسے برباد کرے کم بخت نے ایک بچی کے دل کو اتنا برا رکھ دیا، بے چاری کے لیے اب ایک نئے انجان اجنبی شخص کو قبول کرنا کتنا مشکل ہوگا۔ عورت کی زندگی مسلسل محنت ہے۔ آزمائش اور امتحان ہے۔"

عالیہ کو بے حد دکھ ہو رہا تھا۔ رات کو جو کچھ ہوا تھا، وہ آسانی سے بھلانے والا نہیں تھا۔ ماہین کا اچانک نکاح اور پھر اس کی بے ہوشی۔ اسے اسی وقت ایمرجنسی میں لے جایا گیا تھا۔ جہاں ڈاکٹر نے کہا تھا کہ انہیں کوئی گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ اسی لیے یہ اعصابی دباؤ کا شکار ہو گئی ہیں۔ نواز اکرم، ثروت، سارا علوی، میرب اور وہ خود بھی سب ہی اسپتال اس کے ساتھ آگئے تھے۔

علی الصبح نواز اکرم نے ان لوگوں کو زبردستی گھر بھجوا دیا تھا۔ جبکہ وہ خود اور ثروت، ماہین کے پاس ہی ٹھہرے تھے۔ نیا نویلا دولہا بے چارہ تنہا ایک طرف خاموش کھڑا تھا اس کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا ہے اور کیا ہونے والا ہے، عالیہ کے تصور میں بار بار بے ہوش ماہین اور پریشان، فکر مند احمد کی شکلیں آرہی تھیں۔

ماما! آپ اپنی این جی او کے پلیٹ فارم سے اس ایشو کو اٹھائیں۔" آیان کے مشورے پر عالیہ چونکیں۔

"ویشو... نہیں بیٹا! اب اس ایشو کو اٹھانے کا فائدہ نہیں، کیونکہ اب تو ماہی کا نکاح بھی ہو چکا ہے۔ وہ فراڈیا تو بھاگ گیا۔ اسے تو پولیس خود ہی تلاش کر لے گی۔ نواز بھائی بتا رہے تھے کہ انہوں نے پولیس کو انفارم کر دیا ہے ایف آئی آر کٹوا دی ہے۔ اب تم دیکھنا، وہ جہاں بھی ہوا اسے چین سے رہنا نصیب نہیں ہوگا۔"

"ماما! اس سارے قصے میں ایک مظلوم اور بھی ہے۔ آپ اسے بھول رہی ہیں۔"

"کون؟" عالیہ چونکیں۔

"میں، میرا ویاہ بھی تو لیٹ ہو گیا ماما۔" اس کی بات پر وہ بے ساختہ ہنسی تھیں۔

"تمہارا آن آیان، ایک دو ہفتے لیٹ ہونے سے کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ ابھی وہ بے چارے جس حادثے سے گزرے ہیں، اس کے بعد دوبارہ شادیانے بجانا ممکن نہیں ہے۔"

"ہوں... رائٹ، اسی لیے تو خاموش ہو گیا ہوں۔"

"ویسے مجھے تو میرب کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ اس لڑکی کے چہرے پر نہ کوئی فکر مندی تھی نہ کوئی دکھ سگی بہن کے ساتھ جو ہوا، اس پر اس کا سرد رد عمل اور لاپروا انداز۔ میں تو حیران رہ گئی۔" عالیہ کے کہنے پر آیان چونکا۔

"ماما! دونوں بہنوں کے تعلقات اتنے اچھے نہیں ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے لیے فکر مند ہوں۔"

"سوال ہے، تعلقات کے اچھے یا برے ہونے کا تو اس میں کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ یہ تو احساس کی بات ہے۔ ثروت کو دیکھا تھا۔ تڑپ رہا تھا اس کی اپنی سگی بچی کے ساتھ یہ حادثہ ہوا ہے۔ اس قدر پریشان دکھی تھی کہ سارا بھی اس کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی۔ مجھے سارہ اور میرب دونوں ہی کے رنگ ڈھنگ عجیب اور انوکھے نظر آئے ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ ماہین سارہ کی سگی بیٹی ہے۔ اپنی بیٹی کے ساتھ اتنے بڑے حادثے پر اتنا کولڈ رد عمل۔" عالیہ ناشتے کے برتن سکینہ کو پکڑاتے ہوئے ساتھ ساتھ باتیں بھی کیے جا رہی تھیں۔ ان کی آخری بات پر آیان چونکا۔

"لگتا ہی نہیں کہ ماہین سارا کی سگی بیٹی ہے۔"

آیان کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔ ایک بار یہ ہی بات اس نے بھی میرب سے کہی تھی۔

"ارے نہیں بھئی۔ وہ میری ہی بہن ہے۔ سگی والی۔ بس وہ پیاری نہیں ہے نا تو ماما اسے اتنا پیار نہیں کرتی ہیں جبکہ میں بالکل ماما کا عکس ہوں۔ وہ مجھ سے نہیں بلکہ خود سے محبت کرتی ہیں اور بابا ماہین سے نہیں بلکہ خود سے ہی محبت کرتے ہیں۔"

میرب نے عجیب فلسفہ بیان کیا تھا۔ تب اس نے اس کی بات کو سرسری سن کر نظر انداز کر دیا تھا۔ مگر اب عالیہ واسطی کی کہی بات کو نظر انداز نہیں کر سکا تھا۔ پر سوچ انداز میں ماتھے پر بل ڈالے۔ وہ اسی ایک پوائنٹ کو سوچے جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"احمد بیٹا! آپ اب گھر جاؤ۔ اب ماہین کی حالت بہت بہتر ہے، تم رات بھر کے جاگے ہوئے ہو۔ تم گھر جا کر آرام کرو بیٹا!"

نواز اکرم نے آئی سی یو کے باہر بیٹھے احمد کے قریب بیٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنائیت اور محبت سے کہا تھا۔ اس پل اسے احمد دنیا میں سب سے عزیز پیارا لگ رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اس کی عمر بھر کی نیک نامی اور عزت کو بچا لیا تھا۔ اس کی بیٹی کو دیکھے بغیر اپنا نام دیا تھا۔ بھلے وہ برسوں پہلے اپنے باپ کے ہاتھوں ہونے والی زیادتی کا ازالہ کر رہا تھا مگر اس کے لیے وہ فرشتہ تھا۔ جس نے نواز اکرم جیسے تڑپتے اور اذیت سے بے حال قریب المرگ شخص کو زندگی کی نوید سنائی تھی۔

"جی انکل۔" اب اسے بھی یہاں بیٹھنا کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے وہ اٹھ گیا تھا۔ آئی سی یو کے باہر ہی ثروت اسے مل گئی تھی۔

"احمد... کہاں جا رہے ہو؟"

"آنٹی... انکل نواز کہتے ہیں، مجھے اب گھر جانا چاہیے۔" اس نے مسکرا کر کہا تو ثروت بھی ہولے سے ہنس دی۔

"ٹھیک کہا انہوں نے۔ میں بھی یہ ہی کہہ رہی تھی کہ تم اب ریسٹ کرو۔ رات بھر اپ سیٹ رہے ہو۔ اب ماہین کی طبیعت بہتر ہے۔"

"جی آنٹی... میں جاتا ہوں۔"

"احمد..." اس نے پکارا تو وہ ٹھٹک کر مڑا۔ سوالیہ نظروں سے ثروت کو دیکھا۔

"احمد... ماہین بے ہوش کیوں ہوئی تھی؟" اس کے سوال پر احمد بے ساختہ چونکا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سمیرا انیس

دردگر

"اُفوہ! ساڑھے دس ہوگئے، ابھی تک لائٹ نہیں آئی۔" عشاء کے لہجے میں پریشانی نمایاں تھی۔ ٹی وی لاؤنج میں بے قراری سے ٹہلتے ہوئے اس نے ایک لمحے کو رک کر منال کی طرف دیکھا جو صوفے پر دونوں پیر اوپر کرکے بیٹھی ڈرائی فروٹ کھا رہی تھی۔

"جنریٹر کو بھی اسی وقت خراب ہونا تھا۔ میرا پسندیدہ پروگرام نکلا جارہا ہے۔" عشاء سخت جھنجلاہٹ کا شکار تھی۔

"اب تمہارے اس طرح ٹہلنے سے لائٹ تو آنے سے رہی۔" منال ڈرائی فروٹ کھانے میں اس طرح مگن تھی گویا ساری پلیٹ آج ہی ختم کرنے کا تہیہ کیے بیٹھی ہو۔ "ریپیٹ ٹیلی کاسٹ میں دیکھ لینا۔" اس نے بے نیازی سے اسے مشورہ دیا تھا۔ عشاء نے اسے بری طرح گھورا۔ ابھی کچھ کہنے کے لیے اس نے لب کھولے ہی تھے کہ اچانک لائٹ آگئی۔ عشاء نے بے تابی سے ریموٹ اٹھا کر فوراً ٹی وی آن کیا۔ پروگرام شروع ہوچکا تھا۔

"میں نے ہمیشہ اقلیتوں کے حقوق کی حمایت کی ہے۔ ہمارا مذہب بھی کہتا ہے ہم ان کے حقوق کا تحفظ کریں۔"

اینکر کے سوال کے جواب میں مقتدر سیاسی رہنما نے بڑے مدبرانہ انداز میں جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر اینکر نے ان کے جواب کو کیا اہمیت دی تھی وہ اس کے اگلے چبھتے ہوئے سوال سے عیاں ہوگئی تھی۔

"بالکل بجا فرمایا سر! آپ نے کہ مذہب اسلام بھی اقلیتوں کے تحفظ کا حامی ہے۔ لیکن میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اکثریت کے تحفظ کے لیے آپ کی کوششیں کیا ہیں؟ یہ جو آئے دن خودکش دھماکے ہورہے ہیں۔ غریب عوام اپنے۔۔"

"دیکھیں اکثریت کے لیے۔" سیاسی رہنما نے اینکر کی بات کاٹتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

"ایک منٹ سر! معذرت کے ساتھ، میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ میں کہہ رہا تھا کہ غریب لوگ غربت اور بے روزگاری کے ہاتھوں آئے دن اپنے بچوں کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کرکے بھوک جیسے عفریت سے ان کی جان چھڑاتے ہیں۔ اور بھی کئی ایسے مسائل ہیں جن سے اکثریت دوچار ہے۔ ان کے لیے آپ نے کیا کیا ہے۔ آپ پہلے اکثریت کے مسائل کو تو حل کریں پھر اقلیت کی باری آتی ہے۔ آپ صرف اقلیت کی بات کریں گے تو وہی بات ہوگئی کہ آپ کے اپنے گھر والے تو بھوکے ہیں مگر آپ

ناولٹ

پڑوسیوں کے حقوق ادا کررہے ہیں کہ مذہب اسلام پڑوسیوں کے حقوق کی بہت حمایت کرتا ہے۔"

اینکر کے بولڈ اور بے باک انداز پر ٹی وی اسکرین کے سامنے بیٹھی منال کبیر کے لبوں پر بڑی محظوظ مسکراہٹ چھا گئی۔

مہمان سیاسی رہنما بظاہر بڑے سکون سے اینکر کے سوالات کے جوابات دے رہا تھا' مگر اینکر کے تیکھے اور چبھتے ہوئے سوالات اس کی آنکھوں میں ناگواری' غصہ اور ناپسندیدگی کے علاوہ "وارننگ" کے تاثرات بھی ابھار رہے تھے۔

عشاء نے اسے محسوس کیا اور اٹھ کر برآمدے میں آ گئی۔

دل پر انجانا سا بوجھ آ گیا اور ایسا اکثر ہی ہوتا تھا۔

حیدر بن مغیث کا "بولڈ انداز" بڑے سے بڑے پاور فل عہدیدار سے بلا جھجک تیکھے سوالات کرنا اس کی پہچان تھی۔ اس کا یہ انداز اس کے مداحوں کی تعداد میں تو اضافہ کررہا تھا لیکن دشمنوں کی گنتی بھی اسی حساب سے بڑھ رہی تھی۔

اور عشاء کبیر جانتی تھی کہ اس پروگرام کے بعد بھی اس نے پہلے کی طرح کئی دھمکی آمیز کالز وصول ہوں گی۔

اخیر دسمبر کی یہ اداس شب اس کے متفکر دل کو مزید مضطرب کرنے کا سامان کررہی تھی۔ اس نے گہرا سانس لے کر دسمبر کی ٹھنڈی ہوا سے اپنے جلتے جی کو سرد کرنے کی ایک ناکام سی کوشش کی اور ستون سے ٹیک لگا کر پورے چاند میں چرخہ کاتتی عورت سے دل بہلانے لگی۔ مگر دل بھی بڑا سیانا ہوتا ہے۔ ایسی باتوں میں بھلا کب آتا ہے۔ اپنی ہی من مانی کرتا ہے۔ اس وقت دل' دھیان کے پنچھی کو اپنے ساتھ اڑا کر اسٹوڈیو لے گیا تھا۔ جہاں حیدر مغیث تھا' اس کے تیکھے' تلخ سوالات تھے اور ان سوالات سے جنم لینے والی دشمنی اور اس دشمنی سے پیدا ہونے والے اس کو ختم کردینے کے عزائم۔ جو عشاء کبیر کو اب کئی دنوں تک چین نہیں لینے دیں گے۔

"میرے بولڈ انداز کی وجہ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ حیدر مغیث کسی دن اپنے کسی دشمن کی گولی کا نشانہ بن کے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ بڑے بھولے ہیں لوگ میری طرف کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے بڑے پاور فل چینل کی سپورٹ حاصل ہے۔ وہ حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے ہیں۔"

دھیان کے پنچھی نے اسٹوڈیو سے اڑان بھری اور ایک ریسٹورنٹ پر جا اترا۔ جہاں وہ اس کے سامنے بیٹھا اسے جھوٹی تسلی دے رہا تھا یا شاید یونہی بات کررہا تھا۔ مگر یہ دل بھی نا۔ اسے بھی کبھی کبھار اپنے آپ کو خوش کرنے کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ پھر وہ غلط بیانی کو صحیح سمجھنے لگتا ہے۔ بے تکی باتوں میں خوش کن پہلو ڈھونڈ کر خوش فہم ہونے لگتا ہے۔

سیل فون کی مدھر دھن سے دسمبر کی خاموشی ہڑبڑا اٹھی۔ چونک کر اس نے مٹھی میں دبے سیل فون کی اسکرین کو دیکھا۔ جہاں اس کے باپ کا نام جگمگا رہا تھا' گویا آج پھر اس کے باپ کو اولاد کی ضروریات سے آگاہ ہونے اور پھر اس کے پورا کرنے کا خیال آیا تھا۔

کال ریسیو کرتے ہوئے وہ لان میں آ گئی۔

آج سے بیس برس پہلے جب وہ محض دو سال کی تھی اس کی ماں اس کی چھوٹی بہن منال کبیر کو جنم دے کر اس دنیا سے منہ موڑ گئی تھی۔ اور اس کے اگلے برس ہی اس کے باپ نے اپنے ہم پلہ دولت مند شخص کی بیٹی سے بیاہ رچا لیا اور اپنی دونوں بچیوں کی ذمہ داری اپنی ماں کو سونپ کر نئی بیوی کے ہمراہ نیا گھر بسانے چلا گیا۔ اور اب گزرے انیس برسوں سے وہ ہر ماہ کال کرکے ماں اور بیٹیوں کی خیریت دریافت کرتا تھا۔ ضروریات پوری کرنے کے لیے روپے پیسے بلا حساب مہیا کرتا تھا اور مہینے میں ایک آدھ بار اپنے درشن کرا کر اپنے تئیں تمام فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو جاتا تھا۔

آج بھی اس کے باپ نے اپنی پرانی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے "کیسی ہو؟ پڑھائی کیسی جارہی ہے؟ منال مزے میں ہے؟ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" سے ہٹ کر کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

"کیا تھا جو آج آپ اپنی روایت سے ہٹ کے میرے بھیگے لہجے کی بابت ہی پوچھ لیتے۔" لائن ڈسکنکٹ کرتے ہوئے اس کے دل نے پھر ایک انہونی سی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔

"عشاء جی!" اسی پل دروازہ کھلا اور منال نے وہیں سے ہانک لگائی۔ "ہماری معزز دلوی محترمہ فرمارہی ہیں کہ اگر آپ نے تجربہ کرلیا ہو کہ سات سینٹی گریڈ میں انسانوں کی قلفی جمتی ہے یا نہیں تو پلیز تشریف لے آئیں۔ ڈنر کا وقت ہو گیا ہے۔" وہ پیغام رسانی کرکے اگلے پل پلٹ گئی۔

"تم نے پورا پروگرام کیوں نہیں دیکھا عشاء؟ اف کیا بتاؤں واؤ! کیا غضب کا پروگرام کرتا ہے۔ بندہ۔" ڈائننگ روم میں قدم رکھتے ہی منال اس سے مخاطب ہوئی پھر دادی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"اچھے اچھے سیاستدان اس کے آگے گھبرا جاتے ہیں۔ بولڈ انداز میں ایسے بے خوفی سے سوالات کرتا ہے جیسے اس کے سامنے کوئی باا ثر شخصیت نہیں بلکہ کوئی بے ضرر سا بندہ ہو۔ حالانکہ کوئی اسے ضرر بھی پہنچا سکتا ہے۔" اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر چھری کانٹوں کی آواز تھی یا پھر منال کبیر کی۔ وہ اس کا پروگرام دیکھنے کے بعد یوں ہی دو دن تک اس کے گن گایا کرتی تھی۔

"اور آج تو کمال ہی کردیا۔ مہمان سیاست دان تو آخر میں ہکلانے لگ گئے تھے۔ قسم سے بڑا زبردست پروگرام تھا۔ تم ریپیٹ میں ضرور دیکھنا۔" وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اور وہ اسے کیا جواب دیتی حلق میں نوالہ اٹک گیا تھا اور دھیان منال کے اس جملے میں کہ کوئی اسے ضرر بھی پہنچا سکتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"سنا ہے کل کے پروگرام میں آپ نے مہمان کے چھکے چھڑا دیے تھے؟" کافی شاپ کے پرسکون ماحول میں اس کی آواز سرگوشی کی صورت برآمد ہوئی تھی۔

"سنا ہے کیا مطلب؟ آپ نے میرا کل کا پروگرام نہیں دیکھا۔" حیدر کو اس کے پروگرام مس کردینے پر افسوس ہوا ہے یا نہیں؟ عشاء اس کے بے تاثر لہجے سے اندازہ نہیں لگا پائی۔

"لوگ کہتے ہیں حیدر مغیث کا "سچ" اسے زیادہ دن جینے نہیں دے گا۔" اس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھائی تو دیکھا' وہ مسکرا رہا تھا۔ نجانے کیوں؟

"یعنی لوگوں کے کہنے کا مطلب ہے کہ اگر میں سچ بولنا چھوڑ دوں تو زیادہ دن جی لوں گا۔ پھر موت اپنے مقررہ وقت پر نہیں آئے گی۔ چند برس ٹھہر کر آئے گی۔ ہے نا؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ عشاء کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ سو اس نے نظریں چرائیں اور کافی کے مگ کو مضبوطی سے تھام کر اپنے یخ ہاتھوں کو حرارت پہنچائی۔

"اس پروگرام کے بعد سے کتنی کالز دھمکی آمیز موصول ہوئی ہیں۔" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ خود کو دوبارہ بھی سوال کرنے سے باز نہ رکھ سکی۔

"پتا نہیں۔" اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں نے شمار نہیں کیں۔"

"آپ کو ڈر نہیں لگتا' ان دھمکیوں سے؟" اس نے کسی قدر جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"دھمکیاں نہیں' گیدڑ بھبکیاں کہیں مس عشاء کبیر! گیدڑ بھبکیاں۔" اس نے اس کی تصحیح کی۔

"میں اثر نہیں لیتا ان گیدڑ بھبکیوں کا۔" اس نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر اتنی دھیمی آواز میں بولا کہ وہ بمشکل سن پائی۔ "آپ بھی نہ لیا کریں۔"

عشاء نے چونک کر اسے دیکھا۔ اور اس کا اس طرح دیکھنا حیدر مغیث کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا

تھا۔ تب ہی اس نے اپنی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے دانستہ کہا۔

"میں اپنے فینز سے یہی کہتا ہوں کہ جن باتوں کو میں ہی اہمیت دینے کو تیار نہیں ان کے متعلق آپ لوگوں کا فکر مند ہونا عبث ہے۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

"فینز۔؟" اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔ "میں کیوں ہر بار یہ بھول جاتی ہوں کہ یہ مجھے فین سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں۔" اس نے جھنجلا کے سوچا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چلوں گی اب۔ دیر ہو رہی ہے۔" دل نے معمولی باتوں پر غیر معمولی اداس ہونے کی عادت ہی بنالی تھی۔

"ٹھہریں مس عشاء" حیدر نے اس کی ٹھنڈی کافی کے بھرے مگ کو دیکھا جس میں سے ایک گھونٹ بھی نہیں لیا گیا تھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہماری منزل جدا سہی۔ مگر پارکنگ ایریا تک تو ہم ساتھ جا سکتے ہیں نا؟" مسکرا کے وہ اس کے ہم قدم ہوا تو بہت کچھ جتا گیا۔ عشاء محض دیکھ کر رہ گئی۔

"آپ نے ایک بار کہا تھا کہ آپ دو سے سات بجے تک گھر پر ہی ہوتے ہیں۔ کل میں یونیورسٹی سے واپسی پر آپ کے فلیٹ آئی تھی۔ فلیٹ لاکڈ تھا۔" وہ اپنی سوک سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"ہاں۔ میں کل کچھ زیادہ ہی مصروف تھا۔"

"میں نے کافی دیر وہاں رک کر آپ کا انتظار کیا تھا۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"میرے فلیٹ کے باہر؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"جی میں نے سوچا شاید آپ آنے ہی والے ہوں۔"

"اوہ" حیدر نے لب بھینچے۔ "عشاء! میں جس بلڈنگ میں رہتا ہوں۔ وہاں رہنے والے لوگ اتنے اچھے نہیں ہیں۔ آپ کا یوں میرے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا۔ آپ کو اس معاملے میں احتیاط برتنی چاہیے تھی۔" اس کے لہجے سے فکر مندی عیاں تھی۔ اس نے غور سے حیدر کی صورت دیکھی۔

"تو ہم۔" اس نے بری طرح اپنے دل کو جھڑکا۔ پہلے بھی کئی بار وہ اسے دھوکا دے چکا تھا۔

"آئندہ نہیں آؤں گی۔" اس نے روٹھے پن سے کہا۔

"ایسا میں نے کب کہا؟" وہ اس کے انداز پر ہنس دیا۔

"اچھا یہ لیں۔" اس نے اپنی پینٹ کی جیب سے چابی نکالی۔ "ڈپلی کیٹ۔ تاکہ آئندہ بھی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو آپ کو باہر کھڑا نہ ہونا پڑے۔"

"تنی بڑی عنایت۔" دل خوشی سے اچھلا۔

"اب اس واقعہ کو تو کسی اور رنگ میں لے سکتا ہوں نا میں۔" دل نے پچھلی جھڑکی کو ذہن میں رکھتے ہوئے سرگوشی میں جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ کوئی بھی مہمان میرے گھر آئے اور فلیٹ لاکڈ ہونے کی صورت میں کھڑے کھڑے باہر سے ہی چلا جائے۔ اور مجھے پتا ہے کہ میرے فلیٹ میں آپ کے علاوہ کوئی مہمان نہیں آئے گا۔ یہ چابی اسی لیے آپ کو دے رہا ہوں۔"

"دھت تیرے کی۔" ہمیں کا دل سینے کے اندر چلایا۔ مگر چابی اس نے کسی قیمتی متاع کی طرح نہایت احتیاط سے اپنے شولڈر بیگ میں رکھ دی تھی۔

☼ ☼ ☼

درد گر آدمی ہوتا
تو گریبان پکڑ کر کہتے
اس طرح رہتے ہیں بے چین دلوں کے اندر؟
اس طرح کرتے ہیں بیماروں کے ساتھ؟

دل میں رہنا ہے تو ٹھیک سے رہنا سیکھو
ہم تمہیں سہتے ہیں کچھ تم بھی تو سہنا سیکھو

اک تھوڑی سی خوشی آئے تو جل جاتے ہو۔
درد گر آدمی ہوتا۔"

پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ ہاتھ میں مینجمنٹ کی کتاب لیے خالی نظروں سے اس کے الفاظ گھور رہی تھی۔ ذہن ہمیشہ کی طرح کسی اور ہی دیار کی سیر کو نکلا ہوا تھا۔

"کیوں اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں"

منال نے اس کے برابر صوفے پر بیٹھتے ہوئے معنی خیزی سے شعر پڑھا۔ اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا۔ لاؤنج کا پرسکون ماحول یکدم چیخ اٹھا۔

اس نے نرمی سے منال کے ہاتھ سے ریموٹ لے کر ٹی وی آف کر دیا۔

"تو بیا سے مل کر آئی ہے۔
بس آج سے نیند پرائی ہے۔"

منال کہاں باز آنے والی تھی۔ ڈرائی فروٹ کی پلیٹ ہاتھ میں لیے ہوئے اس نے سامنے میز پر پاؤں پھیلا لیے اور نہایت فرصت سے اسے ڈسٹرب کرنے لگی۔

"منال!" عشاء نے دھیرے سے پکارا۔

"اف اللہ!" منال نے سر دھنا۔

"یہ کس نے پکارا ہے اتنے پیار سے
احساس برتری سے خدا ہو گیا ہوں"

وہ سیریس ہونے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھی۔

"منال!" اب کے اس نے زچ ہو کر پکارا۔

"جی منال کی جان! بولو نا۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔" وہی غیر سنجیدہ انداز۔

"مجھے ایک سامع کی ضرورت ہے منال!" اس نے بے چارگی سے کہا۔ کئی دنوں کا بوجھ اس کے سینے پر دھرا تھا۔

"ہر قسم کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کبیر احمد سے رابطہ کریں، کیونکہ آج تک عشاء اور منال کی ہر ضرورت انہوں نے ہی پوری کی ہے۔ شکریہ۔" منال اس کی اداسی سے باخبر تھی، سو اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے اس کی اداسی کم کرنا چاہتی تھی۔

"منال! تم سیریس کیوں نہیں ہو جاتیں۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

"تمہاری ون سائیڈڈ بور لو اسٹوری سننے کے لیے؟" منال نے منہ بنایا۔

"ہاں۔" اسے سننے پر آمادہ دیکھ کر عشاء کو کچھ ڈھارس ہوئی۔ "ون سائیڈڈ لو اسٹوری سننے کے لیے۔"

"بور بھی کہا ہے میں نے۔" منال نے یاد دہانی کرائی۔

"وہ مجھے بہن سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتا منال!" سنی ان سنی کرتے ہوئے اس نے اپنا دکھ بیان کیا۔

"تو ون سائیڈڈ لو (یک طرفہ محبت) میں ہوتا ہی یہی ہے۔ ہیرو ہیروئن کو اپنی بہن سمجھتا ہے۔ تمہاری کہانی میں تو پھر بھی مارجن موجود ہے۔ بہن نہیں کزن سمجھتا ہے۔ اور اگر تم اسی طرح اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر بلکہ نہا دھو کر پڑی رہیں تو ایک دن وہ تمہیں کزن سے بڑھ کر بھی کچھ سمجھنے لگے گا۔ اور پھر "دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے" پر فلم کا اینڈ ہو جائے گا۔ تمہیں ٹینشن کس بات کی ہے؟" وہ مزے سے بادام ٹونگتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔

"پتا نہیں کس بات کی ہے۔" قدرے بیزاری سے کہتے ہوئے اس نے کتاب میز پر پٹخ دی۔

"ایک پل میں وہ مجھے اپنے فلیٹ کی چابی دے کر کہتا ہے "آپ کا میرے انتظار میں فلیٹ کے باہر کھڑے رہنا مناسب نہیں۔ اندر بیٹھ جایا کریں۔" اور دل کو خوش گمانی کی سرحدوں پر لا کھڑا کرتا ہے۔ مگر اس کے اگلے ہی پل یہ کہہ کر مایوسی کی اتھاہ گہرائی میں پہنچا دیتا ہے کہ "مجھے اپنے گھر آئے کسی بھی مہمان کا یوں باہر کھڑے رہنا اچھا نہیں لگے گا۔" اس نے "کسی بھی" کیوں کہا منال؟" وہ مکمل آزردگی کے حصار میں تھی۔

"اگر تمہیں برا نہ لگے تو ایک بات کہوں؟" منال پلیٹ سینٹر ٹیبل پر رکھ کر پوری کی پوری اس کی طرف گھوم گئی۔

"اپنے جملے میں "مہمان" کی جگہ "لڑکی" لگا دو۔"

"وہ ایسا نہیں ہے منال!" عشاء اس کی بات سمجھتے ہوئے کسی قدر ناگواری سے بولی۔

"تم اتنے دعوے سے کیسے کہہ سکتی ہو؟" اس کے لہجے پر منال نے چونک کر سوال کیا۔

"میں جانتی ہوں اسے۔ اس کا مضبوط کردار ہی میرے لیے سب سے بڑی خوبی ہے۔" لمحوں کے توقف کے بغیر اس نے منال کی بات کا جواب دیا۔

"ایسے لوگ خوب جانتے ہیں کہ کون سی لڑکی کس طرح متاثر ہو سکتی ہے۔" منال قائل ہونے کے موڈ میں بالکل نہیں تھی۔

"ایسے لوگ؟"

"ہاں فلرٹی۔ بہرحال تمہیں اتنی جلدی کسی پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔" منال لگی لپٹی کی قائل بالکل نہیں تھی۔ عشاء محض اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"اللہ! یہ حیدر مغیث مجھے کسی روز کہیں مل جائے تو میں نجانے کیا کر بیٹھوں۔" پرجوش چہکتی ہوئی آواز پر عشاء کبیر نے نگاہیں اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھی ان تین لڑکیوں کے بے فکرے گروپ کو دیکھا۔

مسلسل تین پیریڈز اٹینڈ کرنے کے بعد چائے کی غرض اسے کیفے ٹیریا تک کھینچ لائی تھی اور بیٹھتے ہی چہکاتی آواز نے اس کی توجہ کھینچ لی۔

وہ سانولی سلونی چہکاتی چڑیا اپنے سامنے میز پر اخبار پھیلائے بیٹھی تھی، جس میں یقیناً "حیدر مغیث" کی کوئی خبر مع تصویر چھپی تھی۔

"کوئی ایسا مشکل تو نہیں حیدر مغیث سے ملنا۔ میں متعدد بار مل چکی ہوں۔" اس "چڑیا" کی گوری چٹی دوست نے قدرے اتراتے ہوئے کہا۔

"اچھا! کیسے؟ کب؟ کہاں ملی ہو؟ بے ایمان بڑے بڑے کارنامے انجام دے لیے اور ہوا تک نہیں لگنے دی۔" حیدر کی پرستار تڑپ اٹھی۔ ان کی تیسری دوست بھی اس انکشاف پر چائے کا کپ لبوں سے ہٹا کر ہمہ تن گوش ہوئی۔

"یہ نہ پوچھو کہ کب کہاں، اب کیا میں تم لوگوں کو سب کچھ بتا دوں؟ اپنے ہاتھ پیر کٹوا دوں۔" وہ "گوری چٹی" بلاوجہ ہی ہنسی تھی۔ کم از کم عشاء کبیر کو تو یہی لگا۔

"اف! ملیحہ کی بچی! بڑی ڈرامہ باز ہو۔ بس لوگ دعا کیا کریں کہ ملیحہ بھی خباثت پر نہ اترے۔" ان کی تیسری دوست نے "گوری چٹی" کے بازو پہ مکا مارتے ہوئے کہا۔

"نہ بتاؤ۔ ہمیں اس سے غرض نہیں۔ تم بس آج ہی ہمیں بھی ملوا دو۔" وہ "چڑیا" تاؤلی ہوئی جا رہی تھی۔

"دھیرج صباحت! دھیرج، جلدی کا کام شیطان کا۔" تیسری لڑکی نے "چڑیا" کو صبر کی تلقین کی اور پھر دوبارہ اس "گوری چٹی" کی طرف مڑ گئی۔

"جی تو ملیحہ صاحبہ! پھر کب ملوا رہی ہیں آپ ہمیں؟"

"آج تو کسی صورت ممکن نہیں۔ بلکہ اگلے پانچ روز تک ممکن نہیں، کیونکہ وہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں اور پانچ دن بعد ہی لوٹیں گے۔" اس کی حیدر سے متعلق معلومات قابل رشک تھیں۔ عشاء کبیر خواہ مخواہ ہی سلگ اٹھی۔

اس کا یہ خیال کہ یہ باتیں صرف اسے ہی حیدر نے بتائی ہیں، غلط ثابت ہوا تو من بے کل ہو گیا۔

"ایسے لوگ خوب جانتے ہیں کہ کون سی لڑکی کس طرح متاثر ہو سکتی ہے۔" دھیان کے پردے پر منال کبیر ابھری اور دل میں ملال اتر آیا۔

اسے لگا اب پڑھنا محال ہو جائے گا" سو وہ لوٹ آئی۔

☼ ☼ ☼

اور پھر اگلے پانچ دن بڑے بے تاب گزرے تھے۔ چھٹی شام بھی مضطرب ٹھہری اور ساتویں شب بھی اداس رہی۔ آٹھویں آزردہ سہ پہر کے اختتام پر اس

کے موبائل کی اسکرین "حیدر" کے نام سے جگمگائی تھی۔ اسکرین پر نگاہ پڑتے ہی ہزاروں آرزوؤں سے بہلایا ہوا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔

"ہیلو!" اس نے لہجے کو مقدور بھر سپاٹ رکھا۔

"السلام علیکم!" نرم پرجوش لہجہ، اسے لگا صدیوں سے اس کی سماعتیں یہ آواز سننے کو ترس رہی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔" اس نے دل کی حالت عیاں ہونے سے بمشکل روکا۔

"کیا حال چال ہیں مس عشاء؟"

"الحمدللہ! مزے میں ہوں۔" اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے اس نے بشاش لہجے میں کہا۔

"مجھے کراچی آئے ہوئے تین روز گزر چکے ہیں۔" وہ اس کے اطلاع دینے کا مقصد سمجھ نہیں پائی۔

"جانتی ہوں، جاتے سے آپ نے ذکر کیا تھا اپنی واپسی کے متعلق۔"

"پچھلے کئی روز سے آپ کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ سوچا حال دریافت کرلوں۔" بشاش لہجے نے خود سے کیے گئے تمام عہد و پیمان بھلا دیے۔

"سوری!" اس نے لہجے میں شرمندگی سموئی "دراصل پچھلے کئی دنوں سے بہت مصروف رہی ہوں۔ اس لیے دھیان سے اتر گیا۔"

یک دم فون کی دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ اتنی کہ اسے گمان گزرا کہ شاید لائن کٹ گئی ہو۔ مگر حیدر نے اس کے گمان کو یقین میں نہیں بدلا۔

"کوئی بات نہیں۔ مصروفیت میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔" لہجے کی بشاشت ماند پڑ گئی تھی یا عشاء کو ایسا لگا۔ وہ سمجھ نہیں پائی۔

"اوکے مس عشاء! اپنا خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔" لائن منقطع ہوتے ہی بڑی مشقت سے بہلایا گیا دل ضدی بچے کی طرح ہمکنے لگا تھا۔ نتیجتاً شام ڈھلتے ہی اس کی سوک اسٹوڈیو تک کا سفر طے کر آئی۔

اسٹوڈیو سے باہر آتے ہوئے اس کی نگاہ عشاء پر پڑی تھی اور عشاء کبیر کے خوش فہم دل کو لگا جیسے اس کی آمد پر ان آنکھوں میں کئی دیپ جل اٹھے ہوں۔

وہ بڑی خوش گوار مسکان لبوں پر سجائے اس کے قریب آیا۔

"السلام علیکم!" عشاء نے دھیمے سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ آپ نے اپنی مصروفیت کے متعلق مجھے بتایا نہیں۔" حیدر کے لبوں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہو رہی تھی۔

"کیسے بتاتی۔ آپ کو بڑی جلدی تھی۔" اس نے روٹھے لہجے میں کہتے ہوئے سامنے موجود ریسٹورنٹ کی سمت قدم بڑھا دیے۔

"تو اب بتا دیں۔ اب میں بڑی فرصت میں ہوں۔" حیدر اس کے ہم قدم چلتے ہوئے بلاوجہ ہی مسکرائے جا رہا تھا۔

"کچھ خاص نہیں۔ بس وہی پیپرز کی مصروفیت۔ تھرڈ سمسٹر چل رہے ہیں۔"

"گڈ پھر تو بڑے شان دار رٹے مارے گئے ہوں گے۔ جب دوسری ہر چیز ہی ذہن سے محو تھی۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں ریسٹورنٹ کی حدود میں داخل ہو گئے۔

"ظاہر ہے۔" مختصر جواب دے کر وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"سنا ہے لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد حیدر مغیث کی گرویدہ ہے۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا۔ لیکن حیدر مغیث نے اس کے لہجے میں رقابت کی آمیزش محسوس کرلی تھی۔

"آپ کے خیال میں جھوٹ ہے کیا؟" حیدر مغیث نے محظوظ سی مسکان لبوں پر سجاتے ہوئے استفسار کیا۔

"اور حیدر… ؟ حیدر! کتنی لڑکیوں کا گرویدہ ہے؟"

حیدر نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بلا ارادہ ہی کہہ گئی تھی اور کہہ کر بری طرح پچھتائی۔ ایسا سوال اسے برا لگ سکتا تھا۔

"بھلا کیا ضرورت تھی اس طرح کہنے کی۔ نجانے کیا سوچتے ہوں گے حیدر بھی۔" اس نے لب کچلتے ہوئے نگاہیں جھکالیں۔

"وہ دراصل ملیحہ کہہ رہی تھی کہ حیدر مغیث کے پرستاروں میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے۔" اپنی بات کا اثر زائل کرنے کی کوشش میں وہ مزید بے وقوفی کر گئی۔

"ملیحہ؟" حیدر کا دھیان پچھلی باتوں سے ہٹ کر "ملیحہ" میں اٹک گیا۔

"جی! جس سے اکثر آپ کی ملاقات بھی ہوتی ہے۔" اس کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ وہ بات بنانے کے فن سے نا آشنا تھی۔

"میری ملاقات؟" وہ حیران ہوا۔ "اور آپ کی ملاقات…؟ آپ کہاں ملیں ان سے؟"

عشاء کو وہ الجھن کا شکار لگا۔

"میری یونیورسٹی کی لڑکی ہے وہ۔ آپ جانتے تو ہیں اسے۔ متعدد بار آپ سے مل چکی ہے۔ آپ کے شب و روز کے معمولات کا حساب رکھتی ہے۔" اس نے یوں کہا جیسے دل جل رہا ہو۔

حیدر کے کچھ کہتے لب ویٹر کو دیکھ کر باہم پیوست ہو گئے۔ بیرا ان کی آرڈر کی ہوئی چیزیں میز پر لگا رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہی ہوں، وہ بے شمار بار مجھ سے مل چکی ہو مگر میں اسے جانتا نہیں۔" بات کچھ کچھ حیدر کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

"میں کیا جانوں۔" عشاء نے لاپروائی سے کاندھے اچکائے۔ "وہ خود ہی اپنی دوستوں سے کہہ رہی تھی کہ وہ آپ کے تمام معاملات سے باخبر رہتی ہے۔"

"تو اس میں میری تو کوئی خطا نہیں۔ مجھ سے سینکڑوں لڑکیاں دسیوں بار مل چکی ہوں گی۔ مگر ان سب کو یاد رکھنا میرے بس سے تو باہر ہے۔" حیدر مغیث پر تمام معاملہ واضح ہو گیا تھا۔ کچھ عشاء کی باتوں سے اور کچھ اس کے برہم مزاج سے۔

"میں نے کب کہا کہ آپ کا کوئی قصور ہے۔" اسے لگا جیسے نادانستگی میں ہی اس کے دل کا چور رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ وہ بری طرح شرمندہ ہوئی۔

"وہ تو میں نے برسبیل تذکرہ آپ سے کہہ دیا۔"

اس خوف سے کہ کہیں دل کا حال نگاہوں سے عیاں نہ ہو جائے، وہ نظریں جھکا کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی اور حیدر نے اس کی جھکی نگاہوں کے باعث لبوں تک آئی بے ساختہ مسکراہٹ کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔

اس سے اگلی شب حیدر اس سے فون پر کہہ رہا تھا۔

"عشاء اسلام آباد کے پروگرام میں جس شخص نے میرے ساتھ ہوسٹنگ کی تھی، ملیحہ اس کی کزن ہے۔ وہ آج اپنی دو دوستوں کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ آٹو گراف اور اگلی ملاقات کا وعدہ ساتھ لے گئی ہے۔" عشاء کو لگا جیسے وہ مسکرا رہا ہو۔

"تو؟" عشاء نے اپنی حیرانی عیاں کرنا ضروری سمجھا۔ دل کی حالت چھپانا بھی بڑا دشوار امر ہے۔

"میں نے سوچا آپ کو بتا دوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے بھی میری غلطی میں شمار کیا جائے۔" لہجہ اب بھی شرارت لیے ہوئے تھا۔

"سوری حیدر! میں نے تو بس ویسے ہی اک بات کہہ دی۔ کسی بھی خاص مقصد کے بغیر۔ آپ نے شاید اسے دل پر لے لیا۔" اپنی کل کی حماقت یاد کرتے ہوئے وہ ازسرنو پچھتائی۔

"ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ چلیں چھوڑیں ان باتوں کو۔ یہ بتائیں آپ کے پیپرز کیسے جا رہے ہیں؟" اس نے عشاء کے لہجے میں شرمندگی بھانپ لی۔ سو دانستہ موضوع بدل دیا۔

☆ ☆ ☆

حیدر مغیث کے پیچھے وہ فلیٹ میں داخل ہوئی۔ آج پہلی بار وہ یہاں آئی تھی۔ دن کے اس حصے میں جب سورج اپنی روشنی بڑی فیاضی سے زمین پر لٹا رہا تھا۔ اس کے فلیٹ میں غیر معمولی اندھیرا تھا۔

حیدر نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں سے پردے ہٹائے۔ لمحوں میں سنہری روشنی کمرے کے چاروں

طرف پھیل گئی۔

کمرے کے دائیں طرف کچن تھا۔ بائیں طرف ایک رائٹنگ ٹیبل اور اس کے برابر میں دوپٹ والی الماری' الماری کے عین سامنے سنگل بیڈ' جس کے سرہانے موجود کھڑکی سے مین روڈ دکھائی دیتا تھا۔

کمرے کے ایک طرف نہایت خوب صورت لکڑی کا صندوق رکھا ہوا تھا' جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے بنانے والے نے نہایت محبت اور محنت سے بنایا ہے اور اپنی تمام تر صناعی اس ایک صندوق میں دکھانے کی سعی کی ہے۔

حیدر پلٹا تو اس نے دیکھا کہ وہ ابھی تک کھڑی کمرے کا جائزہ لے رہی ہے۔

اس نے عشاء کبیر کی نگاہوں سے اپنے فلیٹ کو دیکھا۔

معمولی فلیٹ' معمولی فرنیچر اور معمولی پردوں کو دیکھ کر اس کے اندر کسی قسم کا احساس کمتری نہیں جاگا۔

لیکن دو روز سے صفائی نہ کر سکنے کی وجہ سے فرنیچر پر جمی ہلکی دھول اور میز پر رکھے خالی کپ کے پیندے سے لگی چائے کی سوکھی تہہ نے اسے شرمندگی کے حصار میں جکڑ لیا۔

"میں اپنی اس عادت سے عاجز آیا ہوا ہوں۔" اس نے ٹشو پیپر سے کرسی پہ جمی دھول صاف کی اور عشاء کو بیٹھنے کے لیے پیش کی اور خود بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"اگر رات بھر جاگنا پڑ جائے تو ہر آدھے گھنٹے بعد چائے کی تمنا بھی جاگ اٹھتی ہے۔ یہ جو آپ کو یہاں اتنی ابتری دکھائی دے رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصروفیت کے باعث پچھلے دو دنوں سے اپنے گھر آنے کا بھی وقت نہیں تھا میرے پاس۔" اس نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا۔

"میں اپنے معمولی سے فلیٹ کو ہمیشہ صاف رکھتا ہوں۔ اور اگر کبھی آپ کو یہ گرد آلود لگے تو سمجھ جانا کہ میرے قدم فلیٹ میں پڑے ہی نہیں۔"

"اچھا یعنی میز پر موجود مگ اس بات کا ثبوت ہے کہ حیدر مغیث نے ساری رات بنا سوئے بتائی ہے؟" عشاء کی استفہامیہ نگاہیں اس کی صورت تکنے لگیں۔

"ہاں۔" اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

"وہ کیوں بھلا؟"

"اس کا جواب بھی ہمیشہ کپ کے ساتھ دھرا ملے گا۔" وہ مسکرا کر اٹھا اور میز پر موجود کاغذوں کے پلندے کو اس کی نگاہوں کے سامنے لہرایا اور دوبارہ میز پر رکھ دیا۔

"دراصل اخبار والوں کو کل کالم ہر حال میں چاہیے۔ میں جانتا تھا کہ میرے اگلے دو دن بڑے مصروف گزریں گے۔ اس لیے میں یہ کالم دو روز پہلے ہی مکمل کر چکا ہوں' رات بھر جاگ کر اور پھر پرسوں صبح ہمیشہ کی طرح جلدی نکلنے کے باعث اپارٹمنٹ کی حالت سدھار نہیں سکا۔" وہ شرمندگی سے وضاحت دینے لگا۔

"میں اگر یہ کالم پڑھ لوں تو آپ کو برا تو نہیں لگے گا؟" وہ اس کے سامنے بلاوجہ ہی شرمندہ ہو رہا ہے۔ یہ خیال اسے موضوع بدلنے پر مجبور کر گیا۔

"ارے نہیں۔ آپ یہ کالم پڑھیں۔ میں مزے دار سی چائے بنا لاتا ہوں۔" وہ اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔

"حیدر مغیث کے سر پر سچ' اور انتہائی کڑوا سچ بولنے کا جنون سوار رہتا ہے۔" عشاء کا یہ خیال ہر بار اس کا پروگرام دیکھنے اور کالم پڑھنے کے بعد راسخ ہو جاتا تھا۔ وہ جتنا دو ٹوک اور لگی لپٹی رکھے بغیر ٹی وی پر بولتا تھا' اخبار میں اس سے کچھ بڑھ کے ہی ہوتا تھا۔ وہ اس سچ سے ڈرتی بھی تھی اور خدا سے اس کی لمبی عمر کی دعائیں مانگتی تھی۔

ایک بار پھر اس کی نگاہیں کمرے کے اطراف کا نظارہ کرتے ہوئے اس لکڑی کے صندوق پر جا ٹھہریں۔

وہ صندوق بہت خوب صورت تھا یا کمرے میں رکھے دیگر فرنیچر کے معمولی ہونے کے باعث حسین لگ رہا تھا۔ وہ اس کا اندازہ نہیں لگا پائی۔ اور دل میں ابھرتی قریب سے دیکھنے کی خواہش کی تکمیل کے لیے اٹھ کر صندوق کے قریب فرش پر بیٹھ گئی۔

اس صندوق میں کوئی انوکھی بات نہیں تھی' لیکن جو چیز متوجہ کرتی تھی وہ اس کی عمدہ بناوٹ تھی۔ عام سا بندہ بھی یہ اندازہ بخوبی لگا لیتا کہ یہ کسی ماہر کے ہاتھوں تکمیل پایا ہے۔

"ارے آپ فرش پہ کیوں بیٹھ گئیں مس عشاء؟" اسی پل وہ کچن سے چائے کے ساتھ نمکو اور چکن نگٹس لیے نمودار ہوا۔

"کیمپس سے سیدھی یہیں آئی ہیں۔ یقیناً بھوک سے بے حال ہوں گی۔" وہ اس کے مقابل قدرے فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"میرے والد لکڑی کے کام کے ماہر تھے۔ یہ ان کے ہی ہاتھوں تکمیل پایا ہے۔" اس نے عشاء کی دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس ان کی پہلی اور آخری نشانی اور میرے لیے اس کمرے میں رکھی ہر چیز سے زیادہ قیمتی بھی کہ خود اپنے آپ سے بھی۔"

اس کی نگاہیں جو اس وقت صندوق پر جمی تھیں' عشاء کو عقیدت اور محبت کے جذبات سے لبریز لگیں۔

"میں جب بھی اپنے باپ کے متعلق سوچتا ہوں' ایک کھانستا ہوا' کمزور اور بیمار شخص میرے ذہن میں ابھرتا ہے۔ میرے شعور میں اپنے صحت مند باپ کی کوئی شبیہہ محفوظ نہیں۔ میں نے اسے ہمیشہ کھانستے اور بیمار ہی دیکھا تھا۔ میرا باپ ٹی بی کی آخری اسٹیج پر تھا۔ مگر اسے اپنی بیماری کی پروا نہیں تھی۔ اسے اپنے چند دنوں کے مہمان ہونے کی بھی فکر نہیں تھی۔ اس کے ذہن پر بس ایک ہی پریشانی سوار تھی کہ اس کے بعد میری اور میری ماں کی زندگی انتہائی مشکل ہو جائے گی۔ کیونکہ اس کی موجودگی میں بھی زندگی اتنی آسان نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اس کی موجودگی نے کئی مشکلات کو روکے رکھا تھا۔" جانے کن احساسات کے زیر اثر وہ بولتا چلا گیا۔

"میری سماعت میں آج تک اپنے والد کی زندگی کے آخری الفاظ محفوظ ہیں جو انہوں نے اپنی موت سے ایک روز قبل میری ماں سے کہے تھے۔" اس نے گہرا سانس لے کر پشت اپنے پیچھے موجود الماری سے لگا دی۔

"انہوں نے میری ماں سے کہا تھا کہ اگر انہیں علم ہوتا کہ وہ اتنی جلدی میری ماں کو حالات سے لڑنے کے لیے تنہا چھوڑ جائیں گے تو وہ کبھی میری ماں سے شادی نہ کرتے۔" ان کی اس بات کا میری ماں نے بہت برا مانا' تب انہوں نے بے بسی سے کہا تھا۔ "بعض اوقات جب ہم اپنے کسی بہت ہی پیارے کو کسی بڑے غم سے آشنا نہیں کروانا چاہتے تو ہم اسے چھوٹا غم دے کر بڑے غم سے بچا لیتے ہیں۔ اگر تب تمہاری شادی مزمل سے ہو جاتی تو تم میری جدائی میں چند دن آنسو بہا کر آج مسرور زندگی گزار رہی ہوتیں۔"

اور یہ مزمل نہ جانے کون تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ماں اور باپ کی مختصر رفاقت کے سوا کسی تیسرے رشتے سے واقفیت ہی نہیں پائی تھی۔

میرے باپ کے جانے پر میری ماں نے بہت آنسو بہائے تھے۔ میں نے اسے پہلے کبھی اتنا روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ تقدیر میں بیوگی رقم ہوتے ہی اس کی ذمہ داریاں لامحدود ہو گئی تھیں اور تمنا محدود ہو کر صرف ایک ہی رہ گئی تھی۔ مجھے بہت سارا پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانے کی تمنا۔

اس نے چند پل کو رک کر عشاء کی سمت دیکھا۔ وہ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد پھیلائے سانس روکے اسے سن رہی تھی۔

"میرے باپ نے ترکے میں جو گھر چھوڑا تھا' وہ محض ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ کمرے سے باہر صحن کے نام پر سات آٹھ فٹ کی جگہ۔ فرنیچر کے نام پر صرف یہی ایک صندوق تھا۔ جس میں میرا اور میری ماں کا ایک ایک جوڑا رکھا جاتا تھا اور ایک جوڑا ہمارے تن پر ہوتا تھا۔" اسے نجانے کیا یاد آ گیا تھا جو اس نے لب بھینچ لیے۔

"اپنی اکلوتی خواہش کی تکمیل کے لیے میری ماں گاؤں کی حویلی والوں کے کام کرنے لگی تھی۔ جن کی مہربانی سے ہمیں اپنے سرد چولہے کو بھی گرم کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ان کا بچا ہوا ہم دو بندوں کے لیے بہت ہوتا تھا اس کے علاوہ چند روپے عنایت کے لیے جاتے تھے جو صرف اور صرف میری پڑھائی کے خرچے کے لیے میری ماں سنبھال رکھتی تھی۔ گاؤں کے سرکاری اسکول کے بھلا خرچے ہی کیا۔ سو وہ چند روپے بڑے غنیمت تھے۔" اس نے ہنس کر گویا اپنی ہنسی اڑائی۔

"اس روز میرا دل بڑا بوجھل تھا۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"میں اسکول نہیں جانا چاہتا تھا' مجھے لگتا تھا میں اس روز اسکول گیا تو میرا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ جبکہ میری ماں کا خیال تھا کہ چھٹی میرا بہت بڑا نقصان کروا دے گی۔ میں ماں کے کہنے پر اسکول گیا تھا اور سارا دن چھٹی کے انتظار میں بے کل رہا تھا۔ چھٹی میں' میں جب لڑکھڑاتے قدموں سے گھر لوٹ رہا تھا' اس وقت مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے میرا کوئی عظیم نقصان ہو گیا ہے۔ اور اس وقت تک واقعی میرا عظیم نقصان ہو چکا تھا۔" ایک بے قرار آنسو اس کی آنکھ سے پھسل کر قمیص میں جذب ہو گیا۔

"نجانے اس روز میری ماں کے من میں کیا سمائی تھی' جو اس نے ہمیشہ سرد رہنے والے چولہے کو گرم کرنے کی کوشش کی تھی۔ گاؤں کی عورتوں کے مطابق وہ میرے لیے حلوہ بنا رہی تھی۔ چولہے سے چنگاری اڑ کر پاس پڑی رضائی کو چھو گئی اور میری ماں سب کچھ ختم ہونے تک بے خبر ہی رہی۔" کئی اشک چپکے سے حیدر کی آنکھ سے ٹپکے تھے۔

"سب کچھ ہی راکھ ہو گیا۔ سوائے میری ماں کی چادر کے جو اس نے صحن میں تار پر ڈالی تھی۔ یا پھر اس صندوق کے جو صحن میں رکھا ہوا تھا۔ اور اس روز یہ صندوق بھی نجانے کیوں میری ماں نے صحن میں رکھ دیا تھا۔ ورنہ یہ ہمیشہ کمرے میں ہی ہوتا تھا۔" اس نے چپکے سے آنسو صاف کیے اور صندوق کھول کر چادر نکالی اور اسے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"مجھے جب اپنی ماں کی بہت یاد آتی ہے تو یہ چادر مجھے سکون دیتی ہے۔ جس روز میں نے یہ چادر اس صندوق میں رکھی تھی' اس روز جیسے خود بخود ہی ایک فیصلہ ہو گیا تھا کہ میں اس صندوق میں صرف وہی چیزیں رکھوں گا' جو مجھے اس چادر اور اس صندوق جتنی عزیز ہوں گی۔" اس نے احتیاط سے چادر دوبارہ رکھ دی۔

"اور حقیقت یہ ہے مس عشاء کبیر! کہ آج تک مجھے کوئی شے اتنی قیمتی نہیں لگی۔" اس نے مسکرا کر عشاء کی سمت دیکھا۔ پھر کئی لمحوں تک خاموش رہا۔

"پھر۔؟" عشاء کبیر جو ورق ورق اس کے ماضی سے آشنا ہو رہی تھی' اس کی خاموشی دم بھر کو ہی برداشت کر پائی۔ "یہاں تک کیسے پہنچے آپ؟"

"پھر۔" اس نے لب بھینچ کر گہری سانس لی اور گویا ہوا۔ "میں اپنے والدین کو کھونے کا سب سے بڑا دکھ اپنی ذات پر سہ چکا تھا۔ پھر اس کے بعد کوئی دکھ کوئی تکلیف مجھ پر بہت زیادہ اثر انداز نہ ہو سکی' اسی سبب کوئی مشکل میری یادداشت پر بھی کوئی نمایاں نقش نہیں چھوڑ سکی۔ میرے دل میں ایک ہی لگن تھی' کوئی غیر معمولی کام کر کے اپنی ماں کی تمنا پوری کر سکوں اور وہ میں پوری کر چکا ہوں۔ میری ماں کی تمنا کے مطابق میرا شمار بھی مال دار اشخاص میں ہوتا ہے۔ مگر۔" بات ادھوری چھوڑ کر اس نے عشاء کی سمت دیکھا۔

"مگر۔؟" حیدر کی خاموشی عشاء کے استفسار کی منتظر تھی یا بتانے نہ بتانے کے قصد کے درمیان معلق سو وہ اس حساب میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

"مگر۔" وہ چند پل کو پھر خاموش ہوا۔ "مگر میں اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ اس مدرسے اور مسجد پر صرف نہ کرتا جو میں نے اپنے والدین کے نام پر بنائے ہیں۔ لیکن میں ایسا کیوں نہ کرتا جب کہ میرے شب و روز کی آسودگی ہی اسی سبب ہے۔" جانے کن احساسات کے زیر اثر حیدر مغیث نے اپنی بیتی زندگی کی سطر سطر اس کے سامنے پڑھ ڈالی۔

اور عشاء کبیر کو شاد کرنے کے لیے یہ بات ہی کافی تھی کہ حیدر مغیث نے اسے اپنے ماضی سے آگاہ کرنے کے قابل جانا۔

اس روز اور اگلے کئی روز تک وہ شاداں و فرحاں رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ دل بھی نا۔ ہزاروں تاویلوں کے باوجود بھی خوش گمانی کے بادلوں میں ہمہ وقت گھرا رہتا ہے۔ اور جب بادل چھٹتے ہیں اور حقیقت کی روشنی چاروں طرف پھیلتی ہے تو رو رو کر گڑگڑا کر زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔

محض سترہ روز قبل ہی وہ حیدر کے ماضی سے آگاہ ہو کر خود اپنے آپ کو کوئی اعزاز دے بیٹھی تھی اور گویا کوئی خطا کر بیٹھی تھی۔ جس کے نتیجے میں وہ آج شام کے دھندلکے میں اپنے دریچے سے لگی برستی آنکھوں سے سہ پہر کے اس واقعہ کو یاد کر رہی تھی' جس نے اس کے آنے والے ہر دن کو ایک تشنگی عطا کر دی تھی۔

آج حیدر کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر وہی چمک جاگی تھی جو اس نے ہمیشہ اس وقت حیدر کی آنکھوں میں دیکھی جب ان کی ملاقات کافی دنوں بعد ہوئی یا غیر متوقع طور پر ہو۔ لیکن اب عشاء کو یہ سب اپنا وہم لگ رہا تھا۔

فائنل سمسٹر کی پڑھائی کے آغاز کی مصروفیت کے باعث آج سترہ روز بعد ان کی ملاقات ہو رہی تھی۔ اور اس نے عشاء کو دیکھتے ہی بڑے خوش گوار لہجے میں کہا تھا۔

"یہ بغیر اطلاع کے کئی کئی دنوں تک کہاں غائب ہو جاتی ہیں آپ؟" اسے کرسی پیش کر کے وہ خود بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"پڑھائی کی مصروفیت کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنا فولڈر میز پر رکھ دیا' عشاء کا دل چاہا وہ اس سے کہے کہ آج بھی وہ اس سے ملنے کی خاطر اپنا ریسرچ ورک ادھورا چھوڑ آئی ہے۔ لیکن وہ اپنے دل کی ایسی باتوں پر ذرا کم ہی عمل کرتی تھی۔

"بہت خوب! یعنی بہت جلد ایک محنتی بزنس وومن منظر عام پر آنے والی ہیں۔" ایک بار اس نے ایم بی اے کے بعد اپنے بابا کے بزنس سنبھالنے کا سرسری ذکر کیا تھا اور حیدر نے یاد رکھا تھا' وہ کھل اٹھی۔

"پچھلے کئی دنوں سے ایک اچھی خبر سنانے کو بے تاب ہوں' سوچا ملاقات پر بتاؤں گا' میرے خیال کے مطابق خوش خبری فون پر سنانے سے پھیکی پڑ جاتی ہے۔" عشاء کبیر کو وہ از حد خوش لگا۔

"اچھا کیسی خبر؟" اس کے استفسار میں کسی قدر تجسس تھا۔

"میں نے پچھلے اتوار کو نکاح کر لیا ہے۔" لمحوں میں اس نے عشاء کے دل مسل ڈالا' اور بے خبر رہا۔

"نکاح؟" اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔

"مدعو نہ کرنے پر آپ کو یقیناً" برا لگا ہو گا۔" اس نے عشاء کی صورت کے آثار چڑھاؤ کو اپنی نظروں کے حصار میں رکھتے ہوئے کہا۔ "دراصل سب کچھ بہت عجلت میں ہوا' اب رخصتی پر بڑی پارٹی ارینج کروں گا تو پہلا دعوت نامہ آپ ہی کو ملے گا۔" وہ گویا اسے بہلا رہا تھا' اور وہ بہلتی کیونکر؟ دل کو روگ تو اس کے ایک ہی جملے نے لگا دیا تھا۔

"میں نے نکاح کر لیا ہے۔" وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ اس کی محبت یک طرفہ ہے۔ مگر ایسا کچھ تو سوچنا بھی اس کے لیے دشوار تھا۔ وہ ایسے خیال سے بھی خوف زدہ رہتی تھی۔ کبھی ذہن میں آ بھی جاتا تو وہ سر جھٹک کر اگلی سوچ سے بدل دیتی۔

اور کیا ہی خوب ہو جو سر جھٹک کر حقیقت کو بھی بدلا جا سکے۔

"کیا ہوا؟ بہت بڑا قصور سرزد ہو گیا مجھ سے؟" حیدر نے اس غیر معمولی خاموشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو۔" وہ بدقت مسکرائی۔ "دراصل غیر

متوقع خبر تھی تو۔ "مزید کچھ کہنے پر الفاظ نم آلود بر آمد ہونے کا اندیشہ تھا سو وہ دانستہ خاموش ہو گئی۔

"چلیں پھر اس خوشی میں آپ کو زبردست سا لنچ کرواؤں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"نہیں چلوں گی اب۔" آنکھوں میں سمندر اتر آیا تھا اور اگر وہ مزید رک جاتی تو حد پار کر کے اس کا بھرم بہالے جاتا۔

فولڈر اٹھا کے وہ تیزی سے پلٹی۔ پہلا قدم اٹھانے کے بعد اگلا قدم اس کے اس قلم پر آیا تھا جو اسی پل اس کے فولڈر سے گرا تھا۔ اسے اپنے پیروں تلے کسی چیز کے روندے جانے کا احساس ہوا، مگر وہ تیزی سے نکلتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں کے آگے دھند کی چادر تن گئی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو بھی اس کی خبر ہو خصوصاً "حیدر مغیث" کو۔

☼ ☼ ☼

"تو گویا موصوف نے بالآخر اپنی اصلیت عیاں کر دی۔" منال کبیر نے کینو ہوا میں اچھال کر کیچ پکڑا اور عشاء کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔

اس نے اپنی خالی نگاہیں کتاب سے ہٹا کر گردن ترچھی کر کے منال کی بے فکری صورت دیکھی اور سدا خوش رہنے کی من ہی من میں دعا دے ڈالی۔

کینو کی خوشبو لاؤنج میں چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ اس کی خاموشی پر منال نے گردن ترچھی کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اپنی صورت دیکھو ذرا آئینے میں۔ غم و الم کی ان کہی داستان لکھی ہوئی ہے۔" منال نے کینو کی قاش منہ میں ڈالتے ہوئے کسی قدر ناگواری سے کہا۔ منال کی محبت بھی عجیب تھی۔ عشاء کی اداسی اسے مشتعل کر دیتی تھی۔

"منال!" اس نے احتجاج بھری نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا۔ نگاہیں چار ہونے پر اس نے اپنی آنکھیں دوبارہ کتاب پر جما دیں۔ بھیگی پلکیں دیکھ کر منال کے مزید مشتعل ہونے کا اندیشہ تھا۔

"مجھے پہلے ہی علم تھا کہ اس شخص کے جذبات میں سچائی نہیں۔ وہ محض وقت گزاری چاہتا ہے۔" منال نے رائے قائم کی۔

"اب اس سارے قصے میں اس کا کیا قصور۔" منال کا تبصرہ وہ سہہ نہیں پائی۔

"اس نے کبھی مجھ سے عہد و پیماں نہیں باندھے۔" منال کے بے یقینی سے دیکھنے پر وہ مزید گویا ہوئی۔

"وہ مجھ سے اس لیے ملتا رہا ہے کہ میں اس سے ملتی رہی ہوں۔ اگر وفا کا کوئی پیمان ہی نہیں تھا تو بے وفائی کا کیا سوال!؟ اگر میری صورت بیماروں جیسی ہو گئی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور؟ خطا تو میری ہے نا جو میں حقیقت سے نظریں چراتی رہی۔ یا پھر میری یہ غلطی ہے کہ میں خواب کے حقیقت میں بدلنے کی امید لگا بیٹھی تھی۔" وہ بغیر رکے بولتی چلی گئی۔

"قصور ہر صورت میرا ہی نکلتا ہے منال! تم جانب داری سے سوچنا چھوڑ دو۔" آخر میں وہ بے بسی سے بولی۔

"پھر تمہارا موبائل نمبر تبدیل کرنا اور اس سے آئندہ نہ ملنے کا فیصلہ کرنا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ایسا تو اس صورت میں ہوتا ہے جب صنم ہرجائی ہو۔" عشاء کی سنجیدہ تقریر کے جواب میں اس نے قہقہہ لگا کر غیر سنجیدگی پھیلائی۔

"اب اگر میں اس سے ملتی رہی نا منال! تو زندگی اور زیادہ دشوار ہو جائے گی۔"

اس کی بے بسی پر منال کبیر کے دل میں تاسف سمٹ آیا اور وہ اس اداس صورت کی خوشی کے لیے خدا سے التجا کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼
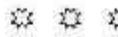
وقت دھیرے دھیرے سرک کر ماضی کی آغوش میں سمٹ رہا تھا، لیکن دل کے اک گوشے میں اداسی جڑ پکڑ چکی تھی۔ جس پر وقت کا موسم اثر انداز نہیں ہو رہا تھا اور وہ جانتی تھی کہ یہ اک گوشہ یونہی نارسائی کے کرب

سے تادم آخر یں آباد رہے گا۔

فائنل سمسٹر کے آخری پیپر سے فارغ ہو کر گھر پہنچی تو اسے لگا کہ دادو اس کے آخری پیپر سے فراغت کی بڑی دیر سے منتظر تھے۔ مگر کیوں؟ یہ اس نے اس دن کے اختتام پر جانا۔ جب دادو نے اسی شب تین پرپوزل مع تصاویر اس کے سامنے رکھے۔

"تینوں پرپوزل ہر لحاظ سے شان دار ہیں۔ مگر تمہارے بابا کے مطابق داؤد حسن بے مثال ہے۔ بہرحال اہمیت تو تمہارے فیصلے کو ہی ملے گی۔" دادو اس کے گالوں پر جھولتی لٹوں کو کانوں کے پیچھے کرتے ہوئے دلار سے کہہ گئے۔

اس نے دادو کی جگمگاتی نگاہوں کو دیکھا اور جانا۔

"بعض اوقات انسان کو اپنی ذات کے فیصلے اپنوں کی ذات کو سامنے رکھ کر کرنے پڑتے ہیں۔ اور ایسے فیصلوں میں اپنی رضا چاہے ایک فی صد بھی نہ ہو مگر اپنوں کو اس فیصلے سے ملنے والی خوشی سے کچھ نہ کچھ ہمارا حصہ بھی نکل آتا ہے۔"

عشاء کبیر نے اپنے من کی رضا کے بغیر داؤد حسن کے نام پر ہاں کر دی اور اپنے باپ کے چہرے پر کھلتی خوشی سے اپنا حصہ وصول کر لیا اور مطمئن ہو گئی۔

مگر پھر کیا ہوا!؟ خاص دن کی آمد پر کیا ہوا!؟ وہ جان نہ پائی۔

اطمینان نے دل کی سرزمین سے لمبی اڑان بھری اور ہجرت کر گیا۔ اس خاص دن صبح سے بے کل من شام ڈھلے تک بے کل ہی رہا۔ اور وہ حد درجہ بے چین تھی جب شب اس کی انگلی میں داؤد حسن کے نام کی انگوٹھی سج گئی۔

اس روز اس نے بابا، دادو اور منال کے سرشار چہروں سے بارہا اپنے حصے کی خوشی وصول کرنا چاہی۔ لیکن اس روز اسے حصے کی خوشی نہیں مل سکی۔

اگلے دن کا سورج اس کے لیے اپنی ہر کرن میں اک عجیب بے قراری اور اداسی بھر لایا تھا۔ نیا دن گئے دن سے زیادہ مضطرب تھا۔ بولائی بولائی وہ اپنی بے چین کیفیت کی وجہ پانے سے قاصر تھی۔

"سنا ہے جب لڑکیوں کی منگنی ہوتی ہے تو ان کے دلوں میں پھوٹنے والے لڈوؤں کے اثرات چہرے پر دکھائی دیتے ہیں، مگر یہاں لڈو تو کیا جلیبی پھوٹنے کے آثار بھی نظر نہیں آرہے۔" منال کبیر نے اخبار میں اس کی تصویر دیکھ کر تبصرہ کیا اور بدمزہ ہو کر اخبار میز پر پٹخ دیا۔

کراچی چیمبر آف کامرس کے پریذیڈنٹ حسن ابصار کے بیٹے داؤد حسن کی منگنی کی خبر مع تصویر اخبار میں چھپی تھی۔

"ویسے یقین جانو اگر فنکشن میں تم تھوڑا سا مسکرا دیتیں نا تو کوئی بھی ڈر کے بھاگتا نہیں۔ وہاں سب ہی مضبوط دل کے لوگ تھے۔" منال صبح سے اس کی غیر معمولی خاموشی سے تنگ آئی ہوئی تھی اور اب چڑی بیٹھی تھی۔

عشاء نے اب بھی کچھ بولنا ضروری نہیں سمجھا اور تھوڑی گھٹنے سے ہٹا کر خفا خفا سی نگاہ منال کبیر پر ڈالی۔

"آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟" منال زچ ہو اٹھی۔

اور وہ اسے کیا جواب دیتی۔ یہی ایک سوال وہ گزرے کل سے سینکڑوں بار خود سے کر چکی تھی۔

لیکن اپنے اضطراب کی وجہ جان نہیں پائی تھی۔

منال کبیر چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی پھر مایوس ہو کر اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

اس کی ہنڈا سوک ریگستانی مٹی میں اس جگہ پھنس گئی تھی، جس کے آگے ڈھلان تھی۔

ڈھلان کے آگے کیا تھا؟ گاڑی میں بیٹھے ہونے کی وجہ سے اس کی نگاہوں سے یہ پوشیدہ تھا۔ لیکن اپنی نگاہوں کی حد تک وہ اس سنسان صحرا میں تنہا تھی۔

اس نے ایک بار پھر اپنی گاڑی کا انجن متحرک کر کے اس ریتیلی مٹی سے نکلنے کی سعی کی۔ لیکن اس بار بھی اس کی سعی لاحاصل رہی۔

دفعتاً اس نے ڈھلان سے ایک سر کو ابھرتے دیکھا جو دھیرے دھیرے ابھر کر اس کے سامنے آ کھڑا

ہوا شام کی ملگجی روشنی میں اس کی صورت واضح نہیں تھی۔

آنے والے کے عزائم ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ یکدم ہی اس کا دل خوف کے احساس سے بھر آیا۔

اور لاشعوری طور پر اس نے ایک بار پھر انجن متحرک کرنے کی کوشش کی۔ لیکن تب تک وہ شخص اس کی گاڑی کے بالکل قریب آ گیا تھا۔

قبل اس کے کہ وہ کچھ سوچتی، سمجھتی وہ شخص گاڑی کی کھڑکی پر جھک آیا تھا' اور اس کے ہاتھ میں موجود اس شے کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا جس کے متعلق وہ جانتی تھی کہ وہ شے اس کے لیے نہایت قیمتی ہے۔

لاشعوری طور پر اس نے اپنی گرفت مضبوط کی۔ لیکن وہ شخص اس سے کئی گنا زیادہ طاقت ور تھا۔ لمحوں میں ہی وہ اس قیمتی شے کو اپنے قبضے میں لے کر پلٹ کر دوبارہ ڈھلان کی طرف بڑھ گیا تھا گویا وہ صرف یہی حاصل کرنے آیا تھا۔

عشاء کبیر نہیں جانتی تھی کہ وہ شے کیا ہے' لیکن وہ شے اس کے لیے اپنی زندگی سے زیادہ قیمتی تھی۔ تب ہی وہ اس شخص کے ہاتھ میں موجود ہر ڈر اور کی پروا کیے بغیر اس کے پیچھے لپکی تھی۔ لیکن وہ شخص ڈھلان سے اترنے کے بعد کہیں غائب ہو گیا تھا' اب پھر وہ اس وسیع و عریض صحرا میں تنہا تھی' جہاں رات کی سیاہی دھیرے دھیرے اپنا تسلط جما رہی تھی۔ اور شام آہستہ آہستہ اپنا وجود کھو رہی تھی۔ ماحول انتہائی خوف ناک ہو چلا تھا۔ وہ اس شے کو پانے کی دھن میں نیچے اترنا چاہ رہی تھی۔ لیکن کوئی غیر مرئی طاقت اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ بے بسی کا احساس شدید تھا۔ وہ وہیں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح دو زانو بیٹھ گئی۔ اس کے اندر وحشت اتر آئی تھی اور وہ اتنی شدید تھی کہ وہ ہڑبڑا کے اٹھ گئی۔

اس کا پورا وجود پسینے میں نہایا ہوا تھا' اور سانس یوں پھولی ہوئی تھی جیسے وہ میلوں کا سفر پا پیادہ طے کر آئی ہو۔ ذہن جاگنے کے بعد بھی اسی خواب کے زیر اثر تھا۔

کیا تھی وہ شے جس کے لیے وہ اس قدر پریشان تھی۔ وہ چیز نہ خواب میں واضح تھی اور نہ اس وقت۔ لیکن اس کی چھٹی حس کسی انہونی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

گھڑی رات کے تین بج کر دس منٹ کا پتا دے رہی تھی۔

پچھلے تین دنوں سے کوئی ایک احساس تھا جو اس کو چین نہیں لینے دے رہا تھا' اور اب یہ خواب' اس نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔

اس نے کبھی خوابوں کو اپنے اوپر سوار نہیں کیا تھا۔ لیکن اس خواب نے مسلسل اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

کمرے میں اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ لان میں آ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ لیکن ذہن سے اس خواب کو جھٹک نہ سکی۔ اس کا دل عجیب کیفیت میں گھرا ہوا تھا۔

"کیا ہونے والا ہے میرے ساتھ؟ کیا چھننے والا ہے مجھ سے؟ یہ خواب میری زندگی پر کس طرح اثر انداز ہو گا۔" اس کا ذہن ان خیالات سے ہٹ نہیں رہا تھا۔

خواب میں بھی شدید احساس کسی شے کے چھن جانے کا تھا۔ ایسی شے جو اسے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تھی۔ اور اب جاگنے کے بعد اسے لگ رہا تھا وہ اپنی نہایت قیمتی شے سے محروم ہونے والی ہے۔

اسے سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز کوئی "مادی شے" نہیں بلکہ جیتے جاگتے' سانس لیتے انسان تھے' جو اس کی زندگی میں ہر چیز سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ اور جن کو کھونے کے تصور سے ہی اس کا دل کانپ اٹھتا تھا۔

دادو' بابا' منال اور۔۔۔ حیدر۔ یہ چار ہستیاں اس کی متاع کل تھیں' وہ ان میں سے کسی کو بھی کھونے کا حوصلہ خود میں نہیں پاتی تھی۔ یہ چاروں اس کے اندر سانس لیتے تھے۔

ٹہلتے ٹہلتے ٹانگیں شل ہو گئیں اور پیہم دعا گو لب سوکھ کر اکڑ گئے۔ لیکن ہر پل کے ساتھ بڑھتی وحشت

کوئی اور ہی کہانیاں سنا رہی تھی۔

گھبرا کر اس نے پہلے دادو اور پھر منال کے کمرے کا رخ کیا۔ دونوں کو اطمینان سے سوتا پا کر اس نے وقت کی پروا کیے بنا بابا کو کال ملا دی۔

"ہیلو بابا!" کال ریسیو ہوتے ہی ہر بیل پر ڈوبتے ابھرتے دل کو کچھ سہارا ملا۔

"کون؟ عشاء؟" ان کی نیند کے نشے سے مغلوب آواز میں حیرت نمایاں تھی۔ انہوں نے شاید نمبر دیکھے بنا کال ریسیو کی تھی۔

"خیریت۔ اس وقت؟"

اور وہ جواب سوچنے لگی۔ اس کی اپنے باپ سے کبھی بھی اتنی بے تکلفی نہیں رہی تھی کہ گفتگو "اسلام علیکم کیسی ہو؟ اور پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟" سے آگے بڑھ سکے۔

بابا کا سوال اس کے لیے کچھ انجان تھا اور دل جواب دینے پر مائل' محض بابا کی خیریت مطلوب تھی' جوان کی بشاش آواز سے مل گئی۔

چپکے سے اس نے لائن منقطع کر دی۔ اس ایک نمبر سے اسے کال بیک کی آس تھی نہ امید لیکن اس نے سیل آف کر کے سائیڈ پر ڈال دیا۔

باقی وقت اس کے دل نے حیدر مغیث کی زندگی کی دعا کرتے ہوئے گزارا۔ مگر بے قرار دل کو قرار آیا' نہ مضطرب من کو چین۔

رات کی تاریکی بمشکل چھٹی اور صبح نمودار ہو گئی۔ لیکن یہ صبح اس کے لیے بیتی شب سے زیادہ سیاہ ثابت ہوئی۔ جب ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھتے ہی بریکنگ نیوز نے اس کے ہوش اڑا دیے۔ اس کے لیے اگلا قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا۔

"چینل "افق" کے معروف اینکر اور صحافی حیدر مغیث کل شب نامعلوم موٹر سائیکل سوار کے ہاتھوں شہادت پا گئے۔"

منال نے شاک کے عالم میں پیچھے مڑ کر عشاء کبیر کو دیکھا۔ جس کی ویران آنکھیں گواہ تھیں کہ یہ خبر اس کے لیے قابل قبول نہیں۔

"تفصیلات کے مطابق یہ واقعہ آج شب تین بجے پیش آیا' جب وہ اپنے کسی پروگرام کی ریکارڈنگ کے بعد گھر جا رہے تھے کہ ایک بائیک پر سوار دو بندوں نے اچانک بائیک ان کے قریب روکی اور عین دل کے مقام پر فائر کر کے فرار ہو گئے۔"

نیوز کاسٹر اور بھی کچھ کہہ رہی تھی لیکن اس کا دل مزید سننے کی تاب نہ لا سکا اور صوفے کی پشت کو مضبوطی سے تھامے کھڑی عشاء کبیر لمحوں میں زمین بوس ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

گر یہی حال رہا ساقی مے خانوں کا
ڈھیر لگ جائے گا ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا
قحط دنیا میں ہے ایسے مسلمانوں کا
زور جو توڑ دیا کرتے تھے طوفانوں کا
کوئی طارق ہے نہ خالد ہے نہ ہے ابن قاسم
راستہ صاف ہے ان بڑھتے ہوئے شیطانوں کا
جہاں چاہو' جیسے چاہو' بہا دو اس کو
خون اس دور میں سستا ہے مسلمانوں کا
جن کے ہوتے ہوئے لٹ جاتے ہیں غریبوں کے مکان
مرثیہ آؤ پڑھیں ایسے بزدل نگہبانوں کا!

حیدر کی اپنے آخری پروگرام میں سنائی گئی غزل اس کے ذہن میں بازگشت بن کر گونجنے لگی۔

حیدر مغیث کی ناگہانی موت اس کے لیے نروس بریک ڈاؤن کا باعث بنی تھی۔

تین دن اسپتال میں رہنے کے بعد وہ پچھلے چار روز سے گھر پر تھی۔ اور ان چار دنوں میں اس نے جانا' دادو ہمہ وقت اس کی طویل عمری کے لیے دعا گو رہتی ہیں' منال کے لیے عشاء سے بڑھ کر کچھ نہیں اور بابا کو عشاء کو کھو دینے کا خوف چین نہیں لینے دیتا۔

اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اداس سہ پہر کو اپنے لان میں اترتے دیکھا۔

"اتنا واشح سچ نہ بولا کریں حیدر! انسانی جان کی قیمت اب کچھ نہیں رہی۔" عشاء کبیر نے ایک بار اس سے کہا تھا اور جواباً" اس نے زوردار قہقہہ لگا کر بات کو مذاق میں اڑاتے ہوئے کہا تھا۔

"انسانی جان کی کوئی قیمت چاہے نہ ہو لیکن بندوق کی گولیاں بڑی مہنگی آتی ہیں مس عشاء! کوئی اپنی قیمتی گولی مجھ جیسے فضول بندے پر چلا کر ضائع نہیں کرے گا۔" وہ مانتا ہی کب تھا کسی کی۔

عشاء کبیر نے تھک کر سر کھڑکی کے شیشے سے ٹکا دیا۔ حیدر مغیث کے قتل کو سات روز بیت چکے تھے لیکن آنسو اندر ہی کہیں گر کر ایک گلیشیر بنا چکے تھے۔ ان آنسوؤں کو آنکھوں کی راہ نہ مل پائی تھی۔

زندگی میں زندگی جیسی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ اس کے دل میں حیدر کا غم گھر کر چکا تھا' جس کا عکس اس کی نگاہوں سے جھلکتا تھا۔

"عشاء!" پکارے جانے پر وہ چونک کر مڑی' جانے کب منال اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ اسے خبر ہی نہ ہو سکی۔

"تمہارا فیورٹ "آنگن ٹیڑھا" آرہا ہے۔ چلو آؤ دیکھتے ہیں۔" منال نے اسے زندگی کی طرف لوٹانے کی جیسے خود سے قسم کھائی تھی۔

"چھوڑو منال! میرا موڈ نہیں۔" اس نے آہستگی سے ہاتھ چھڑایا اور بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔

"تمہیں معلوم ہے میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں؟" منال کو یوں اچانک محبت جتانا کیوں یاد آرہا تھا؟ اس نے نگاہوں میں حیرت سموئے منال کو دیکھا۔

"اتنی کہ میں تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی اداس نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن تم پچھلے کئی دنوں سے میرا حوصلہ آزما رہی ہو۔" منال کے اپنے ہی خیالات تھے۔ وہ چھڑی گھما کر سب کچھ پہلے جیسا کر دینا چاہتی تھی۔ اس سے نہ صبر ہو پاتا تھا نہ انتظار۔

"میں بھی تم سے بہت محبت کرتی ہوں' مجھے کچھ ہو جائے نا منال! تو غم نہ کرنا۔ ورنہ میں بے چین رہوں گی۔" وہ کیا کہہ رہی تھی' اسے خود معلوم نہیں تھا۔

غائب دماغی سے کہتے ہوئے اس کا دل کئی خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

"عشاء!" منال دہل گئی۔ "ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟" منال نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"یوں ہی' زندہ رہنا اتنا آسان تو نہیں ہے۔" اس نے ہاتھ چھڑایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کے دل میں نجانے کیا سمائی تھی۔ تیزی سے وہ الماری کی طرف بڑھی اور اس کی دراز سے چابی لے کر اس نے اپنا شولڈر بیگ کندھے پر ڈالا۔

"عشاء!" اس کا ارادہ بھانپ کر منال اس کے پیچھے لپکی۔

"کہاں جارہی ہو؟"

منال کے استفسار پر وہ رکی اور پھر پلٹ کر آہستگی سے گویا ہوئی۔

"دل کو بہلانے میں وقت لگے گا منال! مجھے چند روز غم منا لینے دو۔ آج میں خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی ہوں۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ دوبارہ مڑ گئی۔ منال اس کے پیچھے لپکی۔ جس وقت وہ اگنیشن میں چابی گھما رہی تھی' منال اس کے برابر والی سیٹ سنبھال چکی تھی۔ عشاء نے ایک نظر اسے دیکھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☼ ☼ ☼

حیدر کے اپارٹمنٹ کے باہر وہ لمحہ بھر کو ٹھہری تھی۔ وہ کیوں آئی تھی یہاں؟ وہ کیا چیز تھی جو اسے بے بس کیے یہاں تک لے آئی تھی' وہ جاننے سے قاصر رہی۔

وہ اس آس پر کھڑی رہی کہ وہ کہیں سے آکر ہمیشہ کی طرح فکرمندی سے کہے گا۔

"اپارٹمنٹ کے سامنے یوں کھڑے رہنا مناسب نہیں۔ اس بلڈنگ کے لوگ بلاوجہ ہی شبے میں پڑ جائیں گے۔"

فکرمند سی آواز اس کے پیچھے سے ابھری۔ بے اختیار اس نے پلٹ کر دیکھا۔

فقرہ منال کے لبوں سے آزاد ہوا تھا اور منال اس کی آنکھوں میں کرب مچلتے دیکھ کر پریشان ہوا تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ چلو گھر چلتے ہیں۔" منال نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلا کر دوسرے ہاتھ سے منال کا ہاتھ ہٹایا اور اپنے بیگ سے چابی نکالی۔

اپارٹمنٹ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ منال نے سارے سوئچ آن کر دیے۔ کمرا لمحوں میں روشن ہو گیا۔

وہی کمرا وہی فرنیچر' پرانی ترتیب' بدلا کچھ بھی نہیں تھا' لیکن کمی بہت بڑی تھی۔ وہ یہاں کہیں نہیں تھا' بلکہ کہیں بھی نہیں تھا۔

فرش' فرنیچر ہفتے بھر کی گرد سے اٹا ہوا۔

"میں اپنے معمول سے اپارٹمنٹ کو ہمیشہ صاف رکھتا ہوں اور اگر آپ کو یہ گرد آلود لگے تو سمجھ جانا کہ میرے قدم اپارٹمنٹ میں پڑے ہی نہیں۔"

وہ یہاں کہیں نہیں تھا لیکن اس کی یادیں سارے میں چکراتی پھر رہی تھیں۔ اس کے دل میں ڈھیروں اداسی اتر آئی تھی۔

وہ تھکے تھکے انداز میں کرسی پر یوں بیٹھ گئی جیسے میلوں کا سفر پیادہ طے کر آئی ہو۔

منال بیڈ پر بیٹھی بے بسی سے اسے دیکھے گئی۔ جو اب میز پر پڑے کپ پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔

"میں اپنی اس عادت سے عاجز آیا ہوا ہوں۔ اگر رات بھر جاگنا پڑ جائے تو ہر آدھے گھنٹے بعد چائے کی تلب بھی جاگ اٹھتی ہے۔"

وہ اٹھ کر میز کے قریب آئی۔ خالی کپ کے پیندے سے لگی سوکھی چائے اسے کئی یادیں پیچھے لے گئی۔

اپنی انوکھی خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے گردن موڑ کر بیڈ کی سمت دیکھا' جہاں بیٹھ کر حیدر کے لبوں پہ فقرہ ادا ہوا تھا۔

اور تب بیڈ پر بیٹھی منال نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ملال کا سمندر موجزن ہے۔

اس نے اپنی پرملال پیاسی نگاہیں دوبارہ موڑ لیں۔ اب مرکز نگاہ میز پر پڑا اخبار تھا۔

"اچھا یعنی میز پر موجود مگ اس بات کا ثبوت ہے کہ حیدر مغیث نے ساری رات بنا سوئے جاگی ہے؟"

اسے گزرے چند ماہ کے فاصلے پر کھڑی اپنی ہی آواز کہیں نزدیک ہی سے سنائی دی۔

"ہاں۔"

"وہ کیوں بھلا؟"

"اس کا جواب بھی ہمیشہ کپ کے ساتھ دھرا ملے گا۔"

میز پر اخبار حیدر کی موت سے پہلے اس کی توجہ کا مرکز رہا تھا' اور اس کے ساتھ رکھے پیڈ پر صرف ایک جملہ لکھا تھا۔

"بعض اوقات جب ہم اپنے کسی بہت ہی پیارے کو کسی بڑے غم سے آشنا نہیں کروانا چاہتے تو ہم اسے چھوٹا غم دے کر بڑے غم سے بچا لیتے ہیں۔"

"میں نے پچھلے اتوار کو نکاح کر لیا ہے۔" اخبار پر

جمی نگاہیں کسی یاد سے دہک اٹھیں۔ حیدر کا شاش لہجے میں کہا گیا جملہ سراسر غلط بیانی تھا اس راز کے منکشف ہوتے ہی "کیوں؟" کا سوال جاگ اٹھا تھا۔ اور جواب وہ کھو کر گیا تھا۔

اچانک دل کی زمین زلزلے کی زد میں آ گئی تھی۔ گلیشیر پگھلنے کا امکان وحشت زدہ چہرے سے عیاں تھا۔

"عشاء!" منال بے اختیار اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھی۔

کیا ہو گیا ہے عشاء؟ چلو اٹھو گھر چلیں۔ منال نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"منال ...! یہ اخبار..." اس نے اخبار منال کی نگاہوں کے سامنے کیا۔

"یہ... اس کے جانے سے ایک روز قبل کا اخبار ہے منال!" اس کا لہجہ لڑکھڑا رہا تھا۔

"اس میں... میری منگنی کی تصویر ہے۔" اس نے لب بھینچ کر بمشکل بات مکمل کی۔

"عشاء! میری جان!" منال بے بس سی ہو گئی۔ "تو اس میں اچھنبے کی کیا بات ہے؟ یہ تصویر تو تمہیں اب ہر گھر سے ملے گی۔" منال سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کس طرح بہلائے۔

"تم نہیں سمجھ سکتیں منال!" اس کے اندر کی تہہ و بالا ہو رہی تھی۔ "تم سمجھ ہی نہیں سکتیں۔" اس نے اپنے ہاتھ پہ دھرے منال کے ہاتھ ہٹایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کے لڑکھڑاتے قدم صندوق کے پاس آ رکے۔

"میرے پاس میرے والد کی پہلی اور آخری نشانی۔" عشاء یوں صندوق کے قریب بیٹھ گئی جیسے ٹانگوں میں کھڑا رہنے کی سکت نہ رہی ہو۔

"میرے لیے اس کمرے میں رکھی ہر چیز سے زیادہ قیمتی۔ حتی کہ خود اپنے آپ سے بھی۔" اس نے ہتھیلی سے صندوق پر جمی دھول ہٹائی۔

اس پل منال کبیر نے بغور اس کی صورت دیکھی، جہاں ضبط کی آخری حد رقم تھی۔

اور وہ آخری حد بھی پار کر گئی جب اس نے صندوق کھول کے دیکھا۔ اسے اپنا دل بند ہوتا ہوا محسوس ہوا اس کی زرد پڑتی رنگت سے منال ایک بار پھر گھبرا کر اس کے پاس آ بیٹھی۔

"جس روز میں نے چادر اس صندوق میں رکھی تھی' اس روز جیسے خود بخود ہی ایک فیصلہ ہو گیا تھا کہ میں اس صندوق میں صرف وہی چیزیں رکھوں گا جو مجھے اس چادر اور اس صندوق جتنی عزیز ہوں گی۔"

اور گلیشیر پگھل گیا۔ اس نے چادر پر رکھا ہوا اپنا قلم اٹھایا' جو کبھی اس کے پیروں تلے آ کر روندا گیا تھا' اور پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

"تم کہتی تھیں نا' منال!" وہ دیوانوں کی طرح منال کی سمت مڑی۔ "وہ دھوکے باز ہے' وقت گزاری کر رہا ہے' اس کی نیت اچھی نہیں۔ دیکھو!" اس نے قلم منال کی نگاہوں کے سامنے کیا۔

"دیکھو' اس نے میرا قلم اس صندوق میں سنبھال رکھا ہے۔ وہ دھوکے باز نہیں ہے۔"

وہ حیدر کے لیے لفظ "تھا" استعمال نہیں کر پا رہی تھی۔

"کسی کا قلم سنبھال رکھنا سچی محبت کا ثبوت نہیں۔" عام حالات میں وہ ضرور اپنے خیالات عشاء کے گوش گزار کرتی۔ لیکن اس وقت اس کی خواہش محض اتنی تھی کہ عشاء آج سارا غم آنسوؤں کے ذریعے بہا کر زندگی کو پھر سے جینا شروع کر دے۔ اور وہ غلطی پر تھی۔

عشاء کبیر کے دل کے ایک گوشے میں حیدر مغیث کی یاد کا دیپ ہمہ وقت جلتا رہے گا۔ جو اسے زندگی گزارنے تو دے گا' زندگی جینے نہیں۔

وہ منال کے کاندھے پر سر رکھے' ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اور منال کبیر اس کے لیے سکون کی دعا کرتے ہوئے پر یقین سی تھی۔

☼

زرتاج بیگم کے بنگلے کو شہر بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ مہینے کی پہلی جمعرات کو یہاں سے غریب عورتوں کو امداد دی جاتی ہے۔ خالہ فروز، سعیدہ اور خول جیسی کتنی ہی عورتوں کے گھر اس امداد کے سہارے چل رہے ہیں۔ بوا عظمت، زرتاج بیگم کی خاص ملازمہ ہے، جو عرصہ دراز سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعاً سخت مزاج ہے۔

سلمان رفتہ رفتہ زوبیہ کی عادت سے مانوس ہو کر عمر کے زیر اثر آجاتا ہے۔ زوبیہ اپنی من مانیوں سے ہر جائز ناجائز خواہشات منواتی ہے۔ اظہار چچا، شاکرہ بیگم اور آپا گل سوائے تلملانے کے کچھ نہیں کر پاتے۔ ان کی تمام امیدیں زوبیہ کو ملنے والے بنگلے اور پیسے سے وابستہ ہیں۔

اسکول کے بچے ساجد کے معاملے پر معاذ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے جس سے وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ سلام صاحب کی بیوی نجمی شدید خوف اور پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔ ربیعہ اس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اظہار چچا کا خاندان سوائے جویا اور زرینہ کے اس حادثے سے خوب حظ اٹھاتا ہے۔ جویا چاہتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ کر نہیں پاتی۔

ملازمان کے جو واپس نکل، رونق دن بدن بڑھتی جا رہی ہے جس پر نگینہ، آسفہ دل جلی کڑھتی رہتی ہے۔ شاہ ہر موقع پر اس کی اٹنگ شوخی کرتی ہے۔ نگینہ کی تمام امیدیں اپنی بڑی بیٹی منزل سے وابستہ ہیں۔ عینی زیادہ تر پڑھائی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن خیام کی یاد اس کے خیالوں کی دنیا کو آباد رکھتی ہے۔ ستارہ نانی کے یہاں سالار کی آمد و رفت اسے قدرے بے چین کرنے لگتی ہے۔

خیام کچھ عرصے بعد ہی ایک بس سروس کمپنی میں معمولی نوکری کر لیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر عینی کی جدائی اسے ملال کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بدنامی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا۔ صرف بابو شوکت سے اس کی اچھی دعا سلام ہے کہ اچانک تمام تر احتیاط کے باوجود گھر سے لائے زیورات کی چوری ہو جاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت تھے۔ اس کے بعد مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

زرتاج بیگم اپنے کلاس کی دیگر عورتوں کی طرح خود نمائی اور خود ستائشی کا شکار ہیں۔ بڑھاپا عمر سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح سگھڑ بدلنے کی عادت ہے۔ جاوید سکر مرزا بیل سے ان کا تعلق ہر کسی کی نظر میں ہے۔ نبیل جیسے ذرا عمر کا چھوکرا اس کی مدد سے یہ نوکری لی ہے۔ زرتاج بیگم کی دی مراعات سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔ بوا عظمت اسے کرتوت بیگموں کی نظر میں رکھتی ہے جس پر وہ خاصا جزبز ہوتا ہے۔ زرتاج بیگم کے بھائی یوسف کمال انہیں کی عیار فطرت کو پہچان کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے زرتاج بیگم چٹکیوں میں اڑا دیتی ہیں۔

زیورات کی چوری کے بعد سے خیام کے برے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی نوکری ختم ہونے سے وہ پیسے پیسے کو محتاج ہونے لگتا ہے۔ بابو شوکت کا بیٹا خیام کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کرتا ہے۔ ایسے وقت میں بابو شوکت اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔ لیکن گھر کی یاد اسے بے چین رکھتی ہے۔ خاص طور پر عینی کی چوڑیاں اسے یاد کی شدت سے باندھے ہوئے ہیں۔

گھر میں جویا کے رشتے کی بات چل رہی ہے جس پر جویا، آپا گل سے بحث کرتی ہے۔ آپا گل کی لایعنی باتوں پر وہ براہ راست اپنے ماں باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسے معاذ کے ارادوں کی سچائی کا پختہ یقین ہے۔ دوسری طرف آپا گل کے شوہر اکبر اپنے اثر و رسوخ سے معاذ کو ملنے والی نوکری کسی اور کو دلوا دیتے ہیں۔ معاذ اس بات کا تذکرہ اپنے والد سے کرتا ہے تو وہ اسے معاذ کا وہم سمجھتے ہیں۔

سلمان، زوبیہ کے گھر میں شفٹ ہو چکا ہے اور شاذ و نادر ہی ماں باپ کو شکل دکھاتا ہے۔ جس پر شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب پریشان رہتے ہیں۔

جویا کا رشتہ آناً فاناً طے ہو جاتا ہے جس میں اظہار چچا، آپا گل اور شاکرہ بیگم کی کوششیں شامل ہیں۔ شاکرہ بیگم کو طلاق کی دھمکی اپنا کام دکھاتی ہے۔ اور جویا کی تمام مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ معاذ کی نوکری اور جویا کے رشتے کی خبر ایک ساتھ ملتی ہے۔ وہ گم صم سا ہو جاتا ہے۔ جویا کے رشتے پر دادی، چچا اظہار کے خاندان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں۔ زوبیہ، جویا کو اکساتی ہے کہ اگر وہ چاہے تو رشتہ ختم کروانے میں مدد کر سکتی ہے۔ زوبیہ آپا گل اور شاکرہ بیگم کو نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ تاہم جویا ایسا کرنے سے منع کر دیتی ہے۔

منزل کو ہالی صاحب کی نظم دنوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ ایسے میں اسے ماں نگینہ کے طور طریقے کھٹکنے لگتے ہیں۔ وہ اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتی ہے تو نگینہ کو دھچکا لگتا ہے تاہم وہ نانی ستارہ کو اس کا علم نہیں ہونے دیتی۔

۴۴
چوالیسویں قسط

"مجھے لگتا ہے کہ اللہ نے میرے کچھ قصور ضرور معاف کر دیے ہیں۔"

"اچھا!" معاذ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

"لگتا ہے، خاصے صاحب نظر ہو جو ایسے اندازے بھی لگا لیتے ہو۔"

"ارے توبہ کیجیے، میں گناہ گار کہاں کا صاحب نظر۔" اس نے انکساری سے اپنے کان کی لو کو چھوا۔ "سنا تھا کہ جب انسان کے جائز کام بنا کسی بڑی رکاوٹ کے ہونے لگیں اور زندگی میں سکون کا چھا جانے والا سا ہی احساس جاگنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے خوش ہے اور ایسے میں انسان کو اپنی شکر گزاری بڑھا دینا چاہیے۔" کمرے کے کھلے دروازے سے پار نظر آتی ہریالی پر نگاہ جمائے وہ کسی اور دھیان میں تھا۔

"کس سے سنا تھا۔" معاذ نے سامنے کھلی کاپی کو چیک کرتے ہوئے یوں ہی سرسری سے انداز میں پوچھا تھا۔

"اپنی نانی سے۔" "وہ یقیناً" بے ساختہ ہی کہہ گیا۔ معاذ نے کچھ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"بہت اچھی بات کہی انہوں نے، بیٹوں کا سر پر ہونا باعث رحمت ہوتا ہے اور ان کی قدر کرنے والے بانصیب۔"

خیام کا دل بڑے ناخوش گوار انداز میں دھڑکا تھا۔ اسے لگا جیسے اب معاذ کا اگلا سوال نانی کے بارے میں ہی ہوگا مگر ایسا نہیں تھا۔

"شکر اور صبر دونوں ہی کا بڑا درجہ ہے خیام! صبر مصیبت کو ٹالتا ہے اور شکر نعمت کو بڑھاتا ہے۔ تم اپنی زندگی میں اس بات کا ضرور تجربہ کر کے دیکھنا ہمیشہ کامیاب رہو گے۔" معاذ کی نگاہ کاپی پر تھی اور ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا۔ اس نے نانی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ پھر بھی خیام کا سر شرمندگی سے جھکا۔

ذہن پر بہت زور ڈالنے کے باوجود بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ کبھی بھی اپنی تقدیر سے جڑے فیروزہ جان نامی دکھ پر صبر کر سکا ہو یا پھر نانی ستارہ کے زیر سایہ گزرنے والی اپنی انتہائی آرام دہ زندگی پر شکر گزار ہو سکا ہو۔

اس کے پاس صرف غصہ، نفرت اور حقارت کا ہی کھاتہ کھلا رہا۔

دوسروں کے حساب میں بھی اور اپنے میں بھی۔

وہ سب جو اس سے بے حد محبت کرنے کے باوجود آج بھی معتوب تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو۔" معاذ نے آخری کاپی بند کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اتنے خاموش مت رہا کرو خیام! یہاں اتنے بچے آتے ہیں۔ ریحان وغیرہ ہوتے ہیں۔ سب سے گھلنے ملنے کی کوشش کرو۔ بہت سارے دوست بن جائیں گے تمہارے۔"

"میں نے کبھی کوئی دوست نہیں بنایا معاذ بھائی! مجھے نہیں پتا دوست کیسے بنائے جاتے ہیں۔"

اس کے لہجے میں وہی اعتراف جرم والی شرمندگی جس کے پیچھے درد کا نا معلوم کون سا گہرا سلسلہ تھا۔

معاذ نے جو اس روز مزید کچھ نہ پوچھنے کا تہیہ کیا تھا۔ اس پر کاربند تھا، سو دل میں اٹھتے سوال کو جھٹک کر مسکرا دیا۔

"دو دوست تو تم اب تک بنا ہی چکے ہو، ایک ساجد اور ایک میں، پھر بھی کہتے ہو کہ کوئی دوست نہیں۔" وہ کچھ چونک سا گیا۔

"آپ مجھے اپنا دوست سمجھتے ہیں؟"

"کیوں کیا میں اس قابل نہیں لگتا تمہیں کہ مجھے اپنا دوست کہہ سکو۔" معاذ خوش دلی سے ہنسا۔

"نہیں نہیں کیسی بات کرتے ہیں۔" وہ بری طرح جھینپا۔

"میں تو خود کو اتنا خوش نصیب نہیں سمجھتا تھا کہ آپ مجھے دوستوں کی لسٹ میں شامل کرلیں گے۔"

"اب اتنی بھی انکساری مت برتو۔ اتنے ہینڈسم اور بلاشبہ خوب صورت لڑکے ہو۔ کبھی ٹی وی یا فلم کا رخ کرنے کے بارے میں کیوں نہیں سوچا خیام! تم تو ٹھیک ٹھاک ہیرو آسکتے ہو کسی فلم میں۔"

کاپیاں سمیٹ کر الماری میں رکھتے ہوئے جوابات معاذ نے محض یوں ہی اسے خوش کرنے کے لیے کی تھی، بدقسمتی سے اس کا سرا بھی خیام کے اس پرانے گہرے کمپلیکس سے تھا' سو وہ جواباً ہنس بھی نہیں سکا۔

"پھر کچھ غلط کہہ گیا میں۔" معاذ اس کے اترے ہوئے چہرے کا نوٹس لیے بغیر نہیں رہ سکا۔

"ارے نہیں!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "بس چائے بنا کر لاتا ہوں آپ کے لیے۔" اس بار وہ معاذ کا جواب سننے کے لیے رکا نہیں تھا۔

معاذ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جیسے تھکن سی اتاری۔ بچے بڑھتے جارہے تھے۔ ابتدائی حساب کتاب اور اردو لکھنا پڑھنا سیکھ کر بہت سے واپس اپنے کاموں پر واپس چلے جاتے تھے اور کچھ آگے پڑھائی جاری رکھنے پر تیار ہوجاتے جو بھی تھا ملک میں شرح خواندگی کے انتہائی نچلی سطح کو چھوتے گراف کو تھوڑا سا بہتر کرنے کی ایک چھوٹی سی مثبت کوشش کامیاب ہوئی تھی۔

"کاش ایک بہت چھوٹا سا حصہ سب ہی ڈال سکیں تو کیا بہتری نہیں لائی جاسکتی۔" وہ عادتاً "ایسی فکر پالتا تھا' جو خود اپنی طرف توجہ جانے سے بڑی خوبی سے بچالیتی تھیں۔ خیام چائے بنا کر لا رہا تھا تب ہی چھوٹے سے گیٹ کو کھول کر ساجد اندر آتا ہوا دکھائی دیا۔

خیام اسے دیکھ کر برآمدے میں ہی رک گیا۔

ساجد کے گلے میں بسکٹ' ٹافیوں کا وہی خوانچہ لٹکا ہوا تھا' جو وہ لے کر سارے شہر میں گھومتا تھا۔

"چائے پیو گے۔"

"دے دیجیے۔" اپنے گلے سے بوجھ اتارتے ہوئے اس نے فوری ہامی بھری تھی۔

خیام' معاذ کے سامنے چائے کا کپ رکھ کر دوبارہ کچن میں چلا گیا۔ واپس آیا تو ساجد سینہ پکڑے بری طرح کھانس رہا تھا اور معاذ بہت تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"چلو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتا ہوں' کتنی بڑھ گئی ہے تمہاری کھانسی اور بخار بھی کتنا تیز ہورہا ہے۔"

"میں دوا لے رہا ہوں معاذ بھائی! دکھایا تھا ڈاکٹر کو۔ انہوں نے کہا ہے تھوڑے دن لگیں گے ٹھیک ہونے میں۔" وہ بمشکل سانس پر قابو پاسکا تھا۔

مگر معاذ مطمئن نہیں تھا۔

"خالی دوا سے کچھ نہیں ہوگا۔ تمہارا بلڈ ٹیسٹ ہونا ضروری ہے اور یہ اپنی دکان داری بھی کچھ دن کے لیے بند ہی کردو تو اچھا ہے۔ فی الحال تمہاری صحت اتنی محنت کی اجازت نہیں دے رہی ہے۔ آرام کرو گھر پر۔"

ساجد تلخی سے مسکرادیا۔

"آرام کے لیے ہی تو میں گھر سے باہر جاتا ہوں۔"

"مطلب؟" معاذ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں۔ وہ میں کچھ دینے آیا تھا۔" اس نے خیام کو مخاطب کیا تھا اور ساتھ ہی شرٹ میں اندر کی طرف خصوصی طور پر لگائی گئی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا احتیاط کے ساتھ بندھا ہوا شاپر نکالا۔ گرہ در گرہ۔

معاذ اور خیام دونوں ہی نے صبر سے ان گرہوں کے کھلنے کا انتظار کیا تھا۔

"یہ لیں۔" اس نے اپنا ہاتھ خیام کے ہاتھ پر رکھا۔

سونے کی وہی دو نازک سی چوڑیاں خیام کے ہاتھ پر جگمگا رہی تھیں جن کی اب وہ آس تک چھوڑ چکا تھا۔

"یہ کہاں سے ملیں تمہیں ساجد؟" اس کے لہجے میں بڑا اطمینان آیا تھا۔ معاذ نے بہت غور سے خیام کے چہرے پر اترتی جذباتیت اور ان دو جگمگاتی چوڑیوں کو دیکھا۔

دونوں کے بیچ عجیب سا تال میل تھا۔ بنا پوچھے کے بتائے بھی سمجھ میں آرہا تھا' مگر اس سے آگے کی اگلوائی ممکن نہیں تھی۔

"بس مل ہی گئیں۔ آپ سے وعدہ کیا تھا میں نے' پھر کیسے نہ لاتا' چاہے جان بھی دینا پڑجاتی مگر آپ ساجد کو وعدہ خلاف نہ پاتے۔ یہ مرد کی زبان ہے۔"

اس کی آواز میں بڑا انوکھا سا دبدبہ تھا' جو متاثر کرنے کے بجائے لبوں پر ہنسی لا رہا تھا۔

معاذ نے ایک ہاتھ ساجد کے کندھے پر جمایا۔

"اتنی سی عمر میں اتنی بڑی باتیں۔"

"جب اتنی سی عمر میں بڑے کام کررہے ہیں تو باتیں کرنے میں کیا حرج ہے معاذ بھائی!" معاذ کی بات کا جواب دیتے ہوئے چائے کا آخری گھونٹ ساجد نے حلق سے نیچے اتارا اور اٹھ کھڑا ہوا "چلتا ہوں۔"

"رک جاؤ نا' تھوڑی دیر آرام کرلو' جلدی کیا ہے۔"

معاذ نے اسے روکنا چاہا تھا' مگر وہ اب بیٹھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"تھوڑا سا مال باقی رہ گیا ہے' وہ بھی بیچنا ہے' پھر فارغ ہوکر ہی گھر جاؤں گا' سامان کم بکے تو مالک غصہ کرتا ہے۔ کہتا ہے حرام خوری کی عادت ہے تم سب لوگوں کو۔ کریں تو کیا کریں۔" اپنی بات کہہ کر وہ ہنس پڑا تھا' لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ وہ تینوں برآمدے سے نکل کر اب صحن میں آچکے تھے۔

"آپ کا اسکول تو ماشاء اللہ اب بہت اچھا لگنے لگا ہے معاذ بھائی! ہر چیز بڑی سیٹنگ میں آگئی ہے۔"

اس نے ایک تعریفی نگاہ اس سارے منظر پر ڈالی' جہاں اب واقعی قاعدے قرینے کا دور دورہ تھا۔ ترتیب سے رکھی کرسیاں' میز' ریک پر کتابیں' گملوں میں کھلے خوش رنگ پھول اور دھلا دھلایا فرش۔

"اب یہ سب خیام کی بدولت ہے۔ اس نے بڑی فکروں سے ہمیں آزاد کردیا ہے۔ اس بار تم نے ہمیں واقعی کام کا آدمی دیا ہے ساجد! مجھے تو تمہارا باقاعدہ شکریہ ادا کرنا ہے۔" خیام اور ساجد دونوں ہی اس تعریف پر مسکرائے تھے۔

"خیام بھائی کو اپنے پاس رکھنا' آپ کا مجھ پر ذاتی احسان ہے معاذ بھائی!" ساجد کچھ جذباتی ہوا۔

"اوں ہوں!" معاذ شرارت سے مسکرایا۔ "اگر تمہیں ذاتی احسان کا اتنا ہی شوق ہے تو اسے زری کے کھاتے میں ڈالو' خیام کے نہیں۔"

"مجھ پر تو آپ دونوں ہی کا احسان ہے۔ ساجد کا کہ وہ مجھے آپ تک لایا اور آپ کا کہ آپ نے مجھے اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دی' ورنہ پتا نہیں۔"

اتنے لمبے عرصے دھکے کھانے کے بعد وہ اچھا خاصا رف اینڈ ٹف ہوچکا تھا' مگر کبھی کبھی دل پر چوٹ بھی کسی نئے زاویے سے پڑتی تھی۔

"اچھا' اب یہ باہمی تعریف کا سلسلہ بند کرو۔ ساجد کو دیر ہورہی ہے۔" معاذ نے اسے خوانچہ گلے میں لٹکائے کھڑا دیکھ کر اس کی تکلیف کا احساس کیا تھا۔

"سنو ساجد! تم کچھ دن کے لیے یہ سامان مجھے دے دو' میں بیچ آیا کروں گا۔ تم یہاں آکر حساب کرلیا کرنا' چند دن

ذرا آرام کرلو۔" خیام نے ساجد کی پریشانی دور کرنے کا ایک بڑا موزوں حل نکال ہی لیا تھا' معاذ نے تعریفی نظروں سے خیام کو دیکھا۔

"بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں ہے۔ چند گھنٹے کے لیے خیام کام کرسکتا ہے۔"

خیام اسے بتاچکا تھا کہ وہ چند ماہ یہ کام ساجد کے ساتھ مل کر کرچکا ہے۔

اور حلال روزی کے کسی ذریعے میں معاذ کے نزدیک کبھی بھی کچھ بھی باعث شرم نہیں تھا۔

"اور تم ہی کیوں میں بھی مدد کرسکتا ہوں۔"

"خیر آپ تو نہیں۔" ساجد اور خیام دونوں ہی نے اتنی تیزی سے کہا کہ معاذ ہنستا چلا گیا۔

"اچھا لیکن زیادہ دور مت جایئے گا اور بس تین چار دن اس سے زیادہ نہیں۔"

وہ اپنا خوانچہ واپس رکھتے ہوئے خیام سے کہہ رہا تھا۔ خیام اور معاذ دونوں اس کے ساتھ چلتے ہوئے باہر تک آئے تھے۔

روٹ کی بس سڑک کے دوسرے طرف آئی تھی' سو وہ تیزی سے سڑک کراس کرگیا۔

بس سامنے سے آرہی تھی۔

اور بس میں چڑھتے ہوئے' وہ ایک بار پھر بری طرح کھانس رہا تھا۔ معاذ اور خیام نے ایک دوسرے کو تشویش سے دیکھا۔

☼ ☼ ☼

تایا گل کے ہاں ہونے والی قرآن خوانی' آہستہ آہستہ ایک بڑے فنکشن میں تبدیل ہورہی تھی۔

قرآن خوانی کے بعد درس بھر میلاد۔

حالانکہ ان کے کسی بچے کی سالگرہ ابھی اگلے چار ماہ تک بھی نہیں تھی مگر اتنا سب ہونے کے بعد حرف آخر کے طور پر انہیں سالگرہ بھی یاد آرہی تھی۔

"اتنا اچھا کھانا پکوا رہی ہوں' تو پھر ایک کیک کی ہی تو کمی رہ جاتی ہے۔ سالگرہ ہوگی تو سارا خرچا نکل کر بھی خاصا نفع دے جائے گی۔"

انہوں نے داد طلب نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا۔ زویا اور حویا کے لیے ان کی بات غیر متوقع نہیں تھی پھر بھی تھوڑا سا افسوس تو ہوا ہی تھا' لیکن شاکرہ امی نے خوب پیٹھ ٹھونکی۔

"اتنی منگائی میں اسی طرح چلنا چاہیے۔ ہاتھ کے ہاتھ حساب برابر ہوجائے گا اور ساتھ میں واہ واہ بھی ہوجائے گی۔"

"کوئی واہ واہ نہیں ہوگی۔ سب ہی پیچھے بات کرتے ہیں اور آپا! آپ کے بارے میں تو پہلے ہی خاندان بھر میں مشہور ہے کہ صرف لینا ہی لینا آتا ہے آپ کو دیتی دلاتی کچھ نہیں ہیں کسی کو' سو آپ پلیز لوگوں کو اپنے اوپر ہنسنے کا موقع مت دیں۔ قرآن خوانی کرنا ہے کریں۔ لوگ مٹھائی کے ڈبے تو لے ہی آئیں گے آپ کے لیے۔"

زویا عادتاً بولتی تھی بیچ میں۔

تایا گل اور شاکرہ امی دونوں ہی کو برا لگا۔

"مجھے کیا مٹھائی کی دکان کھولنا ہے شہر کے بیچ۔ میرے تو بچے تک میٹھا نہیں کھاتے۔ ساری سسرال والوں کے پیٹ میں جائے گی' اور یہ کون میرے بارے میں اناپ شناپ بولتا ہے' جس کا تم نے حوالہ دیا ہے۔ نام بتاؤ پھر دیکھو میں کیسا ٹھیک کرتی ہوں۔" وہ نام جاننے پر مصر ہوئیں۔

زویا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔

"ابھی یاد نہیں آ رہا کس نے کہا تھا۔ جب یاد آئے گا بتا دوں گی۔" وہ ٹل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

آپا گل ہمیشہ کی طرح ناراض ہو کر رخصت ہوئی تھیں۔

"سب پتا ہے مجھے کوئی غیر نہیں میرے اپنے بہن بھائی دشمن بنے ہوئے ہیں میرے۔ دوسروں کا نام لے کر خود مذاق اڑاتے ہیں۔"

شاکرہ امی سیڑھیوں تک ان کے پیچھے گئی تھیں۔ مالک مکان کی طرف سے ملی تازہ دھمکی کے بعد گھر میں اونچی آواز میں بولنے سے آج کل پرہیز کیا جا رہا تھا۔

سو خود آپا گل کا انداز بھی دھیما پڑا تھا۔

"مٹھائی کا پانچ کلو کا ڈبہ لے کر آئیے گا۔ ویسے تو ہم سب کے جوڑے بھی لانے چاہیے تھے آپ کو لیکن اب آپ کے حالات ہی اتنے بگڑ گئے ہیں کہاں سے کریں گی۔ جویا حالانکہ جاب کر رہی ہے مگر اسے بھی احساس نہیں ہے کہ بہنوں کے ہاں کس طرح لیا دیا جاتا ہے۔"

آخری سیڑھی تک اترتے ہوئے ان کی ہدایتیں تھیں سب ہی جیسے۔

شاکرہ امی فکر مندی سے واپس آ کر اپنے کمرے میں بیٹھ گئیں۔ پانچ کلو مٹھائی اور سالگرہ کا تحفہ۔ دونوں کی مالیت کا تخمینہ ہوش اڑا رہا تھا۔

مہینے کا آخری ہفتہ اتنا لمبا ہو جاتا تھا کہ کاٹنا مشکل ہونے لگتا تھا۔ ہاتھ پاؤں جوڑ کر مالک مکان سے ایک اور موقع لے لیا گیا تھا ورنہ۔۔۔

انہوں نے ایک پریشان نگاہ اس معمولی سے جگہ جگہ سے جھڑتے گھر پر ڈالی جہاں آتے ہوئے انہوں نے بیزار منہ بنائے تھے مگر اب وہی گوشہ عافیت تھا۔

دن میں کتنی ہی بار انہیں اپنا وہ آسائشوں سے بھرا دو منزلہ گھر یاد آتا تھا جسے بقول خود ان کے دشمنوں کی نظر کھا گئی تھی۔

کسی اور کے سامنے ذکر کرنا بھی فضول تھا۔

نہ سلمان نہ زویا اور نہ اظہار صاحب۔

انہوں نے آپا گل کی فرمائش جویا کے سامنے دہرائی تو وہ کچھ چپ سی ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔

"اتنا کچھ تو دیا جا چکا ہے آپا گل کو۔۔۔ ابھی بھی مزید ضرورت ہے انہیں۔۔۔ آپ نے صاف منع کیوں نہیں کر دیا۔" جب وہ بات کر رہی تھی تو تھوڑی سی تلخ ہو گئی۔

"بیٹیوں کو تو ساری عمر دیا جاتا ہے۔ ایک تحفے اور مٹھائی کی حیثیت ہی کیا ہے۔ تم کسی سے ادھار لے لو پھر تنخواہ ملنے پر اتار دینا۔ آپس میں لین دین تو چلتا ہی ہے۔"

شاکرہ امی کو اس کا منع کرنا برا لگا تھا مگر جویا کے نزدیک چند اور باتیں تھیں جو آپا گل کے ہاں کے فنکشن سے زیادہ ضروری تھیں۔

"زویا کی کتابیں ہیں۔ فیس جمع کرانا ہے۔ کہاں سے لائیں گے پھر ہم۔"

"کتابیں کسی سے لے کر بھی پڑھی جا سکتی ہیں اور فیس اگلے ماہ جانا ہے۔ اب اتنی سی بات کے لیے شادی شدہ بیٹی کا سسرال میں سر نیچا تو نہیں کیا جا سکتا۔" ان کا تعقل کمال کا تھا۔

جویا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "اتنی سی بات؟"

"زویا کی پڑھائی اتنی سی بات ہے امی؟ گھر میں کیا کیا فضول خرچیاں ہو چکی ہیں جن کا کچھ حاصل بھی نہیں تھا۔ زویا کی پڑھائی پر اس کا پورا کیریر منحصر ہے، کتنی سخت پڑھائی ہے میڈیکل کی اور وہ کتنے مشکل حالات میں پڑھ رہی ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کیا؟"

بہت عرصے بعد وہ اس طرح جھنجلائی۔ شاکرہ امی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے لیکچر دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب پتا ہے مجھے لیکن گل کے ہاں کے فنکشن کو تو نمٹانا ہے۔ چاہے قرضہ لو یا بھیک۔"

"آپ پانچ سو روپے دے دیں ان کے ہاں۔ فی الحال یہ بھی بہت ہیں اور آپا گل کو اس سے زیادہ توقع بھی نہیں کرنا چاہیے۔" اس نے اپنے طور پر مناسب ترین حل گوش گزار کیا مگر انہوں نے شدت سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"میں کر لوں گی خود کچھ نہ کچھ۔۔۔ تمہیں اپنے پیسے بہن پر خرچ کرتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہے تو بے شک بچا کر رکھو اپنے پاس۔۔۔ یہاں کسی کو ضرورت نہیں ہے۔"

بے رخی سے اپنی بات کہہ کر شاکرہ امی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

یہاں رشتوں میں توازن کا بڑا ہی دل دکھانا فقدان تھا۔ جویا نے دل پر بھاری بوجھ سا پڑتا ہوا محسوس کیا تھا مگر آج وہ بجائے انہیں منانے کے خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

"کیا ہوا؟" زویا نے اس کی اتری ہوئی شکل دیکھ کر فوراً ہی پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ یوں ہی الماری میں منہ دیے کھڑی رہی۔

"کسی نے کچھ کہا کیا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر یہ یکایک کپڑوں میں ایسی کیا دلچسپی پیدا ہوئی ہے جو تم وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی ہو۔" وہ کچھ اتنے بے تکے پن سے بولی کہ جویا بے ساختہ ہی ہنس پڑی۔

"اب صبح اسکول بھی شروع ہو رہا ہے۔ کپڑوں کی زیادہ ضرورت پڑنے لگے گی۔ بس وہی دیکھ رہی تھی۔" نرمی سے کہتی ہوئی وہ الماری بند کر کے ہٹ آئی۔

زویا کو ہر بات بتانی ضروری نہیں تھی اور خود اس کا اپنا خیال تھا کہ تکلیف دہ باتوں کو دہراتے رہنے سے صرف انسان کی تکلیف اور بڑھتی ہے اور حوصلہ ختم ہوتا ہے۔ یہاں گھر میں سب سے با حوصلہ ایک زویا ہی تھی سو کم از کم اسے تو بچا کر رکھنا ہی تھا۔

"ساری ذمہ داری تم ہی اٹھاؤ گی؟ یہ لوگ آخر کچھ کرتے کیوں نہیں؟ سلمان بھائی نے کیا سوچا ہے کوئی پوچھتا نہیں ہے ان سے۔ آدھا وقت سونا اور باقی آدھا وقت کھانے اور لڑنے میں ضائع ہوتا ہے۔ مرد ہیں باہر نکلیں۔ زوبیہ نے تو لگتا ہے کہ اب علیحدگی کی ٹھان لی ہے ان سے اور وہ آپا گل لاکھوں کا سامان ہضم کر گئیں۔ ایک روپیہ تک دینا گوارا نہیں کیا۔ یہ ہمارے بہن بھائی ہیں سگے۔ شرم آتی ہے مجھے تو۔" زویا کی آواز اونچی ہوتی چلی گئی۔

جویا نے ایک تھکی تھکی سی سانس لی۔

وہ کیوں بار بار بھولتی تھی کہ گھر میں سب سے زیادہ با حوصلہ ہونے کے ساتھ زویا سب سے زیادہ باخبر اور انصاف کی بات کرنے والی بھی ہے۔

اگلے چند دن بوجھل سے انداز میں آگے پیچھے گزرے سو ہی ایک سے بے زاری بھرے دن رات۔

شاکرہ امی کی ناراضی شاید جاری رہتی لیکن آپا گل کے ہاں سے خود ہی سالگرہ ملتوی ہونے کی اطلاع آ گئی۔ ان کے ساس سسر نے اس بے وقت سالگرہ کے پروگرام کا سخت برا مانا تھا سو پروگرام مختصر ہو کر قرآن خوانی اور میلاد

تک ہی محدود ہو گیا تھا۔
کچھ بھی تھا جویا اور زویا دونوں ہی نے سکھ کا سانس لیا تھا اور شاید شاکرہ امی نے بھی۔
بڑے عرصے بعد وہ لوگ آپا گل کے گھر آئی تھیں۔
ٹیکسی سے اترتے ہوئے باہر ہی سے آپا گل کے اوپر کی منزل پر بنے نئے پورشن کی شان و شوکت کو ان لوگوں نے بخوبی محسوس کیا تھا۔
"ماشاء اللہ!" شاکرہ امی کی آواز مارے خوشی کے بھیگنے لگی تھی۔ زویا کے ساتھ قدم اٹھاتے وہ گیٹ کی طرف جاتے ہوئے مہمانوں میں ہی شامل ہو گئی تھیں۔ جویا کو چند منٹ رکنا پڑا۔
ٹیکسی ڈرائیور کے پاس کھلے پیسے نہیں تھے، سو وہ آگے تھوڑی دور کھڑی دوسری ٹیکسی سے چینج لینے جا چکا تھا۔
جویا یوں ہی آتے جاتے ہوئے مہمانوں کو دیکھنے لگی۔ شناسا شکلیں کم تھیں۔
آپا گل کی سسرالی رشتے دار اور دیگر مہمان خواتین بڑی تعداد میں تھیں۔ لگتا تھا کہ ان کا حلقہ احباب اب کافی بڑھ چکا تھا۔
وہ یوں ہی چند لمحے دیکھے گئی اور پھر شاید ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھنے کے لیے مڑی تھی کہ جیسے سارا منظر ہی بدلا تھا۔
محض چند قدم کے فاصلے پر معاذ کھڑا تھا۔
خواب تھا یا گمان، مگر چند لمحوں کے لیے تو اس پر ہنگام سڑک پر موجود ہر شے ہی گویا کسی سحر میں گرفتار ہوئی تھی۔
ساکت اور خاموش... کوئی آہٹ تک نہیں۔
جویا نے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنی تھی۔
وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا، اور شاید پلک بھی نہیں جھپکی تھی، مکمل دھیان۔
اور بیچ میں آیا، تلخ ترین دور، مکمل طور پر گم۔
"کیسی ہو جویا؟" وہ دو قدم اور آگے آیا تو جویا کو نگاہ جھکانا پڑی۔
"ٹھیک ہوں۔"
"لگ بھی رہی ہو۔" وہ طنزیہ انداز میں اس کے زرد چہرے اور کمزور وجود کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔
وہ جواباً خاموش رہی۔
"تم نہیں پوچھو گی میں کیسا ہوں۔"
"ٹھیک ہیں ماشاء اللہ!" جویا نے اس کے بے حد فریش محسوس ہوتے چہرے پر نگاہ جمائی۔
"تمہیں کیسے پتا کہ میں ٹھیک ہوں۔" وہ اس چھوٹی سی ملاقات کو محض ایک پل میں ختم کر دینے کے لیے آج بھی تیار نہیں تھا۔
"تم بھی لگ رہے ہو نا!"
وہ ہلکے سے مسکرائی تھی، اور تب ہی اچانک اسے خیال آیا تھا کہ وہ یہاں اس جگہ معاذ کے قریب کھڑے ہو کر کتنی خطرناک غلطی کر رہی ہے۔
سارا خاندان مدعو تھا، اور سب ہی کو ان دونوں کے اس ٹوٹے پھوٹے تعلق کی پوری کہانی کا علم تھا۔ سو کہیں سے بھی سرا پکڑا جا سکتا تھا۔
"وہ ٹیکسی والا پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے۔"
اس نے معاذ کو نظر انداز کرنے کی ناکام سی کوشش کرنا چاہی اور مڑنے لگی تھی کہ وہ تیزی سے سامنے آیا۔

"ڈر کیوں رہی ہو مجھ سے تم؟"
"غلط فہمی ہے تمہاری۔ میں کیوں ڈروں گی تم سے۔"
ان چند لمحات میں اس نے اپنا کھویا ہوا اعتماد بحال کیا تھا۔ لیکن معاذ کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ٹھہر پاتی تھی۔
"غلط فہمی غنیمت ہے جویا! کچھ تو ہے جو ہمارے بیچ رہ گیا ہے۔"
اس کی آواز بہت نیچی تھی، لیکن جویا نے اسے بہت واضح انداز میں کہتے سنا۔
اس بار وہ اس کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے اندر جاتے مہمانوں میں شامل ہو گئی تھی۔
معاذ کی نگاہوں نے اتنے ہجوم میں بھی اس کا پیچھا اس وقت تک کیا، جب تک وہ نظر آتی رہی۔
اندر اوپر کے پورشن میں بڑی چکا چوند تھی۔ آپا گل کی سمجھداری سے تخلیق کردہ۔
اور جویا کے سابقہ سسرال سے آئے ہوئے جہیز کے عالی شان سامان کی مرہون منت۔
لاؤنج کافی بڑا تھا اور یہیں قرآن خوانی منعقد کی گئی تھی۔ زویا نے دور سے ہی اس کے اترتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور صبر نہ کر سکی تو اٹھ کر قریب چلی آئی۔
"تمہیں کیا ہوا۔"
"مجھے کیا ہونا ہے۔"
"چہرہ بالکل سفید پڑ رہا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔" زویا نے بہت تشویش سے اسے دیکھا۔
"ہاں بس ایسے ہی گھبراہٹ ہونے لگی تھی، شاید اتنے لوگوں کی عادت نہیں رہی۔"
بڑی ہی عجیب سی وجہ تھی، مگر یہاں بحث کا موقع نہیں تھا۔ آپا گل کو آج اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ فالتو باتوں کی طرف توجہ دیں، لیکن پھر بھی وہ ان کے کپڑوں کا نوٹس لیے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔
"کہا بھی تھا کہ کوئی نیا سوٹ بنا لو، لیکن تم لوگوں کو ضد سی ہو جاتی ہے، کتنی بار پہنے ہوئے کپڑے ہیں تم دونوں کے۔"
گو ان کی آواز نیچی تھی، مگر زویا اور جویا دونوں کو بے حد برا لگا تھا۔
"اور ادھر امی کے پاس جا کر بیٹھو۔ یہاں سارے خاندان والے جمع ہیں، جویا کو دیکھ کر سب کو اس کی شادی کا ٹوٹ جانا یاد آ جائے گا، بے کار میں باتیں بنیں گی، اور پھر میری ساس نے شائستہ چچی کو بھی انوائٹ کر لیا ہے، وہ دیکھو وہ بیٹھیں۔"
دونوں نے ان کی انگلی کی سمت میں دیکھا، معاذ کی امی سر جھکا کے سپارہ پڑھ رہی تھیں۔ پتا نہیں انہوں نے دیکھا بھی تھا یا نہیں۔
جویا خاموشی سے اٹھ کر لاؤنج کے دوسرے سرے پر بیٹھی شاکرہ امی کے پاس آ بیٹھی۔
"یہ لو تم پورا کر دو!"
انہوں نے جویا کو دیکھتے ہی سپارہ اس کے ہاتھ دے دیا اور خود تفصیلاً جائزے میں مصروف ہو گئیں۔
فرنیچر بلاشبہ قیمتی اور خوب صورت تھا، ساتھ میں فریج، ٹی وی، دونوں فل سائز۔
کبھی یہ سب کچھ اتنا قابل رسائی تھا اور اب دیکھو تو پہنچ سے اتنا دور کہ تمنا کرنے کی بھی ہمت نہیں پڑتی۔" کتنی ہی ٹھنڈی سانسیں شاکرہ امی کے سینے میں گھٹتی رہیں۔
آج اس تقریب میں انہوں نے خود کو سب سے کم تر محسوس کیا تھا، خاندان کی وہ ساری عورتیں، جو کل تک انہیں اس طرح عقیدت سے گھیرے بیٹھی رہتی تھیں کہ جیسے وہ ان کی رعایا ہوں، آج سب ہی کھنچی کھنچی سی تھیں۔
بس یوں ہی سرسری سی سلام دعا کر کے خاصے فاصلے پر جا بیٹھی تھیں۔

ناظم آباد والی صفیہ خالہ' شادمان والے ماموں زبیر کی بیوی اور بہو' نارتھ سے آنے والا بھائی ابرار کا خاندان اور...

یہ وہ سب تھے جو بڑی باقاعدگی سے سالوں ان کے گھر آتے' ان کی خوش حالی کا قصیدہ پڑھتے' لوازمات سے بھرے دسترخوان سے لطف اندوز ہوتے اور اپنی راہ لگتے۔

جن کے ہاں کی شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں' وہ اتنا بڑھ چڑھ کر دیا کرتیں کہ مہینوں پورے خاندان میں واہ واہ ہوا کرتی اور تعلقات میں مزید مرعوبیت بڑھ جاتی۔ کیا حسین دور تھا اور کچھ ایسا ماضی بعید بھی نہیں تھا۔ ابھی چند ماہ' سال' سوا سال۔

وہ کسی معزول ملکہ کی طرح ایک کونے میں بیٹھی' نمک حرام درباریوں کی بے وفائی پر کڑھے گئیں۔ تب ہی صفیہ خالہ کو ان کا خیال آہی گیا۔

"کیا بنا اظہار کے کیس کا؟ اب تو سنا ہے ضمانت ہوگئی ہے' مگر کیس ختم تو نہیں ہوا نا!"

ان کے پاس مکمل معلومات تھیں' مگر تصدیق کروانے کا اپنا ہی مزا تھا۔

شاکرہ ای نے کھا جانے والی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"اور یہ جویا' ایسی زرد بے رونق کیوں ہو رہی ہے' بیمار وبمار تھی کیا' سنا ہے نوکری کرنے لگی ہے!"

"نوکری کیا خالہ' یوں ہی بس شوق ہوا ہے تو پورا کر رہی ہے۔" وہ بمشکل ہی مسکرائی تھیں۔

خاندان بھر کی جاب کرنے والی لڑکیوں پر کیے گئے ان کے اعتراضات کو کوئی نہیں بھولا تھا' سو اب باری بھی ان ہی کی تھی۔

"اب کیا شوق کہ لڑکی کی جان پر بن جائے' تم نے بھی تو حد ہی کر دی' اتنا اچھا لڑکا تھا معاذ' دیکھا بھالا' شریف خوش شکل' خوش مزاج اور پھر اسلام جیسے نیک آدمی کی اولاد' مگر تم لوگوں نے تو ذرا بھی قدر نہیں کی اس کی' اب دیکھ لو' کون ہے جو معاذ کو اپنی بیٹی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔" صفیہ خالہ نے دور بیٹھی شائستہ کی طرف اشارہ کیا' جن کے پاس آج عورتوں کا خاصا گروپ بیٹھا تھا۔

"چاہے آسمان سے اتر کر آیا ہو معاذ' ہمیں نہیں کرنا تھی سو نہیں کی' آپ کو کیا تکلیف ہے آخر؟" آس پاس مہمانوں کی موجودگی کا احساس شاکرہ بیگم کو دبی زبان میں بات کرنے پر مجبور کر رہا تھا' ورنہ تو وہ ان کی ایسی طبیعت صاف کرتیں کہ آئندہ بات کرنے سے پہلے سو بار سوچتیں۔

صفیہ خالہ بدمزہ ہو کر اٹھ گئیں۔

"شاکرہ کی زبان تو دو دھاری تلوار ہے' اس کے بڑے بول آگے آئے ہیں۔" انہوں نے دوبیں خاندان کی عورتوں کے بیچ اپنی حتمی رائے دی تھی' جس سے سب متفق بھی ہوئے تھے۔

کھانے کا مرحلہ اختتام پر تھا۔

جویا بہت پہلے کھانا ختم کر کے ٹیرس پر بچھی کرسیوں پر آکر بیٹھ چکی تھی۔ شائستہ اس طرف اتفاق سے ہی آئی تھیں۔

"السلام علیکم شائستہ چچی!" وہ سارا وقت ان کے سامنے جانے کی ہمت نہیں کر پائی تھی' لیکن اب جب وہ بالکل ہی سامنے آکھڑی ہوئیں تو سلام تو کرنا ہی تھا۔

"وعلیکم سلام!" ان کے لہجے میں سردمہری تھی اور نگاہوں میں غضب کی کاٹ۔

"ربیعہ کیسی ہے؟" جویا نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

"ٹھیک ہے' اللہ کا شکر ہے' ماسٹرز کر رہی ہے ہسٹری میں۔" انہوں نے ایک پرائیویٹ اور قدرے مہنگے ادارے کا حوالہ بھی دینا ضروری سمجھا تھا۔

"آپ نہیں!" وہ ان کی نگاہوں کا مقابلہ بہادری سے کر رہی تھی۔

"وہ نہیں بھلا اسے کہاں فرصت' پڑھائی میں مصروف ہے' ویسے بھی میرے بچے' خاندان میں آنے جانے کے عادی نہیں ہیں اور نہ ہی اپنا بے کار وقت ضائع کرتے ہیں۔"

"جی!" اس بار اس نے ہلکے سے صرف سر ہلایا تھا۔ ان کی چبھتی ہوئی نگاہوں کے سامنے کھڑے رہنا آسان نہیں تھا۔

"تم تو سنا ہے پڑھانے وڑھانے لگی ہو' اپنی پڑھائی چھوڑ دی؟"

وہی سوال' جس کا آج اس نے یہاں کتنی ہی بار جواب دیا تھا' ایک بار پھر۔

"جی!"

"کیوں؟" وہ کسوٹی کسوٹی کھیلنے کا مزہ لینے لگیں۔

جویا نے ایک گہری سانس لی۔

یہاں بیشتر لوگ آیا گل جیسے ہی ہوتے ہیں' بس درجات کا فرق ہوتا ہے' کچھ کم' کچھ زیادہ۔

اب یہ شائستہ چچی' ساری عمر حالات کی چکی میں سر جھکائے پستی رہیں' مگر وقت بدلا تو خود بھی کس تیزی سے بدل گئیں۔ وہ اب بھی اپنی جواب طلب نگاہ اس پر جمائے کھڑی تھیں۔ ٹیرس کے اس انتہائی کونے میں قدرے خاموشی تھی۔

"جاب کیوں کرتے ہیں شائستہ چچی! ضرورت کے لیے بھی اور مقصد کے لیے بھی' زندگی میں کام تو کرنا ہی ہے نا۔"

وہ اداس تھی' مگر پرسکون' شاید وہ اندر سے مضبوط ہوتی جا رہی تھی اور لوگوں کے سامنے کھڑا ہونا اب قدرے آسان تھا۔

"شادی بھی تمہاری عین وقت پر ختم ہوگئی' کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے منع کیا تھا' کچھ کہتے ہیں کہ لڑکے والوں کی طرف سے انکار ہوا تھا۔"

وہ اس کے منہ سے سننا چاہتی تھیں' لیکن اس کی بات پر یقین بھی کرنے والی نہیں تھیں۔

جویا کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔

"جس بات پر آپ کا دل مان رہا ہو' وہی سچ سمجھ لیجیے!"

پتا نہیں انہیں کیا برا لگا تھا۔

"اتنی دیر کر دی' اب تک کوئی لینے نہیں آیا' حالانکہ گھر میں گاڑی کھڑی ہے۔"

ٹیرس کی ریلنگ سے جھک کر نیچے دیکھتے ہوئے' خود سے مخاطب تھیں یا اس سے۔

جویا تھکے تھکے سے انداز میں واپس کرسی پر بیٹھ گئی۔ شائستہ چچی بے اعتنائی سے اس کے پاس سے گزرتی ہوئی چلی گئیں۔

"ان کا رویہ فطری طور پر ایسا ہی ہونا چاہیے تھا' سو دکھ کس بات کا۔" تکلیف کے ایک اور لمحے کو اس نے بہادری سے ٹالا۔ نیچے سے گاڑیوں اور لوگوں کا ملا جلا سا شور تھا اور اس سارے ہنگامے کے بیچ کہیں وہ بھی کھڑا تھا یقیناً۔

دل نے اپنی اس خستہ حالی کے باوجود ایک اور نگاہ کی شدت سے تمنا کی تھی اور وہ اس ڈھٹائی پر اتنی شرمندہ کہ خود سے بھی نگاہ ملانا دشوار۔

"دھت!" وہ جیسے خود سے بھی خفا ہو کر کرسی پر جم کر بیٹھی تب ہی زویا اس کے پاس چلی آئی۔

"کیا کہہ رہی تھیں شائستہ چچی تم سے۔ خاصی دیر بات کر کے گئی ہیں تم سے' میں دیکھ رہی تھی مگر جان بوجھ کر نہیں آئی سوچا کہ شاید کچھ غلط فہمیاں دور۔۔۔!"

"زویا! امی سے پوچھو اب ہمیں کتنی دیر ہے چلنے میں۔" مارے جھنجلاہٹ کے اس کی آواز تھوڑی بلند ہوئی تھی۔ زویا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"چل رہے ہیں' میں بلانے ہی تو آئی تھی۔"

"چلو پھر!" وہ بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

شاکرہ امی چادر اوڑھے سیڑھیوں کے پاس ایک کرسی پر بیٹھی تھیں۔

"چل رہے ہیں۔۔۔ وہ گل کچھ کھانا بھجوا دیتی اپنے ابا اور سلمان کے لیے تو۔۔۔"

ان کی آدھی ادھوری بات کوفت کا بڑا سامان بنی تھی۔

"اب کیا آپ آپا گل سے کھانا مانگیں گی' اگر انہیں بھیجنا ہوتا تو خود دے دیتیں' اب اٹھیں بس' اور گھر میں کھانا پکا ہوا ہے۔"

زویا نے دبے دبے لہجے میں انہیں سمجھانا چاہا تھا مگر وہ پھر بھی مصر رہیں۔

"بغیر کھانا لیے چلے گئے تو گل بھی برا مانے گی اور سلمان کا بھی دل خراب ہوگا۔"

"دوسری بات صحیح ہے صرف آپ کی!" زویا بڑبڑاتے ہوئے سامنے سے آتی آپا گل کی طرف متوجہ ہوئی۔

وہ مہمانوں کو خدا حافظ کہنے میں مصروف تھیں' بار بار سیڑھیوں تک آتیں اور جو اس قابل ہوتے' انہیں نیچے تک بھی چھوڑنے چلی جاتیں۔

اس وقت نیچے سے اوپر آ رہی تھیں۔

"آپا! ہم جا رہے ہیں' کسی سے ٹیکسی منگوا دیں۔"

"ارے تم لوگ اب تک ہو' میں تو سمجھی کہ جا چکے۔" وہ انہیں دیکھ کر واقعی چونکی تھیں۔

جویا اور زویا کو نگاہ ملانا بھی مشکل ہوا تھا۔

"اور اب ٹیکسی لینے کون جائے گا' گلی سے مڑ کر سڑک ہے وہاں تک چلی جائیں' فوراً ہی ٹیکسی مل جائے گی۔"

وہ اس بار شاکرہ امی سے مخاطب تھیں۔ "درست کریں' لڑکیاں ساتھ ہیں آپ کے۔"

شاکرہ امی کو اٹھنا پڑا۔

"تمہارے ابو اور سلمان کا کھانا۔۔۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے یہ سوچ کر یاد دلایا کہ شاید وہ بھول رہی ہیں۔

مگر وہ بھولی نہیں تھیں' صرف عجلت میں تھیں۔

"کل صبح لے کر آؤں گی' ابھی کون نکالے گا' پتا نہیں کیا چیز کتنی بچی ہے اور پھر ابھی اکبر کے سب رشتے دار بھی کھڑے ہیں۔ آپ کو دیا تو پھر سب کو ہی دینا پڑے گا۔" انہوں نے نیچی آواز میں اپنی سمجھداری کی ایک اور دلیل دی۔

اس بار جویا شاکرہ امی کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اترتی چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات بہت لمبی تھی اور بے خواب۔

صبح وہ سب سے پہلے اپنے کمرے سے باہر آیا۔

پچھلا برآمدہ' احاطہ سب ہی پر علی الصبح کی ہلکی نیلی روشنی پھیلی تھی۔ ہر شے خاموش۔

وہ چلتا ہوا پچھلے احاطے کی سیڑھیوں تک آیا' پھر وہاں سے اتر کر چمپا کے درختوں کے جھنڈ کی طرف مڑتی ہوئی ابا کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے آ بیٹھا۔ کھڑکی کے نیچے بنی یہ منڈیر اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ چمپا کے پھولوں کی دل فریب سی خوشبو اور تنہائی۔ اسی دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے زندگی کے چھوٹے بڑے خواب دیکھے' وہ بھی جو تعبیر پا گئے اور وہ جن کی راکھ آج بھی آنکھوں میں جلتی بجھتی تھی۔

اس نے اپنی آنکھوں پر داہنا ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دبایا تو احساس ہوا کہ کتنی جلن تھی۔

اگلے کئی لمحے اسی طرح ماحول سے بے گانہ ہو کر گزرے۔ بند آنکھوں میں ہوتی جلن کا سبب آنکھوں میں ہی قید تھا' وہ زرد پڑتا چہرہ اور اس کا پھیکا پن۔

یہ وہ جویا کہاں تھی' جس کا خیال آج بھی بھری مصروفیت میں بھی کبھی اس طرح چونکاتا تھا کہ وہ اگلے کئی دن کے لیے پھر سے گم صم ہوتا تھا۔

یہ تو کوئی اور ہی تھی' بے چین اور سہمی ہوئی۔

نہ وہ پہلا سا غرور بھرا اعتماد اور نہ ہی کسی کی بھی پرواہ نہ کرنے کا کھلا دعوا' حالانکہ خود کو چھپانے کی کوشش اب بھی کی تھی' جو چند بے ضرر باتیں وہ محض اپنے دل کی جلن کو مٹانے کے لیے کہہ گیا تھا' انہیں بھی کہنے پر گہری شرمندگی نے گھیرا تھا۔

اظہار چچا کے گھرانے کے ڈاؤن فال کی خبر اب پرانی ہو چکی تھی۔

سلمان کی زوبیہ سے علیحدگی' ابرار چچا کے غبن کا کیس' سب پر خاندان بھر میں سیر حاصل تبصرہ ہو کر بھی ختم ہو چکا تھا۔ مگر اس سارے عرصہ میں' خود جویا کہاں تھی' اس پر کیا گزری تھی' اس نے شدید خواہش کے باوجود بھی یہ جاننا نہیں چاہا تھا۔

بے حسی بھری لاتعلقی کا یہ دور خاصا طویل تھا اور اب جب کہ پوری طرح فرض کیا جا چکا تھا کہ اس کی طرف باقی ہر راہ معدوم ہو گئی ہے' تو وہ پھر سے اپنی موجودگی کا احساس دلانے آ کھڑی ہوئی۔

وہ بھی اس طرح کہ نہ غصہ' نہ نارسائی کا رنج۔

اس سے تو شاید بہتر ہوتا کہ وہ اسے اعجاز کے ساتھ ایک خوش و خرم زندگی گزارتے دیکھ لیتا تو اس تکلیف دہ احساس سے بچ جاتا کہ وہ اسے دنیا کے سرد و گرم میں اکیلا چھوڑے ہوئے ہے۔

اس نے اپنی انگلیوں پر نمی سی محسوس کی تو آنکھیں بے دردی سے رگڑ کر خشک کیں۔

"یہ لو چائے!"

سامنے ابا کھڑے تھے' ہاتھ میں بھاپ اڑاتا چائے کا کپ لیے۔

"ارے آپ مجھے کہتے' میں بنا لاتا۔" وہ شرمندہ ہوا۔

"اوں ہوں' کبھی کبھی مجھے بھی کچھ کرنے دیا کرو' تم سب لوگوں نے تو مل کر مجھے بالکل آرام طلب کر دیا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب بیٹھے۔ "ایک کپ تمہاری امی کو بھی بنا کر دیا ہے' بہت خوش ہوئیں۔"

"امی ماشاءاللہ بہت لکی ہیں کہ انہیں آپ ملے!"

"ہاں شاید' سوچنے کے انداز پر منحصر ہے' کیا خبر وہ خود کو خوش قسمت نہ سمجھتی ہوں۔ ویسے جس کی تم سے شادی ہوئی' اس کی خوش قسمتی میں تو واقعی کلام نہیں ہوگا۔"

اپنی بات کہہ کر وہ خود ہی خوشگوار انداز میں ہلکے سے ہنسے تھے مگر وہ یوں ہی خاموش سر جھکائے چائے کے کپ سے اڑتی ہوئی بھاپ پر نگاہ جمائے بیٹھا رہا۔

"کیا ہوا معاذ!"
ابا نے اس کی غیر معمولی خاموشی کا نوٹس لے ہی لیا۔ "بہت خاموش ہو، کوئی بات ہوئی ہے کیا!"
اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"طبیعت تو ٹھیک ہے، آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں، جاگے ہو یا روئے ہو۔"
ان کا تجربہ ہمیشہ کی طرح درست تھا، جسے وہ چاہتا بھی تو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔
"نیند نہیں آئی بھی رات میں، شاید اس لیے آپ کو ایسا لگ رہا ہے۔"
"کوئی خاص وجہ!" وہ اب بھی مطمئن نہیں تھے۔
"کبھی بھی نیند اڑ ہی جاتی ہے ابا! آپ پریشان نہ ہوں۔"
"تمہاری امی سے کہوں گا کہ اب وہ تمہاری شادی میں دیر نہ کریں۔ جلد ہی کوئی اچھی لڑکی دیکھ لیں، تاکہ تمہاری تنہائی کا ازالہ ہو سکے۔"
"میں شادی نہیں کروں گا ابا! آپ امی کو منع کر دیں پلیز۔" وہ بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"کیا!" وہ چونک سے گئے۔
کچھ عرصہ پہلے وہ اس سلسلے میں اپنی رضامندی دے چکا تھا اور گھر میں اس حوالے سے خاصے چرچے بھی تھے۔
سب کچھ بہت نارمل تھا۔
"کیوں نہیں کرو گے۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔
"تمہاری امی اس سلسلے میں تم سے بات کرنے کے بعد ہی تمہارے لیے رشتہ دیکھنے کے لیے گئی تھیں۔ سو اب ایسا کیا ہوا ہے۔"
"کچھ نہیں ہوا ہے، بس میں نہیں کروں گا اور ابھی امی نے کچھ طے وے تو کیا نہیں ہے، سو اس بات کو یہیں ختم کر دیں میں آپ سے بہت سیریسلی کہہ رہا ہوں۔" وہ بہت رنجیدہ تھا کم از کم ایک بات تو پکی تھی۔
ابا نے بہت غور سے اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھا۔ امی کچن کی کھڑکی میں سے ناشتے کے لیے بلا رہی تھیں۔
"آ رہے ہیں!" انہوں نے پکار کر کہا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔
"بہتر سمجھو تو مجھے وجہ ضرور بتانا، ابھی یا کچھ دن بعد، زندگی کے فیصلے اتنے اچانک کیے جائیں تو غلطی کا امکان نوے فیصد تو ضرور ہی ہوتا ہے۔"
وہ اس کے سامنے چلتے ہوئے اپنے دھیمے اور پر اثر انداز میں سمجھانے لگے۔
معاذ خاموشی سے سنتا گیا اور جب وہ خاموش ہوئے تو۔
"جو فیصلہ غلط تھا، وہ میں نے پہلے کیا تھا ابا! یعنی شادی کرنے کا۔ اب غلطی نہیں کر رہا، شادی خوشی کے لیے کی جاتی ہے، میں کسی اور لڑکی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا، یہ تو ظلم ہوتا دوسرے پر بھی۔"
وہ دونوں برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اندر آئے۔ اندر ناشتے کی میز پر ان دونوں کا ہی انتظار تھا۔
"تو جس کے ساتھ خوش رہ سکتے ہو، اس سے کر لو شادی، کوئی تو ہو گی نا، آخر پہلے بھی تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں تھا، جب اتنا عرصے جویا سے رشتہ طے رہا۔" اندر جانے سے پہلے ابا نے رک کر اس سے کہا۔
وہ کچھ جواب دیے بغیر تیزی سے اندر چلا آیا اور پیچھے متفکر سے ابا۔
"دیکھنے والی شکل تھی شاکرہ بھابھی کی، میں نے تو ایک بار بھی ان کی آواز نہیں سنی، بالکل چپ لگی ہوئی تھی، سارا وقت ایک کونے میں بیٹھی رہیں ورنہ خاندان کی ہر تقریب میں کیا کیا جملے نہیں کستی تھیں دوسروں پر، اب

جب خود پر پڑی ہے تو کیا منہ اترا ہوا تھا۔"
شائستہ بیگم کے لہجے میں بڑی انوکھی اور اطمینان بھری کھنک تھی۔
"میں نے تمہیں منع کیا تھا وہاں جانے سے، جب ہمارا اظہار کے خاندان سے تعلق ختم ہو چکا ہے تو کل کے ہاں جانے کی ضرورت کیا تھی۔" ابا کو اچھا نہیں لگا، سو وہ ٹوکے بغیر نہیں رہ سکے۔
"کیوں نہیں جاتی، مجھے کل نے نہیں بلایا تھا، اس کے ساس سسر نے انوائٹ کیا تھا مجھے اور وہ ہمارے عزیز ہیں۔"

شائستہ خود کو حق بجانب سمجھنے میں اب سو فیصد کامیاب تھیں اور اپنی رائے اور اس کے اظہار میں، وہ سو فیصد۔

"وقت بھی کسی کا نہیں رہا، جو انسان دوسروں پر حقارت سے ہنس سکتا ہے، اپنی باری آنے پر کسی رعایت کا مستحق نہیں ہوتا، شاکرہ اور اظہار بھائی انتہائی سنگ دل لوگ ہیں۔"
گرم پراٹھے لاتی ہوئی زری کا سارا دھیان اس گفتگو پر تھا، یہ سارے نام اب اس کے لیے مانوس تھے۔
دادی، ربیعہ اور امی تینوں کے درمیان یہ قصے بار بار دہرائے جا چکے تھے اور وہ اس ان دیکھی لڑکی جویا پر غصہ کھاتی یا پھر رشک کرتی۔
مگر آج کل اس کے لیے زبان بندی کا دور تھا۔
ورنہ معاذ نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اسے اس کی بھابھی سعیدہ کے حوالے کرنے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہیں لگائے گا۔
"اللہ سب پر رحم کرے، کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ اظہار کے گھر کو میری ہی آہ لگ گئی۔ بڑی تکلیف دی ہے انہوں نے مجھے، لیکن سچ کہتی ہوں کہ ایسا تو میں نے بھی نہیں چاہا تھا کہ وہ اتنے برے حال کو پہنچے۔"
دادی نے بڑی رقت سے کہا تھا۔
انہیں پچھلی محبتوں کا بڑا پاس تھا اور ان کی سخت زبان اور لہجے کے پیچھے بڑا ہی نایاب دل تھا۔ ابا نے بڑی محبت سے انہیں دیکھا۔
"خیر اماں! آپ اور آپ کے بیٹے تو دونوں جانی دشمن کو بھی معاف کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں، مگر میرا اتنا بڑا دل نہیں ہے اور سچی بات ہے کہ جو ہم نے سہا ہے تو پھر ہمیں بھی حق ہے۔"
عجیب بے تکے پن سے انہوں نے بات میں بات جوڑی اور آملیٹ کی پلیٹ معاذ کی طرف بڑھائی۔ "خالی پلیٹ کیوں لیے بیٹھے ہو، ناشتہ شروع کرو۔"
"جی!" اس نے آہستگی سے پلیٹ میں ایک بالکل چھوٹا سا ٹکڑا لیا۔
"بس؟" وہ کچھ حیرت سے بولیں۔
زری کی نگاہ بھی اسی طرف گئی، کی دل تو چاہا کہ ابھی لایا ہوا سب سے گرم پراٹھا کسی کی بھی پرواہ کیے بغیر لے جا کر معاذ کی پلیٹ میں رکھ دے، مگر انجام بخیر نہ ہوتا!
"فی الحال کافی ہے۔"
"جویا کیسی ہے امی؟ بہت دن ہو گئے اسے دیکھے ہوئے۔" ربیعہ دیر سے جو سوال پوچھنا چاہ رہی تھی، اس وقت بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔
"ہاں ملی تھی مجھے، کیا تھا سلام اس نے، ٹیرس پر الگ تھلگ بیٹھی تھی، اب دیکھو گی تو پہچان بھی نہیں سکو گی، تتی زرد کمزور، چپ لگی ہوئی ہے لڑکی کو۔ ظاہر ہے شادی ہوتے ہوتے ختم ہو گئی، گھر بار بک گیا، نوکری کر کے گھر کا

خرچا پورا کر رہی ہے' نانا کارہ باپ بھائی کو پالنے کے لیے سردی گرمی میں دھکے کھاتی پھر رہی ہے' اب تو گھر میں سائیکل بھی نہیں رہی ہے ان کے' بسیں ہیں مقدر میں یا پھر خود ہی جوتے چٹخاتی پھرتی ہوگی۔"

معاذ نے ایک جھٹکے سے کرسی پیچھے کی تھی۔ فرش پر کرسی کے زور سے کھینچے جانے پر بڑی ہی چبھتی ہوئی آواز گونج اٹھی تھی۔ سب ہی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

معاذ کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا اور نچلا لب اس طرح دانتوں تلے دبا تھا جیسے ضبط کی آخری حد کو چھو رہا ہو۔

"کیا ہوا' خیر تو ہے!"

شائستہ اس کی شکل دیکھ کر بری طرح گھبرائی تھیں۔ وہ شاید کچھ کہنا بھی چاہ رہا تھا مگر پھر ایک دم ہی مڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

"معاذ' معاذ!" امی آواز دیتے ہوئے اٹھنے لگی تھیں' مگر ابا نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں رکنے کے لیے کہا تھا۔

"بغیر ناشتہ کیے نکل جائے گا آفس کے لیے اور پھر سارا دن۔۔۔"

"تم۔۔۔ تم شائستہ۔" مارے جھنجلاہٹ کے ان سے بات پوری نہیں کی گئی۔

"ارے' بیوہ پر رحم نہیں کر سکتیں' تو اپنے بیٹے پر تو کرو' حالت دیکھی تھی اس کی' مگر تمہارے پاس تو وہی ایک موضوع۔۔۔"

ان کی آواز اونچی تھی اور لہجہ اتنا تلخ جو پہلے کبھی نہیں سنا گیا تھا۔

دادی اور ربیعہ نے بے ساختہ ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا' تو کیا وہ اب بھی جو ایسے۔۔۔

شائستہ بیگم نے بے حد کنفیوز ہو کر سوچا تھا۔

"نہیں' کبھی نہیں۔" انہوں نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔

زری کی نگاہ اس طرف جمی تھی' جہاں سے معاذ نکل کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام گہری ہو رہی تھی۔

سڑکوں پر مخصوص اوقات والا' بے بہا ٹریفک۔

یوسف کمال نے ایک اکتائی ہوئی نگاہ سامنے اور اطراف میں پھیلے ٹریفک پر ڈالی۔

وقت کا ضیاع روز کا معمول تھا۔

تب ہی ان کے سیل فون کی بیل ہوئی تھی۔

ڈیش بورڈ سے فون اٹھاتے ہوئے انہوں نے سالار کا نمبر دیکھا اور مسکرا دیے۔

"کہاں ہو بھئی' کتنے دن لگا دیے!"

"بس آرہا ہوں کمال صاحب! دو' تین دن اور' ساتھ میں ایک بڑا سرپرائز اور چند نئی کہانیاں۔۔۔"

انہوں نے اس کی آواز میں ایک نئی کھنک اور ایک ہلکی سی فکر ایک ساتھ محسوس کی۔

"خیریت تو ہے نا سالار! کوئی خاص بات!" وہ کچھ چونکے تھے۔

"خیریت تو ہے مگر کمال صاحب! ماضی کی تلخ حقیقتیں' اب کھل کر سامنے آرہی ہیں' مجھے آپ کی سخت ضرورت ہوگی۔" کچھ تھا جو اسے افسردہ کرنے لگا تھا۔

"تم فکر مت کرو سالار! میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں' تم مجھ پر ہمیشہ اعتماد کر سکتے ہو' کوئی بھی بات چاہے کتنی

ہی سنگین ہو۔"

دوسری طرف سالار چند لمحے کے لیے خاموش ہوا تھا۔ شاید وہ ان کی بات کی سچائی پر یقین دلا رہا تھا یا نہیں! کمال صاحب کو ایسا ہی لگا۔

"سالار' سالار ہیلو!" انہیں لگا جیسے لائن منقطع ہو گئی ہے' مگر وہ موجود تھا۔

"اور اگر اس بات کی زد' آپ کے کسی خونی رشتے پر پڑتی ہو تب کمال صاحب؟"

"تب بھی' مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ بہت تیزی سے بے ساختہ بولے۔ "مجھے بتاؤ کیا نبیل کے خلاف کوئی ثبوت ملا ہے' یا زرتاج کے۔"

"کوئی ثبوت نہیں ہے کمال صاحب! مگر سچائی خود منہ سے بولتی ہے' میں دو تین دن میں آرہا ہوں' پھر سکون سے بات کرتے ہیں۔"

"اچھا اور وہ تمہارا سرپرائز!" انہیں اس کی دوسری بات یاد آئی تو سالار ہلکے سے ہنس پڑا۔

"وہ بھی ساتھ ہی ہوگا' فکر مت کریں۔"

"چلو ٹھیک ہے' پھر جلد ملاقات ہوتی ہے ان شاء اللہ!" انہوں نے فون بند کر کے ڈیش بورڈ پر ڈالا۔

سامنے گاڑیوں کی لائن آہستہ آہستہ چلنا شروع ہوئی تھی' تب ہی اچانک وہ ان کے سامنے آیا۔

یوسف کمال کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر زندگی میں پہلی بار کپکپائے تھے۔

وہی رنگت' وہی خدوخال' وہی سنہری آنکھیں۔

اتنا مانوس چہرہ' جو ایک عمر گزرنے کے بعد بھی یاد ہو' ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

ان کی نگاہ اسی ایک پر جمی۔

کون تھا یہ؟ اتنی مشابہت۔

گاڑی کا شیشہ انہوں نے بے قراری سے نیچے کیا۔

"اے' اے لڑکے!" وہ اسے اونچی آواز میں پکارے تھے مگر پیچھے سے گاڑیوں کے ہارن اس تواتر سے بجے تھے کہ ان کی آواز دب کر رہ گئی۔ وہ بے بسی سے اسے اپنا خوانچہ گلے میں ڈالے سڑک کے دوسری طرف جاتا دیکھتے رہے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فرحانہ ناز ملک

سپنے سچ

عمران! اپنی ہی سوچوں کے جال میں الجھا میں قدرے چونک کر امی کی جانب متوجہ ہوا۔ جو مجھے کچھ خفا خفا سی نظر آئیں۔

"کدھر گم ہو؟ صبح سے ناشتہ کر رہا۔" وہ ناشتے سے میری بے توجہی محسوس کر چکی تھیں۔ تب ہی ٹوکنے لگیں۔

اب میں ان کو اپنے گم ہونے کی وجہ بتا دیتا تو انہوں نے زمین آسمان ہلا دینا تھے اور میں فی الحال ان ہلے ہوئے زمین آسمان کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

"دل نہیں کر رہا۔" امی جاتے جاتے پلٹ آئیں۔ ہاتھ میں پکڑے برتن ٹیبل پر پٹخے اور خاصے جارحانہ تیوروں سے دیکھنے لگیں۔

"اچھا......!" کمر پہ ہاتھ رکھ کر وہ مکمل فارم میں آگئیں۔ "تمہارے دل کو کیوں اکڑ سوجھ گئی؟ کس ضد میں آکر ناشتے سے بیر باندھ رہا ہے؟"

مجھے واضح محسوس ہوا میرے چہرے پر نیلے کالے سائے سے لہرانے لگے ہوں گے۔ کیا تاک کر اندازہ لگایا تھا امی نے...... واقعی ایک ضد ہی تو تھی، جس پہ اڑنا میرے دل کی مجبوری تھی اور جس سے نظریں چرانا میری......"

"ہاں...... بتاؤ نا؟" کسی تفتیشی افسر کی طرح وہ میرے سر پہ آکھڑی ہوئیں۔ جو کام کرنے جا رہی تھیں وہ سرے سے بھول گئیں۔

"بس...... ایسے ہی امی!" مجھے اتنے کم وقت میں جنگی بنیادوں پر کیا بہانہ سوجھ سکتا تھا بھلا!

"ماں بھی......" امی بالکل تھکی ہاری سی کرسی پر یوں بیٹھیں جیسے سارے محاذوں پر ہتھیار پھینکے پڑے ہوں۔ "تم کہاں پیچھے رہو گے باپ اور بہن سے۔"

اس جملے سے واضح بھی ہو گیا شوہر اور بیٹی سے شکست خوردہ ہوئی بیٹھی ہیں۔ "انہوں نے کیا کم جی جلایا ہے...... تم بھی جلالو۔"

میں نے بوکھلا کر انہیں دیکھا۔ ایسی نہ ویسی کوئی بھی تو بات نہیں کی تھی میں نے۔ مگر لگ رہا تھا کسی اور کا نزلہ مجھ پر گرنے والا ہے۔ سو اس وقت کھسکنے میں ہی عافیت تھی۔

"تمہارے والد محترم سے کہا کہ اطمینان سے بیٹھ کر میری بات سن لیں۔" اب نہ جانے وہ کون سا قصہ چھیڑنے لگی تھیں۔ میں بے چارگی سے انہیں دیکھنے لگا۔ "مگر انہیں میں اب کھٹکنے لگی ہوں...... اس بڑھاپے میں آکر۔"

یہ والد محترم پر سراسر الزام تھا۔ لیکن کہہ کر میں نے اپنی شامت تھوڑی بلوانی تھی۔ سو چپ چاپ ان کی سننے پر آمادہ ہوا۔

"مجال ہے آدھا گھنٹہ بھی میری سن لیں...... حالانکہ میں کون سا محلے والوں کے جھگڑے سنانے لگی تھی۔ یہی کہنا چاہ رہی تھی کہ تانیہ کے سسرال والے تاریخ مانگ رہے ہیں۔ بلکہ آج شام میں افروز بھابی آ بھی رہی ہیں اسی سلسلے میں بات کرنے......"

"پھر......" میں ناچار دلچسپی لینے پر مجبور ہوا۔ واقعی معاملہ اہم تھا۔ ابو نے نہ جانے کیوں دلچسپی نہیں لی۔ امی کی ناراضی بجا محسوس کی۔

"پھر کیا۔ میں نے ابھی افروز بھابی کا نام ہی لیا تھا کہ تمہارے والد ماجد اٹھ بیٹھے۔" غصے میں امی کی زبان مزید باادب ہو جایا کرتی تھی۔

"حالانکہ افروز بھابی کا نام اتنا برا بھی نہیں۔" بہت منتشر سوچوں میں سے ایک اس سوچ نے بھی میرے دماغ کی کھڑکی سے جھانکا۔

"تو بھلا بتاؤ...... کب تک ٹالوں میں ان کو......؟ دو سال تو ہو گئے منگنی کو۔"

"میرا خیال ہے۔ تانیہ کا ماسٹرز۔" میں نے کہنا چاہا۔

"بھاڑ میں جائے تانیہ کا ماسٹرز۔" میری بات پوری ہونے سے پہلے وہ بھڑک اٹھیں۔

"ماسٹرز نہ ہوا...... امریکہ کی صدارت ہو گئی۔" عموماً امی کی یہ مثالیں مجھے محظوظ کرتی تھیں۔ مگر اس وقت طبع نازک کچھ ایسی بوجھل ہو رہی تھی کہ مسکرایا ہی نہ گیا۔

"جب یہ طے ہے کہ نوکری نہ یہاں کرنی ہے نہ

وہاں پھر یہاں پورا کرنے کی ضد کیوں؟"
"تو تم سے کس نے کہا میری بچی ڈگری کے لیے ڈگری لے رہی ہے۔"

امی کے ارشادات بنا روک ٹوک گھر کے ہر کمرے میں پہنچ رہے تھے۔ تب ہی تو ابو نے دوبارہ سے ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ہاتھ میں کوئی کتاب پکڑ رکھی تھی۔ امی نے خاصی تیکھی نظروں سے پہلے انہیں پھر کتاب کو گھورا۔

"یہی کام آتا ہے بس..... کبھی اخبار کو عزت بخش رہے ہیں' کبھی کتابوں سے سیر ہو رہے ہیں۔ ہم انسانوں کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں۔" امی کو ابو کے مطالعے کی عادت سے چڑ تھی۔ بقول ان کے ابو کے بس میں نہیں تھا ورنہ نیند میں بھی کتاب پڑھتے۔

"نہیں خیر۔ نیند میں تو میں خواب دیکھتا ہوں ۔" ابو مسکرا کر تصحیح کرتے۔

"اور خواب میں آپ سے قرۃ العین حیدر' عصمت چغتائی اور خدیجہ مستور ملنے آتی ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" ابو جلال میں آجاتے۔ "غصہ کرنے کی اتنی عادت ہو گئی ہے تمہیں کہ اب مذاق بھی کرو تو گولی کی طرح لگتا ہے۔"

اس وقت بھی ابو کسی سیاسی کتاب کو عزت بخشے ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے؟ آج دوپہر کے کھانے تک ناشتہ چلنا ہے کیا؟" ساڑھے نو تو ہو چکے تھے اور ہم ابھی تک ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے۔ شاید تب ہی ابو نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"اور عمران ۔ تم آفس نہیں جا رہے آج ۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" ابو کو میری موجودگی کا احساس ہوا تو پوچھنے لگے۔

میری طبیعت تو ٹھیک ہی تھی۔ ہاں جس مشن امپاسبل کی خاطر آج میں نے چھٹی کی تھی۔ وہ تمام تو ان کے جوابی ردعمل سے طبیعت خراب ضرور ہو جانا تھی۔

"جی۔ وہ۔ بس۔" میں آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

"اور تم نے میری بیٹی کو بھی یونیورسٹی نہیں جانے دیا؟" مجھے ابو اسٹڈی روم کو پیارے ہو جاتے تھے لیکن خبر گھر بھر کی رکھتے تھے۔

"ہاں تو۔" امی نے لاپروا نظر آنے کی کوشش کی۔ "افروز بھابھی کے ہمراہ ان کی دونوں بیٹیاں اور سو بھی ساتھ ہوں گی۔ غفار بھائی بھی آئیں گے۔ میں کہاں سارا انتظام کر پاؤں گی؟"

"تو تم نے طے کر ہی لیا ہے میری بچی کا مستقبل تباہ کرنے کا۔" ابو جو کام کر سکتے تھے' وہی کیا۔ یعنی ایک ٹھنڈی آہ بھرنے کا۔ ویسے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی اندر سے راضی ہیں۔ بس ثانیہ کی وجہ سے مخالفت کر رہے تھے۔

"مستقبل تباہ کیوں کروں گی؟" امی کو برا محسوس ہوا۔ "بیٹی کی شادی کا سوچ رہی ہوں..... مستقبل سنوارنے کا سوچ رہی ہوں۔ ایم اے وہ بعد میں کرتی رہے گی۔"

یہ لاحاصل بحث تھی۔ مجھے اکتاہٹ نے آلیا۔ دونوں بڑوں کو صاف میدان فراہم کرتے ہوئے میں اٹھ کر ڈائننگ ہال سے لاؤنج میں آگیا۔

وہاں ثانیہ پہلے سے موجود تھی۔ بے حد پھولے ہوئے منہ اور سوں سوں کرتی ناک کے ساتھ۔ لال آنکھوں سے صاف عیاں تھا کہ وہ روئی ہے۔ ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر مجھے دیکھنے کے بعد وہ پھر سے ٹی وی دیکھنے لگی تھی۔

میرے قدم اسے دیکھ کر قدرے سست پڑے کچھ کہنے کے لیے' دلاسا دینے کے لیے۔ ہمت بھی کی مگر پھر ارادہ بدل ڈالا اس وقت اسے چھیڑنا قطعی مناسب نہیں تھا۔ وہ رونا شروع ہو جاتی اور میری جان پر بن آتی۔ سو اس کے خفا خفا سے چہرے سے نظریں ہٹاتا میں سیڑھیاں چڑھ کے اپنے کمرے میں آگیا۔

موبائل میں کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ فوراً اس کی جانب لپکا حسب توقع روشانہ کی مسڈ کالز آئی ہوئی تھیں۔ بیس سے زیادہ۔ مجھے شدت سے افسوس ہوا۔ یقیناً" فضا سازگار دیکھ کر ہی اس نے مجھے کال کرنے کی کوشش کی ہو گی اور نہ جانے کیا کہتا چاہ رہی ہو گی؟ سب کچھ تو میں نے اسے سمجھا دیا تھا۔

میں نے دوبارہ سے اسے کال بیک کیا۔ مگر اب اس نے سیل آف کر رکھا تھا یہ احتیاط بھی میری سکھائی ہوئی تھی۔ مجھے خود پر تاؤ آنے لگا۔

"کیا تھا اگر ناشتے کی میز پر موبائل ساتھ لے جاتا کم از کم کال کا تو پتا چل جاتا۔" میں ماتھا سہلاتے ہوئے یہاں سے وہاں ٹہلنے لگا۔

کئی کام تھے جو آج کے آج سرانجام دینے تھے۔ پی کار لے جانے کی غلطی میں نہیں کر سکتا تھا۔ سو پہلے مجھے زیدی سے کہہ کر کسی جیپ یا کار کا بندوبست کروانا تھا گو کہ وہ میرا شریک راز نہیں تھا۔ لیکن آج اسے ہمراز بنانا ہی پڑ رہا تھا۔ مشکل وقت میں ہمیشہ کام آتا تھا اور آج تو میری زندگی کا مشکل ترین کام آن پڑا تھا۔

مگر گھر میں ہونے والی اس غیر متوقع اچھل نے میرے سامنے ہلکی سی رکاوٹ کھڑی کر دی۔

"امی بھی کمال ہیں۔ ماموں' ممانی کو آج ہی بلانا تھا۔ ثانیہ کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی۔" زیرلب بڑبڑاہٹ کے بعد میں نے اپنی ہی زبان دانتوں تلے داب لی۔

"ثانیہ کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی ۔" اس جملے نے میرے اندر سنسناہٹ سی دوڑا دی۔ ایک لمحے کو تو میری روح کانپ کر رہ گئی۔

"میرے منہ میں خاک ۔ کیا بکواس سوچ بیٹھا میں۔" اگلے کئی پل میں خفت میں مبتلا رہا یہ الگ بات تھی کہ میرے اندر سے گھبراہٹ ختم ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

گیارہ بجے کے قریب میں نے زیدی کو فون کیا۔ اور میری توقع کے عین مطابق میرا مسئلہ سن کر وہ سکتے کی کیفیت میں آگیا۔

"زیدی ۔ یار کیا ہوا؟" گھبرا کر مجھے اسے مخاطب کرنا پڑا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے؟" وہ یقیناً" بے یقین ہو رہا تھا۔

"محبت میں دماغ ٹھیک کہاں رہ سکتا ہے۔" میں نے فلسفہ جھاڑا۔

"تو لعنت بھیجو ایسی محبت پہ ۔ جو ایب نارمل بنا دے۔"

"تم میری مدد کر رہے ہو یا نہیں؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ جواباً" اس نے گہری سانس لی۔

"تیرے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔" یہ سراسر ڈائیلاگ تھا۔

"مجھے جان کی نہیں' سواری کی ضرورت ہے۔ جیپ یا کار کچھ بھی۔" میں جھنجلایا۔

"سوچ لو ۔ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ تمہاری آنے والی نسلوں کی عزت کا سوال ہے۔ تمہاری امی ابو ۔"

"فار گاڈ سیک۔" میں نے اس کی اس آخری کوشش پر چیخ کر بند باندھا۔

"سب کچھ سوچ چکا ہوں میں ۔ مجھے مزید نصیحتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"معراج صاحب نیکی و شرافت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ ان کی بیٹی کیسے اس پچھڑ کی نکلی۔" اس نے روشانہ کے والد کا حوالہ دیا تھا۔ میں نے بھنا کر فون بند کر دیا۔

"شریف اور نیک لوگوں کی بیٹیوں کے لیے محبت حرام ہوتی ہے کیا؟" کمرے میں مسلسل چکر لگاتے ہوئے سوچنے لگا۔ "اور محبت پر کس کا اختیار؟ کسی کو بھی کبھی بھی کسی سے بھی ہو سکتی ہے ۔ اس میں روشانہ یا میرا کیا قصور؟" میں حتی الامکان خود کو پرسکون کرنے میں لگا رہا۔ موبائل میرا پھر سے گنگنا رہا تھا۔ زیدی کی کال تھی۔ میں نے ریسیو کر لی کہ میری مجبوری تھی۔

"کیا یاد کرے گا پیارے ۔ انتظام ہوا سمجھو۔" مجھے یقین تھا وہ میرا ساتھ دے کر رہے گا۔

"لیکن یہ گل کھلے کب سے؟ ہمیں کیوں نہ خبر ہوئی؟" اس کا اشارہ میری اور روشانہ کی محبت کی طرف تھا۔

"گل کہاں کھلے ہیں۔۔۔ گل تو اب کھلیں گے۔" میں نے اس سے زیادہ خود کو یقین دلانا چاہا۔ یہ مذاق کر کے کہ میں ہشاش بشاش ہوں۔ یہ اور بات تھی کہ مذاق بیہودہ ہی ثابت ہوا۔ زیدی نے ہنسنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ میرے اعصاب بھی بدستور کھنچے رہے۔

"گل کھلیں گے کہ نہیں۔۔۔ البتہ گولیاں ضرور گونجیں گی۔ دونوں طرف ہی عزت کو جان پر ترجیح دی جاتی ہے۔" زیدی نے یہ کہہ کر گویا میری بولتی بند کر دی۔

اعصاب میرے پہلے سے شل ہوئے تھے۔ یہ بات تو سو فیصد ماننے والی تھی کہ غیرت و عزت کے نام پر ہم ہی نہیں روشانہ کا خاندان بھی جان لینے اور دینے والوں میں سے تھا اور آج کی رات کے آخری پہر ہم دونوں ہی اپنے اپنے خاندانوں کی عزت و غیرت کا جنازہ نکالنے لگے تھے۔

"عمران!" موبائل میرے کان سے لگا تھا اور زیدی ہنوز لائن پر تھا جب امی نے دروازہ دھڑ دھڑا کر میرے ساکت وجود میں جنبش پیدا کی۔ میں نے جلدی جلدی زیدی کو اللہ حافظ کہہ کر دروازے کی جانب دوڑ لگائی۔

"چھٹی تم نے چلہ کاٹنے کے لیے لی ہے کیا؟" اندر آتے ہی بنا موقع کے انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"ٹائم نکلا جا رہا ہے کئی کام پڑے ہیں۔ مہمان بھی آنے والے ہیں اور تم مراقبے میں گم ہو۔۔۔ چلو نیچے۔" وہ یوں غصہ ہو رہی تھیں جیسے میں ان کا بیٹا نہیں بیٹی ہوں اور کچن میں ان کی مدد کے بجائے کمرے میں گھسی ہوئی ہوں۔

"میں نے کیا کرنا ہے؟" میں منمنایا۔ امی نے گھور کر دیکھا اور اسی گھور کر دیکھنے کا نتیجہ تھا کہ میں انہیں بے حال سا نظر آ ہی گیا۔

"کیا ہوا۔۔۔ تم اتنے پیلے کیوں ہو رہے ہو؟" اب کے ان کے لہجے میں تشویش غالب ہوئی۔ میرے لیے موقع تھا۔ میں نے شکل پر مزید افسردگی پھیلائی۔

"بس امی۔۔۔ پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔" آواز میں بھی نقاہت پیدا کر لی تھی۔ ان کے اکلوتے بیٹے کے لیے خالص الخالص ممتا بھرے جذبات اعتراض پر غالب آ گئے۔

"یہ تانیہ بھی ناں۔۔۔" توپ کا رخ اب دوسری طرف ہوا۔ "ہر کھانے میں مرچوں کی دکان انڈیل دیتی ہے۔ پیٹ تو کیا ہو گا ہی تم نے کوئی گولی وغیرہ کھائی؟"

"ہوں۔"

"بس تو پھر آرام کرو۔۔۔ کام کیا ہیں۔۔۔ ماجد سارا سامان لادے گا۔" انہوں نے کام والی کے بیٹے کا نام لیا۔ "جب تمہارے ماموں، ممانی آجائیں تب ذرا دیر کو ملنے آجانا۔ شاباش اب آرام کرو۔"

میرے ماتھے کا بوسہ لے کر مجھے تاکید کرتی وہ چلی گئیں تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ کچھ آسانی ہو گئی تھی اپنے اس فعل پر سوچنے کے لیے اور بہت سی باتوں کو عملی شکل دینے کے لیے۔

جوں جوں وقت سرک رہا تھا میری بے چینی اور گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ وہ جو ایک سکون یا خوشی ہونی چاہیے وہ چاہ کر بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔" میں نے جیسے خود کو یقین دلایا تھا۔

"اور میں غلط تو نہیں کر رہا۔۔۔ نہ ہی زبردستی کر رہا ہوں۔ مجھ سے زیادہ روشانہ یہ سب کرنے پر بضد ہے اور اللہ گواہ ہے۔۔۔ میں مجبور بھی روشانہ کی ضد پر ہی ہوا ہوں۔"

"مگر اس کو صلاح تو تم نے دی تھی۔" میرے اندر کہیں سے آواز آئی تو میں نے بالوں میں انگلیاں چلانا شروع کر دیں۔

"صرف صلاح ہی دی تھی۔۔۔ اصرار تو نہیں کیا تھا۔" میرے پاس خود کو مطمئن کرنے کے لیے یہ جواب بھی موجود تھا۔

"جو بھی ہے۔۔۔ تمہارے دل میں کھوٹ تو تھا۔" میرے اضطراب میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہونے لگا۔

نیچے کی چہل پہل سے اندازہ ہوا ماموں، ممانی آ چکے ہوں گے۔ میں دلگرفتہ سا صوفے پر ڈھے گیا۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کچھ بھی۔۔۔ حتیٰ کہ اگلی صبح تک روشانہ کا صرف میرا ہو جانا بھی میرے دل میں بہار لانے کا سبب نہیں بن رہا تھا۔ اسی اضطراب کے بیچ ڈولتے میں نے پل پل گنتی آوھا منٹ اور گنوا دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے پاس صرف آج کی رات تک کا ٹائم ہے میں لایعنی پریشانیوں و سوچوں میں گھرا سست سا پڑا رہا اور یہی سستی شاید مجھے پوری طرح شل ہی کر ڈالتی اگر روشانہ کا ایس ایم ایس نہ آجاتا۔

"کال کی۔" اس کا یہ دو لفظی جملہ میرے اندر پھریری سی بھر گیا۔ بنا کسی تاخیر کے میں نے اسے کال کی۔

"صبح کہاں تھے تم؟" چھوٹتے ہی اس نے وہ کہا جس کی مجھے امید تھی۔ چھوٹی سے چھوٹی بات کو پکڑ کر باز پرس کرنا اور اسی بہانے میری کھال ادھیڑ کر رکھ دینا اس کی عادتوں میں سب سے نمایاں عادت تھی۔ ابھی بھی میں غیر ارادی طور پہ جھنجلا گیا۔

"خیریت تو ہے ناں۔۔۔ کال کرنے کا کیوں کہا؟ جبکہ میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ آج کی رات تک نہ کال کرو گی نہ مجھے کرنے کا کہو گی۔ کوئی بھی مشکل کھڑی ہو سکتی ہے۔ صبر کر لو یہ چند گھڑیاں۔۔۔"

اس کے سوال کو قطعی نظر انداز کر کے میں نے اپنی کہی۔

"کیا کروں۔۔۔ صبر ہی تو نہیں ہے مجھ میں۔" میں نے بے ساختہ ٹھنڈی آہ کھینچی۔۔۔ بے صبری ہونا اس کی ایک اور خوبی تھی۔

"جانتا ہوں۔" میں بدستور سنجیدہ رہا۔ "لیکن یہ گھنٹے بہت خطرناک اور نازک ہیں۔ تمہیں اپنی اور میری پوزیشن ذہن میں رکھ کے برداشت کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔۔۔ اور۔" میں نے کچھ توقف کے بعد احتیاطاً پوچھا۔ "سب ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔" اس کی ٹون واضح بدلی تھی۔ لہجے کی سوچ کو کر ختگی میں بدلنے بہانہ درکار تھا۔ وہ میری نصیحت نے فراہم کر دیا۔ "ماسوائے تمہارے، میں اسے کچھ ہی عرصے میں اتنا جان چکا تھا کہ مجھے پکی امید تھی کہ وہ یہی کہے گی جو اس نے کہا۔

"کیا ہو سکتا ہے اب۔۔۔" میں نے شانے اچکائے۔ "اس غلط بندے کو بھی تم نے خود ہی پسند کیا ہے۔" اور یہ واقعی حقیقت تھی۔ مجھے رجھانے اور اپنی جانب ملتفت کرنے میں روشانہ نے ہر پاپڑ بیلا تھا۔ تب ہی تو آج میں اس مقام تک آگیا تھا۔

"یہ طعنہ بھی مجھے ساری زندگی سننے کو ملے گا۔" وہ حسب عادت جل بھن رہی تھی۔ میں نے ایک اور ٹھنڈی آہ کھینچی۔

"کال کرنے کو کیوں کہا؟" میرا جوش ٹھنڈا پڑنے لگا۔

"دماغ خراب ہو رہا تھا اس لیے۔۔۔ یہ نہیں پتا تھا کہ تم سے بات کر کے اور زیادہ خراب ہو جائے گا۔" اس نے سیل آف کر دیا۔

میں بے بسی کا شاہکار بنا اپنے موبائل کو گھورتا رہا۔ کیسی عجیب محبت تھی ہماری جس پر میں اپنی قیمتی متاع قربان کرنے چلا تھا۔ ماں باپ کی عزت، روایات، اپنے ساتھ جڑے ڈھیروں تعلق۔۔۔ اور ان کی چاہتیں۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر اپنی انا۔۔۔ مردانہ وقار۔ سیل کی بجتی اپ نے ایک بار پھر میرے اعصابی سکتے کو توڑا۔ زیدی کا نام جگمگا رہا تھا۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر میں نے آن کا بٹن دبا دیا۔

"مورال کیسا ہے جوان؟" زیدی کی شوخ آواز میری سماعت کے آر پار ہوئی۔ ایک اور غیر ارادی ٹھنڈی آہ میرے حلق سے برآمد ہو کر زیدی کے دل تک جا پہنچی۔

"یار۔۔۔" وہ فوراً متجسس ہوا۔

"فتح والا دم خم نہیں تجھ میں۔"

"بکومت۔" میں نے آہستگی سے جھڑکا۔

"قسم سے۔۔۔ تو رویا رویا لگ رہا ہے۔" وہ بضد

ہوا۔

"منہ بند کر۔" مجھے جھنجلاہٹ نے آگھیرا۔

"کہاں وہ صبح والی اکڑ اور چستی ۔۔۔ اور کہاں اب ایک دم سے ٹھنڈی یخ سانسیں ابھی سے تھک گیا تو؟"

وہ استفسار کر رہا تھا میں چپ رہا۔

عجیب بات تھی۔ روشانہ کی کال کے بعد اچانک ہی دل پر دھند سی طاری ہو گئی تھی۔ ایک گھاٹے کا احساس تھا جو وجود سے لپٹتا چلا جا رہا تھا۔

"بات سن۔" زیدی میری چپ سے سارے مطالب اخذ کر کے کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

"پوری زندگی کا سوال ہے تجھ جیسا بندہ جسے انا اور وقار ہر شے سے زیادہ پیاری ہو وہ بعد کی زندگی بے وقعت ہو کر کیسے گزارے گا؟"

میں ہونٹ بھینچے سنتا رہا۔

"اور اپنا نہیں اپنے سے متعلق لوگوں کا سوچ ۔۔۔ ماں باپ کا سوچ تانیہ کا سوچ۔" وہ میرے سامنے سوچ کے نئے در کھول رہا تھا۔ میں دم سادھے بیٹھا رہا۔

"کتنے ارمان ہوں گے تانیہ کے دل میں تیرے متعلق اس کے سامنے بھائیوں کی قطار تو نہیں لگی ہوئی لو رپھر بالفرض لگی بھی ہوئی ہوتی تو بھی ہر کسی کی اپنی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔"

زیدی جیسا گھونچو اتنی دانش مندانہ گفتگو بھی کر سکتا ہے؟ مجھے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"تانیہ کو صرف ایک پل کے لیے روشانہ کی جگہ رکھ کر سوچو۔" اس نے گویا میری شہ رگ پکڑ لی تھی۔

"زیدی!" میں بری طرح سے بھڑکا۔

"غصہ مت کرو۔ ٹھنڈے دل سے غور کرو۔" وہ ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ "سوچو ذرا تانیہ کا آج کل میں رشتہ فائنل ہونے والا ہو ۔۔۔ ماں باپ دعاؤں کے خزانے لے کر اسے رخصت کرنے کو بے قرار ہوں اور وہاں باپ کی توقعات کو ملیامیٹ کر دی ۔۔۔"

"بس ۔۔۔" اتنی ہی برداشت تھی۔ میری میں نے پوری بات سنے بغیر سیل آف کر کے بیڈ پر پٹخا اور کنپٹیاں سہلانے لگا۔ زیدی نے جیسے میرے ارد گرد آئینے رکھ دیے تھے۔ جن میں میری بدنما شکل خود مجھے ڈرانے کا باعث بن رہی تھی۔

زیدی کا ہر ہر لفظ تازیانے کی مانند لگا تھا۔ صبح سے جو گھبراہٹ اور بے چینی میرے وجود سے لپٹی ہوئی تھی اس میں ایک دم سے اضافہ ہو گیا۔ میں بھول گیا کہ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے اور مجھے ابھی بلال کو بھی ہموار کرنا ہے۔ میرا ارادہ تھا اگلا ایک مہینہ اس کے فلیٹ میں رہائش رکھنے کا۔

"عمران بیٹا ۔۔۔ تھوڑی دیر کو نیچے آجاؤ۔" امی کی محبت بھری آواز نے میرے حواس پھر سے جگائے اور مجھے یاد آیا کہ ماموں مع فیملی تانیہ کی شادی کی تاریخ طے کرنے آچکے ہیں۔ میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر چہرے پر دو تین بار ہاتھ پھیرا گویا ۔۔۔ مضطرب کیفیت صاف کی۔ بالوں میں برش پھیرنے کے بعد کمرے سے باہر چلا آیا۔ وہ سب لوگ لاؤنج میں ہی جمع تھے ۔۔۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے خود کو مزید سنبھالا چہرے پر مسکراہٹ طاری کی۔

"عمران تو تو عید کا چاند ہو گیا۔" مجھے دیکھتے ہی فرہاد چلایا۔

"پیٹ کیسا ہے؟ کیا الا بلا کھا لیا تھا؟" ممانی کے سامنے سر جھکایا تو انہوں نے یہ کہہ کر شرمندہ ہی کر دیا۔ قریب ہی تو وہ بیٹھی تھی۔ جس نے ہنسی روکنے کا تردد بھی نہیں کیا تھا۔

"امی بھی ۔۔۔" میں جلتا بھنتا فرہاد کے پہلو میں جا بیٹھا۔ "ڈھنڈورا پیٹ ڈالتی ہیں۔" یوں ہی سرسری سی نظر جملہ حاضرین پر سے ہوتی ہوئی اس پر بھی جا ٹکی تو اس نے بھرپور شوخی و شرارت سے اپنی آنکھیں بھنوؤں سمیت نچا ڈالیں۔ میں سٹپٹا سا گیا۔

"گھر میں نئی کوئی بات ہو اس کو بو پہلے پہنچ جاتی ہے۔" میں نے اس کی موجودگی سے کافی بدمزگی محسوس کی بلا کی طرح ہر وقت پیچھے پڑی رہتی تھی۔

"میں اب کھانا لگانے لگی ہوں۔ سب آجائیں۔" سب کہتے ہوئے اس نے دیکھا صرف مجھے لو ردیکھتے ہوئے حسب عادت بھنویں نچائیں۔

میرے دل کا بوجھ مزید بڑھ گیا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے وہ تعلق بھی یاد آ گیا تھا کہ جو اس کے اور میرے بیچ بڑوں کی مہوائی و مرضی سے طے ہوا تھا۔ بوجھل دل و قدموں کے ساتھ میں ڈائننگ ہال تک پہنچا جہاں ہوری چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کو شرف بخشنے کے بجائے فرشی دسترخوان کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تانیہ اور وہ یعنی گیتی آرا کھانے کے لوازمات لا لا کر رکھ رہی تھیں

افروز ممانی کی دونوں بیٹیاں مہرین اور نرمین بھی اس بریڈ میں شامل ہو گئیں۔ کل بھابھی البتہ امی اور ممانی کے ساتھ کسی خاندانی موضوع کو پورے جی جان سے ڈسکس کرنے میں مصروف رہیں۔ چند ہی لمحوں میں سبھی دسترخوان کے گرد آ بیٹھے۔ سنجیدہ اور قدرے خفا خفا سی تانیہ بھی۔ میں نے دیکھا فرہاد کی نظر بار بار اس پر پڑ رہی تھی۔

اس کی نظر میں احترام تھا محبت تھی نئی زندگی کے آغاز کا سگنل مل جانے کی خوشی تھی۔ مجھے اس کی طرف سے اطمینان ہوا۔ ہاں تانیہ نے ایک دفعہ بھی کوئی اڑتی پڑتی نظر تک فرہاد پر ڈالنا ضروری نہ سمجھا۔ وہ پوری تندہی سے چاولوں میں چمچہ پھیرتی رہی۔

"کہیں تانیہ ۔۔۔ کسی اور میں۔" یوں ہی اس پر نظریں جمائے جمائے ایک خیال کوندے کی طرح لپکا اور میرے چند لمحے پہلے سرتوڑ کوشش کے بعد سر نیہوڑا کر سلائے اضطراب کو جھنجوڑ گیا۔

"شاید اسی وجہ سے ۔۔۔ وہ ایسے کیوں اداس ہوتی؟" میرے اعصاب چٹخنے لگے۔

منظر بدلنے لگا تھا۔ تانیہ کی جگہ مجھے روشانہ بیٹھی نظر آئی ۔۔۔ ان کے یہاں بھی کھانے کا ٹائم ہو گا۔ آج ہی کے دن اسی ٹائم اس کے گھر بھی اس کے چچا کی فیملی آئی بیٹھی ہو گی۔ اس کے بوڑھے والدین کے چہرے پر بھی ایسا ہی اطمینان و سکون ہو گا جیسا اس وقت میرے امی ابو کے چہرے پر تھا۔ بیٹی کا رشتہ ماں باپ کی مرضی سے طے ہو رہا تھا۔ ایک مقدس رشتہ ۔۔۔ اللہ کی مدد سے اس گھر تک آنے والا ۔۔۔ ماں باپ کیونکر خوش نہ ہوتے۔

منظر ایک بار پھر بدل گیا۔ چاول کے دانے چگتی تانیہ مجھے کسی گہری سوچ میں گم لگی۔ سارے ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔ ماموں فرہاد کے کوئی بچپن کا قصہ سنا کر سب کو محظوظ کر رہے تھے اور تانیہ ۔۔۔ وہ اس ماحول سے کٹی کہیں اور بیٹھی تھی۔

"کہاں ۔۔۔؟" اس کے بعد سوچتے ہوئے میری روح بھی تھرا گئی۔

"کہیں تانیہ بھی وہیں تو گم نہیں جہاں اس وقت روشانہ ہو گی ۔۔۔؟" اس سے آگے میری سوچ کے پر جل جل گئے۔ ایسی گھٹن سی اندر پھیلی تھی کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا؟ ۔۔۔" ابو، ماموں، فرہاد سمیت سبھی حیران رہ گئے۔

"وہ ۔۔۔ مم میں۔" میں خوامخواہ ماتھا مسلنے لگا کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"پیٹ میں درد ہے۔" گیتی کی شوخ سی بڑبڑاہٹ با آسانی سب کی سماعتوں تک پہنچی تھی۔

"ہاں ۔۔۔" امی نے ماتھا پیٹ ڈالا "گیتی! بچے جاؤ کچن سے اسپغول لے آؤ۔ میرا بچہ دہی میں ڈال کے کھالے کچھ تو افاقہ ہو۔" گیتی بھاگم بھاگ اٹھا لائی۔

اس وقت میرا کھانے سے دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ لیکن فقط امی کی خوشی کی خاطر میں نے اسپغول ملا دہی کا پیالہ ختم کیا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ تانیہ کا کملایا چہرہ میری توانائی ختم کیے جا رہا تھا۔ میں نے بغور جائزہ لیا۔ وہ بہت جلدی جلدی ہر کام نمٹا رہی تھی۔ جیسے اسے ان کاموں سے گلوخلاصی کر کے اپنا کوئی اہم کام کرنا ہو اور وہ اہم کام کیا ہو سکتا تھا؟ یہیں آ کر میری روح فنا ہونے لگتی۔

سب لوگ پھر سے لاؤنج میں آ بیٹھے تھے۔ ماموں لوگوں نے رات گئے تک واپس جانا تھا۔ سو جی بھر کر باتیں ہو رہی تھیں۔ تانیہ، گیتی، مہرین اور نرمین کے درمیان بھی مصنوعی مسکراہٹ سجائے ہوئے کسی اور

مجھ کی سیر کرائی محسوس ہوئی۔ ان لمحوں میں وہ ہنس بول بھی رہی تھی امبرین کے ڈریس پر تبصرے بھی کر رہی تھی۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہمارے بیچ ہوتے ہوئے بھی ہمارے بیچ نہیں۔ میری ہمت جواب دے گئی۔

"میں آتا ہوں یار!" فرہاد سے ایکسکیوز کرتا میں اوپر اپنے کمرے میں آگیا۔

بیڈ پر گرتے ہی میرا ہاتھ موبائل سے ٹکرایا تو مجھے پتا چلا کہ میں ایک بار پھر اپنا موبائل کمرے میں بھول گیا تھا۔ مگر اس دفعہ اٹھا کر دیکھنے کے بجائے میں چت لیٹا رہا۔ مجھے اندازہ تھا روشانہ کی کتنی مسڈ کالز آچکی ہوں گی۔۔۔ بے صبری کہیں کی۔۔۔ لیکن میں کیا کرتا کہ میرا دل نیچے موجود میرے ماں باپ، پیاری سی محبت سے لبالب بھری میری بہن ثانیہ کے قدموں میں کہیں رہ گیا تھا۔ سو چاہ کر بھی میں نے موبائل اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔

رات دس گیارہ بجے کے درمیان ماموں لوگ روانہ ہوئے۔ ڈھیر ساری محبتیں، مبارکبادیں اور خوشیاں سمیٹ کر۔۔۔ اور یقیناً "دے" کر بھی۔ امی ابو کے چہروں پر چھائی آسودگی دیکھنے کے لائق تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خوش و مطمئن تھے۔ ابو لاکھ معترض سہی لیکن اب وہ بھی پُرسکون نظر آرہے تھے۔

شاید بیٹی کی باعزت رخصتی کی چاہ انہیں بھی تھی اور میں بیوقوف اپنے خدشات میں گھرا دل سے گھر والوں کی نہ خوشی محسوس کر رہا تھا اور نہ ہی ثانیہ کی دلی خواہش۔

زیدی کی کال گیارہ بجے پھر سے آگئی۔ اسے ابھی بھی میرے "مورال" کی فکر تھی۔

"بلال سے فلیٹ کے لیے بات کروں۔۔۔؟"

"میں خود کرلوں گا۔" میرے جواب پہ بلال کو خاموشی نے گھیر لیا۔ شاید وہ توقع کر رہا تھا اس کی نصیحتوں نے میری اخلاقیات جگا دی ہوں گی مگر۔

"اوکے۔۔۔" تھک ہار کر اس نے گہری سانس بھری۔

"انکل آنٹی اور ثانیہ کو تو تو چیٹ کر ہی رہا ہے۔۔۔ آخری بار معراج صاحب کے بارے میں بھی ضرور سوچ لینا۔ مجھے نہیں یاد پڑتا انہوں نے کبھی تمہارے یا تمہارے گھر والوں کے ساتھ برا کیا ہو۔" کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا تھا۔ میں دیر تک جھنجلاتا بھنناتا رہا۔

یہ خیال رد کر دینے کے لائق ہرگز نہیں تھا کہ وہ میرا مورال جانچنے کے بجائے درحقیقت میرے سامنے اپنی نصیحتوں کے اسپیڈ بریکر کھڑے کر رہا تھا۔۔۔ اور مجھے یہ تسلیم کرتے ہوئے "تاؤ" آرہا تھا کہ اس کے یہ اسپیڈ بریکرز میرے حوصلے کی راہ میں کامیاب رکاوٹ بنتے جارہے تھے۔

☼ ☼ ☼
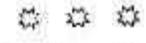
زیدی کی کال کے بعد دھواں ہوتے دماغ کو ری چارج کرنے کے لیے کافی کی اشد ضرورت محسوس ہوئی تو میں نیچے کچن میں چلا آیا۔ جہاں گیتی آرا پہلے سے موجود تھی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہوئی؟" مجھے ٹھٹکتے دیکھ کر اس نے عام سے لہجے میں پوچھا اور دو کپوں میں باری باری چائے انڈیلنے لگی۔ میں نے گہری نظر اس کے جھکے سر کی سیدھی مانگ پر ڈالی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اپنے لمبے گھنے بالوں کی سیدھی مانگ نکال کر کس کے چٹیا بنائی ہوئی تھی اور اسے ہمیشہ ہی اس ہیر اسٹائل میں دیکھ کر میں نے متعدد بار اسے چھیڑا تھا۔ جواباً "برا" ماننے کے بجائے وہ کھل کر مسکرا دیتی۔

"آپ کو کچھ چاہیے تھا؟" اچانک ہی سر اٹھا کر اس نے دریافت کیا۔ میں نے تیزی سے نظروں کا زاویہ بدلا تھا۔

"تم جاؤ۔۔۔ میں کافی بنا لوں گا۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"پتا ہے مجھے "آپ بہت سگھڑ ہیں۔" اس کی شوخی سے مجھے خوف آتا تھا۔ "لیکن میری مانیں ابھی کافی نہ پئیں۔۔۔ پہلے ہی آپ کا پیٹ کچا۔" میرے چہرے کے زاویے بگڑتے دیکھ کر اس نے زبان دانتوں تلے دبا کر بقیہ جملے کا راستہ بند کیا۔

"مشورے کا شکریہ۔ بٹ اب۔" مجھے غصہ آگیا تھا سو وہ پشیمان نظر آنے لگی۔

"سوری۔۔۔" یہ تو طے تھا اس سے میری خفگی برداشت نہیں ہوتی تھی، یہ بات میں نے بارہا محسوس کی۔

"آپ یہ کافی لے لیں۔ میرا ویسے بھی پینے کا دل نہیں کر رہا تھا۔ ثانیہ کے لیے بنانے آئی تو اپنے لیے بھی بنالی۔"

میں نے زیادہ آکڑنہ دکھاتے ہوئے اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پر اکتفا کر لیا کہ اس وقت خود سے کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اور دوسری بات وہ کافی بہت مزے کی بناتی تھی۔

"سنو۔۔۔" میرے پکارنے پر وہ کچن کے دروازے پر رک گئی اور استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"ثانیہ ٹھیک تو ہے؟" میں نے نامعلوم کیا جاننا چاہا تھا۔ گیتی کی آنکھوں میں حیرانی سمٹ آئی۔

"ہاں کیوں۔۔۔ اسے کیا ہونا ہے؟"

"مطلب۔۔۔" مجھے ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ "وہ خوش تو ہے؟"

گیتی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو سکوڑ کر میری طرف تادیر دیکھا اور پھر سے ہنس دی۔ میں خوامخواہ خجالت کا شکار ہوا۔

"وہ کیوں خوش نہیں ہوگی؟" اس نے الٹا جرح کی۔ "اور آپ اس کی اماں بن کر بلاوجہ فکر مند ہونا چھوڑیں۔ ان باتوں پر پریشان ہونے اور بیٹی سے پوچھنے کے لیے چچی ماشاء اللہ، الحمدللہ حیات ہیں۔ آپ اپنی اور میری کافی ٹھنڈی نہ کریں۔" انتہائی شریر لہجے میں کہتی وہ کچن کا دروازہ عبور کر گئی۔ پیچھے اپنی کھنکتی آواز کا سحر پھونک کر مجھے پتھرا گئی۔

☼ ☼ ☼

پہلے پہل۔۔۔ روشانہ کی مسڈ کالز میرے نمبر پر آیا کرتی تھیں۔ میں دیکھ کر نظر انداز کر دیتا تھا کہ فی الحال مجھے یہ کالز نقصان نہیں دے رہی تھیں۔ پھر یوں ہوا کہ اسی نمبر سے SMS "آنا شروع ہو گئے۔ ہر میسج میں میری زمین آسمان کے قلابے ملاتی تعریفیں ہوتیں اور بس۔۔۔ میں نے انہیں بھی نظر انداز کیا۔ اور کبھی بھی کسی بھی میسج کا جواب نہیں بھیجا۔ یہاں تک کہ روشانہ کال کرنے پر مجبور ہو گئی۔

"آپ کے پاس فالتو پیسے ہیں تو غریبوں میں بانٹ دیں۔ کسی دارالامان کو دے دیں۔ بجائے فضول چیزوں پر خرچ کرنے کے۔" چھوٹتے ہی میں نے اپنی برہمی دکھائی۔ دوسری طرف خاموشی چھائی تھی۔

"سوری۔" پھر جب میں نے سوچا کال کاٹ دوں اس کی خفت بھری آواز سنائی دی۔

"آپ کو تنگ کیا۔۔۔ سوری فار دس۔"

"سوری تو بعد میں قبول ہوگی پہلے یہ بتائیں آپ نے مجھے تنگ کیوں کیا؟" میں اس کی سوری پر نہ چاہتے ہوئے بھی پگھل گیا۔

"کیونکہ۔۔۔" اس کی دھیمی سی آواز کوئی اتنی دلنشین تو نہیں تھی مگر جس طرح سے بن بن کر وہ بول رہی تھی۔ وہ انداز مجھے تو کیا کسی کو بھی متاثر کر سکتا تھا۔

"آ۔۔۔ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔" اب بکنے میں آنے کی باری میری تھی۔ نامعلوم کون فارغ تھی جو مجھے اتنا ملاحظہ کر چکی تھی کہ میں اسے اچھا بھی لگنے لگا تھا۔ میں نے مزید جھمیلے میں پڑے بغیر لائن کاٹ دی تھی۔ لیکن جھمیلے میں تو کال ریسیو کرتے ہی پڑ گیا تھا۔ وہ میرے پیچھے ایسی پڑی کہ مجھے اپنے پیچھے لگا کر ہی چھوڑا۔ وہ مجھے باآسانی اپنا اتا پتا دینے پر رضامند ہو گئی تھی۔

"معراج صاحب" ایک سال قبل تک ہمارے ہی محلے کے رہائشی تھے۔ نہایت نیک، شریف اور عبادت گزار ریٹائرڈ بزرگ۔ جن کی صورت دیکھ کر ہی بندے کا دل عزت کرنے پر مچل اٹھتا۔ ان کی بیٹی مجھ سے یکطرفہ عشق میں مبتلا رہی۔ میرے لیے قسمیں کھانے والی بات تھی پھر جب روشانہ نے مجھ پر اپنے جذبات

عمل کرنے کے لیے ہمت پکڑی تو معراج صاحب یہ عمل ہی چھوڑ گئے۔

روشانہ کو کچھ عرصہ اس یکطرفہ محبت کو ایک طرف رکھنا پڑا۔ لیکن پھر جب اس نے مجھے تانیہ کو یونیورسٹی سے پک کرتے ہوئے دیکھا تو پرانی آگ پھر سے جل اٹھی۔ وہ بھی وہیں کسی ڈپارٹمنٹ کی اسٹوڈنٹ تھی۔ پھر ہزار مشکلوں کے بعد اس کی مجھ تک رسائی ہوئی۔ میں جو اپنا نام گیتی آرا کو بزرگوں کی پسند سے دے چکا تھا۔ لاکھ عزت دار اور روایت پسند سہی تھا تو ایک مرد۔ روشانہ کی پیش قدمی کو روکتے روکتے بھی مثبت عندیہ دینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بعد ہماری چند ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ وہ بہت خوب صورت نہیں تھی۔ مگر غضب کی طرح دار تھی۔ نت نئے فیشن اور ہیر اسٹائل اسے دوسری لڑکیوں میں ممتاز ضرور کر دیا کرتے تھے۔ میں حیران بھی بہت ہوتا تھا کہ روشانہ جیسی لڑکی معراج صاحب کے گھر کیسے پیدا ہو گئی؟ وہ پوری طرح سے باپ کے اصولوں کی ضد تھی۔ روشانہ کو طریقہ آتا تھا کسی کو بھی اپنا بنا لینے کا اور وہ کسی میں بھی بن گیا۔

پھر حالات ویسے ہوتے گئے جیسے اس نے چاہا۔ ہم دونوں کی ملاقاتیں بہت کم ہوئیں۔ البتہ ٹیلی فونک محبت ہر روز دوہرائی جاتی۔ وہ ہر کال پہ اصرار کرتی کہ میں اس کے گھر رشتہ لے کر آؤں اور میں ہر بار ہی ٹال دیتا۔ ٹال دینے کی ایک وجہ تو گیتی آرا تھی۔

لیکن دوسری اور نسبتاً "بڑی وجہ اس کا اور میرا الگ الگ مسلک سے تعلق ہوتا تھا۔

ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ اس وجہ کو بھلا کر رشتے کر لیتے ہیں مگر میرا یا روشانہ کا خاندان ایسا نہیں تھا۔ سو میں کتنا بھی بہادر بن جاتا۔۔۔ ابو کے سامنے یہ التجا لے کر بھی نہیں جا سکتا تھا کہ میری روشانہ سے شادی کر دیں کہ جس کا مسلک ہم سے جدا ہے۔

سو میں اور روشانہ اپنی اپنی جگہ پر بزدل بنے ٹیلی فونک کالز تک ہی محدود رہتے۔ روشانہ کا ایک چچا زاد ڈاکٹر اور روشانہ سے شادی کا خواہش مند تھا دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کا رشتہ بھی طے ہو گیا۔ اور شادی کی تاریخ طے ہونے کی باتیں بھی ہونے لگیں تو روشانہ نے ہمت پکڑی۔ پرسوں رات کی کال میں وہ رو رو کر اپنا بھی گلا بٹھا رہی تھی اور میرے بھی ہاتھ پاؤں پھلا رہی تھی۔

"پلیز کچھ کرو عمران! میں تمہارے علاوہ کسی اور سے شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"تم بتاؤ۔۔۔۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔" میں اس سے زیادہ لاچار تھا۔

"تم مجھ سے شادی کر سکتے ہو اور کیا کر سکتے ہو؟" وہ چیخی تھی۔

"روشی بات کو سمجھو۔۔۔۔ میں اور تم اس زندگی میں شاید ہی کبھی ایک ہوں۔"

"کیوں؟" اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔

"ہم دونوں کا مسلک جدا ہے۔"

"تو یہ پہلے سوچنا تھا۔" وہ چیخی۔۔۔ "اور اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

میں کہہ نہیں سکا کہ مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"ہمارے بڑوں کو پڑتا ہے۔ خصوصاً" ایسی صورت میں جب تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس ہونے کی باتیں ہو رہی ہوں۔"

"میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔" روتے روتے وہ بمشکل بول پائی۔

میں مجبوری و بے کسی کی تصویر بنا رہا۔

"دیکھ لینا۔۔۔ پرسوں تک تمہیں میرے مرنے کی خبر مل جائے گی۔" اور اس دھمکی کے بعد مجھے مجبوری کا چولا اتار پھینکنا پڑا۔

"تو ایک ہی آپشن ہے ہمارے پاس۔۔۔۔ گھر سے بھاگ چلتے ہیں۔" میں نے حالات کی سنگینی کا جائزہ لیے بغیر محض روشانہ کو پرسکون کرنے کے لیے یہ آپشن رکھا اور دوسری طرف وہ تو جیسے تیار ہی بیٹھی تھی۔

"ہاں۔۔۔ ٹھیک ہے۔" ایک سیکنڈ کی بھی دیر لگائے بغیر اس نے مثبت عندیہ دیا تو مجھے گم صم ہی کر دیا۔

"میں تمہارے ساتھ ایسا کرنے کو بھی تیار ہوں۔"

وہ کہہ رہی تھی اور مجھے چپ لگ گئی تھی۔ مجھے ہرگز ہرگز امید نہیں تھی کہ وہ مثبت جواب دے گی۔ تب ہی تو حواس سلب ہو گئے۔

"کیا ہوا۔۔۔ کیا سوچنے لگے؟" میری مسلسل خاموشی بالآخر اسے کھٹک گئی۔

"جلدی سے انتظام کرو میرے پاس صرف ایک ہی دن ہے۔ پرسوں میرے چچا تاریخ رکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔" میں نے سب کچھ اللہ اور پھر روشانہ پر چھوڑتے ہوئے اپنے دماغ کو روشانہ کی مرضی کے مطابق چلانا شروع کر دیا اور اسی مرضی کا نتیجہ آج کی رات کا فیصلہ تھا۔

☼ ☼ ☼

میں نے وہیں کچن میں کافی ختم کی۔۔۔ جس کا ذائقہ میرے دل کے کئی راستوں تک رسائی حاصل کر گیا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔۔۔۔ صبح کی سپیدی پھیلنے سے پہلے مجھے اپنے گھر سے ایک ایسے کام کے لیے قدم باہر نکالنے تھے جو تھا تو شرعی مگر اسلامی و سماجی اصولوں کے قطعی خلاف۔ روشانہ کو لے کر میں نے پہلا کام کورٹ میرج کا کرنا تھا۔

مگر کیا کیا جا سکتا تھا کہ میرا دل اس وقت کسی لڑکی کے دل کی مانند خوف کا شکار تھا۔ مجھے علم تھا۔۔۔ میرے اس اقدام کے بعد ابو مجھے عاق کرنے سے بھی نہیں چوکیں گے۔ میں ان کی اکلوتی نرینہ اولاد سہی لیکن اصول تو پھر اصول ہوتے ہیں اور میرے ابو کے اصول ان کی پدرانہ شفقت پر حاوی تھے۔ لیکن مجھے عاق ہونے کا بھی کوئی خوف نہیں تھا۔

دولت اور پیسہ۔ میں اپنے زور بازو پر بھی کما سکتا تھا۔ مجھے خوف تھا تو اس گھر کے مکینوں سے جدائی کا۔ مجھے خوف تھا اس گھر سے دوری کا۔۔۔ یہ گھر جہاں میں پل بڑھ کر اتنا بڑا ہوا۔ جس کے چپے چپے سے مجھے محبت تھی۔ جس سے دور جانے پر مجھے اس کی کشش واپس کھینچ لاتی تھی۔ جس میں سکون و آسودگی کی دولت وافر موجود تھی۔ جس کی بنیادوں میں محبتوں کا خمیر تھا۔ جس کی چھت تحفظ کے احساس سے مالا مال تھی۔ میں اس گھر سے تاحیات دور رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر اس گھر میں موجود میری ماں۔۔۔ جس کی ممتا کے پھول ہر دم مجھ پر نچھاور ہوتے تھے۔ جس نے اپنا آپ بھلا کر میری پرورش کی مجھے آج دنیا میں مضبوطی سے قدم جمانے کے لائق بنایا جو میں دفتر سے لیٹ ہو جاؤں تو وہ گیراج تک اپنے جوتے گھسا ڈالتی ہے۔۔۔ میں اس ماں کو دیکھنے کا "اسے سننے کا اتنا عادی تھا کہ اس سے مستقل دور جانے کا سوچ کر ہی سانس رکنے لگی۔

پھر تانیہ۔۔۔ جسے میں نے گود میں کھلایا اور جو آج اتنی بڑی ہو گئی کہ میرے کھانے پینے صحت اور کپڑوں کا خیال رکھنے لگی۔ میں کہیں دفتری کام سے باہر جاؤں تو سب سے زیادہ یاد مجھے اسی کی آتی تھی۔

مگر کیسے اللہ کے عنایت کردہ ان پیارے پیارے رشتوں کو چھوڑ کر ایک نیا رشتہ جوڑنے چلا تھا کہ۔۔۔۔ جس کے حاصل ہو جانے پر میرے سکون و اطمینان کی بھی گارنٹی نہیں تھی۔

وہیں کچن میں کھڑے کھڑے جب ٹانگیں بوجھ سہارنے سے انکاری ہو گئیں۔ تب اندازہ ہوا کہ بہت دیر ہو چکی ہے۔

مگر میرے اندر سکون کا سمندر موجزن ہو چکا تھا۔ دیر ہوئی تھی مگر۔۔۔ نہیں دیر نہیں ہوئی تھی۔۔۔ میرے گھر والوں کی محبتوں کا خزانہ۔۔۔۔ میرا گلشن نما یہ گھر۔۔۔ بے سکونی و اضطراب نے منہ چھپا لیا تھا پھر زیدی کی نصیحتیں۔۔۔ بعد گیتی آرا کی بنائی کافی اور سب سے بڑھ کر میرے اپنے دل کا ہمکنا۔۔۔ اتنی ڈھیر ساری مخالفتیں اور ایک بے چارہ میں! کہاں تک مقابلہ کر سکتا تھا۔ سو کچن کا دروازہ بند کرتے ہوئے میں مکمل طور پر چیت ہو گیا اور روشانہ سے معذرت کے بہانے تلاش کرنے لگا۔

سیڑھیوں کی طرف جانے سے قبل میں لاشعوری طور تانیہ کے کمرے کے بند دروازے پر آکھڑا ہوا۔ دروازہ ہلکا سا کھلا تھا اور اندر سے آتی آوازیں با آسانی میری سماعتوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں رک گیا۔

"وہ انسان محبت کے معنی کیا جانے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ مخلص نہیں۔" تانیہ کی ٹھوس لہجے میں کہی گئی بات میرے دل پر لگی۔

"جب یہ طے تھا کہ میں نے فرہاد کے ہی ساتھ رخصت ہونا ہے تو میں دانش کی حوصلہ افزائی کر کے اپنے گھر والوں کی کمٹمنٹ توڑنے کا سبب کیوں بنتی۔۔۔؟" میرا ہوا جو۔

"اس بے چارے کو دکھ تو بہت ہوا ہو گا۔" گیتی آرا افسوس کا اظہار کر رہی تھی۔

"بے چارہ نہ کہو۔" تانیہ نے ناگواری سے کہا۔ مجھے اس کی محبت اس کا اپنا روگ ہے۔۔۔ میں نے اس کو نہیں اکسایا تھا کہ وہ اتنا آگے تک آئے۔۔۔ تم گواہ ہو میں نے ہر ہر موقع پر اس کی حوصلہ شکنی کی۔"

"پھر بھی یار۔۔۔! وہ محبت کرتا تھا تم سے۔ مجھے تو ترس آتا ہے بے چارے پر۔"

"اچھا۔" تانیہ نے طنزاً بولی۔ "میں جب اس کو پازیٹو رسپانس دیتی پھر بھی تم ہو تیں جو میرے بجائے فرہاد اور میرے امی ابو پر ترس کھا رہی ہو تیں۔۔۔ مائی ڈیئر! جس رشتے کے بنانے پر پیچھے بہت سے رشتوں اور خاندانوں کو تکلیف پہنچے اس رشتے کو بنانے سے پہلے ہی منہ پھیر لینا چاہیے۔"

کتنی بڑی بڑی باتیں کر رہی تھی تانیہ۔۔۔ اور کتنی مطمئن اور آسودہ بھی نظر آ رہی تھی۔ صبح والی روئی روئی تانیہ کا تو شائبہ تک نہیں تھا۔

"تم بتاؤ۔۔۔ عمران بھائی تم سے دو سالہ منگنی بھلا کر کسی اور لڑکی کے ساتھ اتنا انوالو ہو جائیں کہ تم کو چھوڑ دینے پر بھی آجائیں، تب بھی تم اس لڑکی پر ترس کھاتے ہوئے عمران بھائی کو ان کے حوالے کر دو گی کہ جائیے۔۔۔ آپ کی محبت ہے، نہ ملی تو مجھے ترس آئے گا۔" جہاں میں لیٹے لیٹے ہوا تھا وہیں گیتی آرا اچھل

پڑی تھی۔

"تمہارے منہ میں خاک۔" وہ تڑپ کر بولی "وہ تمہیں مثالیں دینے کے لیے میں ہی ملی ہوں۔"

"یہ محبت وحبت دماغ کا فتور نہیں بنتی جا رہی ہے۔۔۔ ورنہ اس کے ہو جانے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ محبت کا صرف یہی روپ ہی نہیں ہوتا، ماں باپ، بہن بھائی بھی تو ہوتے ہیں، ہماری محبت کے حقدار اور محبت کے سب سے خوب صورت رنگ صرف یہی ہوتے ہیں۔"

تانیہ گویا بھگو بھگو کر مجھے مار رہی تھی۔

"اس بات سے مجھے بھی انکار نہیں۔"

"اور دانش کی جہاں تک بات ہے۔۔۔ وہ مجھ سے محبت کا دعوے دار ہے لیکن ایک الگ مسلک کا ہے۔ بالفرض میں اس کی جانب راغب ہو بھی جاتی تو مجھے یا اسے اپنے مسلک کی قربانی دینی پڑ جاتی۔ تب ایسی محبت کا کیا فائدہ جو آپ کو اپنی پہچان، شناخت بھلا دینے کے بعد ملے۔۔۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی شناخت نہیں کھونا چاہتی۔۔۔ میں اپنے ماں باپ کو دکھ نہیں دینا چاہتی، میں نہیں چاہ سکتی کہ میری وجہ سے میرا بھائی سر جھکا کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو۔۔۔ جو لڑکیاں یہ سب کھونے کی ہمت رکھتی ہیں وہ یا تو بہت بہادر ہوتی ہیں یا پھر محبت واقعی اندھی ہوتی ہے۔"

زیدی کے بعد تانیہ نے بھی میرے سامنے آئینہ لا رکھا جس میں مجھے اپنی کریہہ شکل واضح نظر آنے لگی۔ روشانہ سے میری محبت اندھی تھی، احساس کی شوقیہ تھی یا دماغ کے فتور کا نتیجہ تھی؟ جو کچھ یا جیسی بھی تھی اس آخری دھکے سے منہ کے بل آ گری تھی۔

"اور تم بتاؤ؟" اب کے تانیہ نے شوخی سے کہا۔ "فرہاد میں کیا کمی ہے جو میں اسے بھول کر دانش سے متاثر ہو جاتی؟"

"جب کوئی کمی نہیں تو صبح نیر کیوں بہا رہی تھیں؟"

"وہ تو میں ناراض تھی فرہاد سے۔" تانیہ نے شرمگیں مسکراہٹ سجالی۔ "میں نے اسے پرسوں

رات منع کیا تھا کہ ابھی ٹھہر جاؤ۔ میرا ماسٹرز ہو جائے پھر بھلے رزلٹ کے آنے سے پہلے رخصتی کرا لینا۔ لیکن میرے سامنے جی جی کی رٹ لگانے والا آج ماموں ممانی کو لے آیا۔۔۔ مجھے اسی بات کا غصہ تھا۔"

"یار مجھ سے پوچھو۔۔۔" گیتی نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ "تمہاری ہو تو رہی ہے رخصتی۔۔۔ میرے منگیتر صاحب کا پتا نہیں؟ دعا کرو انہیں بھی خیال آ جائے اپنے سر پہ سہرا سجانے کا۔"

تانیہ کا جواب میں نے سننا ضروری نہیں سمجھا۔ میری سمت واضح ہو چکی تھی۔ مجھے اب جو کرنا تھا اس کے لیے مجھے سیل فون کی ضرورت تھی اور وہ اوپر میرے کمرے میں تھا سو میں نے تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے کمرے کی راہ لی۔ جہاں سائیڈ ٹیبل پر پڑا سیل میری توجہ کا منتظر تھا۔ مجھے معلوم تھا روشانہ بہت خفا ہو گی۔ مجھے برا بھلا کہے گی، روئے گی چلائے گی۔ جب میں ایک مرد ہو کر گھر والوں کی عزت اور محبت سے منہ نہیں موڑ سکتا تھا۔ اس کے نیک اور متقی والد معراج صاحب کو دنیا کی نظروں میں گرانے کا ذریعہ نہیں بن سکتا تھا۔ تو وہ تو لڑکی تھی وہ کیسے نہ سمجھ پاتی میری بات۔

میں نے سیل فوراً اٹھایا۔ روشانہ کی کئی مسڈ کالز آئی ہوئی تھیں اور ایک میسج بھی۔۔۔ میں نے کھول کر دیکھا وہ بھی روشانہ کا تھا۔

"تم میری کال کیوں نہیں اٹینڈ کر رہے ہو؟ پلیز آج کی رات یا آئندہ۔۔۔ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔۔۔ میرے بابا کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی ہے اور میری رخصتی دو ماہ بعد نہیں اسی ہفتے کے کسی دن ہو گی۔۔۔ میرے بابا کی زندگی میری چھوٹی بہنوں کے لیے بہت ضروری ہے اور میں ان کے سر سے۔۔۔ چھت چھیننے کا باعث نہیں بن سکتی۔ گھر میں بہت پریشانی ہے۔ پلیز مس۔۔۔ کرنا اور مجھے معاف کر دینا۔"

جوں جوں میں میسج پڑھتا گیا جیسے ہلکا پھلکا ہوتا گیا۔ پڑھ چکنے کے بعد تو باقاعدہ بھنگڑے ڈالنے کو جی چاہا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا کوئی انعام ہی تھا جو مجھے پچھلے چند گھنٹوں میں اچھا سوچنے پر ملا تھا یا کیا۔۔۔ بہرکیف ٹھوکر لگنے سے پہلے ہی مجھے اور روشانہ دونوں کو عقل آ گئی تھی۔

میں نے صدق دل سے روشانہ کے لیے ڈھیر ساری خوشیوں اور معراج صاحب کے لیے صحت کی دعا کی اور گیتی آرا کی رخصتی کی حسرت بھری خواہش کو عملی جامہ پہنانے کا سوچتے ہوئے سونے ہی لگا تھا کہ زیدی کی کال آ گئی۔

"الو کا پٹھا۔" اس نے گالی دی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

"میں یہاں الو بنا قلفی ہو گیا ہوں اور تیرا آتا پتا نہیں۔"

مجھے پھر سے ہنسی آ گئی۔

وہ یقیناً جیپ لیے نیس باہر میرا منتظر تھا۔

"کمینے ناٹے کے مچھر جی بھر کر میرا خون چوس رہے ہیں۔"

میری ہنسی نان اسٹاپ جاری تھی۔

"کیا بات ہے؟ تیرے دانت کیوں نکل رہے ہیں؟"

وہ زچ ہوا تو مجھے دانت اندر کرنے پڑے۔

"سن۔۔۔" میں نے کہنا شروع کیا۔۔۔ وہ مکمل طور پر ہمہ تن گوش تھا اور سننے کے بعد اس نے بھی دانت نکالے تھے۔ اس ارشاد کے ساتھ کہ۔۔۔

"شکر ہے۔۔۔ دونوں کی عقل سلامت تھی۔"

میرے دانت پھر سے نکل پڑے تھے۔

اُس کو جُدا ہوئے بھی زمانہ بہت ہوا
اب کیا کہیں یہ قصہ پُرانا بہت ہوا

ڈھلتی نہ تھی کسی بھی جتن سے شبِ فراق
اے مرگِ ناگہاں! ترا آنا بہت ہوا

ہم خلد سے نکل تو گئے ہیں پر اے خدا!
اتنے سے واقعے کا فسانہ بہت ہوا

اب ہم ہیں اور سارے زمانے کی دُشمنی
اُس سے ذرا سا ربط بڑھانا بہت ہوا

اب کیوں نہ زندگی پہ محبت کو وار دیں
اس عاشقی میں جان سے جانا بہت ہوا

اب تک تو دل کا دل سے تعارف نہ ہو سکا
مانا کہ اس سے ملنا ملانا بہت ہوا

لو پھر ترے لبوں پہ اسی بے وفا کا ذکر
احمد فراز! تجھ سے کہا نا بہت ہوا

احمد فراز

جشنِ بہاراں، رقصِ بتاں اور تھوڑی دیر
عیش و طرب کی کہکشاں اور تھوڑی دیر

اربابِ اختیار کے ثنا خوانِ خوش کلام
کیف و سرور کا یہ سماں اور تھوڑی دیر

یہ تمکنت، یہ زعم مگر اس کے باوجود
آبِ رواں پہ ثبت نشاں اور تھوڑی دیر

صحرائے زندگی میں کھلیں گے وفا کے پھول
راہِ طلب میں رشکِ رواں اور تھوڑی دیر

ہم چل رہے ہیں جانبِ منزل رواں دواں
گمنام راستوں میں دُھواں اور تھوڑی دیر

سینہ سپر ہیں بادِ مخالف کے باوجود
قائم ابھی ہے رشتۂ جاں اور تھوڑی دیر

پھیلی ہوئی ہے چار سُو اک بے حسی مگر
ہمنے کو پھر ہے عزم جواں اور تھوڑی دیر

جمیل گشکوری

شکستِ زندگی ویسے بھی موت ہی ہے ناں
تو سچ بتا! یہ ملاقات آخری ہے ناں

میں خود بھی یار تجھے بھولنے کے حق میں ہوں
مگر جو بیچ میں کم بخت شاعری ہے ناں

یہ کور چشم اُجالوں سے عشق کرتے ہیں
جو گھر جلا کے بھی کہتے ہیں روشنی ہے ناں

تُو میرے حال سے انجان کب ہے اے دُنیا
جو بات کہہ نہیں پایا سمجھ رہی ہے ناں

میں جان بوجھ کے آیا تھا تیغ اور تیرے بیچ
میاں! نبھانی تو پڑتی ہے دوستی ہے ناں

فضل خان

ساحر

ہمیشہ تم نے اپنا آپ اپنی جیب میں رکھا
مگر پھر بھی کشادہ دل، کشادہ دست کہلائے
لُٹایا تم نے خود پر دوسروں کو مُٹھیاں بھر کے
ہمیشہ چاہنے والوں کو سکّوں کی طرح برتا
مگر ایسے سلیقے سے
کہ خود کو صرف کر کے بھی کسی کو غم نہیں ہوتا

تمہارا سحر ایسا ہے
کہ جس پر کام کر جائے
کبھی یہ پھر کم نہیں ہوتا
تمہارا رنگ جس پر بھی چڑھے
مدھم نہیں ہوتا

حمیدہ شاہین

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں

ایک صاحب کی بیگم وہمی طبیعت کی تھیں۔ وہ روز رات کو گھر کے کسی نہ کسی حصے سے آوازیں بلند ہوتے سنتیں اور روزانہ اپنے شوہر کو سوتے ہوئے جگا کر مجبور کرتیں کہ وہ گھر کے کسی حصے کو جا کر دیکھیں۔ اس روز روز کی مشقت سے تنگ آ کر ایک دن ان صاحب نے بیگم کو یقین دلایا کہ چور چوری کرنے آئیں تو شور و غل مچاتے ہوئے نہیں آتے۔ وہ ہمیشہ خاموشی کے عالم میں اپنا کام سرانجام دیتے ہیں۔

صاحب کی بیگم سمجھ دار خاتون تھیں۔ ان کی سمجھ میں یہ نکتہ آ گیا۔ اس کے بعد سے آج تک وہ ہمیشہ شوہر موصوف کو اسی وقت سونے سے جگاتی ہیں، جب گھر پر خاموشی طاری ہو اور گھر کے کسی حصے سے کوئی آواز نہ آ رہی ہو۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

تشویش

ڈاکٹر نے مریض کو بتایا۔

"لیبارٹری رپورٹ کے مطابق میرے پاس آپ کے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔ رپورٹ کے نتائج بتلاتے ہیں کہ آپ صرف چوبیس گھنٹے مزید زندہ رہ سکتے ہیں۔"

مریض نے تشویش سے پوچھا "یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔ آپ کے خیال میں اب کیا ہو گا؟"

ڈاکٹر نے فوراً جواب دیا "یہی بات بتانے کے لیے تو میں گزشتہ روز سے آپ کو تلاش کر رہا تھا۔"

نمرہ، اقرا۔ کراچی

سبق

ایک خاتون نے اپنے شرابی شوہر کو سبق سکھانے کے لیے سیاہ رنگ کا شیطانی لباس پہنا۔ منہ پر نقاب اور سر پہ سینگ لگا کر گلی کے موڑ پر کھڑی ہو گئی۔ رات کو اس کا شوہر نشے میں دھت جب گلی میں داخل ہوا تو خاتون ایک بھیانک چیخ مار کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

شوہر نے خوف زدہ ہونے کے بجائے جھومتے ہوئے پوچھا "تم کون ہو؟"

"میں شیطان ہوں۔" خاتون نے جواب دیا۔

شوہر نے مسرت آمیز لہجے میں کہا "ہاتھ ملاؤ یار! میں تمہاری بہن کا شوہر ہوں۔"

شہناز شازیہ سیال۔ خانیوال

اسٹوڈنٹ

وقار درس گاہ ہے نہ استادوں کی عزت!
کہ اب کالج میں اسٹوڈنٹ بہت بے خوف آتے ہیں
بھلا یہ فیل ہو سکتے ہیں کیسے امتحانوں میں
کتابوں کی جگہ لے کر کلاشنکوف آتے ہیں

ہری مرچیں

زاہد نے اپنی محبوبہ سے کہا "اگر تمہیں مجھ سے محبت تھی تو میرے پہلی مرتبہ اظہارِ محبت کرنے پر تم ناراض کیوں ہوئی تھیں۔ تم نے تو مجھے بالکل ہی مسترد کر دیا تھا؟"

"میں یہ دیکھنا چاہ رہی تھی کہ تم کیا ردِ عمل دکھاتے ہو؟" محبوبہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تمہارے جواب سے مایوس ہو کر میں چلا جاتا اور پھر کبھی لوٹ کر نہ آتا۔"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے دروازے کو تالا لگا رکھا تھا۔" محبوبہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

لائبہ، عائشہ۔ کراچی

مختصر مختصر

* تبصرہ نگار بنتے ہی میں اس قدر مصروف ہو گیا کہ اب میرے پاس پڑھنے کے لیے وقت نہیں رہا۔
* عورت کے نزدیک راز رکھنا اسے کہتے ہیں کہ بات بتا دی جائے۔ مگر بتانے والے کا نام نہ بتایا جائے۔
* آج کا کام کل پر چھوڑ دیجیے۔ ہو سکتا ہے کل اس کام کو کرنے کے لیے کوئی نئی مشین ایجاد ہو جائے۔
* کار میں شور سے نجات کے لیے خاتون کو گاڑی چلانے دیجیے۔
* ڈاکٹر نے خوب صورت مریضہ سے کہا "آپ کی خوراک درست نہیں لہٰذا آج رات کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں۔"

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

وضاحت

فائزہ نے اپنی دوست ثمینہ کو بتایا "میرا منگیتر بہت ہی جھگڑالو ہے۔"

"واقعی اس میں کوئی شک نہیں۔" ثمینہ نے تصدیق کی "کل مہندی کی تقریب میں اس سے ملاقات ہوئی تھی مجھے بار بار اس کو یقین دلانا پڑا کہ اس کی منگنی مجھ سے نہیں، تم سے ہوئی ہے۔"

کرن۔ فیصل آباد

تعلیم بالغاں

* احمد علی نے پوری کلاس کو مٹھائی کھلائی اور شرماتے ہوئے بتایا کہ وہ دادا بن گیا ہے۔
* کلاس میں پڑھائی کے دوران دو طالبات نے اپنے بچوں کے رشتے طے کر دیے۔
* حمیرا اداس تھی کہ آج موبائل پر اس کے بچوں کا ایک بھی ایس ایم ایس نہیں آیا مگر ٹیچر نے یہ بتا کر اس کی مشکل آسان کر دی کہ "اماں جی! آپ کمزور نظر کی وجہ سے موبائل کے بجائے ریموٹ کنٹرول اٹھا لائی ہیں۔"
* شازیہ جیسے ہی اٹھی نوجوان ٹیچر سے ٹکرا گئی۔ فوراً گھبرا کر بولی "بیٹا! چوٹ تو نہیں آئی؟"

ندا، فضہ۔ گوجرہ

نہلے پہ دہلا

دو شہری کار میں ہائی وے پر سفر کر رہے تھے۔ ایک جگہ سڑک کے کنارے انہیں دیوار کے عقب میں سرخ سرخ سیبوں سے لدے درخت دکھائی دیے۔ وہ گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے دیوار کود کر اندر چلے گئے اور بہت سے سیب توڑ لائے۔ روانہ ہوتے وقت انہیں چار دیواری کے کونے میں مالی کی جھونپڑی نظر آئی۔ جہاں مالی آرام سے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ دونوں کو شرارت سوجھی کہ مالی کو اپنے کارنامے سے آگاہ کرتے ہیں۔ پھر گاڑی بھگا لیں گے۔

چنانچہ انہوں نے رفتار کم کی اور کھڑکی سے سر نکال کر کہا۔

"بڑے میاں۔ بُرا نہ مانیے گا۔ ہم نے آپ کے باغ سے آٹھ دس کلو سیب توڑ لیے ہیں۔"

بڑے میاں حقے کا کش لے کر اطمینان سے بولے۔

"بیٹا! تم بھی بُرا نہ ماننا۔ جب تم سیب توڑ رہے تھے تو میں نے بھی تمہاری گاڑی سے جیک، اسٹیرو ویل اور ٹول کٹ نکال لی ہے۔"

خدیجہ سلیم۔ کراچی

اندازہ

ایک صاحب رات کو چپکے سے پنجوں کے بل اپنے فلیٹ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے سب سے پہلے باتھ روم جا کر اپنے چہرے پر لگی ہوئی چوٹوں پر

دوا لی ہوئی پتیاں چپکائیں، جو یار دوستوں سے دھینگا مشتی کا نتیجہ تھیں۔ پھر آہستگی سے بیڈ روم میں داخل ہوئے اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے اور یہ سوچ کر مسکرانے لگے کہ اب تو ان کی بیوی کو ان کی شراب نوشی کا ہرگز علم نہیں ہو سکے گا۔

مگر صبح ان کی بیوی ان پر برس پڑی "رات کو تم نے پھر شراب پی تھی ناں؟"

انہوں نے انکار کیا تو بیوی بولی۔

"اگر تم نشے میں نہیں تھے تو پھر باتھ روم کے آئینے پر دوا لی پتیاں کس نے چپکائی تھیں؟"

عائشہ، تحریم۔ محراب پور

سادگی

ایک صاحب پہلی بار گاؤں گئے۔ تانگے سے اُتر کر وہ ایک سڑک پر چلنے لگے۔ پھر رُک کر کسی کا انتظار کرنے لگے کہ جو انہیں گاؤں کے بارے میں بتا سکے۔ اتنے میں انہیں ایک دیہاتی نظر آیا جس نے دودھ کا برتن اُٹھایا ہوا تھا۔

"ارے بھائی! ذرا رُکنا۔" شہری نے آواز دی۔

"جی، کیا کام ہے؟" دیہاتی نے پوچھا۔

"میں ایک ناول نگار ہوں۔ پہلی دفعہ گاؤں آیا ہوں۔ آپ کے گاؤں پر ناول لکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے رہنے کے لیے کرائے پر مکان بھی چاہیے۔ کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟" شہری نے کہا۔

"میں آپ کو اپنا مکان دے دوں گا مگر اس کا کرایہ دو ہزار روپے ہوگا۔" دیہاتی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ دراصل میں گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں اور مجھے پُرسکون ماحول کی ضرورت ہے۔" شہری نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"ماحول بھی مل جائے گا۔" دیہاتی نے لاپروائی سے کہا۔ "اور ہاں کرائے کے علاوہ آپ ناول کے بارے میں جو کچھ مجھ سے پوچھیں گے، اس کے پیسے الگ سے ہوں گے۔"

فائزہ صلاح الدین۔ کراچی

حیرت

ایک صاحب فلم دیکھنے سینما گئے، ساتھ ان کا کتا بھی تھا۔ فلم کے دوران کتے کی حرکتوں سے ایسا لگ رہا تھا، جیسے اسے فلم پسند آ رہی ہو۔ مزاحیہ سین پر اس کی باچھیں کھل جاتیں۔ ولن کو دیکھ کر غرانے لگتا اور ہیروئن کو دیکھ کر دُم ہلاتا۔ ان کے قریب بیٹھے ہوئے صاحب نے کہا۔

"لگتا ہے آپ کے کتے کو فلم بہت پسند آ رہی ہے۔ مجھے تو اسے دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔"

وہ صاحب بولے۔ "حیرت تو مجھے بھی ہو رہی ہے، کیونکہ فلم جس ناول پر بنی ہے، وہ تو اسے بالکل پسند نہیں آیا تھا۔"

نمرہ رزاق۔ کراچی

تجریدی آرٹ

راجے صاحب وزیر اعلیٰ پنجاب تھے تو آرٹ کے ایک نقاد نے ان کی تصویر دیکھنے کی ضد کی اور ایک پینٹنگ دیکھ کر کہنے لگا۔

"یہ تجریدی آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔"

راجے صاحب نے کہا۔ "تصویر تو ابھی نہ گیری میں ہے۔ اس کینوس پر تو میں نے برش صاف کیے تھے۔ ویسے بھی تجریدی آرٹ وہ ہوتا ہے، جس میں نقاد مصور کو یہ بتاتے ہیں کہ اس نے کیا بنایا ہے۔"

کسی نے تجریدی مصوری کی یوں تعریف کی ہے کہ "وہ تصویر جسے آپ دیوار پر اُکھڑے ہوئے پلستر کو چھپانے کے لیے لگائیں اور لگانے کے بعد یہ سوچیں کہ اُکھڑا ہوا پلستر زیادہ بہتر تھا۔"

رخسانہ ظفر۔ لاہور

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے حدیث بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"دجال مشرق کی ایک زمین سے نکلے گا، اسے خراسان کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس کا اتباع کریں گے، ان کے چہرے ایسے ہوں گے جیسے تہ دار ڈھال ہوتی ہے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ جس علاقے کو ماضی میں "خراسان" کہا جاتا تھا اس میں اکثر حصہ موجودہ افغانستان کا ہے۔ کچھ حصہ موجودہ ایران کا اور روس سے آزاد ہونے والی ان ریاستوں کا ہے جو افغانستان کے شمال میں واقع ہیں۔

2۔ چہرے کی تہ دار ڈھال کی طرح چپٹے چہروں والے لوگ چین میں، تبت میں، پاکستان کے شمالی علاقوں (گلگت اور بلتستان وغیرہ) میں اور جاپان میں پائے جاتے ہیں۔ حدیث میں ان ہی علاقوں میں سے کسی علاقے کے باشندے مراد ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے خراسان کے بعض علاقوں کے لوگ بھی ایسے ہوتے ہوں۔

موتی مالا

- سڑک چاہے کانچ کی کیوں نہ ہو، پیدل چلنے والوں کو تھکا دیتی ہے۔
- جو راستوں کے عشق میں گرفتار ہو جاتے ہیں، منزلیں ان سے دور ہو جایا کرتی ہیں۔
- اگر آپ سب کچھ کھو چکے ہیں تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جو سب کچھ کھو دیتا ہے، اُس کے پاس پانے کے لیے پوری دُنیا ہوتی ہے۔
- خون کے رشتے چاہے کتنے ہی اذیت ناک کیوں نہ ہوں، تا دم آخر ہمارے احساسات کے ساتھ جڑے رہتے ہیں۔ کچھ رشتوں کو برتتے ہوئے پل صراط پر سے گزرنے کا گمان ہوتا ہے۔

آمنہ اُجالا۔ ڈبرکی

باکمال بچی

حضرت شیخ محمد بن سلیمان جزولی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں سفر پر تھا۔ ایک مقام پر نماز کا وقت ہو گیا وہاں کنواں تو تھا مگر ڈول اور رسی نہ دارد۔ میں اسی فکر میں تھا کہ ایک مکان کے اوپر سے ایک بچی نے جھانکا اور پوچھا۔

"آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "بیٹی! رسی اور ڈول۔"

اس نے پوچھا۔ "آپ کا نام؟"

فرمایا۔ "محمد بن سلیمان جزولی۔"

بچی نے حیرت سے کہا۔ "اچھا، آپ ہی ہیں جن کی شہرت کے ڈنکے بج رہے ہیں اور حال یہ ہے کہ کنویں سے پانی بھی نہیں نکال سکتے۔"

یہ کہہ کر اس نے کنویں کے اندر تھوک دیا۔ کمال ہو گیا۔ آناً فاناً پانی اوپر آ گیا اور کنویں سے چھلکنے لگا۔ آپ نے وضو اور نماز سے فراغت کے بعد اس باکمال بچی سے فرمایا۔

"بیٹی! سچ بتاؤ تم نے یہ کمال کس طرح حاصل کیا؟"

کہنے لگی: "میں درود پاک پڑھتی ہوں۔ اسی کی برکت سے یہ کرم ہوا ہے۔"

آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اس باکمال بچی سے متاثر ہو کر میں نے وہیں عہد کیا کہ میں درود شریف کے متعلق کتاب لکھوں گا۔ چنانچہ آپ نے درود شریف کے بارے میں کتاب لکھی جو بے حد مقبول ہوئی

(سعادۃ الدارین۔ ص ۱۵۹)

ثمرین شہزادی۔ ملتان

صدقہ کی فضیلت،

حضرت عمر بن عبدالرحمٰن (ذراعیؒ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ عید کی رات کو ایک پڑوسی نے آکر مجھ سے کہا۔

"صبح کو عید ہے اور میرے پاس بچوں کی عیدی کے لیے کچھ نہیں ہے لہٰذا اگر آپ کچھ عنایت فرما دیں تو بڑا کرم ہوگا۔" مجھے اس کی اس پریشان حالی پر بڑا رحم آیا اور اپنے بچوں کی عیدی کے لیے جو پچیس درہم میرے پاس موجود تھے۔ میں نے اس کو دے دیے۔ اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو دے گا۔ اللہ کی شان تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک شخص آیا اور کمال ادب سے میرے ہاتھ پیر چومنے لگا۔ میں حیرت میں تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟"

اس نے کہا: "میں آپ کے والد کا غلام ہوں عرصہ ہوا شیطان کے ورغلانے سے بھاگ گیا تھا۔ اور ندامت کی وجہ سے منہ نہ دکھاتا تھا۔ میرے پاس پچیس اشرفیاں ہیں۔ آپ میرے مالک ہیں جو چاہیں کریں۔"

میں وہ پچیس دینار لے کر خدا کا شکر ادا کرتا ہوا گھر میں آیا اور گھر والوں سے کہا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے پچیس درہم کے بدلے پچیس دینار سرخ عطا فرما دیے ہیں۔" میں نے اس خوشی میں اس غلام کو آزاد کر دیا جس سے وہ بھی خوش ہو کر دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

(حکایات الصالحین)

دعا،

حضرت امام زین العابدینؒ اکثر دعا مانگنے سے پہلے فرماتے۔

"اے خدا! میں تجھ سے دعا صرف اس لیے مانگتا ہوں کہ یہ تیرا حکم ہے ورنہ میں کون ہوتا ہوں تجھے مشورہ دینے والا کہ میرے لیے کیا بہتر ہے۔"

صبا افضل بٹ۔ رینالہ خورد

اچھی بات،

اپنے آپ کو "زیر" سمجھو "زبر" نہ سمجھو کیونکہ کل کو تمہیں "پیش" بھی ہونا ہے۔

نمرہ، اقرا، کراچی

قانون،

کیسے دلچسپ ہوتے ہیں وہ لوگ۔ جو ہمیشہ علاج کرتے ہیں اور اپنی تکلیفوں کو بڑھاتے اور پیچیدہ بناتے چلے جاتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ کہیں سے کوئی عطائی نسخہ ہاتھ آجائے مگر ان کی حالت ہمیشہ بد سے بدتر ہوتی چلی جاتی ہے۔

کیا ان لوگوں کا عمل کھیل کے مساوی نہیں ہے جو اپنا ہاتھ قانون سازی پر صاف کرنا چاہتے ہیں کہ اصلاحات کے ذریعے سے وہ بنی نوع انسان کی بددیانتیوں اور بدمعاشیوں کا خاتمہ کر دیں گے۔ ان کو یہ علم نہیں کہ وہ درحقیقت ایک ہائیڈرا (یونانی صنمیات میں ہائیڈرا ایک سانپ کو کہتے ہیں جس کے ایک سر کے کاٹنے کے ساتھ بہت سے سر پیدا ہو جاتے ہیں) کا گویا سر کاٹ رہے ہیں۔"

(افلاطون)

ام ہانی۔ لاڑکانہ

مختصر زندگی،

- کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لیے ہزار ہزار سال کی عمر بخشی کہ وہ اسے عبادت میں صرف کریں گے لیکن انسان بڑے بے پروا نکلے۔ انہوں نے خیال کیا کہ جب اتنی لمبی عمر ہے تو کیوں کچھ عیش و عشرت میں بھی گزاری جائے۔ جب بڑھاپا آئے گا تو اللہ کو یاد کر لیں گے۔ تب اللہ نے انسانی زندگی کی میعاد گھٹا کر ایک سو سال کر دی تاکہ انسان اس چند روزہ زندگی کو ذکر خدا اور فکر عاقبت میں گزارے لیکن انسانوں نے اس کے برعکس "کھاؤ پیو مزے اڑاؤ، کل تو فنا ہونا ہے" کے مقولے پر عمل کیا۔
- ملکہ الزبتھ اول نے مرتے وقت کہا کہ اگر کوئی ڈاکٹر مجھے اب زندہ رکھے تو میں ایک منٹ کی قیمت ایک لاکھ دینے کے لیے تیار ہوں مگر یورپ کا کوئی بھی ڈاکٹر ملکہ الزبتھ کو زندگی کا ایک سیکنڈ بھی دے سکا۔
- نوشیرواں کو ایک شخص نے مبارک باد دی کہ تمہارے ایک جانی دشمن کو اللہ نے اٹھا لیا۔ نوشیرواں نے کہا۔ کیا تم نے یہ بھی سنا کہ اللہ مجھے چھوڑ دے گا۔"
- ایک سادھو کی منڈلی میں کسی نے کہا کہ والی ججہ پور راجا امر سنگھ تو مر گئے بچے ہیں۔"
سادھو نے کہا: "بچہ تو بچ گئے مرنے گا آخر کب تک بچے گا۔"
- حضرت جبرئیلؑ نے ایک دن حضرت نوحؑ کی خدمت میں عرض کیا۔

"آپ کی عمر سب پیغمبروں سے زیادہ ہوئی۔ آپ نے دنیا کو کیسا پایا؟"

فرمایا: "مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک مکان کے دو دروازے ہیں۔ میں ایک سے اندر گیا اور دوسرے سے باہر آگیا۔"

شہناز شاز نے سیال۔ خانیوال

توبہ،

حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب اللہ جل شانہ کی درگاہ میں حضرت آدمؑ کی توبہ قبول ہوئی تو اس وقت فرشتوں نے مل کر حضرت آدم علیہ السلام کو مبارک باد دی اور حضرت جبرائیل علیہ السلام، حضرت اسرافیل علیہ السلام اور حضرت میکائیل علیہ السلام بھی آپ کے پاس تشریف لائے اور عرض کی حضرت آدم علیہ السلام کو خبر دی کہ آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ خداوند کریم نے آپ کی توبہ کو قبول کر لیا ہے۔ اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا۔

"اے جبرائیل! اگر اس کے بعد مجھ سے سوال ہوا تو میرا کیا ٹھکانا ہوگا؟"

اسی وقت اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی۔

"اے آدم! تو نے اپنی اولاد کے واسطے رنج اور مشقت کو میراث میں چھوڑا ہے اور اسی طرح توبہ کو بھی میراث دیا ہے۔ پس جو کوئی میری بارگاہ میں توبہ کے لیے رجوع کرے گا تو میں اس کی توبہ کو قبول کروں گا جس طرح میں نے تیری توبہ قبول کی ہے اور ان کو بخش دوں گا جنہوں نے توبہ کی۔"

وقت کرتا ہے پرورش،

- دریا پہاڑوں میں سے سمٹ کر گزرتا ہے اور میدانوں میں سے پھیل کر گزرتا ہے۔ اپنے حالات کے مطابق سفر کرنا چاہیے۔ انسان حالات سے باہر ہو جائے تو بکھر کر رہ جاتا ہے۔
- اضطراب دراصل اس فرق کا نام ہے جو ہماری خواہشات اور ہمارے حاصل میں ہوتا ہے۔
- سب سے پیارا انسان وہ ہوتا ہے جس کو پہلی ہی بار ملنے پر دل یہ کہے میں اسے پہلی بار سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔
- ظاہر کی روشنی کی تلاش آنکھ کی بینائی سے ہے اور باطن کے نور کی تلاش قلب منور سے ہے۔
- توبہ قبول ہو جائے تو وہ گناہ کبھی دوبارہ سرزد نہیں ہوتا۔
- زندگی آمدن اور خرچ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے اس میں چہرے بھی ہیں اور نگاہیں بھی۔
- گناہ کسی بدی کے ہو جانے کا نام ہے۔

ذکیہ غفار۔ اوچ شریف

شاعری سچ بولتی ہے

سوہٹھ سانند

شروعات کروں گی اپنے پسند کے شعر سے۔

میں سکون ڈھونڈتا رہا بہاروں میں
حسین وادیوں میں سرمئی نظاروں میں
میں اس کی تلاش میں جا پہنچا نظاروں میں
مگر وہ مجھے ملا قرآن کے تیس پاروں میں

ابھی کچھ دن پہلے غلام حسین شہزیب کی غزل کتاب "بستی بستی دھوپ" سے لی ہے۔ امید کرتی ہوں آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

قریہ قریہ بستی بستی جشن منایا کرتے تھے
تیز ہوا میں پیار کے پتے دیپ جلایا کرتے تھے

شاخ شاخ میں اب بھی تیرے پیار کا دھیما لہجہ ہے
جن پیڑوں کے سائے میں ہم گیت سنایا کرتے تھے

آج رتوں کے ساتھ جو بدلا ہم کو تنہا چھوڑ گیا
کل تک تو اس پیڑ کے پتے ہم پر سایہ کرتے تھے

بوڑھے برگد کی شاخوں پر جھولتے تھے ہم روزانہ
سپنوں کے کیا سندر محل بنایا کرتے تھے

کھوئے کھوئے رہنے والا راز محبت فاش ہوا
بھیگی آنکھ نے کہہ ڈالا جو راز چھپایا کرتے تھے

میری طرح وہ پیڑ بھی اب تک تنہا رہتا ہے
جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں تم پریت جتایا کرتے تھے

شہزیب تم تو اتنی جلدی ساتھ ہمارا چھوڑ گئے
کل تک پیار کی کیسی کیسی قسمیں کھایا کرتے تھے

کوئی بھی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ دیکھئے یہ سلیمہ کوثر کیا کہہ رہی ہیں۔

بڑا دشوار ہوتا ہے ذرا سا فیصلہ کرنا
کہ جیون کی کہانی کو بیان بے زبانی کو
کہاں سے یاد رکھنا ہے، کہاں سے بھول جانا ہے

اسے کتنا چھپانا ہے، اسے کتنا بتانا ہے
کہاں ہنس ہنس کے رونا ہے
کہاں رو رو کے ہنسنا ہے
کہاں آواز دینی ہے
کہاں خاموش رہنا ہے
کہاں رستہ بدلنا ہے
کہاں سے پلٹ کے آنا ہے

شاعری کا انتخاب ہو اور احمد فرید کا نام نہ آئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ان کی ایک طویل نظم کا کچھ حصہ آپ سب قارئین کی نذر۔

کیا میں کبھی تم کو یاد نہیں آیا
کبھی کسی درگاہ میں دیا جلاتے ہوئے
لچکتی شاخ پہ پہلا گلاب کھلتے ہوئے
کبھی یوں ہی مخصوص دھن کو سنتے ہوئے
کبھی یوں ہی کتاب پڑھتے ہوئے
برستے ابر میں چھت پر کبھی نہاتے ہوئے
کسی خیال میں بیٹھے سے اٹھ کر چلتے ہوئے
کسی بھی رات کو یوں ہی ٹہلتے ہوئے
اکیلے دور تک خاموشی میں چلتے ہوئے
خلا میں ذات کے بے آسرا بھٹکتے ہوئے
کسی پہاڑ پر سنبھل کر چلتے ہوئے
اترتے چاند کا موجوں میں عکس پڑتے ہوئے
خزاں میں سوکھے پتے کا شور سنتے ہوئے
مٹے ہوئے درختوں سے نام پڑھتے ہوئے
تو کیا میں تم کو کبھی بھی یاد نہیں آیا
کسی گلاب کو ٹہنی سے توڑ کر بھی نہیں
کسی کبوتر کی گردن کو چھوڑ کر بھی نہیں
کسی درخت کے سائے میں بیٹھ کر بھی نہیں ...

اب آخر میں اپنی پسند کے کچھ اشعار آپ کی نذر کر رہی ہوں۔

کبھی اس طور سے ہنسنا دنیا کو رلا دینا
کبھی اس رنگ سے رونا کہ خود پہ مسکرا دینا
میں تیری دسترس چاہوں مجھے ایسی دعا دینا
[illegible]

کل سامنے تھی منزل میری اور پیچھے آوازیں
چلتا تو بچھڑ جاتا اور رکتا تو سفر جاتا
میں شہر کی بھیڑ میں گم ہو کر بہت خوش تھا
اک شام بچا لیتا اور اک روز تو گھر جاتا

میں تو ساحل تھا چلتا بھی تو کیسے چلتا
وہ بھی موجوں کی طرح آیا تو پل بھر کو ٹھہرا
چاند نکلا تھا جو چلا آیا میری جانب
میں تو بادل تھا ہمیشہ سے بے گھر ٹھہرا

سر راہ کچھ بھی کہا نہیں کبھی اس کے گھر میں گیا نہیں
میں جنم جنم سے اسی کا ہوں اسے آج تک یہ پتا نہیں

ایک پل کا جینا بھی قیامت تھا ندیم
اور دعا طویل عمر کی ملتی رہی

اور اب آخر میں اپنا تعارف۔ میں عمر کوٹ سے دور چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہوں۔ میرا نام سوہٹھ ہے۔ میری تعلیم انٹر ہے اور اب پڑھائی چھوڑ دی ہے۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ میرا انتخاب آپ کو کیسا لگا، ضرور بتائیے گا۔

★

آسیہ جاوید ——— علی پور چٹھہ

دلِ ناداں عجب جستجو میں ہے
تم سے پھر شوقِ گفتگو میں ہے
جُدا خود سے کروں تو کیسے کروں
تیری چاہت تو میری گردشِ لہو میں ہے

آصفہ صداقت ——— چشتیاں

تیری ذات کے روشن پہلو کیوں مجھ پہ نہیں کھلتے
چلو چھوڑو کسی کی طلب میں یوں نہیں رلتے
وہ وعدہ تیرا اور ایفا نہ کرنے کی عادتیں
خوابوں، خواہشوں کے جزیرے ہر کسی کو نہیں ملتے

طیبہ سعدیہ سعدی ——— سیالکوٹ

ملا کرو ہمیں اکثر کہ جی نہیں لگتا تمہارے بن
تمہارے رابطے سے زندگی وجود میں ہے

طوبیٰ ——— گجرات

اپنے بالوں کی سفیدی سے ڈرتا ہوں
زندگی اب تیری رفتار سے ڈر لگتا ہے

مہوش ڈوگر ——— گوجرانوالہ

کل کے اندیشوں سے اپنے دل کو آزردہ نہ کر
دیکھ یہ ہنستا ہوا موسم یہ خوشبو کا سفر

فرخندہ خالد ——— اٹک

تھے خاکِ راہ بھی ہم لوگ قہرِ طوفاں بھی
سہا تو کیا نہ سہا اور کیا تو کیا نہ کیا
وہ حیلہ گرِ جور و جفا جو بھی ہے، جفا خو بھی
کیا بھی فیض تو کس بت سے دوستانہ کیا

عقیلہ حنا ——— رینالہ خورد

بہت خاموش لوگوں سے بہت الجھا نہیں کرتے
جو دل کو روگ لگ جائے، وہ پھر سلجھا نہیں کرتے

سمیرا ذکریا ——— منصور آباد فیصل آباد

تمام عمر کی آوارگی پہ بھاری ہے
وہ اک شب جو تیری یاد میں گزاری ہے

مدیحہ نداء ——— فیصل آباد

ترکِ اُلفت کی قسم بھی کوئی ہوتی ہے قسم
تو کبھی یاد تو کر بھولنے والے مجھ کو
مجھ سے تو پوچھنے آیا ہے وفا کے معنی
یہ تیری سادہ دلی مار نہ ڈالے مجھ کو

عظمیٰ نادیہ ——— کراچی

وہ جنہیں سورج میری چوکھٹ سے ملا کرتا ہے
آج خیرات میں دیتے ہیں اُجالے مجھ کو

مریم رانا ——— منڈی بہاؤالدین محمد

اَنا کے دبیز پردوں کو ہٹا کے دیکھ لے زندگی!
محبت آج بھی بادوداں ہے دل کے تہہ خانوں میں

سدرہ مزمل ——— پنڈی شریف جہلم

نکلتا سورج روشنی دے آپ کو
مہکتا پھول خوشبو دے آپ کو
ہم تو کچھ دے نہیں سکتے، دعا ہے کہ
زندگی دینے والا زندگی دے آپ کو

صبا سلیم ——— منڈی دھان محمد

کوئی بھی کام ہو انجام تک نہیں جاتا
کسی کے دھیان میں پل پل یہ دھیان ٹوٹتا ہے
کہ جیسے متن میں ہر لفظ کی ہے اپنی جگہ
جو ایک فرد گئے، کارواں ٹوٹتا ہے

صبا افضل بٹ ——— رینالہ خورد

اپنی آنکھوں کو با وضو رکھنا
جب بھی آئینہ رو برو رکھنا
زندہ رہنا بھی اک عبادت ہے
زندہ رہنے کی آرزو رکھنا

بینش جاوید ——— کھروڑ پکا

زندگی پر تیری عبادت، تیرا افسانہ، تیری حکایت
کتابِ ہستی جہاں سے کھولی تیری محبت کا باب نکلا

صائمہ بشیر ——— گجرات

گرنے والے کو بھلا کون سہارا دیتا
شام کا وقت تھا ہر شخص کو گھر جانا تھا

نمرہ اقرا ——— کراچی

اس شہر کی تباہی کا منظر عجیب ہے
گھر جل رہے ہیں اور سمندر قریب ہے

نازیہ عنبرین ——— سرگودھا

کوئی کمال، کوئی وعدہ تلاش کرتا ہے
وہ واپسی کا ارادہ تلاش کرتا ہے
وہ ریت کر کے مرے خوابوں کی زمینوں کو
مرے وجود میں دریا تلاش کرتا ہے

نادرہ عنایت ——— منڈی بہاؤالدین

زندگی دین بسیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ نفس عمر کے پھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
جس کو نادان کی بولی میں صدی کہتے ہیں
وہ گھڑی شام سویرے کے سوا کچھ بھی نہیں

ایس عطاریہ ——— بادہ قلعہ

دکھ ہے، احساسِ جرم ہے، کیا ہے
کوئی اندر سے توڑتا ہے مجھے
جیسے یہ شہر کل نہیں ہوگا
جانے کیا وہم ہو گیا ہے مجھے

رقیہ ارشد ——— وزیر آباد

تم سے طلب صلہ کیا؟ تم سے کوئی گلہ کیا؟
دیدۂ تر کا ذکر کیا، یونہی چھلک گیا کہیں

سائرہ سحر ریاض احمد ——— چلیانوالہ

کچھ ایسے سنگ ہوئے منتظر جہروں کے
کہ آئینے بھی کہیں، اپنے رو برو کیا ہے
وہی نگاہ، وہی راہِ آشنائی کی
غبارِ شام میں اور اپنی جستجو کیا ہے

سمیرا حیات ——— رینالہ خورد

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں، کوئی کہیں رہتا ہے
روز ملنے پہ بھی لگتا تھا کہ جگ بیت گئے
عشق میں وقت کا احساس نہیں رہتا ہے

ہاجرہ رحمٰن ——— پشاور

دلِ افسردہ تو ہوا دیکھ کے اس کو لیکن
عمر بھر کون جواں، کون حسیں رہتا ہے

سونیا ر تابانی ——— قاضیاں محلہ بالا

اب اور کتنی دیر یہ دہشت، یہ ڈر، یہ خوف
گردِ غبارِ عہدِ ستم اور کتنی دیر
شام آ رہی ہے، ڈوبتا سورج بتائے گا
تم اور کتنی دیر ہو، ہم اور کتنی دیر

آمنہ اُجالا ——— ڈہرکی

اندھیرا لاکھ ہو، مجھ کو سحر کی آس رہتی ہے
یہی وہ روشنی ہے جو مجھے ڈرنے نہیں دیتی
مجھے معلوم ہے وعدہ نبھانا سخت مشکل ہے
مری کم ہمتی انکار بھی کرنے نہیں دیتی

سائرہ لنگڑیال ——— سیال موڑ

جگمگاتے شہر میں تاریک گھر
صبح دم لگتا ہے جیسے شام ہے
راستہ طے ہو تو منزل بھی ملے
زندگی تو راستے کا نام ہے

شازیہ رانا ——— دیپال پور

ربط کس سے تھا کسے کس کا شناسا کون تھا
شہر بھر تنہا تھا لیکن مجھ سا تنہا کون تھا
کچھ برے تھے، کچھ بھلے تھے، خاک تھے، گلزار تھے
ہر کوئی انسان تھا، آخر فرشتہ کون تھا

حورالعین اقبال ——— کراچی

وہ خواب تھا بکھر گیا، خیال تھا ملا نہیں
مگر دل کو کیا ہوا، یہ کیوں بجھا پتا نہیں
ہر اک دن اُداس دن، تمام شب اُداسیاں
کسی سے کیا بچھڑ گئے کہ جیسے کچھ بچا نہیں

شہناز شازیہ سیال ——— خانیوال

دوسروں کے لیے جو زندہ ہوں
اُن کے دکھ بے حساب ہوتے ہیں

رضیہ جمیل

خط آپ کے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات۔ لیے حاضر ہیں۔
آپ کی ہدایت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اور وہ لوگ جو پاکستان کو توڑنا چاہتے ہیں ان کے ارادوں کو ناکام کرے۔ آمین۔

سب سے پہلے ایک اچھی خبر آپ کی پسندیدہ مصنفہ کنیز نبوی کے قدموں تلے جنت تعمیر ہوئی ہے۔ شفا نبوی ان کے آنگن میں رحمت بن کر آئی ہیں۔

ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ شفا نبوی کو دین و دنیا کی تمام نعمتوں سے نوازے اور انہیں زندگی کی ساری خوشیاں عطا کرے۔ آمین

فرح فاطمہ حویلی لکھا سے تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں۔

اس ماہ مجھے ایک بہت بڑی خوش خبری ملی میں نے 9th کلاس میں 480 میں سے 448 نمبر حاصل کیے (وہ بھی سائنس کے مضامین کے ساتھ) اور علاقے بھر میں صرف ایک نمبر کے فرق سے سیکنڈ پوزیشن کی حقدار ٹھہری۔ (فرسٹ پوزیشن والے سے ایک نمبر کا فرق ہے)

سندس جبیں کا مکمل ناول بہت زبردست اور اچھا تھا اس کی تعریف کے لیے تو الفاظ ہی نہیں ہیں۔ راشدہ رفعت کا مکمل ناول بھی زبردست تھا۔ اس ماہ کے شمارے کی جان تو افسانے تھے۔ تینوں افسانے ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ "عید کا چاند" واہ کیا تحریر ہے ثمرہ بخاری کی۔ واقعی شمارے میں ایک آدھ تحریر ہنسنے ہنسانے والی بھی ہونا چاہیے۔ ثمرہ بخاری جی اب جواری اور شبلی کو بھی لے ہی آئیں۔ بہت دن ہو گئے ان سے ملے ہوئے۔ اور اب ان بچاروں کو برسر روزگار بھی کرا دیں۔ آئینہ خانے میں اب پہلے جیسا مزہ نہیں رہا۔ لطائف تو اس دفعہ بہت زبردست تھے۔ تاریخ کے جھروکوں کے صفحات بڑھا دیں۔ مجھے "باتوں سے خوشبو آئے" سلسلہ بہت پسند ہے اور ایک فرمائش بھی ہے کہ پلیز اس ماہ کی مسکراہٹوں کے صفحات زیادہ کریں۔

سب سے اہم بات بھول گئی۔ اس ماہ کا ٹائٹل دیکھ کر جی اندر تک خوش ہو گیا۔ ماڈل کا ڈریس، مہندی، جیولری، سرورق کا بیک گراؤنڈ اور خود ماڈل سب کچھ بہت پرفیکٹ تھا۔ لیکن ماڈل کے بال کچھ چھوٹے تھے۔

پیاری فرح! مبارک باد اور دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر امتحان میں کامیاب و کامران کرے۔ آمین شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

اسلام آباد سے ہما مظہر نے لکھا ہے

سب سے پہلے "خط آپ کے" اور "رنگ عید کے" سمیٹے اس کے بعد "دل کے رستے" پر چل نکلے۔ ماہم نے جو کچھ کیا۔ اس لحاظ سے اس کی سزا کم تھی۔ اس کے ساتھ اس سے بھی برا ہونا چاہیے تھا اور منصور نے شاہم کے ساتھ جو کیا یعنی اتنی قربانی اور خدمت کے باوجود یہ عزت افزائی! ویسے جو کہتے ہیں یقیناً "ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ مرد کی محبت خدمت سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ خدمت تو ماسیاں بھی بہت کرتی ہیں۔ مرد کے دل میں جب ایک بس جائے تو مشکل ہے کہ کوئی اور اس کی جگہ لے سکے۔ ویسے بھی شاہم اتنے عرصے میں منصور کے دل میں وہ جگہ نہیں بنا پائی تھی جو ماہم کو حاصل تھی تو اسے منصور کو اس حد تک آزمانے کی کیا ضرورت تھی" اسلوی بٹ جی نے ناول کے آخر میں اپنا نقطہ نظر حضرت علی کے قول سے واضح کر دیا جو یقیناً "اس ناول کا لب لباب تھا۔

اس کے بعد "قافلے راہ بھول جاتے ہیں" سندس جبین کا پڑھا۔ بہت ہی زبردست لکھا۔ ناول میں شاعری بہت بھائی۔ اریجہ کے صبر پر ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور یہ وڈیروں کی پنچایت اور ان کے فیصلے! ہمارا مذہب کہاں اس بات کا درس دیتا ہے؟ جرم کوئی کرے سزا کسی کو دی جائے۔ راحت نذیر کا "عیدی" بھی اچھا لگا۔

ثمرہ جی کا "عید کا چاند" (ویسے ثمرہ جی خود بھی تو عید کا چاند ہی ہو گئی ہیں) ہمارے چہرے پر مسکراہٹیں بکھیر گیا۔ ناہید کے حسن بھائی گاؤں سے جو سوغات لائے تھے ان کی فہرست پڑھ کر ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا اور آپاؤں نے دونوں بھنوں کی آتے ہی جو عزت افزائی کی وہ قابل دید تھی۔

جی جناب اب آتے ہیں ہم راشدہ رفعت کے ناول کی طرف۔ بہت ہی دلچسپ ناول ماہا اور اس کی ماں کا کردار پسند آیا۔

پیاری ہما! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

طیبہ سعدیہ سیالکوٹ گاؤں کتھیالہ سے لکھتی ہیں۔

سب سے پہلے سلوی بٹ کو پڑھا شاہم کے ساتھ بہت ہی برا ہوا۔ اس کے بعد "زندگی خوب صورت ہے" پڑھا ماہا کی سعد کے ساتھ لیس سیل سمجھ کر کرنا بڑا ہی مزا آیا۔ "قافلے راہ بھول جاتے ہیں" سندس جبین کا ناول بڑا ہی زبردست رہا اس دفعہ کا ٹائٹل بہت ہی پیارا تھا۔ مہندی بھی میں نے بھی ماڈل کی مہندی دیکھ کر لگائی بہت اچھی لگی۔

طیبہ! بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے ہمیں خط لکھا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

مسرت حسن نے ریاض سے ای میل کی ہے

شعاع کا ساتھ اٹھارہ سال پرانا ہے۔ شعاع زندگی کے ہر نشیب و فراز میں میرے ساتھ رہا ہے۔ بہرحال تبصرے کی طرف آتی ہوں۔ "دل کے رستے" کے بارے میں صرف اتنا کہوں گی کہ انہوں نے انصاف نہیں کیا "کوئی (شاہم) اپنا سب کچھ چھوڑ کر نیکی کرے اس کا انجام خراب اور کوئی (ماہم) سب کو دکھ دے پھر بھی کامیاب۔ آخری قسط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔

"میری صبح کا ستارہ" کافی سست جا رہا ہے "تیزی لائیے ذرا۔ کاشف کا انجام برا ہونا چاہیے — "ستارہ شام" بھی سست روی کا شکار ہے۔ "دیوار شب" میں ذرا ہلچل مچائیے۔ "تو عید کا چاند" پڑھ کر مزا آیا۔ "عیدی" بھی اچھا لگا۔ "زرد زمین کی کوکھ" پرانی کہانی تھی مگر اینڈ اچھا تھا۔ "زندگی خوب صورت ہے" بہت اچھا لگا۔ اس میں لفظوں پر گرفت اچھی تھی۔ "تتلی کے پر" عام کہانی تھی۔ کوئی اچھوتا پن نہیں تھا۔ آج کل کی لڑکیوں میں یہ عام بات ہے۔ "قافلے راہ بھول جاتے ہیں" بہت زبردست رہا۔ اریجہ کے صبر پر بڑی حیرت ہوئی۔

پیاری مسرت! آپ کے خط اور انتخاب بھی تو شعاع کے صفحات پر جگہ پاتے ہیں۔ ممکن ہے آپ نے ای میل کی ہوں اور وہ شامل نہ ہو سکی ہوں۔ شعاع کی پسندیدگی اور تفصیلی تبصرے کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

لاہور سے بشریٰ اعوان تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں

شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کی تقریباً گیارہ یا بارہ سال سے خاموش قاری ہوں۔

سب سے پہلے "دیوار شب" کے بارے میں بس اتنا کہوں گی کہ عفیہ بخاری نے کہانی کو اتنے طویل عرصہ تک دلچسپ رکھا "کہیں بھی بوریت نہیں محسوس ہوئی اور خاص طور پر تیتی اور سالار کا ملن بہت اچھا اور ڈرامائی تھا۔ ستارہ شام آغاز میں تو اتنی دلچسپ معلوم نہیں ہوئی مگر اب آ کر کہانی میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ تجسس کا عنصر بھی پیدا ہو گیا ہے اور کردار بھی واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ مکمل ناول دونوں بس سو سو تھے راشدہ رفعت نے نسبتاً "بہتر اور ہلکا پھلکا ناول تحریر کیا سو وہ دل کو زیادہ بھایا۔ افسانوں میں آسیہ مقصود بازی لے گئیں مگر باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ ناولٹ میں ثمرہ بخاری نے اپنا مخصوص روایتی انداز برقرار رکھا۔ سائرہ عارف بھی ناولٹ کو مناسب طریقے سے آگے بڑھا رہی ہیں اور ہاں آپ کا مستقل سلسلہ "تاریخ کے

جھوم کے "بے حد دلچسپ اور میرا پسندیدہ ہے۔ آپ سوچ رہی ہوں گی کہ سب چیزوں پر تبصرہ کیا مگر "دل کے راستے" (سلویٰ بٹ) کو چھوڑ دیا۔ جناب جب کہانی شروع ہوئی تو ہلکی پھلکی رومانٹک اسٹوری محسوس ہوئی آگے جا کر کہانی خطرناک حد تک سنجیدہ ہو گئی اور اینڈ انتہائی بھونڈے اور مضحکہ خیز انداز میں کیا گیا۔ خدارا اس طرح کی کہانیاں شعاع کا حصہ مت بنایا کریں۔ میں نے اس کو فرسٹ ایر سے پڑھنا شروع کیا اور اب میں جب دو عدد پیارے بچوں کی ماں ہوں' اس کو باقاعدگی سے پڑھتی ہوں اور اس دوران زندگی میں جتنے بھی نشیب و فراز آئے شعاع اور خواتین میرے ساتھ رہے اور اس کی بہت سی سبق آموز کہانیوں نے میرے لیے مشعل راہ کا کام بھی کیا۔

پیاری بشریٰ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ سلویٰ علی بٹ کا ناول آپ کو متاثر نہ کر سکا۔ دراصل یہ روایتی کہانیوں سے مختلف انداز کی کہانی تھی۔ اس کہانی کے سارے کردار بنیادی طور پر نیگیٹو تھے اور اسی لیے سب برے انجام تک پہنچے۔

دیگر مصنفین تک آپ کا تبصرہ ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

فائزہ خان لودھی نے لندن سے ای میل کی ہے

میں تین سال سے لندن میں شعاع کی مستقل قاری ہوں۔ سب سے پہلے سلسلے وار ناول کے بارے میں بات کروں گی "دیوار شب" اور "ستارہ شام" دونوں بہت اچھے ہیں' خاص طور پر "ستارہ شام" اس کی ہر قسط کے ساتھ دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ "صبح کا ستارہ" سو سو ہے۔ "دل کے رستے" ایک اچھی کوشش تھی۔ شاہم کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ ماہم اتنے اچھے سلوک کی مستحق نہیں تھی۔ منصور شروع میں اچھا لگا مگر بعد میں ولن ٹائپ لگا۔ اس ناول کا ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ خاص طور پر ماڈل کے لباس اور میک اپ۔ اس ماہ سب سے بہترین افسانہ آسیہ مقصود کا "زرد زمین کی کوکھ" تھا۔ اس کے علاوہ راحت نذیر نے بھی اچھا لکھا۔ دیگر سلسلے بہترین ہیں۔ ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ کنیز نبوی کہاں ہیں آج کل۔ آپ کے لیے بہت ساری دعائیں۔

فائزہ جی! آپ نے اتنی دور سے ہمیں یاد کیا' بہت خوشی ہوئی۔ شعاع اور خواتین تقریباً" پوری دنیا میں پڑھا جاتا ہے اور ہمیں جب دور دور سے خط ملتے ہیں تو یقین کریں بہت خوشی ہوتی ہے۔ آسیہ مقصود بھی لکھنے والی ہیں۔ کنیز نبوی نے جلد لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

گل زرینہ نے خانیوال سے لکھا ہے

جو بات خط لکھنے کا باعث بنی وہ تھی سلویٰ بٹ کی تحریر دل کے رستے دشوار بہت تھے۔ کیا اینڈ کیا ہے اس ناول کا کہ میرا تو ہر رشتے سے اعتبار ہی اٹھ گیا ہے۔ ماہم عورت کے نام پر دھبہ تھی بہت بڑا۔ اس طرح کے کردار ہمارے ارد گرد بہت زیادہ ہیں لیکن منصور بھی مردوں کے نام پر دھبہ نکلا۔ شاہم جس نے اتنی بڑی قربانی دی۔ بچوں کی خاطر اپنی پوری زندگی کا روگ خریدا۔ کیا ملا اسے آخر میں؟ ایک بات اور اگر کاشا کا H.I.V پوزیٹو تھا تو پھر ماہم کا H.I.V پوزیٹو کیوں نہیں تھا۔ وہ کیوں نہیں مری۔ سب کو زندہ در گور کر کے رکھ دیا۔ باقی پچھلے شمارے میں انیقہ نے چکوال سے لکھا تھا کہ کاشا کے کردار پر کھلا ڈلا لکھا۔ بعض کردار کی ڈیمانڈ ہی ایسی ہوتی ہے کہ اس کے بغیر وہ کردار واضح ہی نہیں ہو گا۔ مکمل ناول میں سندس جبیں کا "قافلے راہ بھول جاتے ہیں" اس ناول کی سطر سطر نے رلایا۔ اس ناول میں اریبہ کی بے بسی نے جی بھر کے رلایا اور دل دکھ سے بھر گیا۔ زندگی خوب صورت ہے کچھ خاص نہیں تھا۔ دیوار شب شروع میں مجھے بہت برا لگتا تھا اب اچھا بن گیا ہے۔ سالار کا کردار مجھے بہت پسند ہے۔ عالیہ کو بہت مبارک باد اتنا اچھا ناول لکھنے پر۔

پیاری گل! شعاع کی بزم میں خوش آمدید' بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمیں خط لکھا۔ اب باقاعدگی سے لکھتی رہیے گا۔

پیاری گل! آپ نے لکھا ہے سلویٰ کی کہانی پڑھ کر رشتوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ تو ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ یقین رکھیں کہ آج بھی دنیا میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو رشتوں پر' محبتوں پر' وفاؤں پر' معاشرتی اقدار پر اور مذہب پر یقین رکھتے ہیں۔ ممتا کا جذبہ تو لافانی ہے۔ یہ کبھی ختم نہ ہو گا۔ ماہم جیسی عورتیں تو خال خال پائی جاتی ہیں جو نفس کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ہر حد سے گزر جاتی ہیں جہاں تک منصور کا تعلق ہے تو منصور کبھی بھی شاہم کی طرف مائل نہ تھا۔ بچے منصور کے تھے' وہ اپنے بچوں کے لیے خود سوچتا۔ شاہم کون ان بچوں کے لیے فیصلہ کرنے کا اور منصور پر اپنا فیصلہ تھوپنے کا حق نہیں تھا۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فریدہ سہیل نے لاہور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

بہت سے چٹ پٹے' مزیدار اور رنگا رنگ خطوط کے درمیان ایک "بنیاد پرست مولون" کا خط بھی وصول کیجیے (خط پڑھ کر آپ کے دل میں میرے لیے بھی اعلاظ آنے کا امکان ہے)

لیکن ٹھہریے اپہلے رسم زمانہ نبھا لیتے ہیں یعنی اپنا تعارف کرائے دیتی ہوں۔ عمر کے تیس سے زائد ادوار دیکھ چکی ہوں' دو بچیوں کی ماں ہوں اور کئی بچیوں کی مدرسہ! گورنمنٹ کالج یونیورسٹی سے ایم ایس سی سائیکالوجی کی اور پھر شادی کے بعد B.H.M.S بھی مکمل کر چکی ہوں اور اب حقیقی اسلامی مقصد کے تحت چلنے والے ایک اسکول سے گزشتہ پانچ سالوں سے وابستہ ہوں۔

دو تین دن پہلے ستمبر کا شعاع ملا۔ میں گزشتہ پندرہ سولہ سال سے جب میں ایف ایس سی کی طالبہ تھی تب سے خواتین اور شعاع کی باقاعدہ قاریہ ہوں۔ اس عرصے میں بہت سی تحاریر پڑھ کر بے اختیار خط لکھنے کو جی چاہا۔ کبھی بہت تعریف کرنے کے لیے اور کبھی تنقیدی جائزہ پیش کرنے کے لیے بھی۔۔۔۔ لیکن بس مصروفیات + سستی' لیکن آج جب میں نے سلویٰ بٹ کا "دل کے راستے" پڑھا تو جذبات کچھ اس شدت سے مچلے کہ بالآخر میں نے انہیں صفحات پر منتقل کرنے کا فیصلہ کر ہی ڈالا۔

کچھ عرصے سے ہمارے ان ہر دل عزیز جرائد میں کچھ غیر محسوس سی "کشادگی" آ رہی ہے۔ جیسا کہ اس ناول میں بھی ہے۔ آپ مجھے ایمانداری سے بتائیے کہ کیا ارسل اور شاہم کا تعلق جائز تھا؟ کیا ہمارا مذہب ہمیں یہ اجازت دیتا ہے کہ صنف مخالف سے اتنی دوستی رکھی جائے یا حقیقی زندگی میں ایسی پاکیزہ محبت اتنے گھنٹوں کی تنہائی کے باوجود ممکن ہے؟ جیسی ارسل کی دکھائی گئی کہ اس نے اپنی جان تک دے دی؟ ماہم اور شاہم دونوں نے جب قسمت کے خوب تھپیڑے کھا لیے تو بھی ان کی ڈور "یار منانے" تک ہی رہی۔ رب تعالیٰ سے حقیقی توبہ تو دونوں نے نہیں چاہی کیونکہ اگر وہ رب اور اس کے دین تک آتیں تو جان جاتیں کہ وہ کہاں اور کتنی گمراہ تھیں تو اس کی تو اپنی معافی ہی مشکوک ہے۔ اس کے علاوہ کاشا کی بے راہ روی کی تصویر کشی اس قدر کھل کر کی گئی بینگ گرلز کی نیچر ہونے کے ناتے میں جانتی ہوں کہ ایسی باتیں کس قدر منفی اثرات مرتب کرتی ہیں بچے ذہنوں پر۔۔۔۔ بہت سی مائیں اپنی بچیوں کے مسائل پر میرے ساتھ بات کرتی ہیں یہ "محبت" تو نئی نسل کو بیماری کی طرح لگی ہوئی ہے کوئی دو چار "کلمے" SMS کرے یا امس کال ہی دے دے تو ہماری بچیاں ہتھیلی میں ریت کی طرح پھسلتی ہیں۔۔۔۔ خدارا آپ ان ناجائز جذبوں کو چھوٹی محبت کو جائز کر کے مت دکھائیے کہ نو عمر لڑکیاں جو خود کو فطری طور پر ہیروئن کی جگہ پر رکھ کر سوچتی ہیں انہیں کسی ہیرو کے ساتھ پارک میں یا فلیٹ میں ملتے کوئی عار ہی محسوس نہ ہو۔

میرا آپ کے جرائد کے ساتھ اتنا پرانا تعلق یقیناً" اعتراف ہے کہ آپ نے بے شمار بہترین اور کردار ساز تحاریر دی ہیں اور بہت موثر پیرائے میں ہمارے ذوق (ادبی) کی تسکین بھی کی ہے آج کل بھی بہت خوب صورت تحاریر آ رہی ہیں جیسے "سفال گر' مصحف' دیوار شام' چراغ آخر شب" سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

پیاری فریدہ! پہلی بات یہ کہ بنیاد پرست کی اصطلاح ہمارے معاشرے میں نجانے کس نے رائج کی ہے اور ہم نے اس کو غلط سمجھ لیا ہے۔ درحقیقت ایک مسلمان کی بنیاد قرآن' حدیث' اسوہ حسنہ ہے اور ان معنوں میں ہر مسلمان بنیاد پرست ہے۔ ہاں اس کے علاوہ کوئی بنیاد ہو تو وہ یقیناً" غلط ہو گی۔ سلویٰ کی کہانی میں ہمیں اعتراف ہے کہ کہیں بے احتیاطی ضرور ہوئی لیکن یہ روایتی ہیرو ہیروئن کی کہانی نہیں تھی۔ اس کہانی کے کردار معاشرے کے وہ افراد تھے۔ نفس کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے' اخلاقی' معاشرتی اور مذہبی اقدار کو پامال کرتے ہیں اور اسی لیے وہ سب برے انجام سے دوچار ہوئے۔ ارسل نے ایک لڑکی کے لیے ماں' باپ اور گھر چھوڑ دیا' شاہم پہلے ارسل کے ساتھ بے تکلفی کی حدود پار کر گئی۔ پھر قربانی کے نام پر اسے بھی چھوڑ دیا' ماہم نے گھر' شوہر بچے کسی چیز کی پروا نہ کی اور دل کے راستوں پر چلتی رہی۔ مذہب کے نام سے تو یہ واقف ہی نہ تھے ان سب کی زندگیاں ان کے

برے کاموں کے باعث اپنے ہاتھوں برباد ہوئیں۔ ناقص تربیت اور غذہب سے دوری کا نتیجہ یہ ہی نکلنا تھا غنی کی اپنے بچے کی تربیت پر غیر معمولی توجہ اسی طرف اشارہ ہے۔

آپ نے ہماری کوتاہی کی طرف توجہ دلائی۔ بہت شکریہ ہم مزید محتاط ہو گئے ہیں۔

امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

یاسمین ملک نے لاہور سے ای میل کی ہے

عرصہ دراز سے شعاع کی قاری ہوں مگر خط لکھتے ہوئے ڈرتی تھی کہ کہیں آپ ردنہ کر دیں۔ آج ہمت کر لی۔ " قافلے راہ بھول "اس طرح کا ناول کچھ عرصہ قبل خواتین میں پڑھ چکے ہیں۔ " زندگی خوب صورت ہے " اچھا تھا۔ " تو عید کا چاند " پڑھ کر بہت مزا آیا۔ افسانے سب اچھے تھے "دل کے رستے " شاہم کو نیکی کرنے پر اتنی بڑی سزا دے دی اور ماہم کو برا کرنے پر سب کچھ مل گیا۔ کاشا جیسے بندے کے ساتھ بھی بہت اچھا ہو گیا۔ میں پچھلے دنوں بہت پریشان تھی "شعاع اور خواتین کی وجہ سے میرا دکھ بہت حد تک کم ہو گیا تھا۔ آخر میں مصنفین سے کہنا چاہوں گی کہ طلاق "جیسے موضوع پر بھی کچھ لکھیں۔

پیاری یاسمین! آپ نے اپنی رائے کا اظہار کیا بہت خوشی ہوئی۔ طلاق کے موضوع پر شعاع میں کئی کہانیاں شائع ہو چکی ہیں' شاید آپ کی نظر سے نہیں گزریں۔ شاہم نے نیکی تو کی تھی مگر وہ نیکی کرتے ہوئے یہ بھول گئی کہ منصور ایک جیتا جاگتا انسان تھا کوئی کھلونا نہیں۔ اس کے دل کو شاہم کی یہ نیکی منظور نہیں تھی۔ آپ شاید بھول گئیں کہ شاہم نے شادی کے لیے منصور کو کس طرح مجبور کیا تھا۔ ارسل کا جنازہ بھی نہیں اٹھا تھا اور اس نے منصور کو مجبور کر کے نکاح پڑھوا لیا۔ کاشا کے ساتھ آپ کو کیا اچھا لگا۔ اس کے ساتھ تو کچھ بھی اچھا نہیں ہوا۔

فضہ اور ملائکہ ساجد اپنے شہر کے نام لکھنا بھول گئی ہیں۔ لکھتی ہیں

سرورق بہترین تھا۔ سب سے پہلے جو ناول پڑھا وہ تھا " دل کے رستے دشوار بہت " ویری گڈ سلوی جی آپ نے تو محفل لوٹ لی اتنا ناول لکھا بہت مبارک ہو جی! قافلے راہ بھول جاتے ہیں سندس! پرانا موضوع مگر دلکش انداز تحریر سبحان اللہ راشدہ جی! زندگی واقعی خوب صورت ہے مگر کچھ لوگوں کے لیے بہت بد صورت ثابت ہوتی ہے ستارہ شام میں جنت کا کردار بہت عجیب ہے۔

دیوار شب بھی بہت اچھا اچھا سا جا رہا ہے ناولٹ اور افسانے بھی اچھے تھے اب آتے ہیں ناول تک یا نند کی طرف اوہ سوری ہے تو افسانہ مگر بہت ہی لاجواب ہے " تجلی کے رنگ " نبیلہ آپ نے بہت اچھے انداز میں پردے کی تشریح کی واقعی پردہ ایک ذمہ داری ہے جو اگر انسان سچے دل سے نبھا سکے تو اسے اختیار کرے ورنہ چھوڑ دے۔

پلیز آپی عدنان بھائی اور رخسانہ نگار عدنان کا انٹرویو شائع کریں۔

فضہ اور ملائکہ! عدنان بھائی کا رخسانہ نگار عدنان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ رخسانہ نگار کے شریک زندگی عدنان نیلی کمیونیکشن میں جاب کرتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عمارہ اسلم مصطفیٰ خان نے نندووال سے لکھا ہے

کسی بھی رسالے میں پہلا خط ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ سلوی کی کہانی ہے۔ " دل کے رستے دشوار بہت تھے " کا موضوع بہت ہی زبردست تھا اور اس میں سب سے اچھا اور اہم کریکٹر کاشا کا تھا۔ لیکن یہ کیا! کاشا کو ہی مار ڈالا۔ پہلے ارسل کا دکھ کیا کم تھا جو کاشا کو مارنا بھی ضروری سمجھا۔ اگر اسے مارنا ہی تھا تو اس کی بیماری کی وجہ سے مارتیں۔ خود کشی سے تو اس کی آخرت بھی خراب کروائی اور ایک بات! ماہم جب منصور کو چھوڑ کر کاشا کے پاس جاتی ہے تو کاشا ماہم سے اس کے بنگلے اور لیلی سے امریکہ سیٹل ہونے کے لیے شادی کرتا ہے اور اینڈ میں یہ بھی کہہ دیا کہ اسے ان چیزوں کی ضرورت نہ تھی۔

ماہم کو کوئی سزا کیوں نہ ملی اور منصور کا کریکٹر شروع میں تو زبردست تھا اور رحم دلی بھی بہت دکھائی گئی تھی لیکن شاہم کی دفعہ اس کی رحم دلی کہاں گئی؟ اور منصور کو اینڈ میں کیوں کٹھ پتلی بنا دیا گیا۔ ماہم کے کہنے پہ اس سے شادی کر لی پھر طلاق دے دی' شاہم نے کہا مجھ سے شادی کرو کر لی' اور پھر ماہم نے معافی مانگی۔ اسے معاف بھی کر دیا۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہ تھی اور کیا کیا کہیں! آخری قسط تو ساری کی ساری سوال تھی۔ لگتا ہے سلوی جی کو کچھ زیادہ ہی جلدی تھی اینڈ کرنے کی۔

عمارہ! آپ کو سلوی علی بٹ کا ناول پڑھ کر دھچکا لگا اس کے لیے بہت معذرت۔ لیکن اگر غور کریں تو اصل زندگی میں اس سے زیادہ تلخ اور ناقابل فہم رویے سامنے آتے ہیں اور ایسے بہت سے سوال بھی جن کا جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ انسان کو سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے... کوئی شخص کس وقت کیا کر بیٹھے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ منصور کے خاندان میں سب مرد بنیادی طور پر ایک عورت کے ہی تھے۔ منصور اور شاہم دونوں کے والد نے بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی نہیں کی اور بچوں کو اکیلے پالا۔ منصور ماہم کی موجودگی میں بھی بچوں کا خیال ان کی دیکھ بھال خود ہی کرتا تھا۔ وہ طبعاً " نرم خو تھا۔ شاہم نے اس کو جذباتی طور پر اس اسٹیج پر لا کھڑا کیا کہ اسے اس سے شادی کرنا پڑی۔ اگر ماہم واپس نہ آتی تو شاید نباہ بھی رہتا لیکن۔ اسے درحقیقت ماہم سے ہی محبت تھی۔ جب وہ واپس آئی اور اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کیا تو منصور کی محبت پھر سے بیدار ہو گئی۔ اس کی کمزور طبیعت اور رحم دلی تھی کہ نہ وہ ماہم کو گھر سے نکال سکا اور نہ ہی شاہم کی جذباتیت کے سامنے ٹھہر سکا۔ جب اس نے شادی کے لیے مجبور کیا۔ اس کو ماہم کے آنسوؤں نے اتنے بڑے اقدام پر مجبور کیا۔

فائزہ اصغر نے پھاٹک ڈسکہ سے لکھا ہے

سب سے پہلے ستارہ شام پڑھ کر بہت مزہ آیا دل ان آمنہ کی آئینہ کے انکشافات پڑھ کر دل خوش ہو گیا اب آتے ہیں دل کے راستے پڑھا ماہم شاہم اور منصور کا جھگڑا اور ماہم پر بہت غصہ آیا ہم نے تو اپنے ڈائجسٹ کے صفحے ہی کو جلا دیا (جذباتی جو ہوئے) افسانے سارے ہی بہت پسند آئے سندس جبیں کے ناول کو شمارے کی جان کہوں گی زندگی خوب صورت ہے بھی ایک اچھی کاوش تھی اور سب سے اہم بات کی ہی نہیں اس ماہ کی ٹائٹل گرل بہت بہت پسند آئیں بھائی کی شادی قریب ہے اس لیے سوچا بھابھی کا ڈریس اسی طرح کا بنوائیں گے۔

پیاری فائزہ شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

سمیرا حیات رسالہ خورد سے شریک محفل ہیں۔ لکھتی ہیں

ٹائٹل کی دلہن بہت زبردست ہے۔ رسالہ لے کر پڑھنے بیٹھیں تو ہمیشہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یہ اتنی جلدی ختم کیوں ہو جاتا ہے۔ راشدہ رفعت اور سندس جبیں کے مکمل ناول بہت اچھے تھے۔ کچھ نیا پن نہیں تھا مگر پھر بھی بہت اچھے تھے۔

سلوی بٹ جی کا اختتام مجھے پسند نہیں آیا۔ شاہم کے ساتھ بہت زیادتی کی گئی ہے۔

دیوار شب بہت خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اب پلیز دویا کے لیے بھی تھوڑی آسانی مہیا کریں۔

ستارہ شام بھی کافی اچھا جا رہا ہے۔ بہرحال فرحت اشتیاق جی اور عمیرہ احمد کی بہت یاد ستاتی ہے۔ نگہت عبداللہ جی پلیز آپ بھی قارئین کا خیال کریں۔ ناولٹ اور افسانے بھی شاندار تھے۔ تجلی کے رنگ بہت زبردست افسانہ تھا۔ آسیہ مقصود شاید نئی رائٹر ہیں۔ زرد تمن کی کوکھ بھی بہت شاندار تھا۔

شعاع کے سارے سلسلے بھی بہترین ہیں۔ خبرناک (جیو ٹاک شو) کے میزبان آفتاب اقبال کا انٹرویو بھی پلیز شائع کر دیں۔

پیاری سمیرا! شعاع کی بزم میں خوش آمدید " آفتاب اقبال کا انٹرویو ضرور شائع کریں گے تھوڑا انتظار کریں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آسیہ مقصود نئی مصنفہ ہیں لیکن انہوں نے بہت اچھا لکھا۔

لاڑکانہ سے فہمیدہ لغاری لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت اچھا تھا ماڈل بہت معصوم لگ رہی تھی۔ سندس جبیں کا مکمل ناول بہت زبردست تھا۔ اریجہ بہت پیاری لگی۔ بے چاری نے بہت ظلم برداشت کیا۔ شکریہ سندس آپی نے ہیپی اینڈ کر دیا۔ راشدہ رفعت کا مکمل ناول بھی بہت اچھا تھا۔ " دل کے راستے " سلوی علی بٹ کا ناول بھی اچھا تھا شاہم اور ماہم دونوں نے برا کیا اپنے ساتھ " صبح کا ستارہ " ناولٹ مجھے کچھ خاص پسند نہیں۔ ثمرہ بخاری کا ناولٹ اچھا تھا بہت مزہ آیا پڑھ کر " زرد تمن کی کوکھ " آسیہ مقصود عبیدی راحت نذیر تجلی کے رنگ نبیلہ ابر راجہ "تینوں کے افسانے بہت ہی زبردست تھے۔ ایک

سے بڑھ کر ایک تھے۔

"رنگ عید کے" میں تمام بہنوں نے بہت اچھے جوابات دیے۔ عید کا پورا شمارہ ہی لاجواب تھا۔

فہمیدہ اشتیاق! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ نے اتنا عرصہ صرف اس ڈر سے خط نہیں لکھا کہ شائع نہیں ہوگا۔ خط شائع نہ بھی ہو تو کم از کم ہم آپ کی رائے تو جان سکتے تھے۔ کاش آپ جان سکتیں ہمیں آپ کے خط پڑھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

سائمہ لودھراں سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے

آپ کا شعاع بہت بہت سویٹ ہے بالکل میری طرح ..... لیکن افسوس کہ جو شمارہ ہم پچھلے مہینے کی 25' 26 کو ہی منگوانا شروع کرتے ہیں وہ ہمارے پاس اگلے مہینے کی 25' 26 کو پہنچ پاتا ہے۔ اصل میں ہم لودھراں میں ہی ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہاں رسالے وغیرہ ملنا مشکل ہی نہیں ..... ناممکن بھی ہے۔ اگر کبھی بھائی یا ابو شہر کی طرف جائیں تو لے آتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شہر میں بھی رسالے کی شکل وصورت نظر نہیں آتی۔

ہم سالانہ خریداری بھی نہیں کروا سکتے ..... کیونکہ اس طرح بھی رسالہ ہمارے گھر نہیں بلکہ ڈاک خانہ میں ہی پہنچے گا اور وہاں سے پھر لانے کا مسئلہ ..... اف ری قسمت۔

اب آتے ہیں شمارے کی جانب ..... سب سے پہلے ٹائٹل گرل کو دیکھا اور منہ سے بے ساختہ واؤ نکلا۔

اور سلویٰ جی یہ کیا کر دیا آپ نے ماہم کے ساتھ جتنا برا ہوا کم تھا۔ مگر یہ کیا؟ ماہم کو تو بچے بھی مل گئے گھر بھی اور منصور کا پیار بھی اور شاہم کے حصے میں کیا آیا ..... شاہم بے چاری تو قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی ..... اف سلویٰ جی ..... اللہ پوچھے گا آپ سے۔

ثمرہ بخاری کا "تو عید کا چاند" واہ جی واہ ..... بلے بلے ثمرہ بخاری جی ہزاروں سال جیو ..... ہزاروں عیدیں مناؤ۔ آپ کے اس ناولٹ ہی نے تو قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے ہمیں

سندس جبیں کا "قافلے راہ بھول جاتے ہیں" میں شاہ فضل نے اریجہ کے ساتھ برا کیا مگر پھر بھی پتا نہیں کیوں ہمیں شاہ فضل پر پیار آ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ شاہ فضل دل کا برا نہیں تھا اس بھائی کی محبت نے ایسا بنا دیا تھا۔ سائرہ عارف آپ "صبح کا ستارہ" تو ختم ہی کر دیں اس میں کچھ خاص نہیں ہے وہی عام سی باتیں وہی عام سے قصے "تتلی کے رنگ" بہت بہت اچھا لگا۔ لیکن تھوڑا غصہ مونا اور زیادہ غصہ تیمور پر آیا۔ ایک خاص بات رائٹرز کے ساتھ ساتھ لودھراں کی رضوانہ تکیل راؤ کی بھی فین ہونے لگی ہوں۔ ارے رضوانہ ہر ماہ اتنی باقاعدگی سے خط کیسے لکھ لیتی ہو۔

"تاریخ کے جھروکوں سے" ہمیشہ کی طرح زبردست ..... رضیہ جی ہمیں عمیرہ احمد اور فائزہ افتخار اور ثمرہ بخاری کا انٹرویو بمعہ تصویر چاہیے۔ فائزہ افتخار اور ثمرہ بخاری سے تو مجھے بہت بہت زیادہ ملنے کی خواہش ہے۔

میں نے ایک ناول لکھا ہے۔ بھیجا ابھی اس لیے نہیں کہ پتا نہیں ہے کہ کس قسم کے کاغذ پر لکھ کر بھیجنا ہے آپ پلیز بتا دیں ناں۔

سائمہ! آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی' خطوط کی طوالت سے ہمیں ہرگز کوفت نہیں ہوتی۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ کو پرچہ لیٹ ملتا ہے اس لیے ہر ماہ خط نہیں لکھ پاتیں۔ آپ ہمیں لیٹ خط بھجوا دیا کریں۔ ہم کوشش کریں گے کہ شامل کر لیں۔

کہانی اسی کاغذ پر لکھیں جس پر خط لکھا ہے۔ بس سطر چھوڑ کر صفحے کے ایک جانب لکھیں۔

ایک کھلاڑی ایک حسینہ

معروف کرکٹر وسیم اکرم کو کرکٹ سے "آؤٹ" ہوئے ایک عرصہ بیت چلا ہے۔ مگر وہ ابھی تک خبروں میں "ان" ہیں۔ ان کا نام ان دنوں مختلف اداکاراؤں کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔ سشمیتا سین کے ساتھ ان کی دوستی کا قصہ ابھی ذہنوں سے محو نہیں ہوا تھا کہ اب اداکارہ عمیمہ ملک کے ساتھ ان کی بڑھتی ہوئی قربت کی داستان کے چرچے ہیں۔

کرکٹ اور شوبز کے ستاروں کا سنگم بہت پرانا ہے۔ ماضی میں بھی ہمارے کرکٹرز شوبز میں خاصی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ عمران خان اور زینت امان' محسن حسن خان اور رینا رائے' شعیب اختر اور دیا مرزا وغیرہ کی دوستیاں عوامی توجہ کا خاص محور رہی ہیں۔

مگر وسیم اکرم ان سب سے بازی لے گئے ہیں' کیونکہ انہوں نے میدان سے اسٹوڈیو تک کی دوڑ کئی مرتبہ لگائی ہے۔ ماضی کے دبیز پردے سرکا کے جھانکیں تو وہ اس وقت کی معروف ٹی وی اداکارہ نیلما حسن کے سنگ "تیری میری ایسی دوستی" کا راگ الاپتے نظر آئیں گے۔ بیگم ہما وسیم کی رفاقت کے دوران وسیم کی ساری دوستیاں پس پشت پڑی رہیں' لیکن اہلیہ کے انتقال کے بعد سوگوار وسیم اکرم نے بھارتی اداکارہ سشمیتا سین کی دوستی میں پناہ ڈھونڈی۔ دونوں نے بھارتی ٹی وی کے ایک پروگرام میں ایک ساتھ جج کے فرائض بھی سرانجام دیے مگر سشمیتا جلد ہی انہیں دغا دے گئیں۔ یوں وسیم ایک بار پھر تنہا ہو گئے۔

ادھر شمعون عباسی سے علیحدگی کے بعد عمیمہ بھی تنہائی کا شکار تھیں۔ لہٰذا دونوں نے ایک دوسرے کی تنہائی بانٹ لی۔ ابھی تک تو دونوں طرف سے "یہ دوستی ہم نہیں چھوڑیں گے" کے عزم کا اظہار ہوا ہے۔ لیکن جناب یہ دنیا ہے اور یہاں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ لہٰذا انتظار کیجیے۔

اجی نام میں کیا رکھا ہے

نام کہنے کو ایک سہ حرفی لفظ ہے۔ مگر اس کی اہمیت سے کسی طور بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نام صرف انسان ہی نہیں چیزوں کی شناخت بھی ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی نام دیکھ کر آپ کو غصہ آ جاتا ہے تو کہیں کسی نام پر

کسی کے دل کی دھڑکن تیز بھی ہو جاتی ہے۔
مگر ہماری فلمی صنعت کے پروڈیوسرز اور ہدایت کار غالباً "ناموں کی اہمیت سے واقف نہیں۔ اسی لیے جب ہی تو فلموں کے نام ایسے عجیب و غریب رکھتے ہیں۔
فلمیں ایک کمرشل میڈیم ہیں۔ لوگ فلمیں دیکھنے جتنی بڑی تعداد میں آئیں گے پروڈیوسرز کا اتنا ہی فائدہ ہے۔ لہٰذا فلموں کے نام ایسے رکھنے چاہئیں جو لوگوں کی توجہ فوراً "کھینچ لیں۔ مگر یہ لوگ ایسے نام رکھنے لگے ہیں کہ جنہوں نے صرف فلم بینوں کو ہی نہیں بلکہ اس میں کام کرنے والے بڑے بڑے لوگوں کو بھی فلموں سے دور کر دیا ہے۔ مثلاً "مولا جٹ" لاہوری ٹھگ "گجر بدمعاش" جٹ دا کھڑاک "میڈم دیہاڑی باز اس ضمن میں یہ واقعہ ہی ملاحظہ کر لیجیے۔
پی ٹی وی سینٹر کراچی کے ایک معروف پروڈیوسر کے کمرے میں محفل جمی تھی۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ اداکار ندیم بھی موجود تھے۔ معروف اداکارہ ہما میر نے ندیم صاحب سے پوچھا کہ "اب آپ فلموں میں کام کیوں نہیں کرتے؟"
اس پر ندیم نے کہا "کچھ عرصہ قبل میں نے ایک فلم سائن کی۔ جب میں اس کی شوٹنگ کے لیے لوکیشن پر پہنچا تو وہاں بے حد شان دار سیٹ لگا ہوا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں خاصا پرجوش ہو گیا مگر جوں ہی مجھے فلم کا نام معلوم ہوا میرا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا اور میں وہاں سے "بھاگ نکلا۔" جب ندیم سے استفسار کیا گیا کہ فلم کا نام کیا تھا تو ندیم نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "گجر ٹائی ٹینک"
جی ندیم صاحب! ہمارے فلم میکرز غالباً "یہی سوچتے ہیں کہ بھئی نام میں کیا رکھا ہے۔ گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو وہ رہے گا تو گلاب ہی نا۔

بولی ووڈ کی آفر سے انکار

راحت فتح علی خان' عاطف اسلم اور علی ظفر کی بھارتی فلموں میں بے مثال کامیابی کو دیکھتے ہوئے ہمارے بے شمار فنکاروں نے بھارت کا رخ کیا۔ کئی ایک نے تو وہاں کی فلموں میں کام کرنے کی خواہش میں وہاں ڈیرہ ہی ڈال دیا اور تمام اخلاقی حدود بھی پار کر لیں۔ جو فنکار ابھی تک وہاں کام کرنے سے محروم ہیں' وہ اسی بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح وہاں کام مل جائے۔ جہاں ہر فنکار اسی حسرت کا شکار ہے وہاں ایک فنکارہ ایسی بھی ہیں کہ جنہوں نے بھارتی پیش کش ٹھکرا دی ہے۔ جی ہاں! یہ حقیقت ہے "آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ وہ "جی دار" کون ہیں تو جناب ہم آپ کا صبر آزمائے بغیر بتائے دیتے ہیں کہ وہ ہیں معروف گلوکارہ عابدہ پروین' بھارتی ہدایت کار سجاش گھئی اور لیش چوپڑا نے عابدہ پروین کو اپنی فلموں میں گانے کے لیے پیش کش کی تھی مگر عابدہ پروین نے معذرت کر لی۔
جیو عابدہ جی! بھارتی فلمی صنعت کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس کی طرف بھی اشارہ کر لیں گے' وہ ان کی طرف دوڑا چلا آئے گا۔ آپ نے اچھا کیا جو انکار کر دیا۔

احتجاج

جی نہیں! یہ وہ احتجاج نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ اس احتجاج میں نہ تو کسی نے کوئی دھرنا ڈالا ہے اور نہ ہی بسیں جلائی ہیں۔ یہ تو بہت "دکھری ٹائپ" کا احتجاج ہے۔ جو ہمارے بہت پیارے فنکار سہیل اصغر نے کیا ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ سہیل اصغر کو اس سال 14 اگست کو حکومت کی جانب سے "تمغہ امتیاز" دینے کا اعلان کیا گیا' مگر سہیل اصغر نے اسے وصول کرنے سے انکار کر دیا ہے' کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ تمغہ امتیاز ان کی فنی خدمات کے اعتراف کے لیے ناکافی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب اداکارہ میرا کو پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا گیا ہے تو انہیں صرف تمغہ امتیاز پر ہی کیوں ٹرخایا جا رہا ہے۔
سہیل جی! آپ کی بات تو سچ ہے مگر بات ہے سمجھ کی۔ ہم مانتے ہیں کہ آپ بہت باصلاحیت فنکار ہیں' مگر ہمیں "میرا" کی صلاحیتوں پر بھی کوئی شک نہیں ہے۔ بس وہ صلاحیتیں ہیں ذرا دکھری ٹائپ کی۔

یہ بیان کالمانہ

ہم نے موت پر بھی اپنے اپنے القابات تخلیق کیے ہوئے ہیں۔ ہمارے والا شہید ہے' دوسرے والا ہلاک۔ اس شہید اور ہلاک کی جنگ میں ایک اور لفظ جاں بحق تخلیق کیا گیا۔ یعنی ایسا بے یار و مددگار شخص جو کسی سیاسی پارٹی' کسی لسانی گروہ یا کسی نسل پرست تنظیم سے متعلق نہ تھا' وہ جان سے گیا تو نہ شہید اور نہ ہلاک بس جاں بحق ہو گیا۔

(اوریا مقبول جان۔ حرف راز)

جب مرزا اسلم بیگ فوج کے سربراہ ہوتے تھے تو انہوں نے کراچی میں بھتہ خوری اور حالات کی خرابی کے اسباب کے بارے میں خصوصی تحقیق کروائی تھی۔ اس فوجی ٹیم کو حکم تھا کہ وہ مزدوروں والے کپڑے پہن کر مزدوروں میں گھل مل جائے۔ رات کو فٹ پاتھوں پر نشہ کرنے والوں کے درمیان رہے۔ عام چائے خانوں میں راتیں گزارے۔ اس فوجی ٹیم نے دو' تین ماہ فٹ پاتھوں پر گزارنے کے بعد جو رپورٹ دی تھی۔ کیا جنرل کیانی عوام کو وہ رپورٹ دکھائیں گے؟ کیا جنرل اسلم بیگ ہی عوام کو بتائیں گے؟

(رفیق ڈوگر۔ سیاسی تجزیہ)

بھارت میں وزیر خارجہ حنا ربانی کھر کے ملبوسات کانوں کے آویزے' قیمتی بیگ اور ہیرے کے نیکلس سے لے کر سینڈل تک کو ذرائع ابلاغ میں زیر بحث لایا گیا۔ ان کو کم عمر مسحور کن خاتون کے القابات سے نوازا گیا۔ اس کے برعکس چین میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ انہیں صرف پاکستان کی وزیر خارجہ کی حیثیت سے ہی پذیرائی ملی۔
اس سے پتا چلتا ہے کہ ایک سنجیدہ اور اپنے مقصد پر نظر رکھنے والی قوم اور خرافات میں الجھی رہنے والی قوم میں کیا فرق ہے۔

(بی بی سی نیوز)

میرے یہ دانش ور اس قدر اللہ کے نام کے ذکر سے

خائف ہیں کہ ان کے علم میں ہوتا ہے کہ زلزلے میں' سیلاب میں' آفات میں سب سے پہلے وہی لوگ لپک لپک کر میدان میں آتے ہیں' جو اللہ کی حاکمیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے ٹی وی چینل ان کی داڑھیاں اور ماتھے کے محراب دکھانے سے کتراتے ہیں۔

(اوریا مقبول جان۔ حرف راز)

بنگلہ دیش میں حسینہ واجد کی سیکولر جماعت عوامی لیگ کی حکومت نے ابھی چند ماہ پہلے اسلام کو بنگلہ دیش کا سرکاری مذہب قرار دے دیا ہے۔ اس لیے کہ خود سیکولر ہونے کے باوجود وہ یہ بات جانتی ہیں کہ اسلام کو نکال دیا تو پھر بنگلہ دیش کے الگ ملک ہونے کا جواز ہی ختم ہو جائے گا اور بھارت کے مغربی بنگال میں بنگلہ دیش کے انضمام کی تحریک زور پکڑ جائے گی۔

(عبداللہ طارق سہیل۔ وغیرہ وغیرہ)

غلبہ روم کی پیش گوئی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب سے متصل ایران اور روم کی نہایت طاقت ور اور قدیم حکومتیں قائم تھیں۔ ایران کا بادشاہ خسرو اور روم کا حکمران ہرقل کہلاتا تھا۔ یہ دونوں حکومتیں ایک دوسرے کی حریف تھیں اور ان میں وقتاً فوقتاً لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں لیکن 613ء میں ان دونوں کے درمیان ایک انتہائی خوف ناک جنگ شروع ہو گئی۔ جو اپنی شدت اور وسعت میں پہلی تمام لڑائیوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس وقت بعثت نبوی کا پانچواں سال تھا۔ ایرانی آتش پرست تھے۔ ان کے عقائد مشرکین مکہ کے عقائد سے مماثلت رکھتے تھے۔ دوسری طرف رومی دین مسیح کے پیروکار تھے اور اہل کتاب تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو قدرتی طور پر اہل کتاب رومیوں سے ہمدردی تھی' اور مشرکین مکہ کی دلی ہمدردیاں ایران کے آتش پرستوں کے ساتھ تھیں۔ اس جنگ میں خونریز لڑائیوں کے ایک لامتناہی سلسلے میں ایرانیوں نے رومیوں کو پے در پے شکستیں دیں اور انہوں نے ارض شام کا ایک ایک شہر رومیوں سے چھین لیا حتیٰ کہ عیسائیوں کے مقدس ترین شہر یروشلم پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔

ایرانی فتوحات کا سیلاب یہیں نہیں رکا' بلکہ اس نے پورے مصر اور ایشیائے کوچک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ایرانی لشکر فتح کا پرچم اڑاتا ہوا فرمانروائے روم کے دارالسلطنت قسطنطنیہ کے سامنے جا کر خیمہ زن ہو گیا۔ انہوں نے شہنشاہ روم سے مطالبہ کیا کہ ایک ہزار باکرہ لڑکیاں' ایک ہزار گھوڑے' ایک ہزار گالنٹ سونا ایک ہزار گالنٹ چاندی' ایک ہزار ریشم کے تھان ایرانیوں کے حوالے کر دیں اور خراج میں ایک بہت بڑی رقم ادا کریں۔

رومیوں نے ان شرم ناک شرائط کو قبول کر لیا' لیکن کج کلاہ ایران کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی اور اس نے کہا کہ جب تک ہرقل پابہ زنجیر میرے تخت کے نیچے آکر مجوسیت قبول نہ کرے' میں رومیوں سے صلح نہ کروں گا۔

ایرانیوں کی کامیابی پر مشرکین مکہ نے خوب خوب خوشیاں منائیں اور مسلمان جو پہلے ہی قریش کے جور و ستم کی چکی میں پس رہے تھے۔ اہل کتاب عیسائیوں کی شکست سے سخت دل گرفتہ اور ملول ہوئے۔ یکایک ان مایوس کن حالات میں اللہ تعالیٰ نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر سورہ روم کی یہ آیات جاری کر دیں۔ (ترجمہ)

"رومی قریب کی زمین میں مغلوب ہو گئے ہیں' لیکن وہ چند سال کے اندر پھر غالب ہوں گے۔ اللہ ہی کے ہاتھ میں پہلے اور پیچھے سب اختیار ہے اور اس دن مسلمان اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے۔ وہ جس کی چاہے مدد کرے۔ وہ غالب اور رحیم ہے۔ خدا کا وعدہ ہے اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔" (سورہ روم 104)

یہ پیشن گوئی جس قدر واضح اور غیر مبہم تھی۔ واقعات کے لحاظ سے اسی قدر ناقابل یقین تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بغلیں بجانے والے مشرکین کو باآواز بلند یہ پیش گوئی سنائی۔

"اس پیش گوئی کے پورا ہونے کے لیے کوئی وقت مقرر کرو۔" مشرکین نے کہا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے قیاس کے مطابق پانچ سال کی مدت مقرر کی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "بضع کا لفظ تین سے نو تک بولا جاتا ہے' اس لیے وقت اسی کے مطابق مقرر کرنا چاہیے تھا۔" چنانچہ یہ پیش گوئی سورہ روم کے نازل ہونے کے نویں سال غزوہ بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے پوری کر دی۔ مغلوب رومی خواب غفلت سے چونکے' ہرقل کی طبیعت میں انقلاب پیدا ہو گیا اور وہ اہل روم کی قیادت کرتا ہوا مغرور ایرانیوں پر اس زور سے حملہ آور ہوا کہ ان کے قدم کہیں بھی نہ تھم سکے۔ ہرقل نے ان سے اپنا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ان کو شکستوں پر شکست دیتا اندرون فارس کی طرف دھکیلتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ کامل طور پر مغلوب ہو گئے۔ اس وقت مسلمانوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اور مشرکین غم و اندوہ سے نڈھال تھے۔ تاہم جن کو اللہ تعالیٰ نے عقل سلیم دی تھی۔ وہ اس واضح نشان اور عظیم الشان معجزے کو دیکھ کر شرک سے تائب ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ قرآن کریم کی اس واضح پیشن گوئی اور اس کے پورا ہونے کا اعتراف غیر مسلم مورخین نے بھی کیا ہے۔"

خلیفہ ابو جعفر منصور

منصور ہیبت' شجاعت' اصابت رائے اور متانت عقل میں تمام عباسی خلفاء پر فائق تھا۔ ذہن و جودت طبع میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ لہو و لعب کے پاس تک نہ پھٹکتا تھا۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ منصور نے ساری عمر فقر و فاقہ سے بسر کی۔ مورخ ابن خلدون "ابو جعفر منصور" کے متعلق لکھتا ہے۔ وہ اپنے اہل و عیال کے لیے بیت المال سے نئے کپڑے بنوانے سے بھی احتراز کرتا تھا۔ منصور مخالفین کے حق میں نہایت قہار واقع ہوا تھا۔ لیکن اس کے خصائل حمیدہ میں یہ خاص بات تھی کہ جب کوئی شخص صفائی پیش کر کے اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرتا تھا تو اس کا عذر قبول کر لیتا تھا۔

"زہیر بن قرکی" عامل ہمدان نے ابو نصر مالک بن الہیثم کو گرفتار کر کے اسے ایک غلط فہمی کی بنا پر رہا کر دیا تھا۔

ابو نصر اپنی رہائی کے بعد دارالخلافہ پہنچا۔ خلیفہ اس کو اس بات پر ملامت کرنے لگا کہ اس نے ابو مسلم کو خراسان جانے کا مشورہ کیوں دیا۔ ابو نصر نے عرض کیا۔

"امیر المومنین! واقعی ابو مسلم نے مجھ سے صلاح لی تھی' اور میں نے اسے نیک مشورہ دیا تھا۔ اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جب کوئی اس سے صلاح پوچھے تو اس کو نیک نیتی کے ساتھ ایسی صحیح رائے دے جو اس کے حال و مآل کے لیے بہتر ہو' اگر امیر المومنین بھی کسی امر میں مجھ سے مشورہ کریں تو میں نیک اور خیر خواہانہ مشورہ دوں گا۔ گو میرا مشورہ امیر المومنین کے اغراض اور مفاد کے خلاف تھا۔ لیکن اس شخص کے لیے تو سود مند تھا۔ جس نے میری رائے دریافت کی۔"

منصور نے یہ سن کر نہ صرف اس کی جرم بخشی کر دی' بلکہ اس کو گورنر بنا دیا۔ (تحریر: حسام سلانوالی)

قطب الدین ایبک

وہ سوداگر ترکستان سے آرہا تھا۔ اس کے ساتھ بہت سا سامان تھا اور سانولی رنگت والا ایک بچہ بھی جو اپنی معصوم اور حیران نگاہوں سے نیشاپور کے ترقی یافتہ اور شان دار شہر کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا۔ یہ بچہ خوش شکل تو نہ تھا' لیکن اس کے چہرے کا بے پناہ بھولا پن اور ذہین آنکھیں پہلی ہی نظر میں متاثر کرتی تھیں۔ سوداگر نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اس بچے کو نیشاپور میں کسی کے ہاتھ فروخت کر دے گا۔ اس سیاہ رو بچے کے زیادہ دام ملنے کی امید تو نہ تھی۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ نیشاپور بڑا شہر ہے۔ یہاں بڑے بڑے بازار ہیں' کھاتے پیتے لوگ رہتے ہیں' شاید اس بچے کے

کوئی مناسب دام دے۔

سوداگر نے بچے کو فروخت کرنے کے لیے جس گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا وہ گھر قاضی فخرالدین عبدالعزیز کوفی کا تھا جو نیشاپور اور مضافات کے حاکم تھے۔ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا منصب بھی ان ہی کے پاس تھا۔ شاید سوداگر نے سوچا ہو کہ شہر کا حاکم ہی سب سے زیادہ مال دار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسی کے ہاتھ بچے کو فروخت کر دیا جائے تو اچھے پیسے مل سکتے ہیں۔

قاضی فخرالدین نے بچے کو دیکھا اور پھر حکم دیا کہ سوداگر کو بچے کے عوض ایک خطیر رقم ادا کر دی جائے۔ سوداگر رقم لے کر خوش خوش چلا گیا۔

اب قاضی صاحب بچے کی طرف متوجہ ہوئے اجنبی ماحول کی وجہ سے اس کے انداز میں بڑی جھجک اور ہچکچاہٹ پائی جاتی تھی۔ قاضی صاحب نے اسے تسلی دی۔ پر شفقت انداز میں اس کی ڈھارس بندھائی اور اپنے خادموں کو حکم دیا کہ بچے کی رہائش اور تعلیم کا معقول بندوبست کیا جائے۔

یہ بچہ قطب الدین تھا جو آگے چل کر قطب الدین ایبک کہلایا اور قدرت نے قطب الدین ایبک کو برصغیر پاک و ہند کا پہلا مسلمان فرماں روا ہونے کا شرف بخشا۔ قطب الدین ایبک نے برصغیر پر بحیثیت مجموعی بیس سال اور چند ماہ حکومت کی اور اس عرصے میں اس نے دہلی، میرٹھ، علی گڑھ، بدایوں، قنوج، کالپی، بنارس، جھانسی، بہار اور بنگال کے وسیع علاقے کو فتح کر کے اسلامی مملکت میں شامل کر دیا اور اس سرزمین پر اسلام بڑی تیزی سے پھیلنے لگا۔

مسلمان تقریباً "ساڑھے چھ سو سال تک ہندوستان پر حکمرانی کرتے رہے۔

اچھوت لیڈر

کشمیری رہنما مذہب کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کے خلاف تھے۔ اس سلسلے میں وہ قائداعظم کو قائل کرنے کے لیے نئی دہلی میں ان کی رہائش گاہ اورنگ زیب روڈ پر ان سے ملے تو بقول شیخ عبداللہ قائداعظم رحمتہ اللہ نے میری باتیں نہایت خاموشی اور صبر و سکون سے سنیں۔ پھر ایک مرد بزرگ کے انداز میں مجھے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

"عبداللہ! میں تمہارے باپ کی مانند ہوں اور میں نے سیاست میں اپنے بال سفید کیے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ ہندو پر کبھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کبھی آپ کے دوست نہیں بن سکتے۔ میں نے زندگی بھر ان کو اپنا بنانے کی کوشش کی لیکن مجھے ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک وقت آئے گا جب تمہیں میری بات یاد آئے گی اور اس وقت تم کف افسوس ملو گے۔"

قائداعظم نے بڑے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

"عبداللہ! تم ایسی قوم پر کس طرح اعتبار کر سکتے ہو جو تمہارے ہاتھ سے پانی پینا پاپ (گناہ) سمجھتی ہے۔ ان کی سوسائٹی میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں۔ وہ تمہیں ملیچھ سمجھتے ہیں۔"

قائداعظم نے اس سلسلے میں اپنا ایک تجربہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"ایک بار بمبئی میں وہ دوپہر کا کھانا اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھے کھا رہے تھے کہ اچانک ہوٹل میں پنڈت مدن موہن مالویہ کہیں سے آنکلے۔ وہ بھی غالباً لنچ کے لیے وہاں آئے تھے۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ ہی کھانا کھانے کی دعوت دی۔ وہ بولے۔ "میں مذہبی وجوہ کے باعث ایک ہی میز پر تمہارے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتا۔"

جب میں نے کہا کہ ساتھ والی میز پر بیٹھ کر کھانا تناول فرمائیں تو جانتے ہو انہوں نے کیا جواب دیا۔

"یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ مشترکہ قالین بچھی ہوئی ہے اور اس کے ذریعے چھوت آ سکتی ہے۔ میں چھوت چھات کا سخت قائل ہوں۔" "تب میں نے بیرے کو بلوا کر قالین ہٹوایا اور پنڈت کے لیے خشک میوے اور دودھ کا آرڈر دیا۔"

شیخ عبداللہ لکھتے ہیں۔ مجھے یہ واقعہ سنانے کے بعد قائداعظم نے فہمائش کے انداز میں کہا کہ

"عبداللہ! جس قوم کے برگزیدہ لیڈروں کا یہ حال ہے

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

ہرا مسالا چکن اور چپاتی

اجزاء :

چکن	1 کلو
پیاز	2 عدد پسی ہوئی
دہی	آدھا کپ
دھنیا/پودینہ	1 گٹھی
ہری مرچ	8 عدد
زیرہ	1 چائے کا چمچ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
لیموں	1 عدد
لہسن ادرک پیسٹ	1 چائے کا چمچ
بادام	8 عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب :

پتیلی میں تیل گرم کریں اور چکن فرائی کر کے نکال لیں۔ اسی تیل میں پسی ہوئی پیاز اور لہسن ادرک کا پیسٹ ڈال کر فرائی کریں۔ تمام ہرا مسالا پیس کر پیاز میں شامل کر دیں۔ دہی پھینٹ کر ڈالیں اور 2 منٹ بھوننے کے بعد چکن بھی ڈال دیں۔ جب دہی کا پانی خشک ہونے لگے تو سمجھیں چکن بھی گل گیا ہے۔ اب گرم مسالا اور لیموں چھڑک کر ڈش میں نکال لیں۔ چپاتیوں کے ساتھ پیش کرتے ہوئے بادام بھی باریک کاٹ کر ڈال دیں۔

کھٹے فرائیڈ بینگن

اجزاء :

بینگن	1 کلو
املی پیسٹ	آدھا کپ
کلونجی	آدھا چائے کا چمچ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچ
رائی	آدھا چائے کا چمچ
پسی سرخ مرچ	1 چائے کا چمچ
ادرک	1 درمیانہ ٹکڑا

ہری مرچ	4 عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
زیرہ	1 چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
تیل	ایک کپ

ترکیب :

بینگن کاٹ کر نمک ملے پانی میں بھگو دیں۔ ایک پیالے میں تمام سوکھے مسالے ملالیں اور پیس لیں، پانی سے بینگن نکال کر مسالے میں ڈال دیں۔ تیل گرم کرکے مسالے میں لگے بینگن کے ٹکڑے ڈال دیں۔ ہلکا سا مکس کریں اور ڈھکن بند کرکے بھاپ میں گلنے کے لیے چھوڑ دیں۔ املی کا پیسٹ ڈال کر ہلکے ہاتھ سے بھونیں۔ ڈش میں نکال کر باریک کٹا ہوا دھنیا اور ادرک سے سجاوٹ کریں اور ابلے ہوئے چاولوں یا چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

کوکمبر منس رول

اجزاء :

قیمہ	1 پاؤ
پیاز	1 عدد
کٹی سرخ مرچ	1 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن ادرک پیسٹ	1 چائے کا چمچہ
ٹماٹو کیچپ	آدھا کپ
کریم	آدھا کپ
کھیرے	2 عدد
پراٹھے	4 عدد
تیل	2 کھانے کے چمچے

ترکیب :

تیل گرم کرکے پیاز ڈالیں اور ہلکی نرم کرلیں۔ قیمہ اور لہسن ادرک کا پیسٹ ڈال کر فرائی کریں۔ جب قیمے کا پانی خشک ہو جائے تو بھون لیں۔ نمک، کٹی سرخ مرچ اور ٹماٹو کیچپ ڈال کر مکس کریں اور ایک منٹ تک بھون کر چولہا بند کر دیں۔

ایک کھیرے کو کش کرلیں اور ایک کھیرے کو سلائس میں کاٹ لیں۔ پراٹھے میں قیمہ کا آمیزہ، کش کیا ہوا کھیرا اور کریم ڈال کر رول کریں اور ٹوتھ پک سے بند کر دیں۔ سلائس میں کٹے ہوئے کھیرے کے ساتھ پلیٹ میں سجائیں اور پیش کریں۔

انڈے کی ربڑی

اجزاء :

دودھ	1 کلو
چینی	تین چوتھائی کپ
انڈے کی سفیدی	3 عدد
کارن فلور	1 کھانے کا چمچہ
الائچی	4 عدد
پستے بادام	سجاوٹ کے لیے

ترکیب :

دودھ میں الائچی ڈال کر اتنا پکائیں کہ تین پاؤ رہ جائے۔ چینی ڈال کر مزید پکائیں۔ تھوڑا سا دودھ نکال کر ٹھنڈا کرلیں۔ ٹھنڈے دودھ میں کارن فلور (مکئی کا آٹا) ملا کر گاڑھا کریں پھر انڈوں کی سفیدی پھینٹ کر ڈال دیں۔ اب یہ آمیزہ پکتے ہوئے دودھ میں ڈال کر کچھ دیر پکائیں۔ ٹھنڈا ہونے پر پستے بادام چھڑک کر پیش کریں۔

قیمے بھرے پراٹھے

اجزا :

قیمہ	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
سرخ پسی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا	1 چائے کا چمچہ
پیاز	1 عدد
پسا گرم مسالا	1 چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
ہری مرچ	4 عدد
تیل	4 کھانے کے چمچے

ترکیب :

تیل گرم کرکے پیاز سنہری کرلیں۔ ہرا مسالے کے علاوہ تمام اجزا ڈال کر مکس کریں اور ہلکی آنچ پر قیمہ گلنے کے لیے چھوڑ دیں۔ قیمہ گل جائے تو خوب بھون کر خشک کرلیں۔ ہرا دھنیا اور ہری مرچ باریک کاٹ کر ڈال دیں۔ خیال رہے کہ قیمہ خوب اچھی طرح خشک ہو جائے۔ اب پراٹھے بنانے کے لیے قدرے چھوٹا پیڑا لے کر چھوٹی روٹی بیل کر الگ رکھ دیں۔ اسی سائز کی دوسری روٹی بیلیں۔ 2 کھانے کے چمچے قیمہ رکھ پوری روٹی پر پھیلائیں۔ پہلے سے بیلی ہوئی روٹی اس کے اوپر رکھ کر اچھی طرح دبائیں پھر بیل لیں اور عام پراٹھوں کی طرح تل لیں۔ قیمہ بھرا ہونے کی وجہ سے احتیاط سے پلٹیں۔ انار دانے اور املی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

انڈوں کا کھٹا میٹھا سالن

ضروری اجزا :

ٹماٹر	ایک کلو
ثابت دھنیا	کھانے کے دو چمچے
املی کا پیسٹ	کھانے کے دو چمچے
ادرک (پسی ہوئی)	چائے کے دو چمچے
لہسن (پسا ہوا)	چائے کا ایک چمچہ
سرخ مرچ (پسی ہوئی)	چائے کا آدھا چمچہ
کڑھی پتہ	دس عدد
ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا)	کھانے کے دو چمچے
بیسن	کھانے کا ایک چمچہ
تیل	حسب ضرورت
رائی	چائے کا آدھا چمچہ
سفید زیرہ	چائے کا آدھا چمچہ
سونف	چائے کا آدھا چمچہ
کلونجی	چائے کا آدھا چمچہ
ثابت لال مرچ	ایک عدد
ابلے ہوئے انڈے	4 عدد

ترکیب :

ٹماٹروں کو کاٹ کر ثابت دھنیا، املی کا پیسٹ، لہسن، پسی ہوئی سرخ مرچ، کڑھی پتا اور ہرا دھنیا سمیت ایک پتیلی میں ہلکی آنچ پر پکائیں۔ پھر پانچ منٹ کے لیے ڈھانپ کر ٹماٹروں کو گلا لیں۔ اب آمیزے کو ایک پیالے میں رکھ لیں۔ بھنا ہوا زیرہ وغیرہ آمیزے میں ڈال دیں پھر دوبارہ اس آمیزے کو فرائی پین میں پکائیں۔ اگر تھوڑا پتلا ہو تو ایک چمچہ بیسن سنہری مائل بھون کر ٹماٹروں کے آمیزے میں ملالیں۔ ایک دوسرے فرائی پین میں تیل گرم کرکے اس میں رائی کے دانے، سونف، کلونجی، سوکھی سرخ مرچ، کڑھی پتہ ڈال کر پکائیں۔ جب یہ پکنے لگیں تو اس میں لہسن شامل کریں۔ جب لہسن سنہری مائل ہو جائے تو ٹماٹروں کا آمیزہ ملا دیں اور اچھی طرح ملالیں۔ ابلے ہوئے انڈوں کو آدھا کاٹ کر اس میں شامل کریں۔ لیجیے انڈوں کا کھٹا میٹھا سالن تیار ہے۔

ادارہ

چہرے کا مساج

چہرے کا مساج جلد کے لیے نہایت مفید ہے۔ مساج نہ صرف جلد کو صاف کرتا ہے بلکہ اس سے خون کی گردش بھی بڑھ جاتی ہے۔ مساج ہر طرح کی جلد کے لیے فائدہ مند ہے بشرطیکہ طریقے سے اور ہولے ہولے کیا جائے۔

مساج کے مختلف گر

آپ کو مساج کرنے میں دقت پیش آئے گی اس کے لیے آپ کو چاہیے کہ اپنی انگلیوں کو درست سمت میں حرکت دیں۔ اگر جھریاں عمودی ہیں تو افقی انداز میں اگر افقی ہیں تو عمودی انداز میں انگلیاں چلائیں۔ بہت ساری کریم لگانے کی ضرورت نہیں آدھا اسپون کریم لے لیں جو آپ کی انگلیوں کو چہرے پر پھیلنے میں مدد دینے کے لیے کافی ہوگی۔

تولیہ سے مدد

اگر آپ کو مندرجہ بالا طریقہ دشوار لگے تو آپ صرف یہ کریں کہ مساج کریم (معمولی مقدار میں) انگلیوں پر لگا کر چہرے پر جگہ جگہ نقطوں کی صورت میں لگالیں' دوسرے مرحلے میں نیم گرم تولیے کو تیس سیکنڈ تک چہرے پر مساج کے طور پر رگڑیں۔

مساج کریم صاف کرنا

مساج سے فارغ ہوجائیں تو مساج کریم کی صفائی پر توجہ دیں۔ ٹشو پیپر سے کریم کو صاف کرنے کی بھی کوشش نہ کریں۔ اس سے آپ کی جلد کو نقصان پہنچے گا اور مساج سے جو اثر حاصل کیا گیا ہے وہ ضائع ہو جائے گا۔ اسے صاف کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کاٹن پیڈ کو ملک لوشن میں بھگو کر کریم کو ہولے ہولے صاف کرلیں۔ متبادل کے طور پر آپ گرم تولیے سے اپنا چہرہ صاف کرسکتی ہیں۔ تولیہ کو اگر تھوڑی دیر کے لیے اسٹیم کرلیں تو اور بھی اچھا رہے گا۔ اس سے چہرہ صاف کرنے سے جلد کی رنگت اور نکھر جائے گی۔

مرحلہ وار طریقے

گھر پر فیشل مساج سے سو فیصد نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ذیل میں دی گئی ہدایات سے استفادہ کریں۔

مساج کی شروعات گردن سے کریں۔ دونوں ہاتھوں کو استعمال کریں اور ایک ہاتھ سے مساج کرنے کے فوراً" بعد دوسرے ہاتھ کو حرکت میں لے آئیں تاکہ تسلسل قائم رہے۔ دونوں ہاتھوں کو حرکت میں رکھتے ہوئے اوپر کی طرف آئیں یعنی جبڑے کے نچلے حصے اور پھر کانوں کی طرف۔ ذہن میں یہ بات رہے کہ انگلیوں کی حرکت ایک ہی سمت میں ہو۔

جہاں ہنسنے کی وجہ سے لکیر بن جاتی ہے اسے لافنگ لائن کہتے ہیں۔ وہاں سے مساج کا عمل شروع کریں۔ ناک سے اوپر کی طرف جائیں مگر آنکھوں کے نیچے دباؤ ہلکا رکھیں۔ ایک بار پھر اس بات کا خیال رکھیں کہ مساج ایک ہی ڈائریکشن میں ہو۔

اب ٹھوڑی پر آجائیں اور دونوں ہاتھوں سے اوپر کی طرف حرکت دیتے ہوئے مساج کریں۔ اوپری ہونٹ کے پاس ہتھیلیوں سے مساج کریں اور دونوں ہتھیلیوں کی حرکت میں اختلاف ہو یعنی ایک کو دائیں جانب تو دوسرے کو بائیں جانب حرکت دیں۔

شہادت کی انگلی کی مدد سے آئی پاکٹ کا اندازہ لگائیں اور باہر والے کونے سے مساج کا عمل شروع کریں۔ پپوٹوں پر آئیں اور اسی طرح دوسرے کونے پر نکل جائیں مگر پلک کو ٹچ نہ کریں۔ اب ناک کے اوپر اور نیچے کی جانب مساج کریں' ناک کی دائیں اور بائیں جانب بھی یہی عمل کریں۔